جولائی ۱۹۵۲

مرتب

نعیم صدیقی

مکتبہ چراغِ راہ
اشاعت بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی ۱

ماہنامہ
چراغ راہ
کراچی
کی
اشاعتِ
خاص
اشتراکی جنت میں جبری محنت
FORCED LABOUR IN RUSSIA
قیمت ، آٹھ آنے
جولائی ۱۹۵۲ء
تالیف: ڈیوڈ جے ڈیلین و نکولاوسکی
ترجمہ: پروفیسر عبدالحمید ایم اے
جلد: ۵ شمارہ: ۸

عنوانات

تعارف

گزشتہ سال کی بات ہے کہ "فورسڈ لیبر ان رشیا" میری نظر سے گزری۔ کتاب چونکہ مستعار لی گئی تھی اس لئے پوری پڑھنے سے پہلے واپس کر دینی پڑی۔ مگر جتنا حصہ مطالعہ کیا جا سکا اس کے زیر اثر میری رائے یہ تھی کہ یہ کتاب اشتراکی روس کے ایک اہم پہلو پر مخصوص تحقیقی مواد بہم پہنچاتی ہے جو اشتراکی پروپیگنڈے سے متاثر ہونے والے سادہ دل نوجوانوں اور خصوصاً ہمارے محنت پیشہ طبقہ کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے۔

اس کتاب کی تحریر کا مزاج اگر پروپیگنڈے کا ہوتا تو شاید ہم سے زیادہ اہمیت نہ دیتے۔ لیکن چونکہ یہ سنجیدہ علمی انداز سے مدون کی گئی ہے اس لئے بہت ہی ضروری معلوم ہوا کہ اس کی تلخیص اردو داں طبقے کے سامنے آنی چاہیئے۔ ترجمہ و تلخیص کے کام کے لئے کسی رفیق کے تعاون کی ضرورت تھی۔ چنانچہ خوش قسمتی سے رفیق عزیز پروفیسر عبدالمجید صاحب ایم اے اس کام کے لئے بڑے شوق سے آگے بڑھے اور ہم نے موصوف کے تعاون کی بنا پر یہ جرأت کی کہ "چراغ راہ" کی ایک اشاعت خاص کو اس کام کے لئے وقف کرنے کا اعلان کر دیں۔

یہ تلخیص آپ کو اصل ضخیم کتاب سے بالکل بے نیاز نہیں کر سکتی لیکن بڑی حد تک اس کا معلوماتی جوہر اس میں سمٹ آیا ہے۔ آپ اس کا مطالعہ کر کے اس خوفناک حقیقت سے غالباً پہلی مرتبہ آشنا ہوں گے کہ روس کی جنت کے اندر ایک گوشۂ جہنم بھی ہے جس میں کم و بیش ڈیڑھ کروڑ انسان بدترین قسم کی غلامی کی پستی میں گرا دیئے گئے ہیں۔

بیگار کیمپوں کی یہ آبادی کی انتہائی سستی محنت روس کی منصوبہ بند ترقی کی کامیابی کا ایک بڑا عامل ([illegible]) ہے۔ ان بیگار کیمپوں کی داستان پڑھ کر آپ یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ معاشی مصالح کو اخلاقی قدروں سے اہم تر بنا کر زندگی کا جو نظام تعمیر کیا جائے گا اس میں انسانیت بہر حال اسی طرح پامال ہو کر رہے گی۔ علاوہ ازیں آپ کے سامنے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جائے گی۔ اشتراکیت کا یہ نظریہ کہ جرائم کے اسباب معاشی ہوتے ہیں اور اشتراکی معاشرہ بننے پر جرائم ختم ہونے لگیں گے عمل کے میدان میں کس بری طرح غلط ثابت ہو چکا ہے۔

کمیونسٹ روس پرستی کے جذبے کے تحت کب تک حقائق کی تاویل کرتے چلے جائیں گے۔ وہ کہاں تک سرخ جنت کے پیچھے جہنم کے شعلوں کو پوشیدہ رکھ سکیں گے!

اگر اس تلخیص میں افادیت محسوس کی گئی تو بہت جلد "مکتبہ چراغ راہ" سے نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں بھی آپ کے سامنے پیش کر دے گا۔

اگر امریکہ کے نعرۂ آزادی کے معنی نیگرو قوم کی تاریخ کی غلامی کی روشنی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔
تو روس کے نظام مساوات کی حقیقت اس کے بیگار کیمپوں کے مطالعہ سے بھی جانی جا سکتی ہے۔

ادارہ

[illegible] میں وہ جنرل حالات تھے جہاں [illegible]۔ مگر یہ سب کچھ عارضی تھا اور [illegible] میں حالات سخت بگڑ گئے۔ دوسری جنگِ عظیم میں تو قید نے ان کیمپوں میں مستقل ڈیرے ڈال لئے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ ان قیدیوں کو جان بچانے کے لئے درختوں کی جڑوں، غلاظتوں اور چوہوں تک کو کھانا پڑا۔

ان کیمپوں میں خوراک کے بارے میں عام حکمتِ عمل یہ ہے کہ جتنی خوراک کم سے کم دی جائے اتنا ہی حکومت کے لئے مفید ہے۔ ان قیدیوں کو ہمیشہ فاقہ کشی کی حالت میں رکھا جائے اور پھر انہیں زار بیتے کے چابک دے دے کر زیادہ سے زیادہ محنت پر لگایا جائے۔ چنانچہ ہمیں کثرت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مزدوروں نے مچھلی کے ایک ٹکڑے کے لئے زندگی تک کی بازی لگا دی اور چند سالوں کی ان شاق محنت سے جانِ جان آفرین کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ان سارے کیمپوں میں خوراک کی تقسیم "دیگ" کے نظام Cauldron System کے مطابق کی جاتی ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خوراک کی مقدار اور نوعیت کا انحصار مزدور کی قوتِ کارکردگی پر ہے۔ پھر خوراک کا نظام ہر کیمپ میں علیحدہ علیحدہ ہے۔ یہاں مثال کے طور پر روس کے شمالی حصے کی خوراک کی تقسیم کا سسٹم بیان کیا جاتا ہے۔

پہلی دیگ:۔ اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو مطلوبہ معیار کے مطابق کام کو سرانجام نہ دے سکیں۔ یا دوسرے درجے کے مریض ہوں۔ انہیں دن میں دو وقت پتلا شوربہ اور [illegible] اونس روٹی دی جاتی ہے۔

دوسری دیگ: اس میں وہ لوگ آتے ہیں جو پورا کام کرتے ہیں۔ انہیں دن میں دو دفعہ پتلا شوربہ اور تقریباً ڈیڑھ پاؤنڈ آٹے کی روٹی دی جاتی ہے۔

تیسری دیگ:۔ اس فہرست میں وہ لوگ شمار ہوتے ہیں جو مطلوبہ معیار سے ۲۵ سے ۵۰ فیصد تک زیادہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ انہیں دن میں دو مرتبہ شوربے کے علاوہ کبھی کبھی شام کے کھانے کے ساتھ مچھلی یا گوشت بھی دیا جاتا ہے۔

چوتھی دیگ:۔ اس میں منتظمین شامل ہیں۔ انہیں ڈیڑھ پاؤنڈ کے [illegible] ملتی ہے۔

قیدیوں کو صبح چار سے پانچ بجے تک خوراک دے کر کام پر ہانک دیا جاتا ہے۔ پھر وہ پانچ بجے شام سے پہلے گھر نہیں لوٹتے۔ دن بھر کی فاقہ مستی اور مشقت کشی سے وہ اس قدر تھک جاتے ہیں کہ ان کے لئے ان کی بارکوں میں واپس لوٹنا خونِ جگر پینے کے مترادف ہوتا ہے۔ ان کے پاؤں بوجھل ہونے کی وجہ سے تیز نہیں اٹھ سکتے۔ اور ان کے نگران جانوروں کے گلے کی طرح انہیں ہانک کر واپس لاتے ہیں۔ جب یہ بدحالی ایک حد سے بڑھ جاتی ہے تو شرحِ اموات میں بھی قدرتی طور پر اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور خطرے کا یہ الارم سن کر حکومت کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ کمیٹیاں مقرر ہو جاتی ہیں اور ان کی سفارشات پر وقتی طور پر خوراک قدرے بڑھا دی جاتی ہے۔ مگر یہ دور گزرنے کے بعد وہ غریب پھر فاقہ مستی کے دیو کی نذر ہو جاتے ہیں۔

ان بدحال لوگوں کو اس امر کا پورا یقین ہے کہ انہیں اگر کوئی آسانی میسر ہو سکتی ہے تو وہ صرف کیمپ کی چار دیواری کے اندر کام کرنے میں۔ یہاں اپنے سے وہ باورچیوں کے ساتھ کچھ لے دے پیدا کر لیتے ہیں۔ اس طرح انہیں روٹی کے ٹکڑے مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کام کی اتنی سختی بھی نہیں ہوتی جتنی کہ کیمپ سے باہر ہوتی ہے۔

ان قیدیوں کے باہمی تعلقات کی سرگزشت انسانیت کی ایک نہایت افسوسناک داستان ہے۔ ہر فرد کا ذہن دوسرے کے متعلق شک و شبہ سے آلودہ رہتا ہے۔ انسانی ہمدردی یہاں نام کو بھی نہیں۔ اجتماعی نفسیات کے دوسرے مظاہر کی طرح اس عدمِ اعتماد کا تجزیہ بھی مشکل ہے۔ ایک تو اشتراکی فلسفۂ حیات نے جس کا اولین اصول ہی رقابت و جنگ و جدل ہے اس قسم کے حالات پیدا کئے ہیں۔ دوسرے جس طریق پر اس فلسفۂ حیات کو اپنایا گیا ہے اور باہمی منافرت کے اس جذبہ کو خوب فروغ دیا گیا ہے یوں تو سارے روس میں یہ قیادانہ ذہنیت پوری آب و تاب سے کارفرما ہے۔ مگر اس کی ریشہ دوانیاں ان کیمپوں میں ناقابلِ بیان حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ یہاں ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق باہمی نفرت کے جذبہ کو ہوا دینے کے انتظامات کئے جاتے ہیں اور محبت و الفت کے رشتوں کو حتی المقدور منقطع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قیدی رشتہ داروں کو ایک دوسرے سے دور رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ خاوند اور بیوی کو مختلف جگہوں پر کام دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ آپس میں مل نہ سکیں۔ یہی اصول پر والدین، دوستوں اور [illegible]

کو ایک مشقت طلب کام کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ جب اس شعبہ کے ناظم اعلیٰ کو اس حقیقت کا پتہ چلا تو اس نے اس محکمے کے کارپردازوں سے ایک نظام اور ایک آزاد کے کپڑوں کو دھلانے کی عبادت پر محنت باندھی کی۔

کیمپوں کے انتظام اور مغربی آمریت اور ضابطہ پرستی کے عناصر اتنے غالب ہیں کہ ان کیمپوں کے ناظمین کو آزادی رائے کا کوئی حق نہیں وہ نہ تو اپنا کوئی ارادہ رکھتے ہیں اور نہ اختیار۔ قیدیوں سے وحشیوں کا سا برتاؤ کرنے پر مجبور ہیں اور اگر وہ فرض کی ادائیگی میں ذرا برابر بھی سستی دکھائیں تو کچھ بعید نہیں کہ انہیں بھی قیدیوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایسے ایسے المناک مناظر دیکھے کہ الفاظ ان کے اظہار سے عاجز ہیں۔ بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا کہ آرے پر کام کرنے والے آدمی کام کرتے کرتے اتنے تھک کر چور ہو گئے کہ وہ کھڑے تک نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن آپ کی اس زبوں حالی کے باوجود ان کے سربراہ اس بات کی بازپرس کر رہے تھے کہ انہوں نے مطلوبہ کام کو کیوں ختم نہیں کیا۔ ایسے پُرآشوب حالات میں کوئی محنت سے جاں بچا کر نکل نہیں سکتا۔ مشقت کا پیمانہ اگر کچھ دیر چل سکتا ہے تو صرف ان کا جو اپنی چالاکیوں اور عیاریوں سے ہر قسم کے اصول کو پسِ پشت ڈال کر محنت کی اس اذیت سے کسی طرح بچ نکلتے ہیں اور مختلف حیلوں بہانوں سے چند دنوں کے لیے بیمار بننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کیمپ کی زندگی ایک مسلسل کارزار ہے۔ جو شخص اپنا کام کسی کو منتقل دیکھنا ہو تو وہاں اسی طرح دیکھ سکتا ہے۔ اس جدوجہد میں کسی اخلاقی قانون کا احترام باقی نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ یہ ہے قیدی بداخلاقی کی بھیانک سے بھیانک برائیوں میں مبتلا ہیں۔

یہ کیمپ درحقیقت مقتل ہیں جہاں معصوم انسانوں کے اخلاق کو ذبح کیا جاتا ہے مگر انہیں بھوک، سردی اور دوسرے مصائب میں مبتلا کر کے اور ان کی پیٹھ پر ناقابل برداشت جسمانی محنت کا بوجھ لاد کر دنیا سے نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ وہ دردناک عذاب کی صورتیں ہیں کہ آہستہ آہستہ جان دیتے ہیں۔ ان بدبختوں پر ایسا نظام مسلط ہے جس کے اندر ایک انسان کی بحیثیت ایک فرد کے کوئی عزت و توقیر نہیں۔ انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس نظام کی اساس ہی انسانیت سے نفرت پر رکھی گئی ہے۔

فصل دوم

جبری محنت کے متعلق چند عینی شہادتیں

سوویٹ روس کے ایک افسر سرگئی مالیخوف[1] (Sergei Malakhov) نے روس کے بیگار کیمپوں کے متعلق مندرجہ ذیل تاثرات بیان کئے۔

"دنیا کی اکثر آبادی جبری محنت اور غلامی کیمپ کے مسائل سے شناسا ہے مگر ان کیمپوں کا ماحول ایسا ہے جس پر پردہ ڈالا نہیں جا سکا۔ ان ہزاروں قیدیوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی بھی پیشے میں ان کے متعلق ہمدردی کا کوئی اظہار نہیں۔ اخلاقی طور پر کوئی اس بات کی جسارت نہیں کر سکتا کہ اشارتاً یا کنایتاً اُس کے متعلق کوئی سوال کرے۔ جب کبھی اُن کے متعلق کوئی معاملہ پیش ہوتا ہے تو لوگ نہایت ہی نفرت انگیز احساسات کا اظہار کرتے ہیں تاکہ حکومت کو اُن کی وفاداری کا یقین ہو جائے۔"

جنگ کے دوران میں چند قیدیوں کو جب رہا کیا گیا تو انہوں نے

[1] کرنل مالیخوف نے روس کو دوسری جنگ عظیم کے بعد خیرباد کہا۔

مطلق اعتراف ہے کہ سکتا ہوں ۔ لیکن مت گز بجھے کے سبب یہ حقیقت مجھ پر کھلی ہے کہ سننے اور دیکھنے میں حقیقی کتنا فرق ہے ۔ نالسٹائی نے بالکل صحیح کہا تھا کہ "جس شخص کو کبھی جیل جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو وہ وہاں کے حالات نہیں جان سکتا ہے " اسی طرح جس انسان نے سوویٹ کے جیل خانوں کی سیر نہیں کی وہ روس کی زندگی کو صحیح طور پر جاننے سے قاصر ہے اس زندگی کو قریب سے دیکھنے سے پہلے روس کے متعلق میرا عقیدہ بڑا ہی ڈیم تھا ۔ اور دل کی گہرائیوں میں کسی قدر ہمدردی بھی تھی ۔ یہ عقیدہ محض میرا ذاتی نہیں تھا بلکہ یورپ کے اکثر ترقی پسند لوگوں کا ہے ۔ ہم اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ یہ درست ہے کہ یہ نظام یورپ کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا لیکن یہ روسی عوام کے حسب حال ضرور ہے ۔ ہم اہل یورپ لوگوں کے لئے یہ محض ایک تجربہ ہے جس سے ہم بہت سے خیر کے پہلو اخذ کر سکتے ہیں ۔

مثلاً کثیر التعداد قومیتوں کو متحد کرنے کے مسئلہ کا حل منصوبہ بندی سماج میں عورت کا مقام وغیرہ ۔

میرے یہ نظریات سنہ تک قائم رہے ۔ اور میں نے اپنی کتاب [illegible] میں جو جنگ سے پیشتر شائع ہوئی کہیں بھی روس کے خلاف ایک حرف تک نہیں لکھا ۔ لیکن بعد میں واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھے اس نظام سے سخت نفرت ہو گئی ہے میں اب اس نظام کی شدت سے مذمت کرتا ہوں ۔ جو کچھ میری آنکھوں نے وہاں دیکھا ہے وہ اتنا ہیبتناک اور شرمناک ہے کہ میں اُسے بیان کرنے سے قاصر ہوں ۔

میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کے اظہار کی جانب بہت سے بھائی نہ تو جرأت رکھتے ہیں اور نہ استعداد ۔ لیکن میں ان حقائق کو اس انسان کے احساسات کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں جسے اس امر کا یقین ہے کہ اس دنیا میں مرنے کے بعد ایک اور

پھر زندہ ہونا ہے " ۔

روس اس وقت دو حصوں میں منقسم ہے ایک غلام دوسرا آزاد ثانی الذکر ہی وہ خوش نصیب حصہ ہے جس میں اجنبیوں کا گزر ہوتا ہے ۔ لیکن یہاں جو کچھ ہے محض نمائش ہے اول الذکر روس ـــــ وہ جو کہ خاردار تاروں کے احاطہ کے اندر پھیلا ہوا اپنی آغوش میں ایسے ہزاروں کیمپ رکھتا ہے جن میں بسنے والوں پر جبری محنت کا عذاب مسلط ہے ۔ یہ سیاہ ترین روس ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم انسانوں کا جنگل ہے اس کے باشندے صحیح معنوں میں حکومت کے غلام ہیں ۔ دس سال اور بعض حالات میں بیس سال کی سزا بھگتنے کے بعد ان لوگوں کو خاص مہاجر کے بلند مقام سے سرفراز کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اب اپنے گھروں کو واپس نہیں جا سکتے بلکہ انہیں اسی علاقے کے گرد و نواح میں زندگی کے بقیہ ایام کاٹنے میں روس کا یہ حصہ عام انسانوں کی آنکھ سے اوجھل ہے اور یہی وہ حصہ ہے جہاں کے بسنے والوں کو دوزخ کے سے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے ۔ اس وقت تو میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنی اور وہاں کتنے لوگ آباد ہیں ۔ ـ ـ ـ ـ ـ

ـ ـ ـ لیکن جب میں وہاں تھا تو اس وقت ان کیمپوں میں تقریباً ایک کروڑ سے ڈیڑھ کروڑ تک لوگ تھے ۔ جنگ کے دوران میں کافی تعداد موت کی نذر ہوئی ۔ اب یہاں دو کروڑ بھیجے گئے ہیں ۔ ان مرتبیوں کا تذکرہ سرزمین روس میں سب سے بڑا گناہ ہے اور روسی ادب ان کے متعلق نہایت شرمناک طور پر خاموش ہے ۔ غیر ملکی اخباری نمائندوں کو مشاہدہ کے قائم کردہ تیسری کیمپوں تک میں جانے کی اجازت مل گئی ۔ لیکن آج تک کسی باہر کے آدمی کو روس کے اس دوزخ کو دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا جن لوگوں نے یہ روح فرسا واقعات دیکھے ہیں ۔ وہ صرف وہی ہیں ۔ جو خود قیدی ہوتے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ جنگ کے آغاز تک لوگ ان سے بالکل ناواقف تھے ۔

ان کیمپوں میں ہراس کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ ناقابل بیان ہے ۔ روسی ادب میں پریوں کی کہانی کی طرح جونہی آپ مظلوم غلاموں کا تذکرہ کیا ۔ تو ذہن میں ان پر کیا بیت جائے شاید کوئی جیتا ہی کو کہا جائے ۔ یا یہ سیل پتھر ہو جائیں ۔ آپ کا ان کے متعلق مزید دریافت کرنا عبث ہے ۔ اسی طرح ان کیمپوں میں رہنے والوں سے آپ کا کوئی ناطہ نہیں ۔ اگر وہ آپ کو کوئی خط

تھیں تو وہ احتیاط کی چھلنی سے چھن کر اس طرح نکلا کہ کیمپ وہاں کے
حالات کا کوئی پتا ہی نہیں لگا سکتے۔ درحقیقت یہی تحریک تھی
کہ باقی سب خوب ہے۔ ان بچاروں کا نام بھی کتاب سے نکل کے
خارج ہو جاتا ہے۔

روس کا شکست ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں لوگ ہر وقت موجود
رہتے ہیں۔ صرف ایک کیمپ کے اندر جس کا نام B.G.N. ہے یہاں
لاکھ کے قریب لوگ ویرانوں میں بے بس انسانوں کی طرح میں سے بچاس ہزار
کی ایسی حالت ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سب مجرم
تھے۔ وہ حکومت جو اپنے مفاد کے لئے اپنے شہریوں تک کو غلامی
کی زنجیروں میں جکڑنے سے گریز نہیں کرتی، وہ حکومت جو ان کے جسم پر سے
گوشت نوچ لینے میں ذرہ برابر رعایت روا نہیں رکھتی، وہ جو لاکھوں انسانوں
کو صرف اپنی حکومت کو مستحکم رکھنے کے لئے بغیر کسی جرم کے
بیگار کیمپوں میں ان سے مشقت لیتی چلی جاتی ہے۔ اس کے نرغے سے بھلا
یہ اپنے اور غیر ملکی کس طرح بچ سکتے ہیں۔ ہٹلر کے کیمپوں میں بھی شدید تکلیف
کی یہی حالت ہو۔ گو وہ تو ختم ہو چکے۔ نہ جانے کب تک ان روسی مراکز
پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ صیہونیوں کی ایک نسل کی نسل ان قید خانوں میں
برباد ہو گئی۔ اور ہم ان پر آنسوؤں کا کوئی قطرہ تک نہ بہا سکے۔ ہمارے ان
سے تمام رشتے منقطع ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر دلی رنج ہوتا ہے کہ جنگ
سے متاثر ترین لوگوں کی حمایت میں ایک مضمون تک کسی اخبار میں نہ لکھا گیا
اور نہ ہی رائے عامہ نے اس طرف توجہ دی۔

درحقیقت روسی کیمپوں میں سب سے زیادہ افسوسناک ان لوگوں کی
حالت تھی جنہیں محض صیہونی ہونے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں
بوڑھے اور جوان، مرد اور عورتیں سبھی شامل تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ فنا
ہونے کی آس توڑ چکے ہیں۔ ان میں وہ نامور شخصیتیں بھی شامل ہیں جن پر ان کی
قوم اور ملک بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے نام ظاہر کرنے
سے منع کیا ہے کیونکہ اس بھید کا فاش ہونا ان کے لئے مہلک ثابت ہو
سکتا ہے۔ لہٰذا میں ان کے اسماء ان کی بہتری کی خاطر صیغۂ راز میں رکھتا
ہوں اور صرف ان کا ذکر کرتا ہوں جن سے عوام کسی حد تک آشنا
ہو چکے ہیں۔

ان میں ایک تو ہیم کیوبک J. M. Kalbak ایک
نوجوان شاعر ہے۔ یہ شخص صیہونی نہیں تھا۔ اشتراکی نظام کا زبردست حامی
ہونے کی وجہ سے وہ مزدوروں کی جنت میں زندگی بسر کرنے کے لئے
گیا۔ دوسرا اس نے دوکتابیں لکھیں جن میں ایک کا نام
Messiah Ben Ephraim اور دوسری
Gechmanauer ہے۔ کیونکہ اشتراکیت کے متعلق
اسی خوش فہمی میں گرفتار تھا جس میں عام لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے
حماقت یہ کی کہ پیرس میں رہ کر دور کے سہانے ڈھول سنتے رہنے کی بجائے
اشتراکی زمین میں جا کر بسنا شروع کیا۔ چنانچہ سپنوں کا محل اس نے
برسوں سے تعمیر کر رکھا تھا وہ حقیقت کے بے نقاب ہوتے ہی ریزہ ریزہ
خاک ہو گیا۔ اب اس کا حال یہ ہے کہ اس کی کتابیں تو فہرست میں درج ہیں
لیکن انہیں پڑھنے کی ممانعت ہے۔ بلکہ حکومت نے خود اسے بھی معزول کر
دے رکھا ہے۔

اسی طرح شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو لوتھین یہودی
Benjaman Bongee کے نام سے واقف نہ ہو۔ وہ جنگ
سے پہلے صیہونی تحریک کا صدر تھا۔ میرا سر اس نیک آدمی کے سامنے عزت سے
جھک جاتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے مجھے بھوک کے عذاب سے نجات
دلائی۔ Kotlas کیمپ میں جہاں ہم دونوں قیدی کی حیثیت سے
ملے! اس مقدس ذات نے مجھے سہارا دیا۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ
کسی کو شریف النفس اور پاکباز نہیں پایا۔ اس کے سفید بالوں کے حسن سے
اور اس کی آنکھوں کی چمک سے اس کی شخصیت پر کسی آسمانی مخلوق ہونے کا
گمان ہوتا ہے۔ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ انسانی خدمت میں بسر کیا۔ اس نے
آج تک کسی متنفس کو ایذا نہیں دی۔ ہزاروں انسان ایسے ہیں جن کی زندگی
اس کی رہین منت ہے۔ کیمپ کی اس تاریکی میں اگر کوئی مشعل راہ ہے تو وہ
صرف یہ ایک شخص۔ درندوں کی اس وادی میں اگر انسانیت کا کوئی نمائندہ
ہو سکتا ہے تو صرف یہی۔ سنگ دل انسانوں کے گروہ میں اگر کسی کے دل
میں ہمدردی اور مروت کے جذبات موجزن ہیں تو وہ صرف اسی کا دل ہے۔
یہ بات کتنی تعجب خیز ہے کہ Bergman جیسی شخصیتیں
جو انسانیت کی بے لوث خیر خواہ ہیں انہیں سماج کے لئے نقصان دہ سمجھا

سمجھتے ... ان کے لئے قید کر دیا
گیا۔ کیونکہ اس کا تعلق صیہونیت کی تحریک سے تھا۔ اس حیثیت اور عمر
کے آدمی کے لئے اتنی طویل قید سزائے موت کے مترادف ہے۔
یہ کوئی واحد معاملہ نہیں۔ ہر وہ شخص جس کا تعلق اس تحریک
سے تھا اس کا یہی حشر ہوا۔ پولش قیدیوں نے اس قسم کے ہزاروں واقعات
قلمبند کئے ہیں جو Lagonici sovietique میں
۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان چھپتے رہے۔ ان کے بعض حصے ذیل
میں درج کئے جاتے ہیں:-

"ان قید خانوں میں ہمیں روسی چوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ
دیا گیا۔ یہ لوگ انسان نما درندے تھے۔ ہم جنسی تشدد
(Homosexuality) کی وبا کیمپوں میں عام
ہو چکی ہے۔ جونہی پولز کا کوئی نیا قافلہ آتا تو ان بدمعاشوں
کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ان بے چاروں کو ہر پہلو
سے لوٹتے ہیں۔ بہت سے غلام مل کر ایک ایک فرد پر حملہ
کر دیتے ہیں اور اس کا سب مال و متاع اٹھا کر لے جاتے
ہیں اور محافظ کھڑا مسکرا دیتا ہے۔ جن لوگوں کو اکیلا رکھا جاتا
ہے ان پر بڑے ہی جبر توڑے جاتے ہیں اور بعض اوقات
تو بھوک کا عذاب دے کر مار دیا جاتا ہے۔ ایک شخص
کا زخمی کرنا یا اس کو جان سے مار دینا مکھی کو مار دینے
سے زیادہ جرم خیال نہیں کیا جاتا۔"

"کام کرنے کا ماحول نہایت ناسازگار تھا۔ ہمیں ...
فاصلوں ... کے درجہ حرارت میں مشقت کرنا پڑتی۔ بارش
اور برفباری کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ ہمیں اس وقت
بھی محنت کرنا پڑتی جب برف کئی کئی فٹ ہمارے
اردگرد پڑی ہوتی۔ گرمیوں کے موسم میں دلدل میں کھڑے
ہو کر دس بارہ گھنٹے تک مشقت کرنا پڑتی۔ رات کو ہم
جلتے کی آگ پر اپنے کپڑے سکھاتے مگر وہ اتنی جلدی
کہاں سوکھ سکتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم مختلف موذی امراض کا
شکار ہوتے۔ ... بعض اوقات
انگلیاں گل جاتیں۔ وہ انسان اپنے آپ کو بڑا ہی خوش قسمت
تصور کرتا جو بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو جاتا۔ اس
زبردست محنت کے خوف سے بعض لوگ جان بوجھ کر
اپنے اعضا کاٹ لیتے۔ کمزوری کی وجہ سے جو لوگ اتنی
سخت محنت سے انکار کرتے ان کے لئے جیل کے
دروازے کھل جاتے اور ڈرا دھمکا کر یا مار پیٹ کر ان کو
کام پر مجبور کیا جاتا اس کے باوجود بھی اگر وہ اپنے انکار پر
قائم رہتے تو انہیں موت کی سزا دی جاتی۔ لیکن یہ سزا
دینے سے پہلے انہیں ہر طرح سے کام پر اکسایا جاتا۔ ان کو
زدوکوب کیا جاتا۔ ٹانگوں سے پکڑ کر برف پر گھسیٹا جاتا
ان پر کتے چھوڑے جاتے اور سنگینیں تان کر ان کو دھمکیاں
دی جاتیں۔

یہاں کی آب و ہوا ایسی ہے کہ اس میں شمعِ حیات زیادہ
دیر تک نہیں جل سکتی یہاں مختلف قوموں کے ہزاروں نہیں
لاکھوں آدمی لائے جاتے ہیں۔ سال یا دو سال گزرنے کے بعد
شاید ہی کوئی شخص ایسا خوش نصیب ہو جو بچ جائے۔ کام کی
زیادتی بھی موت کا باعث بنتی ہے۔ برابر کام کرنے سے
بڑے سے بڑا تنومند بھی کسی بدنصیب رات کی تنہائی میں
زندگی کو چپکے سے خیر باد کہہ دیتا ہے۔"

یہ داستان نامکمل ہوگی اگر مظلوم ٹراٹسکی کے مظلوم ساتھیوں کا
تذکرہ نہ کیا جائے۔ ان لوگوں کو جب [illegible] کے کیمپ میں داخل
کیا گیا۔ تو انہوں نے کیمپ کے ناظمین کے سامنے ۳ مطالبے
رکھے:-

اوّلاً:- انہیں عام مجرموں سے الگ رکھا
جائے۔

ثانیاً:- ان کی قابلیت اور استعداد کے مطابق انہیں
کام دیا جائے۔

ثالثاً:- انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ
نہ رکھا جائے۔

ان لوگوں نے اپنے مطالبات بھوک ہڑتال کی دھمکی سے منوانے کی کوشش کی لیکن افسران بالا نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ کانسک کے حامیوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی جو بغیر کسی رعایت کے ایک سو پندرہ دن تک جاری رہی۔ حکام نے اسی اثنا میں بعض مصنوعی خوراک مہیا کرنے کا بندوبست کیا لیکن اس کے باوجود بہت سے مر گئے۔ ان بھوکوں کو کتوں کی مدد سے منتشر کیا گیا۔ بیماروں کو سپاہی اٹھا کر لے گئے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئے اس کے بعد ان کے متعلق ایک لفظ تک بھی کسی نے نہیں سنا۔ داستانوں میں اتنی داستان تک بھی نہیں یہ تھی سزا ان کی سرکشی کی۔

فصل سوم

جبری محنت کی بعض ملکی قسمیں

جبری محنت کی ایک شکل وہ ہم جلاوطنی ہے مگر اس نے روس کی نظر میں جو اہمیت حاصل کی ہے وہ سب سے زیادہ ہے۔ روس کے علاوہ سزا کے طور پر دنیا میں جلاوطنی[1] سے مراد کسی دور دراز مقام [illegible] ہے۔ اس کی رہائش سے روزگار والی بات نہیں نکالی جاتی۔ اس سے ایک قیدی کی طرح کام نہیں لیا جاتا بلکہ وہ اپنی حدود کے اندر ایک آزاد مزدور کی طرح محنت کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ لیکن روس میں اس سے مجرموں کی طرح مشقت لی جاتی ہے۔ جلاوطنی کی سزا روس میں آج سے کئی سال پہلے ملتی تھی۔ مگر ایک حکم ہوتے کے اس کا مطلب یہ تھا کہ سے باقی مجرموں پر رہنے کا پورا اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے آباد ہو سکتا ہے اور جو کام چاہے کر سکتا ہے۔ جلاوطنی سے مقصد یہ تھا کہ وہ ایک خاص حدود جگہ زندگی گزارنے [illegible] ۱۹۱۷ء سے پہلے ان دونوں قسم کی سزاؤں میں ایک حد تک آزادی نصیب تھی۔ اسی سال ایک قانون کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی کہ ان پر زیادہ سے زیادہ سختی عائد کی جائے۔ چنانچہ تارکین وطن کو دور دراز غیر آباد علاقوں میں آباد کیا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ان پر شدید مشقت بھی لازم کی گئی۔

اسی دوران میں ایک اور قسم کی جلاوطنی معرض وجود میں آئی جو تھی یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بدترین تھی۔ اس میں اُن لوگوں کو جو مفادِ عامہ کے لیے نقصان دہ خیال کیے جاتے، مبتلا کیا جاتا۔ ۱۹۲۹ء کے آخر میں جب لاکھوں کُلاکوں [illegible] کو جبری محنت کے کیمپوں میں بند کیا گیا تو اس کے ساتھ ہی ان کے کنبوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پر آباد کیا گیا۔ تاکہ کلاکوں کو مکمل طور پر نیست و نابود کیا جا سکے وہ لوگ جن کو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیان ملک بدر کیا گیا، اُن کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اس کے بعد جب بھی کسی سماج کی تطہیر کی ضرورت محسوس ہوئی تو کئی لاکھ انسانوں کو شمال اور مشرق کی طرف دھکیل دیا گیا ان میں وہ چھوٹی چھوٹی قومیں بھی شامل تھیں جن کو روسی حکومت بستادہ میں نہیں لے سکتی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس نقل مکانی نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ چند لوگ ہی ایسے تھے جن کو محنت کے اصلاحی کیمپوں میں بھیجا گیا۔ باقی سب کو مجبوراً خاص مہاجروں[2] کی حیثیت سے آباد کر دیا گیا۔ اس طرح یہ آتے ہیں ملک کے باہر ہی ایسے [illegible] نصیب ہو گئے جن کو شہروں میں آباد ہونے کی اجازت ملی۔ اصولی طور پر اُن کو

---

[1] جلاوطنی کی اصطلاح یہاں محدود معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔ یعنی ایک ریاست کی حدود ہی میں آدمی کو اپنے مولد و مسکن سے دور کسی علاقے میں نظر بند کر دیا جائے۔ چاہیں تو آپ اسے جدید نوعیت کا بن باس کہہ لیجئے۔
(مناسب اصطلاح "علاقہ بدری" ہو سکتی ہے) (ادارہ)

محنت مشقت لائٹس کے کپڑوں کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ جب اس شعبہ کے ناظم اعلیٰ کو اس حقیقت کا پتہ چلا تو اس نے اس محکمہ کے کارپردازوں سے ایک غلام اور ایک آزاد کے کپڑوں کو ملانے کی جسارت پر سخت باز پرس کی۔

کیمپوں کے انتظام اور عملہ میں آمریت اور ضابطہ پرستی کے عناصر تنے غالب ہیں کہ ان کیمپوں کے ناظمین کو آزادی رائے کا کوئی حق نہیں وہ نہ تو اپنا کوئی ارادہ رکھتے ہیں اور نہ اختیار۔ قیدیوں سے وحشیوں کا سا برتاؤ کرنے پر مجبور ہیں اور اگر معمولات کی ادائیگی میں ذرہ برابر بھی سستی دکھائیں تو کچھ بعید نہیں کہ انہیں بھی قیدیوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایسے ایسے المناک مناظر دیکھے کہ الفاظ ان کے اظہار سے عاجز ہیں۔ بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا کہ آرے پر کام کرنے والے آدمی کام کرتے کرتے اتنے تھک کر چور ہو گئے کہ وہ کھڑے تک نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن اُن کی اس زبوں حالی کے باوجود اُن کے سربراہ اُن سے برابر اس بات کی باز پُرس کرتے رہتے کہ انہوں نے مطلوبہ کام کو کیوں ختم نہیں کیا۔ ایسے پُر آشوب حالات میں کوئی محنت سے سخت جان بھی بہ مکمل زندہ نہیں رہ سکتا۔ مشکل کا چراغ زیادہ دیر جل سکتا ہے۔ قدرت اُن کا جو اپنی چالاکیوں اور عیاریوں سے ہر قسم کے اصول کو پس پشت ڈال کر محنت کی اس اذیت سے کسی طرح بچ نکلتے ہیں اور مختلف حیلوں بہانوں سے چند داشتاؤں سے مہیا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیمپ کی زندگی ایک میدان کارزار ہے جو حقیقتاً کا کسی کو منظر دیکھنا ہو تو وہاں بھی طرح دیکھ سکتا ہے اس جد وجہد میں کسی اخلاقی قانون کا احترام باقی نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ یہ ہے قیدی بد اخلاقی کی مہلک سے مہلک بیماریوں میں مبتلا ہیں۔

یہ کیمپ درحقیقت مقتل ہیں جہاں نہ صرف انسانوں کے اخلاق کو ذبح کیا جاتا ہے بلکہ انہیں بھوک، سردی اور دوسرے مصائب میں مبتلا کر کے اور اُن کی پُشت پر ناقابل برداشت جسمانی محنت کا بوجھ لاد کر دنیا سے نیست و نابود کر دیا جاتا ہے وہ دردناک عذاب کی صورتیں ہیں کہ آہستہ آہستہ جان دیتے ہیں ان بدبختوں پر ایسا نظام مسلط ہے جس کے اندر ایک انسان کی بحیثیت ایک فرد کے کوئی عزت و توقیر نہیں۔ انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس نظام کی اساس ہی انسانیت سے نفرت پر رکھی گئی ہے۔

فصل دوم

جبری محنت کے متعلق چند عینی شہادتیں

سوویت فوج کے ایک افسر سرگئی مالیخوف[1] (Sergei Malakhov) نے روس کے بیگار کیمپوں کے متعلق مندرجہ ذیل تاثرات بیان کئے۔

"دنیا کی اکثر آبادی جبری محنت اور غلامی کیمپ کے مسائل سے شناسا ہے مگر روسیوں کا یہ ایسا راز ہے جس پر سے پردہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ ان ہزاروں قیدیوں کو ہولناک وحشی تشدد کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی سینے میں ان کے متعلق ہمدردی کی کوئی لہر نہیں اٹھتی کوئی اس بات کی جسارت نہیں کر سکتا کہ اشارۃً یا کنایۃً اُن کے متعلق کوئی سوال کرے۔ جب کبھی اُن کے متعلق کوئی بات پیش ہوتا ہے تو لوگ بڑے ہی نفرت انگیز احساسات کا اظہار کرتے ہیں تاکہ حکومت کو اُن کی وفاداری کا یقین آ جائے۔"

جنگ کے دوران میں چند قیدیوں کو جب رہا کیا گیا تو انہوں نے

[1] کرنل مالیخوف نے روس کو دوسری جنگ عظیم کے بعد خیرباد کہا۔

تعلق اور استناد سے کہہ سکتا ہوں۔ حتی مدت گزر چکنے
کے سبب یہ حقیقت مجھ پر کھل گئی ہے کہ سننے اور دیکھنے میں
واقعی کتنا فرق ہے۔ ٹالسٹائی نے بالکل صحیح کہا تھا کہ
جس شخص کو کبھی جیل جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو وہ وہاں کے حالات
نہیں جان سکتا ہے۔ اسی طرح جس انسان نے سوویٹ کے
جیل خانوں کی سیر نہیں کی وہ روس کی زندگی کو صحیح طور پر
جاننے سے قاصر ہے۔ اس زندگی کو قریب سے دیکھنے سے
پہلے روس کے متعلق میرا عقیدہ بڑا ہی نرم تھا۔ اور دل کی گہرائیوں
میں کسی قدر ہمدردی بھی تھی۔ یہ عقیدہ محض میرا ذاتی نہیں تھا
بلکہ یورپ کے اکثر ترقی پسند لوگوں کا ہے۔ ہم اکثر یہ کہا کرتے
تھے کہ یہ درست ہے کہ یہ نظام یورپ کے مزاج سے مناسبت
نہیں رکھتا لیکن یہ روسی عوام کے حسب حال ضرور ہے۔
ہم یورپین لوگوں کے لئے یہ محض ایک تجربہ ہے جس سے ہم
بہت سے خیر کے پہلو اخذ کر سکتے ہیں۔
مثلاً کثیر التعداد قومیتوں کو متحد کرنے کے مسئلہ کا حل،
منصوبہ بندی، سماج میں عورت کا مقام وغیرہ۔
میرے یہ نظریات ۱۹۳۹ء تک قائم رہے۔ اور میں نے
اپنی کتاب The Zionist idea میں جو جنگ
سے پیشتر شائع ہوئی کہیں بھی روس کے خلاف ایک حرف
تک نہیں لکھا۔ لیکن بعد میں واقعات کو اپنی آنکھوں سے
دیکھ کر مجھے اس نظام سے سخت نفرت ہوگئی ہے۔ میں
اب اس نظام کی شدت سے مذمت کرتا ہوں۔ جو
کچھ میری آنکھوں نے وہاں دیکھا ہے وہ اتنا ہیبت ناک
اور شرمناک ہے کہ میں اُسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔
میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں یہ ایک ایسی صداقت ہے
جس کے اظہار کی جائے بہت سے سیاسی نظریات رکھتے
ہیں اور اعتقاد۔ لیکن میں ان حقائق کو انسان کے
احساسات کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں جسے اس امر
کا یقین ہے کہ اس دنیا میں مرنے کے بعد ایک ان

پھر زندہ ہوتا ہے۔"
روس اس وقت دو حصوں میں منقسم ہے ایک غلام دوسرا آزاد۔
ثانی الذکر ہی وہ خوش نصیب علاقہ ہے جس میں اجنبیوں
کا گزر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں جو کچھ ہے محض نمائش ہے۔
اول الذکر روس ـــــ وہ جو کہ خاردار تاروں کے حلقے کے
اندر پھیلا ہوا اپنی آغوش میں ہزاروں کیمپ رکھتا ہے جن میں
بسنے والوں پر جبری محنت کا عذاب مسلط ہے۔ یہ سیاہ بخت روس
ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم انسانوں کا جنگل ہے اس کے باشندے
صحیح معنوں میں حکومت کے غلام ہیں۔ دس سال اور بعض حالات میں پندرہ سال
میعاد کی سزا بھگتنے کے بعد ان لوگوں کو خاص جہاں کے بلند مقام سے منتقل
کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اب اپنے گھروں کو واپس نہیں جا
سکتے بلکہ انہیں اسی علاقے کے گرد و نواح میں زندگی کے بقیہ ایام کاٹنے ہیں
روس کا یہ حصہ عام انسانوں کی آنکھ سے اوجھل ہے اور یہی وہ حصہ ہے جہاں کے
بسنے والوں کو دوزخ کے سے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ اس وقت تو میرے
لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ فی الحال وہاں کتنے لوگ آباد ہیں۔ - - - - -
- - - لیکن جب میں وہاں تھا تو اس وقت ان کیمپوں میں تقریباً ایک کروڑ
سے پانچ کروڑ تک لوگ تھے۔ جنگ کے دوران میں کافی تعداد موت
کی نذر ہوئی۔ اب یہاں اور بھی بھیجے گئے ہیں۔ ان بدنصیبوں کا تذکرہ
سرزمین روس میں سب سے بڑا گناہ ہے اور روسی ادب ان کے متعلق نہایت
شرمناک طور پر خاموش ہے۔ غیر ملکی اخباری نمائندوں کو ہٹلر کے قائم کردہ
قید خانوں کیمپوں تک میں جانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن آج تک کسی باہر
کے آدمی کو روس کے اس دوزخ کو دیکھنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ جن لوگوں نے
یہ دوزخ فرسا واقعات دیکھے ہیں۔ وہ صرف وہی ہیں جو خود قید ہوتے اور
غالباً یہی وجہ ہے کہ جنگ کے آغاز تک لوگ ان سے بالکل ناواقف تھے۔
ان کیمپوں میں ہراس کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ ناقابل بیان ہے روسی ادب
میں پریوں کی کہانی کی طرح جونہی آپ مظلوم غلاموں کا تذکرہ کیا تو نہ جانے
ان پر کیا بیت جائے شاید کوئی جیتا ان کو کہا جائے۔ یا یہ سیل بھر ہو
جائیں۔ آپ کا ان کے متعلق مزید دریافت کرنا عبث ہے۔ اسی طرح
ان کیمپوں میں رہنے والوں سے آپ کا کوئی ناطہ نہیں۔ اگر وہ آپ کو کوئی خط

سمجھتے ۔ اس غریب انسان کو [illegible] میں دس سال کے لئے قید کر دیا گیا ۔ کیونکہ اس کا تعلق صیہونیت کی تحریک سے تھا ۔ اس نحیف اور عمر رسیدہ آدمی کے لئے اتنی طویل قید سزائے موت کے مترادف ہے ۔

پرگر کا معاملہ کوئی واحد معاملہ نہیں ۔ ہر وہ شخص جس کا تعلق اس تحریک سے تھا اس کا یہی حشر ہوا ۔ پولش قیدیوں نے اس قسم کے ہزاروں واقعات قلمبند کئے ہیں یہ سب Lagnotici sovietique میں [illegible] اور [illegible] کے درمیان چھپتے رہے ۔ ان کے بعض حصص ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

" ان قید خانوں میں رہیں ۔ دس چوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ۔ یہ لوگ انسان نما درندے تھے ۔ ہم جنسی استلذاذ Homosexuality کی وبا کیمپوں میں عام ہو چکی ہے ۔ جونہی پولز کا کوئی نیا قافلہ آتا تو ان بدمعاشوں کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے ۔ چنانچہ وہ ان بے چاروں کو ہر پہلو سے لوٹتے ہیں ۔ بہت سے عام ملک ایک ایک فرد پر حملہ کر دیتے ہیں اور اس کا سب مال و متاع اٹھا کر لے جاتے ہیں ۔ اور محافظ کھڑا مسکرا دیتا ہے جن لوگوں کو اکیلا رکھا جاتا ہے وہ ان پر بڑے ہی جبر توڑے جاتے ہیں اور بعض اوقات تو بھوک کا عذاب دے کر مار دیا جاتا ہے ۔ ایک شخص کا زخمی کرنا یا اس کو جان سے مار دینا مکھی کو مار دینے سے زیادہ جرم خیال نہیں کیا جاتا "

" ہم کرنے کا ماحول بڑا ہی ناساز گار تھا ۔ ہمیں ہم فاقوں پیٹ کے وہ جسمانی مشقت کرنا پڑتی بارش اور برفباری کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی ۔ ہمیں اس وقت بھی درخت کاٹنے ہوتے ۔ جب برف کئی کئی فٹ اور گرد پڑی ہوتی گرمیوں کے موسم میں دلدل میں کھڑے ہو کر دس بارہ گھنٹے تک مشقت کرنا پڑتی ۔ رات کو ہم چولہے کی آگ پر اپنے کپڑے سکھاتے مگر وہ اتنی جلدی کہاں سوکھ سکتے ۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم مختلف موذی امراض کا شکار ہوتے ۔ وہاں میں بیمار ہوا لیٹنے سے بعض اوقات انگلیاں گل جاتیں ۔ وہ انسان اپنے آپ کو بڑا ہی خوش قسمت تصور کرتا جو بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو جاتا ۔ اس زبردست محنت کے خوف سے بعض لوگ جان بوجھ کر اپنے اعضا کاٹ لیتے ۔ کمزوری کی وجہ سے جو لوگ اتنی سخت محنت سے انکار کرتے ان کے لئے جیل کے دروازے کھل جاتے اور ڈرا دھمکا کر یا مار پیٹ کر ان کو کام پر مجبور کیا جاتا اس کے باوجود بھی اگر وہ اپنے انکار پر قائم رہتے تو انہیں موت کی سزا دی جاتی ۔ لیکن یہ سزا دینے سے پہلے انہیں ہر طرح سے کام پر اکسایا جاتا ۔ ان کو زدوکوب کیا جاتا ۔ ٹانگوں سے پکڑ کر برف پر گھسیٹا جاتا ان پر کتے چھوڑے جاتے اور سنگینیں تان کر ان کو دھمکیاں دی جائیں ۔

یہاں کی آب و ہوا ایسی ہے کہ اس میں شمع حیات زیادہ دیر تک نہیں جل سکتی یہاں مختلف قوموں کے ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی لائے جاتے ہیں ۔ سال یا دو سال گزرنے کے بعد شاید ہی کوئی شخص ایسا خوش نصیب ہو جو بچ جائے ۔ کام کی زیادتی بھی موت کا باعث بنتی ہے ۔ برابر کام کرنے سے جسم بڑا ہی تنومند بھی کسی بدنصیب رات کی تنہائی میں زندگی کو چپکے سے خیرباد کہہ دیتا ہے "

یہ داستان نامکمل ہوگی اگر مظلوم ترابلسکی کے مظلوم ساتھیوں کا تذکرہ نہ کیا جائے ۔ ان لوگوں کو جب [illegible] کے کیمپ میں داخل کیا گیا ۔ تو انہوں نے کیمپ کے ناظمین کے سامنے ۳ مطالبات رکھے :-

اوّلاً :- انہیں عام مجرموں سے الگ رکھا جائے ۔

ثانیاً :- ان کی قابلیت اور استعداد کے مطابق ان سے کام لیا جائے ۔

ثالثاً :- انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہ کیا جائے ۔

خود اپنی بستیاں آباد کرنا پڑتی ہیں ان پر N.K.V.D. کا ایک شائستہ متعین کیا جاتا ہے جو ان سے ضرورت کے مطابق کام لیتا ہے۔ ان لوگوں کی حالت عجیب ہے یہ لوگ گھاس پھوس پر گزارہ کرتے ہیں۔ بچے عورتیں اور بوڑھے وحشیوں کی طرح جنگلوں میں گھوم کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ جوانوں سے سخت کام لیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق Olaf Feldheim فن لینڈ کے ایک قیدی نے شہادت دیتے ہوئے کہا

"میں نے یہاں ان پانچ مہینوں میں وہ روح فرسا منظر دیکھے ہیں کہ ان کو زبان پر لانا مشکل ہے۔ چودہ سال کے بچوں کو ایک خاص معیار کے مطابق محنت کرکے روٹی میسر آتی ہے اور وہ بھی ان کے لئے ناکافی ہوتی ہے:"

جبری محنت کے کیمپوں کی طرح یہاں بھی راشن مزدوروں کی قوت کارکردگی کے مطابق دیا جاتا ہے۔ اور وہ لوگ جو کام کرنے کے قابل نہیں ہوتے انہیں بہت ہی کم خوراک مہیا کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اموات کی شرح یہاں بہت زیادہ ہے۔ ۱۹۳۹ء کے بعد خاص مہاجروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا اس سے پہلے دس سالوں میں یہاں کا ماحول اتنا پُرہول نہ تھا جتنا کہ یہ جنگ چھڑنے کے بعد ہو گیا۔ اس کے متعلق بہت سی مصدقہ خبریں موجود ہیں یہاں ہم مسز آنا فاک (Mrs Anna Falk) جو کہ مغربی سائبیریا میں ملک بدر تھی اس کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

"جونہی ہمارا قافلہ وہاں پہنچا تو ایک مقامی افسر نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اس بات کو اچھی طرح دل سے نکال دو کہ اب کبھی اپنے وطن کو واپس بھی جا سکتے ہو اب تمہیں چاہئے کہ اپنے کو اس نئے ماحول کے مطابق ڈھالنا ہوگا تمہاری کامیابی کا انحصار صرف اسی بات پر ہے کہ تم کام میں دلچسپی لو .... اگر تم خوب دل لگا کر کام کرو گے تو تمہیں ایک قطعہ زمین کے علاوہ ایک گائے بھی دی جائے گی۔ تمہاری حالت اب بہتر ہو گی لیکن تم اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتے ...... زندگی کے متعلق یہ بڑی بھوک کے ... اور ... کی شدت سے کبھی نہ یاد ہے۔ بیمار ... دنیا سے ...

ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ روس کی خبریں ان کے کانوں تک بھی شکل میں بڑی مشکل سے پہنچتی ہیں۔ ایک دن کمانڈنٹ میرے کمرہ میں آ دھمکا۔ ہم نے اپنے واپس جانے کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ اس نے مجھے کھڑکی پر بلا کر کہا۔

"اپنی بائیں جانب دیکھو یہ Upostapan مکان ہے یہ اس گاؤں میں سب سے زیادہ عمدہ ہے۔ اگر تم بھی اچھا کام کرو گے تو تمہیں بھی اس جیسا مکان مل جائیگا لیکن اس جگہ کو خیرباد کہنا محض خام خیالی ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو اس خیال کو دماغ سے نکال دیجئے:"

ایک امریکی خاتون Olga Kochanska نے جلاوطنی کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب میں اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ جولائی ۱۹۴۰ء میں ... میں گرفتار کرکے مغربی سائبیریا میں لائی گئی تو یہاں پہنچ کر ہم سے جو پہلا خطاب کیا گیا وہ مندرجہ ذیل تھا۔ "تم جتنا کام کرو گے اتنا ہی کھانا کھانے کے مستحق ہو گے۔ تمہیں ہر روز پانچ روبل تک معاوضہ دیا جائے گا۔" عملی طور پر ایک مرد ایک مہینہ میں چالیس روبل سے زائد اور عورتیں بیس روبل سے زیادہ نہیں کما سکتی تھیں۔ ان میں سے بیشتر قسم خوراک مہیا کرنے کے لئے لگ جاتی لیکن پھر بھی انہیں پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوتا معمولی معمولی باتوں پر جرمانہ کیا جاتا۔ لیکن اصل سزا یہ ہوتی کہ ہمیں نازیوں کے کیمپوں تک جو یہاں سے ساٹھ ساٹھ میل دور تھے پیدل چل کر جانا پڑتا۔ اس سے مزدوروں کے دس دس دن ضائع ہو جاتے۔ کام کرنے سے انکار پر جیل دروازے ہر وقت کھول دیئے جاتے۔ اس کا اثر اس آبادی پر یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر بے غیرت بے حس ہو کر رہ گئے۔

"ہم نے ہٹلر کی مخالفت کرنے میں ایک نہایت عظیم کام کیا۔ پولینڈ والوں کو کبھی ڈرنا نہیں چاہئے تھا۔ اس سے زیادہ زبوں حالی اور کہاں ہو سکتی ہے:"

ں عرصہ میں قیدیوں کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ گئی۔
۱۹۴۰ء تک کیمپوں کی تعداد سوا سو سے اوپر پہنچ چکی تھی۔
ن میں کتنے اشخاص قید ہیں؟ اس کا فی الحال کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا
جا سکا۔ مختلف حضرات نے مختلف تعداد دی ہے۔ لیکن خیال یہی ہے
قیدیوں کی تعداد دو اور تین کروڑ کے درمیان ہے اس سے کم نہیں۔
Victor Kravchenko نے اپنی شہرہ آفاق کتاب
"I chose Freedom" میں لکھا ہے۔

"ہماری صنعت کا سب سے بڑا سہارا قیدیوں کی ایک
بہت بڑی فوج تھی جس میں ہر آن اضافہ ہوتا چلا جاتا
سرکاری حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ تعداد دو کروڑ کے قریب
قریب ہے اس تعداد میں چھ سال سے لے کر سولہ
سال تک کے بچے بھی شامل ہیں۔ جن کو بالجبر اپنے
والدین سے الگ کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ سوویٹ روس
کی جنگی صنعتوں کا انحصار زیادہ تر انہیں غلاموں پر ہے"

Brooks Atkinson نے ماسکو کی واپسی پر یہ تحریر
کیا۔ "کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کتنے سیاسی قیدی
اس وقت جلاوطنی کی حالت میں ہیں یا قید و بند کی صعوبتیں
جھیل رہے ہیں۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ ان کی تعداد
ایک کروڑ اور ڈیڑھ کروڑ کے درمیان ہے"

Vasili Petrenko ایک سابق سرخ فوج کے افسر
کے نقطۂ نظر کے مطابق قیدیوں کی تعداد دو کروڑ ۴۰ لاکھ کے قریب
قریب ہے۔

جرمن والوں کی بعض تحریریں جو کہ جنگ میں اتحادیوں کے ہاتھ آئیں
ان سے پتہ چلتا ہے کہ اہل جرمنی نے روس کے جبری محنت کے
نظام کو کتنی دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ جب ۱۹۳۹ میں روس اور
جرمنی کا معاہدہ ہوا تو جرمنی کے بہت سے معاشی ماہر روس
وفد لے کر گئے۔ اور انہوں نے روس کے دوسرے علاقوں کی
بھی سیر کی۔ ان کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جرمنی
نے روس پر حملہ کیا تو اس وقت ان قیدیوں کی تعداد ایک کروڑ تھی

پروفیسر Sergei Prokopovich جو ایک بڑی ہی
ممتاز معاشی مبصر ہے اس نے کہا ہے۔

"ہم ان قیدیوں کی تعداد کے متعلق خواہ کتنا ہی کم
سے کم اندازہ لگائیں۔ ایک بات یقینی ہے کہ روس
میں غلاموں کی ایک ایسی قسم ہے جن کی تعداد کئی
لاکھ سے کم نہیں اور جن کا معیارِ زندگی امریکہ کے
حبشیوں سے بھی گرا ہوا ہے۔ اتنا گرا ہوا کہ ان
مظلوموں کے نزدیک حبشیوں کا طرزِ زندگی مثالی ہے"

ہماری نسلیں کروڑوں اور اربوں کی تعداد سن سن کر اس
کی اہمیت کو بہت حد تک نظر انداز کر چکی ہیں۔ اور ہمیں اس امر کا
احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ ایک کروڑ یا ڈیڑھ کروڑ انسانوں کو قید میں
رکھنا، ان کو ملک بدر کر دینا کسی قوم کی زندگی میں کیا حیثیت اور اہمیت
رکھتا ہے۔ ہمارے احساسات مردہ ہو چکے ہیں۔ ہمارے جذبات ختم ہو
چکے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ریاست نیویارک جو امریکہ کی سب سے
بڑی ریاست ہے اس کے بسنے والوں کی تعداد ۱۰۰ لاکھ ہے۔ اگر ہم روس
کے قیدیوں کی تعداد ایک کروڑ بھی شمار کریں تو یہ کینیڈا جیسی ریاست کی کل
آبادی سے زیادہ ہے۔

یہ اطلاعات خواہ ہمیں کسی ذریعہ سے پہنچی ہوں ان کے ذریعہ
ایک بات بالکل یقینی اور واضح ہو جاتی ہے کہ ان قیدیوں کی ۸۰ فی
فیصدی آبادی مردوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۴۰ء میں اندازہ کیا گیا کہ
روس میں بالغ مردوں کی تعداد چار کروڑ اور سترہ لاکھ کے قریب
ہے۔ جنگ میں بہت سے نوجوان کام آئے اور اس میں کافی حد تک
کمی ہو گئی۔ روسی سرکار کے اعلان کے مطابق پچھلی جنگ میں روس کی ۷۰ لاکھ
جانیں تلف ہوئیں حالانکہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے بہرحال روس میں اس وقت
بالغ مردوں کی تعداد ۳ کروڑ سے کم ہے اگر ہم ان قیدیوں کی تعداد سے متعلق اندازہ
ملا کر بھی لگائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ملک میں کام کرنے
والے مردوں کا بیشتر حصہ جبری محنت کی بھینٹ چڑھ رہا ہے یہی وجہ ہے
کہ ہمیں روس کا جائزہ لیتے ہوئے اس نظام کو سمجھ کر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا
چاہئے۔ روسی نظام میں اس کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ آزاد ملکوں کی۔

فصل پنجم

غلامی کا ایک نیا سسٹم

روس میں جبری محنت غلاموں سے حاصل کی ہوئی محنت کی طرح محنت کو رعایت سستے داموں پڑتی ہے روس کی خوشحالی کا اصل راز اسی میں مضمر ہے۔ حکومت کی اپنی اصطلاحات کے مطابق ایک قیدی پر تقریباً پانچ سو روبلز سالانہ خرچ کئے جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں ایک شہری اوسطاً ۱۲۹۶ روبلز میں گزارہ کرتا ہے۔ حکومت کے اس طریق سے حاصل کئے ہوئے منافعوں کی وسعت کا ہمیں اس وقت صحیح احساس ہو سکتا ہے جب ہم یہ اندازہ کریں کہ مزدوروں کی محنت میں کتنے سالوں سے کئے مظلوموں کے خون سے قند نمائدہ کی شکل میں خون نچوڑا جا رہا ہے اور پھر اس خون کو چند خوش نصیبوں کی شریانوں میں کتنے مختلف طریقوں سے داخل کیا جاتا ہے اب بھی اگر ان چند چہروں پر سرخی نہ ہو تو اس سے زیادہ حیرت کا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس ملک میں اکثر سکیموں کو شروع کرنے کے لئے زیادہ سرمایہ درکار نہیں ہوتا بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سرمایہ کی کمی کو محنت کی فراوانی سے پورا کیا جائے۔ چنانچہ ماہی گیری میں اس طریقے سے بہت فائدہ اٹھایا گیا۔ مثال کے طور پر ۱۲۰۰ ٹن مچھلی سے حکومت کو ۱۹۳۸ء میں دس لاکھ روبلز منافع ہوا۔ اس کے برعکس ۱۹۳۹ء میں آزاد مزدوروں کی مدد سے جو مچھلیاں پکڑی گئیں ان میں ۲۸,۰۰۰ ٹن پر منافع کی مقدار دس لاکھ روبلز سے کم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت ہمیشہ اس تلاش میں لگی رہتی ہے کہ ان کاموں پر جہاں زیادہ تر جسمانی محنت درکار ہو وہاں مشینری کو کم سے کم استعمال میں لایا جائے اور سارا بوجھ قیدیوں کے کندھوں پر ڈال دیا جائے۔ چنانچہ روس میں جنگل کاٹنا، نہریں کھودنا اور سڑکیں بنانا زیادہ تر انہیں قیدیوں کے سپرد ہے۔

جبری مشقت سے تیسرا فائدہ یہ ہے کہ قیدیوں کو سخت سے سخت نظام میں جکڑا جا سکتا ہے۔ آزاد روس میں محنت منصوبہ بندی کے باوجود لوگوں پر کبھی کبھی کاہلی اور سستی چھا جاتی ہے کبھی کبھار کام سے گریز کی راہیں نکال لی جاتی ہیں۔ لیکن جبری محنت میں اس قسم کے مسائل پیش نہیں آتے۔ قید خانوں کے اندر سخت سے سخت قسم کے نظم کا قائم کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کیمپ کا ناظم اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے ہاں قیدیوں کی کتنی تعداد ہے اور ان میں کام کرنے کی کونسی صلاحیتیں ہیں۔ پھر کام کے اوقات کا تعین بھی کچھ مشکل مسئلہ نہیں نہ کبھی وہاں خلل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس نظم کی وجہ سے ہزاروں قیدیوں کو جس وقت ضرورت پڑے بڑی ہی آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ قیدیوں میں نقل مکانی کی اس صلاحیت سے جنگ میں روس کو بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے جب بھی کبھی فوجی اڈے قائم کرنے کا ارادہ کیا گیا تو ان قیدیوں کی مدد سے وہ بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچائے جا سکے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی غلامی معرض وجود میں آئی وہ ہمیشہ چند خصوصیات کی حامل رہی۔ غلامی کی ظاہری شکل زمان و مکان کے فرق کی وجہ سے مختلف اقوام میں مختلف۔ مگر روح کے اعتبار میں ان سب قسم کی غلامیوں میں کسی حد تک ایک گہری مماثلت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ غلامی کی اصل غایت غلاموں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔

مارشل سٹالن نے اپنی ایک تقریر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:-

"غلامی درحقیقت کمزور طبقوں سے ناجائز انتفاع کی پہلی کڑی ہے لیکن غلاموں کی بغاوت نے اس انتفاع اور غلام بنانے والے سرداروں کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد غلامی ایک دوسری صورت میں ظہور پذیر ہوئی

جیسے بغیت پن یا سرفڈم (Serfdom)
کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر اسکو
بھی زوال آیا اور اس کے خاک و خون سے سرمایہ داری
پیدا ہوئی۔ اشتراکیت کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہر قسم
کے ناجائز استحصال کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔"

سٹالن کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ اشتراکیت کے
حامیوں کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے اس بیان کو فتح مندی کا ایک
اعلان سمجھا اور یہ گمان کرنے لگے کہ ان الفاظ کے صرف کہہ دینے میں ایک
ایسا جادو ہے جس سے ہر قسم کی غلامی دفن ہو جائے گی۔ لیکن واقعات جس
چیز کا پتہ دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر غلامی کے معنی یہی ہیں کہ کمزوروں سے
اُن کی کمزوری اور ناداری کی بنا پر ناجائز نفع حاصل کیا جائے تو پھر غلامی
روس میں ناپید نہیں۔ بلکہ پوری آب و تاب سے اس جنتِ ارضی میں
جلوہ گر ہے۔ اور اس نظام میں اس طرح رچ گئی ہے کہ اس کو ختم کرنا
ناممکنات میں سے ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اشتراکی نظام نے ایک
ایسی غلامی کو جنم دیا جس میں غلام ایک فرد کی ملکیت سے نکل کر قوم کی
ملکیت میں آگیا ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ
پرانے غلام افراد کے دستِ تصرف میں ہوتے تھے اور اب یہ غلام
حکومت کے دستِ ظلم کا شکار ہیں۔

غلامی کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کی اصل روح
آقا کا غلام کی محنت سے قدر زائد Surplus [illegible] کو [illegible]
نگل جانا ہے۔ غلام کو مالک صرف اتنا معاوضہ دیتا ہے کہ وہ بمشکل اپنے
سانس کی ڈوری کو باقی رکھ سکے۔ باقی جو کچھ بچتا ہے اُسے خود حاصل کرتا
ہے۔ تاریخ کے وہ ادوار بھی جب کہ ہر انسان صرف زندہ رہنے کے لئے
کماتا تھا اس وقت غلامی کا رواج بھی نہ تھا۔ وہ دشمن جن کو شکست
دی جاتی مار دیئے جاتے۔ جوں جوں زمانہ نے ترقی کی تو انسان نے صرف
اپنی بقا کے لئے نہیں بلکہ اپنے آرائش و آسائش کو حاصل کرنے کے لئے
زیادہ کام کرنا شروع کر دیا۔ جب غلامی معرضِ وجود میں آئی تو غلاموں
کی اس محنت کو جو وہ آزاد ہونے کی صورت میں آسائش حاصل کرنے
پر صرف کرتے، ان کے آقاؤں نے اپنے تصرف میں لے لیا اور غلاموں
کے حصے میں صرف قوتِ لایموت رہ گیا۔

جب تک دنیا میں قدرِ زائد جیسی جاذبِ نظر چیز موجود ہے
اس وقت تک غلامی کو دنیا سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس ادارہ کی ترقی
کا انحصار کسی ملک کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات پر ہے
اس صنعت کا رواج یونانیوں اور رومیوں کے اندر عام تھا۔ مؤرخین کا
اندازہ ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں یونان کی تیس لاکھ آبادی
میں سے ایک لاکھ غلام تھے۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ سارے غلام صرف
افراد کے قبضہ میں نہیں تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر کلرک اور پولیس
میں سپاہی تھے۔

غلامی کا رواج مختلف قوموں اور ملکوں میں بڑی مدت سے
پایا جاتا ہے۔ مگر یہ کمال روس کو حاصل ہوا کہ اس نے غلاموں کو قوم کی
تحویل میں دیکر اسے ایک مربوط نظام کے طور پر پیش کیا۔ مگر اس منحوس ادارہ
کا معاشی پس منظر آج اس جنتِ ارضی میں بھی وہی ہے جو کہ آج سے ہزاروں
سال پہلے تھا۔ غلامی کے اس نئے سسٹم میں اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف
یہ کہ رومیوں کے ہاں غلاموں کی انفرادی ملکیت کا بھی رواج تھا۔ مگر
روس میں ایک فرد غلام نہیں رکھ سکتا۔ دوسری خصوصیت یہ ہے
کہ قانون کے اندر اتنی گنجائش ضرور رکھی گئی ہے کہ ہر غلام اپنی مقررہ سزا
بھگتنے کے بعد آزاد ہو سکتا ہے۔ مگر یہ صرف قرطاس پر لکھی ہوئی باتیں
ہیں۔ عمل کی دنیا میں معاملہ بالکل الٹ ہے۔ سزا کے ختم ہو جانے پر
سزا کو اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہی نہیں آزادی کے بعد بھی انہیں مجبوراً عمر
جلاوطنی میں گزارنا پڑتی ہے۔ باقی پہلوؤں میں یہ غلامی روم کی غلامی
سے ملتی جلتی ہے۔ خاص طور پر علمی ذوق رکھنے والے ذہین آدمیوں کو
جسمانی محنت کی کشاکش میں جوتنا تاریخِ انسانی کے تاریک دور کی یاد تازہ
کر دیتا ہے۔ غلامی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
غلاموں میں کام کرنے کا ذوق شوق کبھی نہیں ہو سکتا۔ محض خوف ہی
اُن کے کام کا محرک ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کوئی نئی چیزیں سوچتے اور نہ
ہی ان کا دل کام میں لگتا ہے۔ بس ایک بیگار ہے جس کو وہ ٹال دینے
کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ قریب قریب یہی ذہنیت روسی قیدیوں
کی ہے۔ جو محرکات انہیں کام پر اکساتے ہیں وہ روٹی کے چند نوالے

اس کے مقابلہ میں غلامی بدرجہا کی سہولت کی ۔
دوسرا کوئی صاف واقعہ Nikanor Smorodkin ہے
جس نے پہلے ضبط باقی کسانوں کی کمیٹی کا بھی ممبر تھا بعد میں قید کر دیا گیا جہاں سال
سزا بھگتنے کے بعد وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے بھی ایک زیر
زمین ہر قسم کی سیاسی جماعت قائم کی۔
بھاگ نکلنے کے یہ مواقع کسی انتہائی خوش نصیب کو ہی میسر آسکتے ہیں۔ باقی اسی قید خانہ میں ہی پڑے زندگی کے دن گزار دیتے ہیں۔
البتہ ان کے دلوں میں اس ظالمانہ نظام کے خلاف عداوت کی چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں اور زبان سے وفاداری کے اظہار کے باوجود دل میں نفرت کے جذبات موجزن رہتے ہیں۔

ان شہادات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جبری محنت کے کیمپ کے ذہنی، جسمانی اور اخلاقی اثرات بالکل ویسے ہی ہیں جیسے غلامی کے ہو سکتے ہیں۔

فصل ششم

انسانیت موت کی وادی میں

کولیما کا ویران خطہ بحر منجمد شمالی کے قریب واقع ہے۔ اس کے دریا سال میں تقریباً دس ماہ تک منجمد رہتے ہیں۔ موسم سرما میں راتیں بیچ سے طلوعوں تک اس خطہ کو اپنے گرداب نے پہلو میں چھپائے رکھتی ہیں۔ جب کبھی سرد ہوا چلتی ہے تو یہاں کے سخت جان اصلی باشندے بھی باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتے اور اگر مصنف کے مطابق انہیں یہ کرنا بھی پڑے تو اپنے آپ کو رسیوں کے ساتھ باندھ کر باہر قدم رکھتے ہیں۔ اس کا درجہ حرارت ۹۲ یا ۹۳ فارن ہیٹ ہے اور سارا سال برف کی تہہ جمی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطہ بالکل غیر آباد تھا۔ ۱۹۲۶ کی مردم شماری میں یہاں ۱۰۰ مربع میل میں ایک یا دو انسان بستے تھے۔ ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں کہ اس خطہ کو آباد کیا جا رہا ہے۔ یہاں اب مشقتی کیمپوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ اور ہر سال ہزاروں قیدی اس میں نظر بند کئے جاتے ہیں۔ جن میں اکثریت ایسے آدمیوں کی ہے۔ جن کو اس موت کی وادی میں جا کر کبھی بھی واپس آنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ چند ہی خوش نصیب ایسے ہیں جو سلامتی کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس لوٹے لیکن انہوں نے بھی ان کے ہیبت ناک مقامات کے متعلق لب کشائی کرنے کی جرأت نہ کی۔ کیونکہ اس راز کے افشا کرنے کی سزا موت یا حبس دوام ہے۔ اس خطہ میں سب سے خوفناک کام یہ ہیں۔ سوویٹ حکومت نے ان سے سونا حاصل کرنے کے لئے لاتعداد انسانوں کو بے دریغ سردی اور طوفان کی نذر کر دیا۔ پہلے پہلے تو یہ کام منفرد راستوں میں رہا لیکن ۱۹۲۸ میں تجارتی نقطہ نظر سے مستقل مہم شروع کی گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب روس میں زمینوں کو قومی ملکیت بنانے کا کام بڑے زور شور سے جاری تھا۔ وہ لوگ جو اس میں مزاحم ہوتے، انہیں سائیبریا کے بیابانوں میں بھیج دیا جاتا۔ ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں پڑھے لکھے کاریگر، صناع، انجینئر اور سائنس دان شامل تھے۔ حکومت نے ان باغیوں کو اس موت کی وادی میں دھکیل کر ان سے نپٹنے کا بڑا کامیاب طریقہ نکالا کہ ایک طرف ان کی محنت سے حکومت کے خزانے بھی بھریں اور بغیر پھانسی پر چڑھائے ان باغیوں کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیا جائے۔

اس مہم کو جی پی یو کے سپرد کیا گیا اور ۳۲-۱۹۳۱ء میں Dalstroy کے نام سے ایک تنظیم معرض وجود میں آیا۔ اس کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ اس مہم کو سائبیریا کے شمالی حصوں تک پھیلا دے۔ حکومت نے اس ادارہ کو جبری محنت کشوں کی بہت بڑی تعداد مہیا کی جن میں مختلف قابلیتوں اور صلاحیتوں کے لوگ شامل تھے۔ اس ادارہ نے نہایت ہی سختی سے ہر قسم کی سرتابی کے دروازے بند کر دیئے۔ ان کیمپوں کے گرد آہنی سلاخیں گاڑ دی گئیں جن کے گرد خفیہ پولیس کے

سپاہی ان جنگلوں سے مسلح گشت کرتے رہتے۔ مختلف جگہوں پر توپیں نصب کی گئی تھیں تاکہ بوقت ضرورت کیمپوں کے بڑھتے پر آسانی سے گولہ باری کی جا سکے۔ اس کے علاوہ بجلی کے پمپ بھی لگائے گئے جن سے بوقت سخت ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بھی پھوٹ سکتے تھے اور پانی سے باغی مزاج کے قیدیوں کو راہ راست پر لا سکتے تھے۔ ان کیمپوں میں قیام پذیر ہوتے ہی پہلا کام جو انہیں کرنا پڑا وہ مختلف عمارتوں کی تعمیر تھی۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے پہاڑوں کو کاٹ کر شاہراہیں تعمیر کیں۔ اس کے بعد لکڑی چیرنے کی مشینیں لگائیں، جھیل کو نمک نکالنے کا کارخانہ، جہازوں کی مرمت کرنے کی ورکشاپ اور بجلی کا کارخانہ تیار کئے گئے۔ انھوں نے دلدلوں کو صاف کر کے زمین کو کسی قدر قابل کاشت بنایا۔ اس کے علاوہ افسروں ان کے خاندانوں اور کتوں تک کے رہنے کے لیے مکانات بنائے گئے۔ ان مکانوں کی دیواروں میں لکڑی کا برادہ ڈالا گیا تاکہ سردی ان پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ مگر ان قیدیوں نے اپنی کوٹھڑیاں گھاس پھوس اور درختوں کی ٹہنیوں سے بنائیں۔ ان کیمپوں میں کام بہت زیادہ محنت طلب تھا۔ سردی ہو یا بارش کام برابر جاری رکھا جاتا اور مزدور دلدلوں میں گھٹنوں گھٹنوں کھڑے رہتے کیونکہ اوقات معین نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اذیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ پھر خوراک بھی مشقت کے مقابلہ میں بہت کم ملتی۔ شام کو یہ فاقہ کش گرتے پڑتے لت پت تھک ہار کر گھروں کو واپس آتے اور صرف آگ تاپ کر رات نہایت ہی بے سروسامانی کی حالت میں گزارتے۔

یہ ظاہر بات ہے کہ سردی کی اتنی شدت کو آخر ایک ذی روح کس طرح برداشت کر سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بیمار پڑنا شروع ہو گئے اور مختلف مہلک بیماریوں نے ان کو نیست و نابود کر ڈالا۔ شرح موت کے بڑھ جانے کو اس وقت تک نظرانداز کیا گیا جب تک کہ اس آگ سے خفیہ پولیس کے کیمپ محفوظ ہے۔ مگر جونہی یہ وبائیں ان کیمپوں میں بھی نازل ہونے لگیں اور حکومت کے آمادہ ملازمین اس کا شکار ہوئے تو اس وقت حکومت کی آنکھیں کھلیں اور اس نے محنت کش قیدیوں کے لئے بارکوں کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا۔

جبکہ ہر ہفتے قیدیوں کا نیا قافلہ آتے۔ ان میں وہ قیدی شامل ہوتے تھے جنہیں حبسِ دوام کی سزا کا حکم سنایا گیا ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کیونکہ عمر قید کی سزا دی ہی اس لئے گئی کہ وہ جسمانی مشقت کے لئے زیادہ موزوں پائے گئے۔ یہ لوگ زیادہ تر سائبیریا، کلاکی اور یوکرین کے تھے۔ ان لوگوں کی خستہ حالی کی داستان نہایت ہی دل فگار ہے ان کو آب و ہوا کے مطابق کپڑے مہیا نہ کئے جاتے جس لباس میں انھیں گرفتار کیا جاتا اسی میں انھیں بھیجا جاتا۔ حکومت کے کارندوں کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ یہ لوگ سردی کی شدت کی تاب نہ لاکر کیمپ سے بھاگ نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے اس کی پیش بندی پہلے ہی سے کر لی جاتی۔ مجرموں کو ہولناک سزائیں دی جاتیں۔ قانون کے مطابق جو شخص بھاگنے کی جرأت کرتا اُسے موت کی سزا دی جاتی۔ یہ سزا اس بدنصیب کے علاوہ اُس کے ان ساتھیوں کو بھی دی جاتی جن کے بارے میں اس راز کے معلوم ہونے کا شبہ تک ہوتا۔ ظلم کے بعض ایسے روح فرسا واقعات سننے میں آئے ہیں جس میں ایک شخص کی حکم عدولی پر پورے کے پورے کیمپ کو گولی مار کر اُڑا دیا گیا۔

لوگوں کو ہر وقت خوف میں مبتلا رکھنا یہاں کے افسروں کا فرض اولین تھا۔ جب کوئی یونٹ کام کے لئے نکلتی تو اس کے ساتھ بھیڑیوں کی نسل کے کتے بھی بھیجے جاتے ان کو اس طریق پر سدھایا گیا کہ وہ خفیہ پولیس کے افسروں اور آزاد شہریوں کو دیکھ کر بالکل برہم نہ ہوتے مگر قیدیوں سے دو چار ہوتے ہی ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ ہر وہ شخص جس کو وہ چشم زدن میں دیکھتے اس پر لپک پڑتے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد کیمپوں کے ناظمین نے قیدیوں کے لئے ایک خاص وضع کا لباس تیار کروایا۔ اس سے کتوں کا کام اور بھی آسان ہو گیا اور وہ اپنا شکار تلاش کرنے میں ذرہ بھر بھی دقت محسوس نہ کرتے جب بھی کسی قیدی کو کتے مار دیتے تو کیمپوں میں اس کی نعش کی تشہیر کرائی جاتی تاکہ دوسرے عبرت پکڑیں اور فرار کی جرأت نہ کریں۔ ایک قیدی نے اس کے متعلق ایک گیت لکھا:

ہم بھاگے،

ہم پکڑے گئے۔

بڑے بڑے بھورے رنگ کے کتوں سے—

ان حالات میں بھاگ جانے کی معمولی سی سعی بھی خودکشی کے مترادف ہوتی ہے اور ہر شخص اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مگر کیمپ کی زندگی

ان پر اس قدر گراں ہے کہ وہ اس سے تنگ آکر بعض اوقات خود موت کے منہ میں جانا پسند کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مفرور ہونے کے یہ واقعات زیادہ تر موسم سرما میں پیش آتے ہیں

یہ بات کسی حد تک مسلّم ہے کہ قیدیوں کی ان سختیوں میں تنظیمی عملہ کی ناتجربہ کاری اور حالات سے ناواقفیت کو بھی دخل ہے ۔ مگر اس کے پیچھے اصل روح جو کارفرما ہے وہ یہ کہ اصل چیز مادی اشیاء کا حصول ہے ۔ اور انسان ان کو حاصل کرنے کا ذریعہ ۔ جس ملک میں دولت کا بت خدائیہ سمجھا ہو ۔ بلکہ حکومت کی مشینری لوگوں کا سر نیاز اس معبود کے سامنے جھکانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دے جس سلطنت میں ذخیرہ اندوزی اور نفع یابی ہی اصل مقصود ہو جہاں لوگوں کے دل کی روشنی بجھ جائے اور نفس کی آگ بھڑک رہی ہو ۔ جہاں اغراض و خواہشات کے سوا دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے وہاں اگر دھاتوں کے عوض انسان کو فروخت کیا جائے تو اس میں کون سی اچنبھے کی بات ہے سوویٹ حکومت کی اسی خود غرضی نے اس ملک کی ساری زمین کو ایک وسیع منڈی بنا رکھا ہے جس میں انسان ایندھن کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں ۔ اس

زری خود غرضی کی شاطرانہ چالوں سے بڑی بے اصولی اور بے رحمی روا ہے اسکے ایک ادنیٰ اشارے پر لاکھوں بے گناہ انسانوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے ۔ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے اور اس مادہ پرستی کی وجہ سے یہاں کے کیمپ قتل گاہوں میں تبدیل ہو گئے ہیں ۔

بالشویک انقلاب کے آغاز میں لینن نے سونے کی افادیت کا ان الفاظ میں ذکر کیا تھا کہ ۔

"ہم سونے کو دنیا کے بڑے بڑے شہروں کی گلیوں میں مفاد عامہ کے لئے پاخانے بنانے میں صرف کریں گے "

پوری دنیا میں سوویٹ انقلاب جس کا خواب اگرچہ ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ۔ مگر اس کا رخ سٹالن کے کہنے کے مطابق اسی سمت کو ہے ۔ اور وہ سوشلزم کی وادیوں میں سے مارچ کرتا ہوا اپنی منزل مقصود کو جا رہا ہے ۔ مگر افسوس کہ سونے کے متعلق لینن کی پیش گوئی پوری نہیں ہوئی یہ زرد دھات نوع انسانی کی خادم بننے کی بجائے اس کی حاکم اور معبود بن گئی ہے ۔ ــــــ قلب و نظر اور فکر و عمل کا اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا ہے ۔

فصل ہفتم

روس میں جبری محنت کا آغاز اور نشوونما

پہلے دس سال

قید خانوں کے ساتھ جرائم کو بھی ختم کر دینے کا یہ سب سے پہلا اور عظیم الشان تجربہ تھا جو روس میں کیا گیا ۔ یہ اس قابل ہے کہ تفصیلی نفسیاتی جماعتیں مدتوں تک اس کا مطالعہ کرتی رہیں ۔ لینن نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا ۔

معاشرہ میں جرائم کی زیادتی کی اصل وجہ غریبوں کی محنت سے ناجائز انتفاع ہے ۔ اگر اس سبب کو ختم کر دیا جائے تو اس کے ساتھ اس قسم کی زیادتیاں بھی خود بخود ختم ہو جائیں گی اور ان کے مٹ جانے سے ریاست بھی آہستہ آہستہ کالعدم ہو جائے گی ۔ جو نیم کوفیت و نابود کر دینے کے لئے سرمایہ داری کو مٹانا اشد ضروری ہے ۔

جونہی سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوگا تو جرائم بھی کم ہوتے چلے جائیں گے اور بالآخر بالکل مٹ جائیں گے۔ ایک متوازن سماج میں جرم کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ایسے سماج میں قید خانوں کو بے ضرورت سمجھ کر سکولوں اور عجائب گھروں میں تبدیل کر دیا جائیگا اور جبر و استبداد کی مشینری جو کہ ریاست کا ایک لازمی جزو ہے بالکل بے کار ہو جائے گی۔ اور ریاست کا وجود بھی باقی نہ رہے گا۔

.... ہر قسم کے جرم کی وجہ اجتماعی ضمیر کا فقدان ہے۔ جرائم کا سرچشمہ غربت، فاقہ مستی، امرا کا جان بوجھ کر بیکار رہنا اور غربا کا مجبوراً بیکار رہنا ہے۔ اخلاقی تنزل سماج میں عدم توازن کا نتیجہ ہے'

یہ اصول لینن کے دماغ کی کرشمہ سازی نہیں۔ اس نے اسے اپنے استاد مارکس سے مستعار لیا جس نے بذات خود یہ اصول انیسویں صدی کی تحریک حریت سے اخذ کیا۔ یہ خیال دراصل اپنے اصول کی پیداوار ہے 'انقلاب فرانس' سے ہی لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اس خیال کے تحت اصل کام افراد کی اصلاح نہیں بلکہ سماج کی اصلاح ہے۔ مارکس کے خیال میں سماج کی اصلاح سے مراد معاشی تعلقات میں تغیر و تبدل ہے۔ لینن نے نہ صرف اس نظریہ کو اپنایا بلکہ اس کی پیچیدگیوں کو دور کیا۔ لینن کے نزدیک سرمایہ داری کو ملیامیٹ و نابود کر دینا جرائم کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔

تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ہمہ گیر اختیارات کی مالک ریاست نئے نئے جرائم کو جنم نہیں دے گی؟ کیا سماج کی نئی طبقاتی تقسیم نئے فتنوں کو بیدار نہیں کرے گی؟ یہ تھے وہ سوالات جو ہر شخص کے ذہن میں پیدا ہو سکتے تھے۔ لیکن اس قسم کے وسوسوں کے پیدا ہونے کی لینن اور اس کے ساتھیوں کے دلوں میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ انہیں یقین کامل تھا کہ نومبر کے انقلاب اور خانہ جنگی کے بعد یہ جرائم خود بخود مٹ جائیں گے۔ اب جتنے مجرم موجود ہیں ان کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ ان کو سزا دینے کی۔ انہیں صحیح طرز عمل اور موثر طریقوں سے اشتراکی سماج کے مفید ارکان بنایا جا سکتا ہے۔ سوویٹ حکومت کا کام ان کو سزا دینا نہیں بلکہ ان کی اصلاح کرنا ہے۔

فوجداری قانون اور تعزیری ضابطہ کو از سر تا پا بدلنا مقصود تھا۔ جو کچھ کہ سرمایہ داری نظام کے اندر ضروری تھا اس کے لئے اشتراکی ریاست میں کوئی جگہ نہ تھی۔ عدالتی نظام کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں انقلاب نہ لایا جائے۔

عدلیہ اور تعزیرات اور قیدیوں کے خلاف اشتراکی اکابر کے دلوں میں شدید نفرت موجود تھی۔ وہ ان کو ہمیشہ سے دفن کرنا چاہتے۔ پیٹر سوچکا (Peter Stuchka) — آئیگن (Eugene Pashukanis) اور نیکولائی (Nikolai) — Krylenko — لینن کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔ مشہور ماہر قانون آئیگن Eugene کو قید خانوں کا انچارج بنایا گیا۔ یہ سب کے سب مصلحین لینن کے سے جذبات رکھتے تھے۔ سرکاری اصطلاح میں "جرم" کا لفظ مٹا دیا گیا اور آہستہ آہستہ جرم کے متعلق یہ نظریہ کہ علم ہونے لگا کہ جرم ماحول کی پیداوار ہے۔ جب افراد جرائم کا ارتکاب کریں تو اس میں اصل قصور افراد کا نہیں بلکہ سماج کا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے جو تجویز قبول کی گئی وہ یہ تھی کہ تعزیرات میں سے "زیادہ سے زیادہ قید" اور "کم سے کم قید" کے الفاظ اڑا دیئے گئے۔ جرائم کے لئے کرائلینکو (Krylenko) چاہتا تھا کہ اس معاملہ کو بالکل عدالتوں کی صوابدید پہ چھوڑ دیا جائے۔ نئے ضابطہ فوجداری میں حکومت نے زیادہ سے زیادہ سزا پانچ سال تک "آزادی سے محرومی" مقرر کی۔ ۱۹۲۲ء میں یہ سزا ۱۰ سال تک بڑھا دی گئی۔ قیدیوں میں تعلیم پھیلانے کا منصوبہ تیار کیا گیا اور پیرول پر رہائی کے انتظامات بھی کئے گئے اور یہ توقع کی جانے لگی کہ نئے اشتراکی نظام کے اثرات جلدی ہی مجرموں کی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب پیدا کر دیں گے۔ اشتراکیت کی سرزمین میں قید خانے ناپید ہوں گے کیونکہ قید خانے سرمایہ دارانہ تہذیب کے نشانات تھے۔ یہ بربریت اور استبداد کی یادگار تھیں۔ اس لئے "قید خانہ" کے لفظ کا استعمال بالکل ختم کر دیا گیا اور ضابطہ فوجداری ان کے لئے صرف نظربندی کے مراکز کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ عدالتی سزاؤں اور قوانین میں بھی ان الفاظ کو ترک کر دیا گیا

اس تبدیلی پر کئی کتابیں تصنیف کی گئیں اور اسے روسی ترقی کا پیش خیمہ سمجھا جانے لگا۔

اِس لفظ "قید خانہ" کو روس کی سرکاری مطبوعات میں ڈھونڈنا بالکل عبث ہے۔ اسی طرح "سزا" کا لفظ بھی بالکل غائب ہو گیا۔ سزا سے مراد پاداش ہے اور ہر جرم کی پاداش اُس جرم کے مطابق ہو سکتی ہے اس قسم کی کسی چیز کی روسی نظام میں جگہ نہ تھی۔ اشتراکی ماحول میں جرائم کے اسباب ناپید ہو گئے۔ اب روس میں ایسے مجرم نہیں تھے بلکہ وہ ایسے بھائی تھے جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

ایسے تمام نظریات جن کی رو سے انسان کا پیدائشی جرم کی صلاحیتیں رکھنا ثابت ہوتا تھا، بالکل رد کر دیئے گئے۔ کیونکہ مارکس کے پیروؤں کے نزدیک انسان کو مجرم صرف اس کا ماحول ہی بناتا ہے۔ ایک مجرم بھی اسی طرح بیمار تھا جس طرح کہ تپِ دق کا مریض۔ اور دونوں علاج کے بھی یکساں محتاج۔

۱۹۱۸ء میں محکمہ قضاء نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ

"قیدیوں کی اصلاح کی جائے گی اور ان کو سزا نہیں دی جائے گی۔"

کمیونسٹ پارٹی کی کانگرس نے ۱۹۱۹ء میں یہ تجویز پیش کی کہ

"اصلاح کا سب سے اہم طریقہ محنت ہے۔"

۱۹۲۲ء میں نئی تعزیرات کی رو سے سزا ہٹ گئی۔ اب صرف سماجی تحفظ مطلوب تھا۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ سوویٹ روس میں نظربندی کے مراکز میں افراد کو علیحدہ علیحدہ قید نہ کرنا ہوگا، نہ کسی کو بھوک کا عذاب دیا جائے گا۔ وہ نہ ہی بربریت کا کوئی اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے گا جو سرمایہ دارانہ نظام سے مناسبت رکھتا ہو۔ بیسویں صدی کے اشتراکی قانون کے مطابق قفل و سلاسل کا رواج ترک کر دیا گیا۔

جیل کے اندرونی نظام میں تبدیلیاں کی گئیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں قید خانوں کی خرابیوں کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا۔ "بورژوا ضابطۂ فوجداری کا مقصد قیدیوں کو منظم سزا کے ذریعہ اخلاقی اور جسمانی طور سے بالکل تباہ و برباد کرنا ہے۔ یہ قید خانے نہ صرف مجرم کی اصلاح نہیں کرتے ہیں بلکہ تعداد زیادہ مجرم بناتے ہیں۔ سوویٹ کے اصلاحی محنتی ادارے اس کے برعکس قیدیوں کو اس طرح تعلیم دیتے ہیں کہ وہ اجتماعی زندگی میں کام کرنے کے زیادہ قابل ہو جائیں۔"

جبری محنت کے قید خانے روسی ماہرینِ قانون کی نظر میں غلامی سے کسی طرح کم نہیں۔ اِصلاحی اداروں کے ناظم نے بہت ہی فخر کے ساتھ کہا۔

"قیدیوں کی محنت سے ناجائز انتفاع اور اُن کا ناحق خون نچوڑنا یہاں جرم ہے۔ قید خانوں کے اندر پیدائش دولت کی تنظیم ممکن ہے کہ تجارتی نقطۂ نظر سے منفعت بخش ہو۔ لیکن اصلاح کے نقطۂ نظر سے یہ بالکل عبث ہے اور ایسے کاموں کے لئے روسی قید خانے کبھی تیار نہیں ہو سکتے۔ یہاں نظربندوں سے بھی کام تو لیا جائے گا۔ مگر یہ اس قسم کا کام نہ ہوگا جو کہ سماج کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہو۔ بلکہ اس کا اصل مقصد انسانوں کی اصلاح ہوگا۔ سرمایہ دار ممالک ایسے نظام کو اپنے قید خانوں میں کب رائج کر سکتے ہیں۔ یہاں قیدی انسان متصور کئے جاتے ہیں۔ نہ کہ غلام۔ انھیں اشتراکی نظام میں اپنے آپ پر حکومت کرنا بھی سیکھنا ہے۔ اس کے لئے انھیں اخبارات رسائل اور کتب بھی مہیا کئے جائیں گے۔ اور جمالی تربیت کے لئے بھی پوری ضروریات فراہم کی جائیں گی۔"

اشتمالی پارٹی ایک انقلابی تحریک کے باعث کی حیثیت سے برسرِ اقتدار آئی۔ مقصد کی عظمت اور منزلِ مقصود کی دُھن نے اس کے داعیوں کو بیش بہا قربانیاں دینے پر مجبور کر دیا۔ تقریباً نصف ..... ۹ انقلابی جو اس تحریک کے روحانی پیشوا تھے، اُن پر ہر قسم کے مظالم توڑے گئے جیل کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے گئے انھیں ہی جابر ادوار سے محروم کر کے ملک بدر کر دیا گیا چونکہ اشتراکی جیل کے مظالم کی حدود سے بھی طرح آشنا تھے۔ اس لئے اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ سب سے پہلے ان کو ختم کرنے کے در پے ہوئے۔ ان کا خیال تھا چونکہ پرانے قانون میں اصلاح کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں

اس لئے اسکو مٹا دینا ہی ضروری ہے۔ مگر افسوس جب اشتراکی
حقیقت کا لباس مجاز میں جلوہ گر ہوئی تو وہ بہت ہی مختلف تھی چونکہ
اشتراکی اقلیت میں تھے انھیں حکومت کے قیام اور بقا کے لئے
اکثریت کو شکست دینا مطلوب تھا۔ بس اسی جد و جہد میں بڑے
ہی بہیمانہ ظلم کے قوانین وضع کئے گئے۔ مخالفین پر دل کھول کر
مظالم کئے گئے اور مقصد کے حصول کے لئے لاتعداد انسانی جانوں کو
ختم کرنے میں پوری بے باکی سے کام لیا گیا۔

دوران انقلاب میں جبکہ تشدد بالکل عام تھا اور ہزاروں
سیاسی مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا حق لینن نے
۱۹۲۰ء میں منسوخ کر دیا۔ بعد میں اسی سزا کو پھر جاری کر دیا گیا اور
کچھ عرصے کے لئے پھر معطل کر دیا گیا۔ اور اب پھر ہمیشہ کے لئے سے
بحال کر دیا گیا ہے۔ ... سیاسی مجرمین کو قید کیا جاتا تھا اور پھر
انھیں رہائی نصیب ہوتی۔ لیکن [illegible] انسانیت اور بربریت کے
درمیان جو مسلسل جنگ جاری تھی، اس میں موخر الذکر کو فتح نصیب
ہوئی۔

ایک ہی خفیہ پولیس کا وجود بھی بالکل عارضی تصور کیا جاتا۔ وہ
سزائے موت ایک ہنگامی ضرورت کے تحت اگر یہ خیال کی جاتی
تاکہ انقلاب کے راستے سے ان لوگوں کو ہٹایا جا سکے جو مسلح
ہو کر میدان عمل میں آئے ہیں۔ یہ ساری مزاحمتیں ۱۹۲۰ء تک
ختم ہوگئیں مگر خفیہ پولیس کو نہ توڑا گیا۔ بلکہ اس کی توسیع کی گئی
اور اس کے ہاتھ میں موت تک کی سزائیں دینے کے اختیارات
دے دیئے گئے۔ یہ محکمہ عدالتوں پر چھا گیا۔

فلسفہ طرازی کے لئے اتنے بلند بانگ خوش آئند دعوے
مگر عمل دنیا میں بر سر اقتدار آنے کے بعد روسی کمیونزم کے نشوونما
کی نہایت ہی افسوسناک داستان ہے۔ سیاسیات کی شاید ہی کوئی
داستان ایسی ہو جس میں اس قدر ترقی معکوس کی گئی ہو جیسی کمیونزم
کی داستان میں کی گئی ہے۔ اس کا آغاز انسانی ہمدردی کے متعلق
نہایت ہی بلند ترین عزائم سے کیا گیا۔ مگر انتہا دل ہلا دینے والے
مظالم پر ہوئی۔ قید خانے، جرائم، سزائیں ۱۹۲۰ء میں یہ سب کی

سب معرض وجود میں آگئیں۔ ۱۹۲۴ء میں روسی حکومت نے اعلان کیا
"قید خانہ آخر قید خانہ ہے۔ اس میں اتنی ہچکچاہٹ
کیوں؟ سزا سزا ہی ہے اس کے متعلق دنیا سے اس قدر ڈرنے
کی آخر کیا وجہ ہے؟"

مشقتی کیمپوں کا وجود روسی زمین میں بھی جی پی یو کی عجیب
و غریب اختراع ہے۔ اس سے پہلے مجرمین کے لئے قید خانے اور
مشقتی کیمپ دو علیحدہ علیحدہ ادارے تھے۔ قید خانوں کی محنت
اصلاح کے لئے رائج تھی اور مشقتی کیمپ صرف سیاسی مخالفین
کی سرکوبی کرنے کے لئے مخصوص تھے۔

۱۹۱۸ء میں ایک قانون کے ذریعے دونوں کو یکجا کرنے کی
سب سے پہلی بار کوشش کی گئی۔ مشقتی کیمپ عملی خانہ جنگی کے
وقت معرض وجود میں آئے۔ شروع شروع میں یہاں صرف ان لوگوں
کو جمع کیا گیا جنہوں نے حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی۔ ان
میں حالات نہایت ہی ناگفتہ بہ تھے اور قیدیوں کے ساتھ بڑا ہی ظالمانہ
برتاؤ کیا جاتا۔ لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے قید کر لیا جاتا۔ موت کی سزا
عام تھی۔ لیکن ان سب سختیوں کے باوجود ان قیدیوں کا باہر کی دنیا سے
کسی حد تک رابطہ قائم تھا اور انھیں وقتاً فوقتاً باہر سے مدد بھی ملتی
رہتی۔ ان میں سیاسی سرگرمیاں بھی کسی حد تک جاری رہتیں۔

لینن کے عہد حکومت میں جب وہ بغاوت کو فرو کرنے
میں انتہائی مصروف تھا اس وقت بھی قیدیوں پر اتنی سختی نہ کی جاتی
تھی کہ آج کی جاتی ہے۔

حالات کا دھارا اسی طرز پر بہتا رہا حتیٰ کہ ۱۹۲۰ء کے وسط
میں حالات نے یہ ثابت کیا کہ انقلاب کے متعلق یہ خواب کہ اس کے
برپا ہونے کے بعد جرائم مٹ جائیں گے یہ محض خواب ہی رہے گا
اور روسی سرزمین میں شاید یہ کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ روس
کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنے سینوں کے تعمیر کردہ فلک بوس محل کو اس
بری طرح مسمار ہوتے ہوئے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ملک میں خانہ جنگی
کی آگ سرد پڑ چکی تھی۔ نئی معاشی پالیسی New Economic Policy
یعنی "N.E.P." کا آغاز ہو چکا تھا۔ صنعت اور زراعت کی پیداوار

میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مگر قتل و غارت، چوری، خیانت اور رشوت خوری کی وارداتوں میں کوئی کمی واقع ہوتی نظر نہ آتی۔ بلکہ ان میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں دس ہزار ۱۰۰۰۰ کی آبادی میں ۱۶۲ مقدمات آئے یعنی کل آبادی میں ایسے مقدمات کی تعداد ۲۳۶۵۰۰۰ تھی۔ ۱۹۲۸ء میں ایسے لوگ جن کا جرم ثابت ہو چکا تھا ان کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ علاوہ ازیں ۴۰ فیصد کی تعداد اُن مجرموں کی تھی جن کے خلاف انضباطی کارروائی کی گئی۔ جرائم کی تعداد میں اس قدر اضافہ روس کے صاحب اقتدار حلقہ کے لئے خرابی تشویشناک تھا کیونکہ کسی قوم کے اخلاق کو ماپنے کا سب سے بہترین اور صحیح پیمانہ جرائم کے اعداد و شمار ہوتے ہیں۔ اشتراکی انقلاب کے وقت روس میں تقریباً ۸۰۰ قید خانے تھے۔ ان میں ۲،۷۷،۲۰۱ انسان سما سکتے تھے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۶ء تک یہاں ۸۰ سے ۹۰ فیصدی تک قیدی آباد رہے۔ ۱۹۱۷ء کے نصف آخر میں تعداد صفر تک پہنچ گئی۔ جولائی ۱۹۱۷ء میں یہاں کل ۲۲۰۹۵ قیدی موجود تھے۔ ایک دم اس تعداد کے صفر تک پہنچ جانے کی وجہ لوگوں کی اخلاقی حالت کا سدھر جانا نہیں تھا۔ بلکہ قید خانوں کے پرانے نظام کا بالکل درہم برہم ہو جانا تھا۔ انقلاب کے وقت بہت سے ناظمین اور عاملے خوف و ہراس کی وجہ سے بھاگ گئے اور نئی فوج اور پولس ابھی حالات پر قابو پا لینے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اس تغیر کے بعد قلیل عرصہ بعد قیدیوں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔

جنوری ۱۹۲۴ء	۸۶,۸۰۰	قیدی
جنوری ۱۹۲۵ء	۱۴۸,۰۰۰	"
جنوری ۱۹۲۶ء	۱۵۵,۰۰۰	"
جنوری ۱۹۲۸ء	۱۹۸,۰۰۰	"

اس کے علاوہ ان قیدیوں کا شمار نہیں ہو سکا جو مشقتی کیمپوں میں گرفتار تھے۔

۱۹۲۸ء میں جب روس نے اپنی دسویں برسی منائی تو اس وقت چشم فلک نے دیکھا کہ قیدیوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ ملک کی آبادی پندرہ فیصدی کم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ان اصلاحی اداروں کے ناظم اعلیٰ نے خود ایک بیان میں کہا کہ:

"۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک قیدیوں کی تعداد میں پندرہ سے بیس فیصدی تک ہر سال اضافہ ہوا ہے اور ان پانچ سالوں میں یہ تعداد دگنی ہو گئی ہے"

اسی طرح عدلیہ کے ایک بہت بڑے افسر نے کہا۔

"جب ایک شخص قید خانے کو چھوڑتا ہے تو تین اور آ جاتے ہیں۔"

انقلاب سے پہلے جس جس قسم کے مجرم تھے بالکل اُسی طرح کے انقلاب کے بعد عدالتوں کے کٹہرے میں لائے گئے۔ رشوت ستانی اور سرکاری مال کے خورد برد کی وارداتیں عام تھیں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک ان کی تعداد ۱۰۰ سے ۲۹۰ تک پہنچ گئی۔

مجرموں کی تعداد میں اضافہ قید خانوں کی توسیع کا متقاضی تھا۔ مگر ملکی خانہ جنگی میں جو جیلیں پہلے موجود تھیں۔ ان میں سے بھی اکثر تباہ ہو چکی ہیں۔ لہٰذا جیل خانے قیدیوں سے بھرے پڑے تھے۔ ان کی اس بھیڑ کو وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے کم کیا جاتا۔ مثلاً بعض پیرول پر رہا کر دیئے جاتے اور بعض کو قید خانوں کے باہر جبری محنت کی رکشا میں جوت لیا جاتا۔ ان سب طریقوں کے باوجود قید خانوں کی بھیڑ کم نہ ہو سکی عدالت مجرموں کو سزا سنا دیتی۔ مگر اس سزا کو نافذ نہ کیا جا سکتا۔ کیوں کہ قید خانوں میں ان کے لئے جگہ نہ تھی۔ اس سے سارا نظام عدلیہ برباد ہو رہا تھا۔ اس مشکل کا کوئی حل حکومت کے پاس موجود نہ تھا۔ کیونکہ خزانے کے اندر اتنا روپیہ ہی نہیں تھا جس سے کہ نئے قید خانوں کی تعمیر کی جاتی۔ اس کے علاوہ قید خانوں میں توسیع سخت پسندی اور استبداد کی علامت تھی اور اسی کے خلاف روسی طویل مدت سے برسرپیکار تھے۔ انقلاب "قید خانے توڑ دو" کے ساتھ برپا ہوا۔ پھر کئی بار بیانگ دہل اعلانات کئے گئے۔ کہ قید خانے سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں اور روسی حکومت اس قسم کے جور و جفا کے مظاہر پر ہنس دیتی ہے۔ جیب کر انسانوں کو بند مجبوروں میں زندگی

کے دن کاٹ رہے ہیں۔ محنت کشوں کی حکومت ، ملکی دولت کو قید خانوں کے بنانے میں کس طرح برباد کر سکتی تھی ۱۹۲۰ء میں یہ مسئلہ پوری شدت کے ساتھ حکومت کے سامنے آیا اور حکومت کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ اپنی پالیسی پر از سرِ نو غور کر کے اس میں حسب ضرورت تبدیلیاں کرے۔

قید خانوں میں جبری محنت کا رواج روسی سرزمین میں غالباً سب سے زیادہ ناکام تھا۔ بڑی جد و جہد کے بعد صرف چند انسانوں کو ہی کام پر لگایا جا سکا۔ اس ناکامی کے کئی اسباب تھے جن میں دو سب سے اہم ہیں۔

(۱) ابھی تک ہزاروں انسان قید خانوں کے باہر بیکار پڑے رہتے تھے اور جیل خانوں کی محنت کو باہر کی محنت سے مسابقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

(ب) قید خانوں میں صنعتی کاموں کے لئے جگہ بالکل ناکافی تھی

(ج) قید خانوں میں ذتو اچھے اوزار مہیا ہو سکے اور دچھا خام مال۔

اس صورتِ حالات میں جبری محنت کا تجربہ کبھی کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد ملک میں نظریاتی تبدیلی واقع ہوئی اور اب یہ اصول طے پایا کہ قید خانوں کے اخراجات مجرموں کی محنت سے پورے کئے جائیں۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں تقریباً ۱۲ سو چھوٹے کارخانے معرضِ وجود میں آئے۔ اسی طرح جن لوگوں کے جرائم سنگین نہ تھے انہیں زراعت پر لگایا گیا۔ ان قیدیوں کو چلنے پھرنے کی بھی آزادی تھی۔ بعض اوقات وہ غلہ بھرنے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں بھی چلے جاتے۔

وہ دیہات جو ان آبادیوں کے قریب تھے ہر وقت خوف و ہراس میں مبتلا رہتے۔ کیونکہ مجرموں کے گروہ وہاں چوری کرتے اور ڈاکے ڈالتے۔

فصل ششم

انقلابِ عظیم

جس دن سے سوویٹ حکومت نے پانچ سالہ منصوبہ بندی کا آغاز کیا اسی دن سے ملک کے اندر ایک ایسا انقلابِ عظیم برپا ہو گیا جس کی نظیر صرف روس میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جس میں اس کے اثرات ظاہر نہ ہوئے ہوں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ اصلاحی مشقتی کیمپوں کا نظام نہ صرف قائم ہوا بلکہ اس نے خاصی ترقی کی۔

سٹالن نے اس عہد کو ایک بہت بڑے تغیر سے تعبیر کیا ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ روس کی اقتصادی زندگی کے سب شعبوں کو جلد از جلد حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اور حکومت از خود بغیر کسی بیرونی مدد کے ان کو چلائے۔ اس آدرش کی رسائی صرف اس صورت میں ممکن تھی کہ روسی مزدوروں اور کسانوں کا معیارِ زندگی جس قدر ہو سکے پست رکھا جائے۔ تاکہ قومی آمدنی کی فاضل قدر کو اجتماعی کاموں میں خرچ کیا جا سکے اس کے لئے پولیس کی ساری قوتوں کو بروئے کار لایا گیا۔ اور جبر کا آزادانہ اور کھلم کھلا استعمال کیا جانے لگا۔

ان پڑھ کسانوں کی زمینوں کو اجتماعی فارموں میں تبدیل کرنے کا سب سے زیادہ مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ مگر حکومت بھی ہر قسم کے استبداد سے کام لے کر اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کر چکی تھی جو لوگ بھی حکومت کی راہ میں مزاحم ہوتے ان کو ملک بدر کر دیا گیا۔

اُن میں نوجوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں سبھی شامل تھے۔

پانچ سالہ منصوبہ بندی کے ابتدائی دو سالوں میں ملک کی ساری انسانی قوت کو استعمال میں لایا گیا اور اس سے بیروزگاری خود بخود مٹ گئی۔ بلکہ مزدوروں کی کمی محسوس ہونے لگی۔

اگر ملک کے حالات کچھ اور ہوتے تو مزدوروں کے لئے اپنے معیار کو بڑھانے کے لئے جد وجہد کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ تھا۔ مگر یہاں اس قسم کی کوئی سعی بھی بغاوت اور حکومت کے صنعتی پروگرام کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ اگر مزدوری بڑھا دی جائے۔ تو سرمایہ کاری کے لئے جو روپیہ درکار تھا اس میں کمی آجانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے ٹریڈ یونین اور حکومت دونوں نے مل کر ہڑتالوں کو روکنے کی کوشش کی۔ محنت کشوں کو ان کی محنت کے مقابلہ میں کم معاوضہ دینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ انھیں مجبوراً اپنی بیویوں اور بچوں کو کام پر لانا پڑا کیونکہ جتنی گھر کے بڑے کمانے کی آمدنی کم ہوگی اتنا ہی زیادہ گھر کے دوسرے افراد کو کام کرنا پڑے گا۔

۱۹۲۸ء کے بعد عورتوں اور بچوں کی خاصی تعداد نے مزدوری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ روسی انقلاب کے پہلے بارہ سال ایک فرد کی معاشی جد وجہد میں کافی حد تک آزادی تھی۔ ایک مزدور باوجود اس بات کے کہ وہ حکومت کا ملازم تھا ایک ملازمت کو قبول یا رد کرنے یا بدلنے کا اختیار رکھتا تھا۔ اس کی نقل وحرکت پر بھی کوئی پابندی عاید نہ تھی اور وہ بغیر کسی دقت کے دوسری جگہ ملازمت اختیار کر سکتا تھا۔ مزدور اکثر اوقات اپنے صنعتی کام کو چھوڑ کر گاؤں میں چلے جاتے اور زراعت اختیار کر لیتے۔ مزدوری کے ضابطہ کے مطابق کسی ملک کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ کسی مزدور کو کسی ادارہ کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کی رضا کے بغیر ہی منتقل کر دے۔ اسی طرح دماغی کام کرنے والے بھی آزاد تھے۔ اور جو کام چاہتے اختیار کر لیتے۔ کسانوں کے اپنی زمینوں پر حقوق مالکانہ قائم تھے وہ جو فصلیں چاہتے بوتے۔ جس طرح چاہتے انھیں اپنی اولاد میں تقسیم کرتے اور جس منڈی میں منافع دیکھتے اپنے اناج کو بیچتے۔ ان پر اگر کوئی پابندی عائد تھی تو وہ زمینوں کو فروخت کرنے کی تھی۔

وہ محکمہ جس میں ملازمین پر کسی حد تک پابندی تھی وہ صرف فوج تھا۔ مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ فوجی نظم کو زندگی کے دوسرے شعبوں میں آہستہ آہستہ نافذ کیا جانے لگا۔ آزاد مزدوروں پر فوجی نظام کی سی سختیاں ہونے لگیں —— حکومت کے رویہ میں یہ زبردست تبدیلی نتیجہ ہے اس زرعی اور صنعتی انقلاب کا جس کو وہ لانا چاہتی تھی۔ چنانچہ مختلف قوانین کے ذریعہ مزدوروں پر پابندی عائد کی جانے لگی۔ پراپیگنڈا کے ذریعہ محنت کشوں کو اس امر پر اُبھارا گیا کہ وہ حکومت کے ساتھ لمبے معاہدے کریں۔ مگر یہ طریقہ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔

حکومت نے ۱۹۳۲ء میں جبری پاسپورٹ جاری کئے جس کے بغیر روس میں کوئی شخص نہیں پھر سکتا۔ اسی سال ایک قانون پاس کیا گیا جس میں بتایا گیا کہ وہ محنت کش جو کام پر چلنے سے متواتر انکار کریں گے اُن کو گھروں سے محروم کیا جائے گا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ حکومت کی پوری مشینری اس کو نافذ کرنے کے لئے حرکت میں آئی اور پریس کے ذریعہ سے تمام اداروں کو متنبہ کر دیا گیا کہ وہ بھاگے ہوئے مزدوروں کو ملازم نہ رکھیں۔

صنعتوں کے قیام کے لئے مشینری درکار تھی جس کو حکومت باہر کے ممالک سے درآمد کرتی۔ اس کے عوض وہ انھیں لکڑیاں برآمد کرتی۔ اس لئے حکومت نے اپنی پوری توجہ لکڑیاں کاٹنے میں صرف کر دی۔ مگر یہ پیشہ معاوضہ کم ہونے کی وجہ سے عوام کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ یہاں بھی حکومت نے جبر سے کام لیا۔

۱۹۳۰ء میں ایک قانون بنایا گیا جس کی رو سے مقامی حکام ہر اُس شخص کی جائداد بیچ سکتے یا اس پر جرمانہ کر سکتے تھے جو جنگل میں کام کرنے سے انکار کرتا۔ اس طریقہ سے حکومت کو چار قسم کے محنت کش مہیا ہو گئے۔

(۱) آزاد مزدور یا ملازمین

(ب) کسان جن کی جبری بھرتی کی گئی مگر جنہیں موسم کے خاتمہ پر واپس آنے کی امید تھی۔

(ج) وہ لوگ جن کو شمالی حلقوں میں ملک بدر کیا گیا مگر

جو قید خانوں سے باہر تھے۔

(۵) اصلاحی محنتی کیمپوں کے قیدی

ان میں سے صرف پہلا گروہ آزاد تھا۔ باقی سب اگرچہ مرتبہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مگر عملی طور پر وہ سب غلامی کی ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے Izvestia نے ۲۵ فروری ۱۹۳۰ء میں لکھا

"ان مزدوروں کے گھر قیدیوں کی کوٹھریوں سے بھی زیادہ خستہ حال تھے۔ آزاد مزدوروں کی کٹیا بھی اتنی پست تھیں کہ ایک انسان سیدھا ان میں چل نہیں سکتا تھا۔ ان کو گھاس پھوس پر لیٹنا پڑتا تھا"

ایک مقامی اخبار نے کہا

"یہ بارکیں جانوروں کی کمین گاہوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں"

ایک انجینئر نے خولمو گوری پراجیکٹ (Kholmogory project) کے متعلق کہا۔

"یہ پروجیکٹ ہر اس چیز سے بری ہے جس کا انسان تصور کر سکتے ہیں۔ یہ جاپانی کام کی کٹھیا سے بھی بدتر ہے۔

وہ کھیت جہاں حبشی کام کرتے ہیں وہاں گرمی پڑتی ہے مگر یہاں کو کبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں انسانوں کو جانور بنایا جاتا ہوگا۔ مگر جسم پر ایسی سختی نہ کی جاتی ہوگی"!

Archangel کے علاقہ میں نوسو پچاس انسان تین دنوں میں ہلاک ہوگئے۔ ۵۰۰ مزدوروں کے لئے ایک میڈیکل اسسٹنٹ تھا اور ہر ۵۰۰۰ کام کرنے والوں کے لئے ایک طبیب ہوتا۔ چند ماہرین کے کسی کو کوئی تنخواہ نہ ملتی۔

ایک شخص کا بیان ہے کہ:-

"میرے تاثرات یہ ہیں کہ میری اور مجھ جیسے دوسرے انسانوں کی گرفتاری کی اصل وجہ یہی ہے کہ حکومت کو پانچ سالہ منصوبہ بندی کو کامیاب بنانے کے لئے زیادہ محنت درکار ہے"۔

فصل نہم

جبری محنت اور پنج سالہ منصوبہ بندی

جب پہلی ۵ سالہ منصوبہ بندی ۱۹۲۸ء میں قائم ہی تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ قیدخانوں کی محنت کو صنعتی کاموں میں لایا جائے۔ لیکن اس وقت یہ اندازہ نہیں لگایا گیا کہ یہ محنت منصوبہ بندی میں اتنا اہم حصہ ادا کرے گی۔

اس ضمن میں پہلا قانون ۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء میں وضع کیا گیا۔ جس کا مقصد اخراجات کو کم دیکھ کر بہت سی اقتصادی تشکیل کی تکمیل کرنا تھا۔ اسی سال جولائی میں عدلیہ نے تمام تنومند قیدیوں کے لئے محنت کو لازم قرار دیا جنوری ۱۹۲۹ء میں حکومت نے لوگوں پر اس امر کو واضح کر دیا کہ جو فرد یا ادارہ اس قانون کی پابندی نہیں کرے گا وہ مستوجب سزا ہوگا۔

ایک قانون جو ۷ اپریل ۱۹۳۰ء میں پاس کیا گیا اس کی رو سے ہر قسم کے گروہوں کو ان کیمپوں میں بھیجا گیا۔

(۱) وہ لوگ جن کو عدالت نے آزادی سے کم از کم تین سال کے لئے محروم کیا ہو۔

(ب) وہ لوگ جن کو خفیہ پولیس کے خاص فیصلہ کے مطابق سزا دی ہو۔

اس کے ساتھ ہی حکومت نے عدالتی کارروائی اور سزا کے اعداد و شمار شائع کرنے بند کر دیئے۔ ۱۹۲۹ء کے بعد صرف خفیہ بتائی جاتی۔ وہ لوگ جن کو جبری کیمپوں میں بھیجا جاتا اُن کی تعداد ۱۹۲۶ء میں کل سزا یافتہ قیدیوں کی تعداد کا ۱۲٫۳ فیصدی تھی۔ اس کے بعد اس میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ۲۱٫۲ - ۱۹۲۹ء میں ۴۸٫۱ - ۱۹۳۱ء میں ۵۶٪ ۱۹۳۲ء ۵۸٪ تک جا پہنچی۔

جس قدر مواد اس وقت تک مہیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جبری محنت سے کس قدر کام لیا گیا ہے اگر قید خانوں کی محنت کو ۱۹۳۰ء کے مطابق ۱۰۰ شمار کیا جائے تو اس نے مندرجہ ذیل رفتار سے ترقی کی۔

۱۹۳۱ء	۲۲۰
۱۹۳۲ء	۳۳۵
۱۹۳۳ء	۵۵۲

سنہ ۱۹۳۲ء میں صرف ایک بار روس کے محکمۂ عدالت نے ۵ سالہ منصوبہ بندی میں جبری محنت کے حصہ کو شائع کیا۔ اس کا حساب دس لاکھ ۱۰،۰۰،۰۰۰ روبل میں لگایا گیا ہے۔

	صنعت	زراعت	دوسری پراجیکٹ	کل
۱۹۳۰ء میں	۵۰	۳	۹	۶۲
۱۹۳۱ء میں	۱۰۹	۱۰	۳۳	۱۵۲
۱۹۳۲ء میں	۱۹۳	۱۹	۹۳	۳۰۵

اس کا موازنہ کرنے کے لئے یہ سمجھئے کہ ۱۹۳۰ء میں موٹر کی صنعت کی کل قدر نو کروڑ بیس لاکھ روبل تھی۔ یوکرائن میں بھی یہ صنعت برق رفتاری سے بڑھی۔ یعنی اگر ۱۹۲۹ء میں اس صنعت کو ۱۰۰ فرض کیا جائے تو:

۱۹۳۰ء میں ۱۶۷ اور
۱۹۳۱ء میں ۲۹۸ تھی۔

فصل دہم

رائے عامہ

پیشتر کیمپ چونکہ روس کے انتہائی شمال میں واقع تھے جہاں عام لوگوں کا گزر کبھی نہ ہوتا اس لئے حکومت کو اس امر کا یقین تھا کہ ظلم کے یہ افسانے ہمیشہ راز میں رہیں اور یہاں کے خستہ حال لوگوں کی پیشانیوں سے نقاب کبھی نہیں سرکے گا۔ علاوہ ازیں حکومت دوسرے مسائل میں اس قدر منہمک تھی کہ اس نے اس استبداد کو صیغۂ راز میں رکھنے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ کیا۔ صرف غیر ملکی اخباری نمائندوں کی آمد پر پابندی عائد کر دینے کو کافی سمجھا۔ اُسے یہ احساس تک نہ ہوا کہ اس جہنم کی سختیوں کی تاب نہ لا کر لوگ یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کریں گے اور دوسرے ممالک میں پہنچ کر لوگوں کو اس سے واقفیت بہم پہنچائیں گے۔

پناہ گزینوں کا پہلا قافلہ ۱۹۳۰ء میں انگلستان اور سکنڈے نیویا پہنچا ان کے پہنچتے ہی پوری دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ لیکن لوگوں کو ظلم کی اس قدر ہیبت ناک داستانوں پر یقین نہیں آتا تھا

اُن کے ذہن اس بات کو قبول کرنے سے قاصر تھے کہ کوئی قوم اپنے ہموطنوں کو اس طرح پامال کر سکتی ہے بلکہ ان پناہ گزینوں کا سیلاب بہہ بہہ کر باہر آتا رہا۔ اور ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی جن کے بیان کردہ واقعات میں اس قدر صداقت تھی کہ اُن کو آسانی سے جھٹلایا بھی نہ جا سکتا تھا اس کے بعد یہ قصے عوام کی زبان پر آنے لگے اور اخبارات میں ان کی نشر و اشاعت شروع ہوئی۔

انگلستان میں ایک منظم مجلس انسدادِ غلامی ([illegible] Society) کے نام سے قائم کی گئی جس کا سب سے اہم مقصد ان واقعات کو جمع کر کے ان کی چھان بین کرنا تھا۔ اور اس کمیٹی نے ان واقعات پر بڑی اچھی طرح غور و فکر کیا۔ اور پھر اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس وقت روس میں مزدوروں کے یہ طبقات کام کر رہے ہیں۔ اس مجلس کے ناظر کمانڈر [illegible] نے ان کیمپوں کی زندگی کے متعلق پناہ گزینوں سے حلفیہ بیانات لئے اور اس کے بعد انہیں یقین آیا کہ روس کی تعمیر میں کتنی جانیں تلف ہو رہی ہیں۔ صرف [illegible] کے جزیرہ میں ایک سال میں ایک بیس ہزار اموات ہوئیں۔

جو داستانیں ان قیدی کیمپوں میں تیار ہوتی ہیں اُن پر لاگت نہایت قلیل آتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسی مال ارزاں ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کی منڈیوں میں مقابلتہً زیادہ بکنے لگا۔ یہ صورتِ حال دوسرے ممالک کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ دوسرے ممالک نے روسی مال کے بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر روس کے حامیوں نے انہیں ان عزائم میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس وقت جبکہ دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں روس کے خلاف غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ رہی تھی مولوتوف Molotov برسرِ اقتدار آیا۔ اس کے سامنے اہم ترین کام روس کے خلاف اس بڑھتے ہوئے پروپیگنڈے کو ختم کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے کیمپوں کی مدح و ستائش میں لمبے لمبے بیانات دینے شروع کئے اور ان کا نقشہ ایسے دلکش انداز میں کھینچا کہ لوگ مسحور ہو گئے۔ مگر وہ ان کے وجود کی نفی کرنے کی جسارت نہ ہو سکی بلکہ اس نے انہیں قومی ترقی کے لئے مفید اور ضروری سمجھا۔ آخر میں اس نے غیر ملکی سرکاری نمائندوں کو روس میں آنے اور اپنی آنکھوں سے سب حالات کا مشاہدہ کرنے کی بھی دعوت دی۔ پروگرام یہ تھا کہ آنے والوں کو حکومت کی سرکردگی میں اس جنتِ ارضی کی سیر کرائی جائے۔ بڑے بڑے لوگوں سے ان کی ملاقات کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ روس کے متعلق اچھے اثرات لے کر واپس جائیں۔ مگر ڈر تھا کہ کہیں ان نمائندوں میں سے کوئی سرِ پھرا شمال کا رُخ نہ کرے۔ چنانچہ اس خطرے سے بچنے کے لئے بھی معقول تدابیر اختیار کی گئیں۔ ان کیمپوں کو یک لخت کالعدم کیا گیا۔

مولوٹوف کی تقریر کے چند ہفتے پیشتر ان کیمپوں کو اٹھائے جانے کا کام نہایت ہی سُرعت سے کیا جانے لگا اور یہ افواہیں گشت کرنے لگیں۔

"کہ امریکی کمیشن، میکسیم گورکی، جارج برنارڈ شا اور اس کے انگریز ساتھی ان کیمپوں کو دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں"۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ان کیمپوں میں پھیل گئی۔ لکڑیاں چیرنے کے سارے کیمپ اُٹھائے گئے۔ بارکوں کو گرا دیا گیا۔ اور قیدیوں کو دوسرے علاقوں میں منتقل کیا جانے لگا۔ کیمپوں کے ناظموں نے یہ سارا کام اتنی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا کہ ان اڈوں کا کوئی نشان تک باقی نہ رہا۔

یہ کام اتنی برق رفتاری سے ہوا کہ ملک میں جنگ کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں اس میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ قیدیوں کو واپس لاتے ہوئے جب کبھی راستے میں گاڑی آ جاتی تو انہیں چھپا دیا جاتا مبادا کوئی غیر ملکی آنکھ انہیں دیکھ نہ لے اور اس سے راز طشت از بام ہو جائے۔

مولوٹوف کی غیر ملکی نمائندوں کی اس پیش کش کے نتائج کی تصویر فن لینڈ کے ایک قیدی نے جو ایک کیمپ میں کلرک تھا۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچی ہے:-

"ایک دن کیمپ کے افسروں نے ایک خاص میٹنگ

بلائی اور اس میں بھی ایک قرارداد پاس کرنے کا حکم دیا جس میں ہم نے کہا کہ ہم سب مطمئن ہیں۔ یہاں کی خوراک ہمیں پسند ہے افسروں کا رویہ نہایت مشفقانہ ہے اور ہم دل و جان سے یہ چاہتے ہیں کہ روس کی ۵ سالہ منصوبہ بندی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔ اس قرارداد کے ایک ہفتہ بعد ایک خفیہ تار آیا جس میں کیمپوں کو تین دنوں میں ختم کرنے کا حکم لکھا تھا۔ یہ تار ملتے ہی ہر طرف ہراس پھیل گیا۔ تمام چوکیوں پر پیغامات بھیج دیئے گئے کہ سارے کام کو ۲۴ گھنٹوں میں نمٹا دیا جائے۔ قیدیوں سے اس سلسلہ میں وحشیوں کی طرح کام لیا گیا۔ تار اکھاڑ دیئے، مینار توڑ دیئے گئے سراسیمگی یہاں تک پھیل گئی کہ ایک افسر نے بیماروں کے کیمپ میں گھس کر گولی چلانا شروع کر دی۔ جس سے بیمار جان بچانے کے لئے بھاگ نکلے۔ ان لوگوں کو اپنے مال کے ساتھ حکومت کے اسباب کو بھی اٹھانا پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی کمزور تو راستے ہی میں چل بسے۔

فصل یازدہم

شاعری اور محنت

روسی ادبا دنیا کے مشقتی کیمپوں کو عہد استبداد کی یادگاریں سمجھتے تھے اور ان کو نسلِ انسانی کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ خیال کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ کلنک کے ٹیکے سرمایہ دارانہ نظام کے لازمہ ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کیمپ اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ لوگوں کے اخلاق کو بگاڑا جائے۔ اور انہیں انسانیت کے درجہ سے گرا کر حیوانوں میں شامل کر دیا جائے دنیا میں اس ظلم و ستم کو ختم کرنے کے لئے سویٹ انقلاب لایا گیا۔ جس سے لوگ یہ امیدیں لگائے ہوئے تھے کہ اس کے آتے ہی سب برائیاں خود بخود مٹ جائیں گی ہر قسم کی دست درازیاں پردۂ غیب میں از خود منہ چھپا لیں گی۔ مگر افسوس کہ انقلاب کے بعد بھی عوام کی حالت ویسی کی ویسی رہی بلکہ بعض پہلوؤں سے تو بدتر ہو گئی۔

خاص اور ادیب عالم خیال میں روس کے متعلق جو چاہیں فسانے گھڑتے رہیں ان کے تخیل کو پابند نہیں کیا جا سکتا مگر حقیقت ان کی تصور کشی سے بہت مختلف ہے۔ وہ جبری سے جبری محنت کو لوگوں کو با اخلاق بنانے کا ذریعہ سمجھتے رہیں۔ مگر اشتراکی تصورِ حیات کے ساتھ یہ مشن کبھی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

جہاں حکومت کے وجود کا مقصد ہی مادی اشیا کی زیادہ سے زیادہ پیدائش ہو اور انسان اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ وہاں، اخلاق، ہمدردی، شفقت، ایثار ایسے الفاظ کچھ بے معنی سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس ملک میں حق وہ ہے جس سے ملکی پیداوار بڑھ جائے اور باطل وہ جس سے اس میں کمی آ جائے یہ معاملہ صرف قیاس کی حد تک نہیں ہے روس کے آہنی پردے سے چھن چھن کر جو خبریں وقتاً فوقتاً باہر آ جاتی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عمال حکومت اور مختلف معاشی اداروں کے ارباب انتظام نے بدکرداری کا ایک اچھا خاصا سخت مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ درحقیقت وہاں اس مسئلے کا پیدا ہونا قابل تعجب نہیں۔ بلکہ نہ ہونا تعجب کے قابل ہے۔

جبری محنت سے لوگوں کے اخلاق کو کس حد تک بہتر بنایا

گیا۔ اس کا اندازہ عدالت کے اس فیصلہ سے کیا جا سکتا ہے
"چوتھی منزل میں چوری کی اجازت ہے کیونکہ
اس منزل میں سیاسی قیدی آباد ہیں"
اس نئے نظام کو نافذ کرنے کے لئے روس کو ایک ایسے
انسان کی ضرورت تھی جو نہ صرف پرانے مذہبی اور اخلاقی اصولوں
کا جو اس کے نئے نئے نظریہ کے خلاف ہیں انکار کرتا۔ بلکہ ملکیتی
کے سارے ساتھ ان کی بیخ کنی پر اپنی ساری قوت صرف کرنے
کے لئے تیار ہوتا۔

یہ نیا انسان اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر سکتا ہو کے۔
جو گیت گاتا ہے وہ سنئے:-

جہنم میں جائے قرآن۔ تالمود اور توریت
جہنم میں جائے مذہب
کہ ہم اپنے انجنوں اور موٹروں کی باگیں موڑیں
اور آگے بڑھیں

اس گیت سے آپ ایک اشتراکی کے محسوسات کا
اندازہ لگا سکتے ہیں۔

فصل دوازدہم

ردِ عمل

۱۹۳۴ء تک اجتماعی زراعت کا کام کسی حد تک مکمل ہو چکا تھا یہاں حکومت کو اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ مخالفت کو دوبارہ سر اٹھانے کی ہمت نہیں پڑے گی اس لئے ان سے گرفت کسی حد تک ڈھیلی کر دی گئی۔ ۱۰ جولائی ۱۹۳۴ء میں O.G.P.U کو توڑ دیا گیا اور قیدیوں کو اپنے مقدمات عدالت تک لے جانے کی اجازت دی جانے لگی اس کے ساتھ ساتھ ان بدنصیبوں کو نسبتاً بہتر خوراک میسر آنے لگی۔ مگر یہ صورت حالات زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ دنیا کے افق پر جنگ کے بادل نمودار ہونے کے ساتھ ہی ان کو پھر شکنجہ میں کس دیا گیا۔ جنگ کی تیاریوں میں زیادہ محنت درکار تھی۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ قیدی بنانے کی مہم پورے زور سے چلائی گئی اور ۱۹۳۷ء، ۳۸ء میں یہ مہم اپنے شباب میں داخل ہوئی اس کے ساتھ ہی جبری محنت کے گرد آہنی پردے ڈال دیئے گئے۔ غیر ملکیوں کا روس میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یہ تبدیلی جن حالات میں آئی

حالات کا ناگزیر نتیجہ تھی۔ سویٹ پریس ہٹلر کے مظالم کو دنیا پر آشکارا کرنے میں مصروف تھا اور اس طرح رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کیا جا رہا تھا۔ ان حالات میں خطرہ یہ تھا کہ کہیں اس ملک کے اپنے مظلومین کی چیخ و پکار بیرونی دنیا تک نہ پہنچے اور مخالف طاقتیں طعنہ دینے لگیں کہ دوسرے کے عیب بتلانے والو پہلے اپنے گھر کی تو فکر کرو۔ علاوہ ازیں ملک کے اندر بھی سماج کو منزہ (purge) کرنے کا حکم وسیع پیمانے پر جاری تھا اس سلسلے میں بڑے بڑے عہدے دار اور روسی نظام کے زبردست علمبردار تک زد پر تھے۔ ان کو قید خانوں میں ڈال کر پھر یہ دعویٰ کرنا کہ سب ٹھیک ہے۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔ اب ملک کا نعرہ یہ تھا۔ "جماعت کے دشمنوں کے لئے کوئی رحم نہیں" جماعت کے دشمنوں سے مراد صرف سرمایہ دار اشتراکی ہی نہیں بلکہ ان میں وہ اشتراکی بھی شامل ہیں جنہوں نے پارٹی کو دھوکا دیا ہے۔
سٹالن نے اعلان کیا کہ:-

روس میں اشتراکی نظام تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔
مگر ان دشمنوں کو بھی طرح علم ہونا چاہئے کہ اشتراکیت
کا مطلب یہ تو نہیں کہ حکومت جبر کرنا ترک کر دے
وہ لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ اشتراکیت کی ترقی سے،
آزادی میں بھی ترقی ہوگی وہ غلطی پر ہیں۔ نہ تو جبر
مٹ سکتا ہے نہ ریاست۔"

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مرکزی کمیٹی نے جرائم کے لئے قید کی میعاد کو دس سال سے بڑھا کر پچیس سال کر دیا ۷ اپریل ۱۹۳۸ء میں ۱۲ سال سے اوپر کے بچے جو قید اور موت کی سزاؤں سے مستثنیٰ سمجھے جاتے اُن پر یہ سزائیں نافذ کی جانے لگیں۔

جنگ کا آغاز ہوتے ہی کیمپوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا قیدیوں کی پوری فوج کو جنگی ضروریات کے مہیا کرنے پر لگا دیا گیا۔ ہوائی مستقروں اور دوسرے جنگی اڈوں کی تعمیر میں ان کی محنت کو بے دریغ صرف کیا جانے لگا۔ ۱۹۴۰ء میں ان قیدیوں میں زیادہ تعداد روسیوں کی تھی۔ لیکن بعد ازیں غیر روسی عنصر بڑھنے لگا۔ ان میں پولز، لیبیا ٹرنزر، جرمن اطالوی اور جاپانی بھی شامل تھے۔

روس کے اپنے باشندوں کو بھی بغیر کسی اطلاع کے قید کر لیا جاتا ان کی کل تعداد کا اندازہ دس لاکھ سے کہیں زیادہ ہے ان کو قید کرنے کے مختلف طریقوں کی داستان المناک ہے دنیا کا شاید ہی کوئی فریب ایسا ہو جس کو اس مقصد کے لئے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ صیادی کا کوئی دام ایسا نہیں جو اس سرزمین میں نہ بچھایا گیا ہو۔ اس کے لئے ایسے ایسے ہتھکنڈوں کو کام میں لایا گیا جن کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ اسیران کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا گیا کہ اس کی مثال انسانی تاریخ میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی۔

اطالوی حکومت نے جنگ کے اختتام پر روس کی جیلوں سے اپنے قیدیوں کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا۔
"ہمارے ساٹھ ہزار قیدیوں میں سے صرف ساڑھے
بارہ سو قیدی زندہ بچے ہیں"

یہ سب واقعات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ روسی افسران کا نامۂ اعمال دوسرے ملکوں کے افسران سے زیادہ سیاہ اور بے کسوں کے خون کے چھینٹوں سے ان کا دامن زیادہ داغدار ہے۔ دوسرے ممالک میں مظلوموں کی شنوائی خواہ دربار سرکار میں ہو یا نہ ہو مگر ان کی زاری سے فضائے ملک تو گونج اٹھتی ہے۔ مگر روسی سرزمین میں ظلم کی بجلی اور ستم کے آرے اس وقت چلائے جاتے ہیں جب کہ ان چیخوں کے دبانے کے انتظامات مکمل کر لئے جائیں۔

غیر ملکی قیدیوں پر مظالم کو تو یہ کہہ کر چھپایا جا سکتا ہے کہ دنیا کا ہر ملک دوسرے دشمن ممالک کے رہنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔ مگر روسیوں پر خود روسیوں کی جفا کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ذبح ہونے والے قیدیوں، بے آبرو ہونے والی عورتوں اور مرنے والے معصوم بچوں کی آہ و فغاں دنیا کے تمام دل رکھنے والے انسانوں کا تعاقب کر رہی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ تاریخ کا یہ کٹھن ترین وقت اس پیچ کو صدیوں میں بدل دے گا اور وہ دن دور نہیں جب پوری انسانیت ان مظلومین کی فلک شگاف آواز اپنے کانوں سے سنے گی اور خود محسوس کرے گی کہ یہ آواز سرمایہ دارانہ نظام کے پاؤں میں پسے ہوئے مظلوموں کی فریادوں سے کسی طرح مختلف نہیں ہے

اشتراکیت سرمایہ داری کی طرح ایک پردۂ فریب ہے۔ مگر اس کو ابھی تک چاک نہیں کیا گیا۔ اس کے لئے زمانہ ایک دوسرے کارل مارکس کا انتظار کر رہا ہے۔

ضمیمہ

روس میں جبری محنت کے متعلق موادِ مطالعہ

موضوع بالا پر ۱۹۴۵ء سے لے کر اب تک امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے پانچ کتابیں ایسی ہیں کہ ہر وہ شخص جو جبری محنت سے روسی نظام کو سمجھنا چاہتا ہے ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

۱۔ "سرخ دلدل" (Red Land) ۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں لندن میں شائع ہوئی یہ ایک عورت کی داستان ہے جسے ۱۹۳۳ء میں گرفتار کیا گیا۔ اس نے آٹھ سال سے زائد عرصہ مختلف قید خانوں میں گزارا یا کام ... ۱۹۴۴ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ اور ۱۹۴۵ء میں اس نے اس جنتِ ارضی کو ہمیشہ کے لئے الوداعی سلام کہا۔

۲۔ "میں روس کے بے زبان قیدیوں کی ترجمانی کرتا ہوں" (I speak for the silent prisoners of the Soviet) اس کتاب کا مصنف ایک روسی سائنسدان ہے۔ اس نے بہت سی ایجادات کیں ۱۹۲۵ء میں اسے مچھلیوں کے محکمہ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے تخریب کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور مشقتی کیمپوں میں بھیجا گیا یہ کتاب جبری محنت کے ابتدائی سالوں کا نہایت ہی اچھا تجزیہ پیش کرتی ہے۔

۳۔ "او جی پی یو کا قیدی" (Prisoner of O.P.G.U) —— اس کتاب کا مصنف جارج کچن (George Kitchin) فن لینڈ کا باشندہ ہے۔ یہ شخص روس میں "نئی معاشی پالیسی" کے آغاز کے وقت بہت سے امریکی کمپنیوں کے نمائندوں کی حیثیت سے گیا۔ روس کی خفیہ پولیس نے اس سے فن لینڈ کے متعلق اطلاعات حاصل کرنی چاہیں۔ لیکن یہ شخص اس مطالبے کو پورا نہ کر سکا۔ چنانچہ اسے چار سال جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ اس نے روس کو خیرباد کہنے کے بعد یہ کتاب لکھی۔ رہائی کے تھوڑا ہی عرصہ بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔

۴۔ "گرفتاری اور بن باس" (Arrest & Exile) اس کتاب کو لکھنے والی ایک عورت مسز کوچنسکا (Kochanska) ہے۔

۵۔ "چاند کا تاریک رخ" (The Dark Side of Moon) —— اس کتاب کا دیباچہ مشہور انگریز ادیب T.S. Eliot نے لکھا ہے۔ اس کتاب کو بھی مرتب کرنے والی ایک عورت ہے۔ اس کتاب میں پولینڈ کے بہت سے مردوں اور عورتوں کی آپ بیتیاں درج ہیں جو روسی قید خانوں میں رہ کر ۱۹۴۱ء-۱۹۴۲ء میں رہا ہوئے۔ اس میں روسی جیل خانوں اور بیگار کیمپوں کی بہت ہی واضح تصاویر کھینچی گئی ہیں۔

ان پانچ کتابوں کے علاوہ روس بارہ اہم کتابیں اور بھی ہیں لیکن اس موقعہ پر ان کی فہرست درج کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایلینا کی آپ بیتی

مولفہ : ڈاکٹر کراوچنکو

ہم کیف میں رہتے تھے۔ والد اُستانی تھیں۔ ابا ایک انجینئرنگ کالج کے شعبے پروفیسر تھے وہ خاصے کمانے والے آدمی تھے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ میرا بچپن بڑے لاڈ اور پیار اور چاؤ چوچلے میں گزرا مجھے زبان دانی اور موسیقی کی تعلیم دی گئی ہو۔ انتہائی بے فکری میں جوان ہوئی مجھے مصوری کا بہت شوق تھا۔

ہمارے پڑوس میں ایک ڈاکٹر رہتی (Sergei) رہتا تھا جو خارکوف کے ایک صنعتی سکول کا طالب علم تھا۔ گرمی کا موسم گھر میں گزارا کرتا تھا۔ ہم دونوں دوست بن گئے اور بہت جلد یہ دوستی محبت میں تبدیل ہوگئی۔ میری عمر ۱۵ برس سے کچھ ہی اوپر ہوگی کہ سرجی نے شادی کا پیغام دیا۔ میں مان گئی اور ہم خارکوف چلے آئے۔ خارکوف آکر میں مصوری کے ایک سکول میں داخل ہوگئی اور ۱۹۳۰ء میں ڈپلومہ لیا۔

تمہیں یاد ہوگا کہ اس زمانے میں بہت سے انجینئروں پر سازش کا الزام لگایا گیا تھا۔ میں کیف میں اپنے ابا سے ملنے کے لئے گئی ہوئی تھی کہ ایک دن خفیہ پولیس والے آئے اور ابا کو گرفتار کرکے لے گئے۔ انھوں نے مکان کی تلاشی لی۔ صوفے پھاڑ دیئے۔ دیواریں گرا دیں۔ لیکن انھیں وہاں سے کچھ نہ مل سکا۔ میرے ابا پڑھنے لکھنے والے آدمی تھے۔ ان پر سازش کا الزام ہی بے معنی تھا۔ ایسا بے معنی کہ مجھے اور امی کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد چھوٹ جائیں گے۔

میں کیف میں ہی رک کر دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ ہماری زندگی میں سے خوشی ختم ہوگئی۔ کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ ابا کے خلاف ان کے پاس کیا ثبوت ہے بس تو وہ ملنے بھی نہیں دیتے تھے کئی ہفتے اور پھر کئی مہینے میں بہت سے ابا کو کھانا پہنچانے کے لئے جیل خانے جایا کرتی اور کئی اور بدنصیب عورتوں کے ساتھ گھنٹوں قطار میں کھڑی رہتی

ایک دن مجھے خفیہ پولیس کے بڑے افسر نے طلب کیا وہ ادھیڑ عمر کا اور بظاہر بڑا شفیق آدمی تھا۔ میں نے اس کو ساری بات سنائی۔

اس نے کہا "تم میری بات سنو۔ ایلینا پیٹرووینا تم حسین عورت ہو پڑھی لکھی اور بات کرسکتی ہو۔ تمہارے ابا کا تو ذکر ہی کیا۔ اں خوبیوں سے تم اپنے ملک اور قوم کی بڑی خدمت کرسکتی ہو۔ ہم تمہاری مدد کرسکتے ہیں بشرطیکہ تم بھی ہماری مدد کرو۔ مجھے زیادہ وضاحت کرنی نہیں پڑے گی کیونکہ تم خود ذہین ہو۔ منہ نہ بناؤ، گھبراؤ نہیں میں یہ کبھی تم سے کہوں گا اتنا گھناؤنا نہیں جتنی زندگی خود ہے۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ کسی کی نقل کرو کیونکہ اس صرف کی ہمارے پاس بہت سی عورتیں ہیں اور ان میں بعض تو ہمارے شہر کے معزز خاندانوں کی ہیں۔ تم ہمارے لئے ایک پاک اور ناقابل حصول لڑکی کی حیثیت سے زیادہ مفید ہو۔ اور یہ ہمارا کام ہے کہ تمہیں صحیح قسم کے لوگ ملتے رہیں گے۔ جن سے تم ایسے راز دریافت کرسکو گی جن کی ہماری حکومت کو ضرورت ہے ہم تمہیں کافی تنخواہ دیں گے اور تمہارا اور تمہارے عزیزوں کا خیال رکھیں گے۔

اس نے مجھے ایک سگریٹ پیش کیا۔ مگر میں نے قبول نہ کیا۔ میں نے بڑے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "دوسرے لفظوں میں آپ چاہتے ہیں کہ میں چند انسانی زندگیاں آپ کے حوالے کردوں۔ زیادہ سنسنی خیز قسم کے جعلی مقدمے بنانے میں آپ کی امداد کروں اور اگر میں یہ کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو آپ میرے باپ کو رہا کردیں گے یہی کہتے ہیں نا آپ؟ صرف یہی"

اس نے قہقہہ لگایا "تم نے تو بہت آسان کردیا ہے اس مسئلہ کو"

"ہاں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ نہیں کرسکتی"

"اوں ہوں، تم تو جلد بازی کرتی ہو۔ ایلینا! کافی وقت ہے سوچ کے جواب دو ——— ہاں اگر تم نے کسی سے اس ملاقات کا ذکر کیا تو تمہارے ابا کو بڑی لمبی قید تنہائی بھگتنی پڑے گی اور ہاں ذرا اس کاغذ پر دستخط تو کردو"

کہ نفسِ راحتی سے ملنے کی درخواست کی۔ دو گھنٹوں کے کٹھن انتظار کے بعد "مارکو" نامی خفیہ پولیس کا ایک آدمی آیا اور مجھے کامریڈ ست ——— کے پاس لے گیا۔ کامریڈ ست ——— ایک خوبصورت اور صحت مند انسان تھا۔ اس کی صورت میں ایک عجیب سی مسحور کن کشش تھی۔

"مجھے تمہاری ملاقات کی توقع تھی" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر کمال مہربانی سے کرسی پیش کی "مجھے علم ہے کہ تم محض مجھے ملنے کے لئے آئی ہو۔ کیف سے مجھے تمہاری مکمل رپورٹ مل چکی ہے۔ کتنی افسوسناک بات ہے کہ ہماری ملاقات ایسے ——— تبریز کے ——— حالات میں ہوئی ہے۔ لیکن میں تمہارے آنے کا ممنون ہوں"

"تمہارا مطلب ہے تم نے میرے خاوند کے کھانے کے پارسل وصول کرنے کی ممانعت کر کے یہ موقع پیدا کیا ہے" میں نے کہا۔

"اچھا؟ تو وہ پارسل نہیں لیتے؟ کیسے گدھے ہیں خیر میں اس کا انتظام ابھی کر دیتا ہوں" یہ کہہ کے اس نے ایک افسر کو بلایا اور اسے پارسل وصول کرنے کی ہدایت کر دی۔

"سچ کہتا ہوں اور تم یقین مانو اطینا پیٹروونا' مجھے تمہاری مصیبتوں کا افسوس ہے۔ لیکن یہ تو تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ دو سال پہلے تمہیں جو مشورہ دیا گیا تھا اب بھی وہ اپنی جگہ قائم ہے ہم خفیہ پولیس والے اپنے وعدے کبھی نہیں بھولتے۔"

"تم نے میرے خاوند کو کیوں گرفتار کر رکھا ہے۔ تم اور میں دونوں جانتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے۔ اگر تمہاری کوئی ماں بہن ہے تو تم مجھ پر رحم کرو۔ میں جاسوسی نہیں کر سکتی۔ یہ میری طاقت سے باہر ہے اس سے تو اچھا ہے کہ مر جاؤں ——— لیکن اس کے ساتھ تم جو شرط چاہو منظور ہے"

میں التجائیں کرتی رہی اور وہ سنتا رہا۔ جب میں تھک کر خاموش ہو گئی تو اس نے میرے کندھے پر بزرگوں کی طرح تھپکی دی "وقت بہت ظالم اور بے حس ہے اطینا پیٹروونا آدمی کو کچھ کرنا چاہئے ——— تم اپنا مستقبل کیوں تباہ کر رہی ہو۔ ہمارا ساتھ دینے میں کیا حرج ہے؟ ہم تمہیں خاوند سے ملنے کی اجازت کیوں نہیں دیتیں"

"میں بتاتی ہوں کیوں! میرے بے گناہ باپ کا قتل اس کی پہلی وجہ ہے اور اس کی طرح ہزاروں آدمیوں کا قتل باقی ہزاروں وجوہات ہیں۔ میں اپنے خاوند کو بچانے کے لئے ہزاروں ماؤں اور بیویوں کے آنسوؤں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی"

"میں تمہارے آنسوؤں کے بوجھ سے آگاہ ہوں لیکن کوئی عقل کی بات کرو۔ ہم تم سے جو کام لیں گے ان سب کا نتیجہ خون اور آنسو ہی تو نہیں ہوگا۔ ہم تو تمہیں غیر ملکیوں کے پیچھے لگانا چاہتے ہیں جو ملک سرمایہ دار بھیڑیوں سے بھرا پڑا ہے جو انقلاب کے خون کے پیاسے ہیں ——— میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ لیکن اگر تم اپنا فیصلہ بدل سکو تو میں حاضر ہوں۔ تمہارا باپ مر چکا ہے اور اب زندہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن تمہارا خاوند ابھی زندہ ہے اب یہ تمہاری اپنی مرضی ہے؟"

"لیکن اس نے اس بات کا وعدہ کیا کہ سرجئی کو پارسل پہنچ دیں گے ——— کم از کم اس وقت تک جب تک اسے باقاعدہ سزا دے کے جیل داخل نہیں کیا جاتا۔ چند ہفتوں کے بعد مجھے خبر ملی کہ اسے دس سال قید سخت کی سزا دے کر کوہ یورال کے کسی جیل خانے میں بھیج دیا گیا ہے۔

میرے ذہن میں بڑی کشمکش تھی کبھی سوچتی کہ مجھے خفیہ پولیس میں شامل ہو جانا چاہئے میں سوچنے کے لئے بڑی بے چین تھی اور اب جدوجہد کرتے کرتے تھک چکی تھی ایسے جھوٹ اور بے انصافی کے دور میں اس احمق پن سے فائدہ۔ کئی دفعہ میں نے یہ مہلک فیصلہ کر لیا۔ لیکن ہر بار میرے اندر کی کوئی طاقت اس فیصلے پر غالب آ جاتی کسی کو دوستی کا فریب دے کے قتل گاہ تک لے جانے کے تصور ہی سے میں کانپ جاتی۔ سال بھر میں مختلف محکموں میں ملازمتیں ڈھونڈتی رہی کہ کسی صورت میرے خاوند کے مقدمے پر نظر ثانی کی جا سکے۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ایک واقعہ ہوا میں تصویروں کی ایک نمائش دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ [illegible] کامریڈ ست ——— ایک نہایت حسین عورت کے [illegible] اور حسن انداز سے

یقیناً میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے کام سے خون اور آنسو کا تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن تم نے اس صاحب کا کسی سے ذکر کیا تو تمہاری اپنی جان کی خیر نہیں" اس نے کہا۔

"لیکن اس ملازمت سے علیحدہ ہونے کا حق تو مجھے ہے مجھے فکر کے دو"

"فکر کے تو نہیں دے سکتا لیکن میں وعدہ کرتا ہوں مجھ پر اعتماد کرو تمہیں علیحدہ ہونے کا حق ہے۔ یہ فارم بھر دو"

یہ فارم دس صفحے کا ایک سوال نامہ تھا میری اور میرے دوستوں اور عزیزوں کی نجی زندگی اور خیالات کے بارے میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو اس سوال نامے میں موجود نہ ہو۔ میں نے اس کو پُر کر دیا تو کامریڈ ---- نے غور وار اُسے پڑھا۔ حاشیے پر کچھ لکھا اور دراز میں رکھ دیا۔ پھر ہم دونوں ایک ساتھ دفتر سے نکلے۔ باہر ایک کار کھڑی تھی اس پر سوار ہو کر ہم غیر ملکیوں کے ہوٹل کے قریب جا کر اتر گئے۔

"میں پیدل چلوں گا ٹھیک تین منٹوں کے بعد تم میرے پیچھے چلی آنا اور ہوٹل کی پانچویں منزل پر پہنچ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا ---- لعنت ایسی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اس وقت میں مرا نہیں سرکاری افسر ہوں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

چند منٹ کے بعد ہم دونوں ایک کمرے میں تھے۔ ایک بیرے نے دروازے پر دستک دی تو میں چھپ گئی۔

"خوب بہت خوب لیکن یہاں چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوٹل کے منیجر سے لے کر بیرے تک سب خفیہ پولیس کے آدمی ہیں"

کھانے کے دوران میں اُس نے مجھے کچھ ہدایات دیں۔

"اس وقت تو تم اور میں الگ الگ کام کریں۔ لیکن جب تم خانکوف جاؤ گی تو دیکھے بھالے اور بڑے بڑے کارنامے کر چکے"

"اب مجھے کہاں جانا ہے؟"

"چند مہینے تو تم خانکوف میں گزارو گی۔ پھر ہم تمہیں نیوپونٹرمک بھیجیں گے۔ بڑا عمدہ شہر ہے اور بہت بڑا صنعتی مرکز ہے اسی لئے یہاں پر بہت سے غیر ملکی رہتے ہیں۔ تمہارے لئے کافی کام ہے"

تمہیں ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ میں نے ذاتی طور پر تمہاری ضمانت دی ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری تقرری کی ساری ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ اگر تم نے کوئی چالاکی کی تو الزام مجھ پر آئے گا یہاں سمجھو کہ تم میرے بس میں ہو ---- لیکن جانِ من حقیقت اس کے الٹ ہے میں تمہارے بس میں ہوں۔ تم سے اتفاقیہ غلطی تو معاف ہو جائے گی لیکن تم نے دھوکا دینا چاہا تو پھر خدا ہی تمہارا حافظ ہے میں تمہارے بس میں ہوں اور اسی لئے میں نے بہتر سمجھا کہ تم سے صاف صاف کہہ دوں"

"ہاں میں سن رہی ہوں"

"تمہارے حسن کے متعلق بھی مجھے یہی کہنا ہے تم ہماری تمام کارکن عورتوں سے زیادہ حسین ہو۔ اور حسین رہنا تمہارے فرائض میں بھی داخل ہے۔ لباس اور آرائشِ حسن پر جتنا روپیہ صرف کر سکو کرو۔ یہ جائز اور ضروری خرچ ہے ---- ہمارے دوسرے کارکن وقتاً فوقتاً تم سے ملتے رہیں گے لیکن تم کسی پر اعتماد نہ کرو۔ اپنے کام کے بارے میں ان سے کوئی بات نہ کرو اگر تمہیں کوئی ایسا کام دیا گیا ہے جس میں خفیہ پولیس کے اور آدمی بھی شریک ہیں تو تم صرف وہی کام کرنا جس کی تمہیں ہدایت کی گئی ہے"

"مجھے ایک بات پوچھنی ہے" بات کاٹ کر میں نے کہا: "میرا خاوند کب چھوٹے گا؟"

"تم بے فکر رہو اسے سپیروپیٹروسک میں بڑی اچھی نوکری دی جائے گی"

دو مہینے کے عرصہ میں سرخی آ گیا وہ سمجھدار آدمی ہے اور بڑا زیرک انسان ہے اس نے فوراً بھانپ لیا کہ مجھے ایک منطقے میں جو والہانہ محبت تھی روسی حکومت نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

میرا فیصلہ درست سیدھا سادا تھا لیکن [illegible] چاہیے اگر تم نے اپنی آنکھوں سے قیدیوں کا کیمپ اور سرحتی کی ڈراؤنی صورت دیکھی ہوتی تو تم سمجھ سکتے کہ سالہا سال کی کشمکش کے بعد میں جھک کیوں گئی میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ ایک میں ہی جو خفیہ پولیس کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئی ہوں [illegible] بہت اونچے افسروں کی بیویاں اور بڑے آدمیوں کی بیٹیاں بھی [illegible] جو محض اس لئے کبھی نہیں کسے منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور انہیں دھمکی دی جاتی کہ اگر وہ خفیہ پولیس کے ساتھ تعاون نہیں کرتیں تو ان کے خاوندوں کو لٹکا دیا جائے گا وہ مجبور ہو جاتی ہیں --- اور [illegible] کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

دو زیرِ طبع کتابیں

★ —— مکاتیبِ زندان —— ★ قیمت دو روپے

مولینا مودودی، مولانا اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کے
مرکزی جیل ملتان سے لکھے ہوئے

خطوط کا مجموعہ

★ —— الاخوان المسلمون —— ★ قیمت ایک روپیہ چار آنے

حسن البنا شہید

●

دونوں کتابیں انشاءاللہ اگست میں شائع ہو جائیں گی۔

مکتبہ چراغِ راہ کراچی

روح افزا

• پاکستان کے جواں ہمت، اسلام پسند طلبہ کی آواز
• اسلامی انقلاب کی صدائے بازگشت
• طلبہ کے حقوق کا محافظ و ترجمان

• پندرہ روزہ:-

"STUDENTS' VOICE"

(زیر نگرانی:- اسلامی جمعیتہ طلبہ، کراچی)

کا پہلا شمارہ

جولائی ۵۲ء کے پہلے ہفتے میں منظر عام پر آرہا ہے

"STUDENTS' VOICE" میں کیا ہوگا؟

• اسلامی نظام زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مقالات
• عہد حاضر کے مادہ پرستانہ نظاموں پر تنقیدی مضامین
• لندن، نیویارک، پیرس، قاہرہ، جکارتا، دمشق، بغداد اور کولمبو کے نیوز لٹر
• بیرونی ممالک کے طلبہ کے حالات اور وہاں کے اسلام پسند نوجوانوں کی سرگرمیاں۔ پاکستان کے طلبہ کے حالات ان کی سرگرمیاں اور طلبہ کی اسلامی تحریک کی رفتار کار کا جائزہ

۲۴ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ——— قیمت فی پرچہ ار ——— سالانہ چندہ (۲۴ شماروں کے لئے) عدر

خط و کتابت کا پتہ

۱۸/۱۳ - بندر روڈ، مقابل وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے کراچی

اچھی کتابیں زندگی کی بہترین رفیق ہیں
سیرۃ سید احمد شہید از مولانا ابوالحسن ندوی 4/8/-
ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک از مولانا مسعود عالم ندوی 2/8/-
محمد بن عبدالوہاب از مولانا مسعود عالم ندوی 2/12/-
دیار عرب میں از مولانا مسعود عالم ندوی 4/8/-
مسلمان اسلام کی کسوٹی پر از نذیر الحق میرٹھی 1/8/-
اسلام اور سود از ڈاکٹر انوار اقبال میرٹھی 3/8/-
مکاتیب حضرت امام غزالی مترجمہ عبدالوہاب ظہوری 3/8/-
فلسفۂ عجم از علامہ اقبال 3/8/-
عہد نبوی میں نظام حکمرانی از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب 3/8/-
قانون بین الممالک از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب 3/8/-
منشور متحدہ اقوام میں الاقوامی دساتیر مترجم احمد عبداللہ المسدوسی 7/0/-
قانون مکافات ضیاء الہدیٰ 1/0/-
حضرت ابوذر غفاری مناظر احسن گیلانی 3/4/-
جہنم کے دروازوں پر اسعد گیلانی 3/8/-
اسلام کا نظام عدالت و سیاست یعقوب الرحمٰن عثمانی 2/12/-
ایک عورت دو مالک اسعد گیلانی 2/12/-
اصول دعوت مولانا محمد قاری طیب صاحب 1/2/-
خدائی حکومت مولانا سید سلیمان ندوی 0/4/-
حکومت الٰہیہ 0/3/-
اصلاحات اقبال مشیر الحق 1/8/-
معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل نعیم صدیقی 3/4/-
اسلام اور فطرت مترجمہ ابو تمکین اشفاق احمد 2/8/-
جمہوریت اور مغربی تحریکیں مترجمہ عبدالوہاب 3/0/-
OUR LEADERS چوہدری محمد اکبر 4/-/-
تاریخ اسلام طبری مترجمہ عبداللہ انصاری 8/12/-
اسلامی تہذیب کیا ہے ؟ غلام دستگیر رشید 3/-/-
الدین القیم مولانا مناظر احسن گیلانی 2/12/-
رسول اللہ کی سیاسی زندگی ڈاکٹر حمید اللہ 5/-/-
پتھر چکی اسعد گیلانی 3/-/-
کھوٹے سکے عاصی ضیائی رامپوری 3/-/-
ہماری دعوت
مشرق وسطیٰ کی اہم دینی تحریک
الاخوان المسلمون
کے
قائد شیخ حسن البنا شہید کے عربی رسالہ کا ترجمہ
قیمت ۔۔۔۔۔ آنے
بچوں کے لئے
سچی اور پاکیزہ کہانیوں کا سلسلہ
چشمے سے ندی پر چار آنے خدائی معمار آٹھ آنے
پہلا خون چار آنے غار والے چار آنے
خوفناک طوفان چھ آنے گاؤں والے چار آنے
مکتبہ چراغ راہ، کراچی نمبر ۱

حاذق نروائن پلز

حبِّ خاص

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے۔ یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم اصحاب کے واسطے آب حیات کا کام دیتی ہیں۔ اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنی ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک	۱۰ یوم	۲۰ یوم	۴۰ یوم
پیکنگ	۲۰ گولی	چالیس گولی	۸۰ گولی
قیمت	2/-/-	3/12/-	7/-/-

حاذق ہسٹریا پلز

یہ گولیاں خالص و کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصولوں پر تیار کی ہوئی ہیں۔ عورتوں کی مشہور بیماری ہسٹریا یا اختناق الرحم، بچوں کی مرگی (ام الصبیان) کے لئے لاثانی دوا ہے۔ اس کے علاوہ عام کمزوری، ضعف ہضم، اختلاج قلب (دل کی دھڑکن) کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ یہ دواخانہ ہذا کی ایسی بے نظیر ترکیب ہے جس پر طب یونانی جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے۔

قیمت:- فی شیشی ۸۰ گولی پانچ روپے (۵؍)

حاذق دواخانہ رجسٹرڈ مقابل ماما پارسی گرلز ہائی اسکول بندر روڈ کراچی

چراغِ راہ (کراچی)

اگست ۱۹۵۲

مرتب

نعیم صدیقی

(پاکستان)

(بھارت)

مکتبۂ چراغِ راہ۔

لوشا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ کراچی

اسلامی ادب کا علمبردار

چراغِ راہ

اگست ۱۹۵۲ء

قیمت ۸ ر

جلد ۵ —— شمارہ ۹

چندہ سالانہ ——

پاکستان	تیابت
صہ روپے	معہ

مندرجات

سوچ بچار

فکر و تحقیق

تخلیقاتِ ادب

دفتر چراغِ راہ ۹، لوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ، کراچی

سوچ بچار

شریعت کا کون سا تصور

دستورِ اسلامی کا بنیادی نکاتی مطالبہ جتنا زیادہ موافق ثابت ہو رہا ہے اتنا ہی اسلام دشمن عناصر پیچ وتاب کھا رہے ہیں۔ ان حضرات کی دنیا صرف کاغذی دنیا ہے اور کاغذی دنیا بھی صرف انگریزی پریس کا گوشہ جس سے ہمارے ملک کی ایک حقیر اقلیت وابستہ ہے۔ اردو پریس میں آتے ہوئے یہ جھجکتے ہیں اور براہ راست جلسوں میں آ کر عوام سے خطاب کرنے یا سوسائٹی میں چل پھر کر اپنے خیالات پھیلانے کے لئے تو ان کو آپریشن کرا کے نیا دل گردہ اپنے اندر فٹ کرانا پڑے گا۔ ان کی نیم مقصد کے لحاظ سے ایک ہے لیکن حربی تدبیر کے طور پر انھوں نے مختلف مورچے اور حربے اختیار کر رکھے ہیں۔ حال ہی میں ایک صاحب پاکستان ٹائمز کے مورچے سے طلوعِ اسلام کے فکری حربوں کے ساتھ نمودار ہوئے ہیں۔ آپ کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ شریعت اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والے یہ تو بتائیں کہ ان کے سامنے شریعت کا تصور کون سا ہے اور جب شریعت کے تصور ہی میں بے شمار اختلافات ہیں تو ان کو حق کیا ہے کہ وہ مولانا مودودی کے تصور کو پوری قوم پر ٹھونسیں۔ طرفہ یہ کہ یہ باتیں کہنے کے بعد طلوعِ اسلام کے تصورِ شریعت کے تحت آپ نے اپنا مطلوبہ دستوری فارمولا پیش کر دیا ہے کہ ہونا یہ چاہیئے یعنی کوئی دوسرا کسی تصورِ شریعت کو لائے تو اسے تو اختلافات کے عذر سے رد کر دیا جائے لیکن جب اپنا فارمولا پیش کرنا ہو تو پھر ساری قوم کو اس پر متفق فرض کر لیا جائے!

ان حضرات کو یہ پتہ نہیں کہ مسلمانوں کے اندر اختلافات فقہی اور اجتہادی امور میں تو ہیں لیکن تصورِ شریعت میں نہیں۔ تصورِ شریعت کے لحاظ سے سارے گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت اسلامی نام ہے ان اصول وقوانین کا جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے ماخذ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس تصور سے اگر خاص قرآنی نظام کا نعرہ بلند کرنے والے پانچ سات افراد کو اختلاف ہو تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ساری امت میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ تمام فرقوں کی نمائندگی کرنے والے اکتیس (۳۱) علماء کراچی میں جمع ہوئے۔ صرف دو روز کی مجلس میں اپنے اختلافات (جن کا پروپیگنڈہ کر کے علماء کو بدنام کیا جاتا ہے) کے ہوتے ہوئے ۲۲ دستوری اصولوں پر کلی اجماع کر چکے ہیں اور ایک ہی تصورِ شریعت پر پورا اتفاق ثابت کر چکے ہیں۔ جناب فرمایئے! آپ کے انگریزی اخبارات میں شائع ہونے والے اوٹ پٹانگ خطوط تحریک نظامِ اسلامی اور امت کے مشترک تصورِ شریعت کا کیا بگاڑ لیں گے؟ — کیا اس کے بعد بھی آپ کو یہ حق رہتا ہے کہ اس مشترک تصورِ شریعت کو مولانا مودودی کا ذاتی تصورِ شریعت قرار دیں!

امت پر کسی تصور کے ٹھونسنے کا سوال ہی کیا! مولانا مودودی کو اگر حق حاصل ہے کہ وہ کسی تصورِ شریعت کو سامنے لائیں اور اکثریت کو اس پر مطمئن کریں تو آپ کو بھی یہ حق برابر کا حاصل ہے کہ آپ اپنے تصورِ شریعت کو میدان میں پیش کریں اور رائے عام کو اگر آپ مطمئن کر جائیں تو کھلا موقع موجود ہے کہ آئندہ نظام آپ کے تصورِ شریعت پر استوار ہو! مولانا مودودی نے آپ کا راستہ روکا تو نہیں! آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ اپنے تصورِ شریعت کو پبلک کے سامنے لانے اور اکثریت کو اس کے حق میں تیار کرنے کی بازی کھیلنے کی سکت نہیں رکھتے ہیں۔ آپ کے پاس ہی ہیں کوئی ایسا کھوٹ ہے کہ آپ اسے کھلے بازار میں لانے کے بجائے ادھر ادھر تاریک گوشوں میں ایک ایک راہ گیر کو بلا کر اس سے سرگوشی میں معاملہ کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ جناب والا! جو لوگ دستور اور نظامِ زندگی کے لئے آئیڈیالوجی پیش کیا کرتے ہیں وہ ایسے بزدل نہیں ہوتے لیکن آپ کی اس کمزوری کی وجہ سے اگر حالات آپ کے منشا کے خلاف کسی اور کے حق میں جا رہے ہیں تو آخر اس میں مولانا مودودی یا جماعتِ اسلامی

اکثریت اور مسلکِ تصور!

یقین جانیے کہ اگر آپ اپنے کسی تصورِ شریعت اور اپنے کسی دستوری خاکے پر عوام کو مطمئن کرنے کے لئے اثباتی جدوجہد نہیں کر سکتے تو پھر جو لوگ
مت کے مسلکہ تصورِ شریعت اور کتاب و سنت سے ثابت شدہ دستوری اصولوں کے حق میں رائے عام کو ہموار کر رہے ہیں ان کے پیچھے تالی پیٹ دینے
سے ان پر ملائیت کے طعنے چست کر دینے سے ان کے خلاف لونڈی غلام رکھنے کی دعوت دینے کا پروپیگنڈہ کرنے سے اور ان پر جاگیرداری کے تحفظ کا
لزام چپکنے سے آپ پالا نہیں مار سکتے، صرف اپنے دل کا بخار نکال سکتے ہیں۔
افسوس کہ اس اشاعت میں ہم نکاتی مطالبے کے خلاف اٹھائے جانے والے دوسرے سوالات کو زیر بحث لانے کے لئے جگہ نہیں ہے، ان شاء اللہ
شاعتِ آئندہ میں ہم تفصیلی بحث کریں گے۔

قادیانی اقلیت

چند روز سے قادیانیوں کو اقلیت کا درجہ دلوانے کے لئے مجلس احرار اسلام کے زیر تحریک ایک زوردار مہم جاری ہے۔ مختلف مدارس فکر کے علما
ور عوام اس مہم کی متفقہ تائید کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک عجیب ماجرا ہے کہ ملت قادیان عملاً بہمہ وجوہ عام مسلمانوں سے الگ ایک ملت ہونے کے باوجود
باہ مخواہ مسلمان اکثریت میں شریک رہنے پر مصر ہے۔ اور بجائے اس کے کہ از خود وہ اپنے آپ کو ایک الگ اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ
ے کے اٹھے، اکثریت کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اسے اپنے دائرے سے زبردستی دھکیل کر باہر پھینک دیں۔ آخر یہ لوگ ایک نئی نبوت کے علمبردار ہیں
ور اس نبوت پر جو کوئی بھی ایمان نہ لائے اسے یہ کافر یا بالفاظ دیگر اپنی ملت کے دائرے سے باہر قرار دیتے ہیں۔ اسی بنیاد پر انھوں نے اپنی نمازیں اور
سجدیں اور جنازے اور قبرستان تک عام مسلمانوں سے الگ کر لئے ہیں، اسی بنیاد پر یہ لوگ شادی بیاہ کے تعلقات صرف اپنے ہی فرقے کے اندر قائم
م کرتے ہیں، اسی بنیاد پر ان کے ہاں نوکریوں اور کاروبار میں بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون قادیانی ہے اور کون غیر قادیانی، اسی بنیاد پر یہ سرکاری عہدوں
ممکن ہونے کے بعد پورے فرقہ وارانہ تعصب کے ساتھ قادیانی اور غیر قادیانی میں بھی امتیاز برتتے ہیں، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے اندر
پنے حقوق تک کے تحفظ کا جذبہ بالکل اقلیتی انداز کا سا ہے۔ چنانچہ ان کے امام وقت مرزا بشیر الدین صاحب محمود اپنی سوچی سمجھی تقریر میں کہہ چکے
ں کہ ان کے پیروؤں کو حکومت کے مختلف محکموں میں گھس جانا چاہیے تاکہ وہ پوری طرح اپنے حقوق کا تحفظ کر سکیں۔ پس جبکہ عملاً یہ گروہ ایک اقلیت
پوزیشن اختیار کر چکا ہے تو پھر یہ اس کی زیادتی ہے کہ یہ مسلمانوں میں شمار ہو کر ان کے حقوق سے ناجائز طور پر زیادہ حصہ اڑائے جاتا چاہتا ہے۔ اس
وہ کا اخلاقی فرض یہی ہے کہ یہ آگے بڑھ کر خود کہے کہ ہمارا مقام واقعی ایک اقلیت کا ہے۔ اور پھر اکثریت کا یہ فرض ہو جائے گا کہ ان کو پورے
حفظات فراہم کر کے دے۔

اس اقلیت نے اکثریت میں داخل رہنے پر مصر ہو کر اکثریت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی حکومت سے مطالبہ کرے کہ وہ ایک
لیت کے مقام پر رکھنے کا دستوری فیصلہ کرے۔ مگر اس مطالبہ کے راستے میں بڑی روک موجودہ ایکٹ ۱۹۳۵ء ہے۔ اس ایکٹ کا مزاج

لہ: ٹھیک اسی طرح اکثریت کے مطالبہ کی بڑھتی ہوئی رو کو دیکھ کر سر ظفر اللہ خان کو چاہیے تھا کہ وہ فی الفور عہدے سے خود مستعفی ہو جاتے کیونکہ کوئی شخص کے
لاف قوم بے اعتمادی کا اظہار کر دے آخر وہ دنیا کے سامنے اپنے آپ کو اسی قوم کے معتمد علیہ نمائندے کی حیثیت سے کیسے پیش کر سکتا لیکن اپنے فرقے کے
زاج کے مطابق موصوف بھی اپنے عہدے سے بالکل چمٹ گئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بالآخر دست بدست دگرے کی طرح سے نکالے جائیں گے

بالکل سیکولر (SECULER) ہے اور اس کے مزاج کے سیکولر رہنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے تحت کسی ایک گروہ اور دوسرے گروہ میں مذہب کی بنیادوں پر کوئی امتیاز نہیں برتا جا سکتا اور حقوق و فرائض کی تقسیم اور حیثیتوں کا تعین کرنے میں کسی مذہب کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا سکتا بلکہ الٹا یہ دستور تقاضا کرتا ہے کہ اقلیتوں کو اسمبلیوں اور وزارتوں اور عہدوں میں بیشتر سدی نمائندگی دی جائے اور ان کی مذہبی سرگرمیوں، تبلیغی جلسوں اور فرقہ وارانہ کانفرنسوں کا تحفظ کیا جائے۔ ایکٹ ۳۵ کا یہی تقاضا ہے جس کے تحت ایک طرف قادیانیوں کی کراچی کانفرنس کی کامیابی کا تحفظ ضروری ٹھہرا اور دوسری طرف ان کے خلاف مہم چلانے کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے پنجاب میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ لازم قرار پایا۔ یہاں تک کہ مسجدوں: وہاں کے منبر بھی اس دفعہ کے زیر تصرف آ گئے! اسی ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تقاضے کے تحت جہاں آپ کی حکومت پر لازم ہے کہ وہ ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو اونچے مناصب تک میں نمائندگی دے، وہاں قادیانیوں کو بھی نمائندگی دے۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خاں کا ایک ذمہ دار منصب پر ہونا اسی بنا پر ہے۔

پس پیش نظر مطالبہ کا پورا ہونا ایکٹ ۱۹۳۵ء سے بالاتر ایک معاملہ ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ایک بنیادی دستوری فیصلہ چاہتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہمارے نئے دستور میں کیا ایک ایک گروہ کا الگ الگ نام لے کر یہ بتایا جانا چاہیے کہ فلاں اقلیت ہے اور فلاں اکثریت میں شامل ہے، یا اس معاملے کو ایک اصولی دفعہ کے تحت طے ہونا چاہیے؟ اور کیا ہر اقلیت کو اقلیت قرار دلوانے کے لئے الگ الگ ایک مہم چلانی چاہیے یا ایک اصولی بات کو منوانے کے لئے یکبارگی قوت صرف کرنی چاہیے؟ آپ کی عقل اگر گواہی دے کہ یہاں فیصلہ تو ایک اصولی صورت ہی میں ہونا چاہیے تو پھر ایک سوال اور بھی سامنے رکھ لیجئے، وہ یہ کہ کیا یہی ایک اصولی مسئلہ اہم ترین ہے کہ جس کے لئے برسر اقتدار قوت سے کشمکش کر کے اور وقت دے کر یہ خیال کہ ہم ان پیچیدگیوں سے نکل آتے ہیں جن میں ایک غیر اسلامی نظام حکومت نے ہمیں مبتلا کر رکھا ہے؟ اور کیا اس سے زیادہ اہم نکات اور نہیں ہیں کہ جن کے بارے میں حاکمانہ قوت اور عوام کے درمیان فکری تصادم موجود ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ جہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ یہاں دستور اسلامی بنتا ہے یا غیر اسلامی؟ یہاں قرآن و سنت پر زندگی کی بنیادیں اٹھائی جاتی ہیں یا کسی اور فلسفہ و ضابطہ پر، ملک کو سرمایہ دارانہ تہذیب کے حوالے کیا جاتا ہے، یا یہاں اشتراکیت کے لئے میدان بنایا جا رہا ہے یا اسلام کو برسر اقتدار آنے کا کوئی موقع ملتا ہے، وہاں قوت صرف کرنے کا اصلی نکتہ ہونا چاہیے، اور وہاں ایک ہی فیصلہ کن مہم چلانی کس چیز کے لئے جانی چاہیے۔

اس سوال پر سوچتے ہوئے یہ حقیقت بھی سامنے رکھئے کہ اگر یہاں آپ اسلامی دستور بنوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ اسلامی ریاست کی شہریت کا اصل منصب انہی لوگوں کے لئے ہو گا جو اس ریاست کے بنیادی اصولوں پر اور اس کے ماخذ قانون پر ٹھیک کسی کمی بیشی کے ایمان رکھتے ہوں اور یہی لوگ اس کے سربراہ کاری کے مناصب پر فائز ہو کر اس کی پالیسی کو بنانے اور چلانے کے مستحق ہوں گے دوسرے لوگوں کے لئے دنیا بھر کی ریاستوں کے مقابلے میں اسلامی ریاست پوری فراخدلی سے حقوق اور تحفظات بہم پہنچائے گی۔ لیکن اپنے اصولی (IDEOLOGICAL) نظام زندگی کی باگ ڈور ان کو از روئے دستور سونپ نہیں سکتی۔ پس لازم ہوا کہ ایک اسلامی دستور اس کی تشریح کرے کہ مسلم کی تعریف کیا ہے؟ تاکہ جو اس تعریف پر اپنے آپ کو پورا اتار دکھائے اس کے لئے ریاست کو چلانے والی طاقت کے دروازے کھلے ہوں اور جو اس تعریف پر پورا اترنے کے لئے تیار نہ ہو اسے ذمی اقلیتوں کا درجہ دے کر وہ تمام حقوق و تحفظات دیئے جائیں جن کا ذمہ خود اللہ اور رسول نے لے رکھا ہے۔

اب آپ یہ دیکھئے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے اسلامی دستور بنوانے کے لئے ایک جدوجہد ہو رہی ہے اور اس جدوجہد کی کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ مذکورہ بالا مطالبے کی مہم بھی از خود کامیاب ہو گئی۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں! بجائے اس کے جزئی امور کے لئے الگ الگ تحریکیں چلا چلا کر عوام کو انتشار میں ڈالا جائے، کیوں نہ سارے قوتیں ایک ہی کلی تحریک پر لگا دیا جائے۔

پنجاب پولس!

پنجاب پولس کے کارناموں کی ایک مسلسل تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ غالباً انتظامیہ و عدلیہ کے متوازی پولیس راج قائم کرنے کا مقصد پیش نظر ہے۔ چنانچہ ہم نہ تو یہ بھول سکتے ہیں کہ لائل پور میں شمس الحق دن دہاڑے صفحہ ہستی سے غائب ہو گیا۔ اور آج تک اس کا پتہ نہ چل سکا، نہ وہ واقعات بھول سکتے ہیں جو دھیرہ کے ضلع لائل پور میں ہوئے تھے اور نہ لاہور کی مال روڈ پر ایک طالب علم کے حشر کو فراموش کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری تاریخ کے شرمناک ابواب ہیں۔ ہم ان کو صرف اس صورت میں بھلا سکتے تھے کہ ہماری پولیس اپنی اصلاح کر لیتی لیکن اس کے برخلاف حالات اور [illegible] ابدتر ہو گئے ہیں۔

مثلاً ملتان فائرنگ کے معاملہ کو لیجئے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ واقعات ٹھیک اسی شکل میں ہوئے جو سرکاری بیان میں پیش کی گئی تھی، تو بھی سوال یہ ہے کہ ہماری پولیس گولی چلانے کے آخری حربے تک اتنا جلد کیوں جا پہونچی۔ ملتان کے واقعات کے بالکل متوازی کلکتہ میں سخت ہنگامہ بپا ہے، اور ہڑتالی ٹرامیں جلا رہے ہیں، ریل گاڑیاں روک رہے اور اپنے غصہ کا اظہار سخت سے سخت صورتوں میں کر رہے ہیں مگر اب تک نوبت گولی چلنے تک نہیں پہونچی، بلکہ لاٹھی چارج اور اشک آور گیس کے ذریعے روک تھام کی جا رہی ہے۔ لیکن ملتان پولیس نے تو گولی چلانے کا فیصلہ اتنا جلد کر لیا کہ گویا سامنے بھیڑ بکریاں ہیں، اپنی قوم اور اپنے ملک کے فرزند نہیں ہیں۔

ادھر ضلع جھنگ کے چک ۲۳۲ میں جو قیامت گزری ہے اس پر ہم کوئی ایسی رائے ظاہر کرنے کے مجاز نہیں ہیں جو اس معاملے کے ہائی کورٹ کے سامنے جا چکنے کے بعد مقدمے پر اثر انداز ہو یا جس سے توہین عدالت لازم آئے، لیکن محض عرضی گذار کا بیان اور اس کے بعد جناب حمید نظامی صاحب کے تاثرات پڑھنے کے بعد آدمی سکتے میں رہ جاتا ہے کہ کیا ایک اسلامی ریاست کی مسلمان پولیس یہ کچھ کر سکتی ہے؟ کیا محض انسانیت کا ضمیر بھی اسے گوارا کر سکتا ہے؟ —— ہمارا احساس تو یہ ہے کہ اگر عدالت میں مبینہ واقعات کا دسواں حصہ بھی صحیح ثابت ہو جائے تو ہماری حکومت اور ہماری قوم اور ہمارے دین کے نام پر سخت کالا دھبہ لگے گا۔ حمید نظامی صاحب کا بیان ہے کہ :-

"ایڈیٹر نے اپنے کانوں سے بوڑھوں اور نوجوانوں کو باچشم گریاں یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ گاؤں کے مردوں کو زمین پر لیٹنے کا حکم دیا گیا اور عورتوں کے کپڑے اتار کر انھیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ مردوں کے سامنے رقص عریاں کریں۔ ایڈیٹر نے ایک سفید ریش بوڑھے کو بلک بلک کر روتے دیکھا ہے۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اسے گزشتہ دس روز سے پتہ نہیں کہ اس کے بیوی بچے کہاں ہیں۔ ایڈیٹر نے ایک ۵۵ سالہ بوڑھی عورت کو سسکیاں بھر کر یہ فریاد کرتے ہوئے سنا ہے کہ اس کی ۱۲ سالہ لڑکی پر ہاتھ ڈالا گیا۔ ایڈیٹر نے اپنی آنکھوں سے ایک نوجوان دیہاتی عورت کو دیکھا ہے جو روتی جا رہی تھی ۔ ایک ہاتھ سے مارے شرم کے سفید چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی — اور فریاد کر رہی تھی کہ امن کے محافظوں نے اس کی عصمت لوٹی ۔ ایڈیٹر نے اپنے کانوں سے لوگوں کو بیک آواز یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے یہ حیا سوز منظر دیکھا ہے کہ ماں اور بیٹے دونوں کو ننگا کر کے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور سنگین کی نوک سے بیٹے کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا...... اپنی ماں کے منہ میں ڈالے! ——
اس ایڈیٹر نے اپنی آنکھوں سے اس گاؤں کے مکان دیکھے ہیں جنھیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ غنیم کی فوج نے ابھی ابھی اس گاؤں کو تاراج کیا ہے —— لوگ اس طرح بھاگے ہیں کہ تن کے کپڑوں میں بھاگ کھڑے ہوئے اور جوتے لینا بھی بھول گئے — دس دن بعد بھی بھاگے ہوؤں میں سے ایک کنبہ بھی گاؤں میں واپس نہیں آیا تھا —— تمام گاؤں میں رہا ہا جو بین محفوظ ہے) قبرستان کی طرح ہو کا عالم ہے!

اور تھانہ مہر خلف شہر جو۔ کمن۔ وجس نے چک نمبر ۲۲۲ کے مظلومین کی طرف سے ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی ہے، کی طرف سے پیروی کرنے والا وکیل ہے، ہائی کورٹ کے سامنے یہ درخواست پیش کرنے پر مجبور ہوا ہے کہ عبدالرشید اے۔ ایس۔ آئی جھنگ پولیس نے اسے دھمکی دی ہے کہ جس مقدمے کی پیروی کے لئے جھنگ کا کوئی اور وکیل تیار نہیں ہوا اس کیس کو ہاتھ میں لے کر تم پورے محکمہ پولیس کے خلاف اقدام جنگ کر رہے ہو اور اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوں گے۔ اگر یہ واقعہ عدالت میں ثابت ہو گیا تو پھر یہ پولیس راج قائم کرنے کے منصوبے کو قطعی طور پر نمایاں کر سکے گا!

ایک اور واقعہ (بہ روایت روزنامہ آفاق لاہور) یہ ہے کہ ۱۶ جولائی ۱۹۵۲ء کو شجاع آباد میں پولیس نے فیض بخش نامی ایک شخص کو اس قدر پیٹا کہ وہ وہیں جاں بحق ہو گیا۔ اس کے بعد میت کو اٹھوا کر شہر سے آبادی کے قریب ڈلوا دیا گیا۔

ہم ان واقعات اور خبروں کو پیش کرکے اپنی پولیس سے پوچھتے ہیں کہ کیا کسی آزاد مملکت کی پولیس بربریت کے ذریعے بھی کامیاب پولیس بن سکتی ہے؟ انگریز کے دور میں تو یہ طریقے مفید ہو سکتے تھے (اگرچہ انگریزی دور میں نوبت یہاں تک نہ پہنچی ہوگی) لیکن آزاد پاکستان میں ان طریقوں کا اختیار کرنا بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہماری پولیس ابھی سے ہوش سے کام لے۔

ہمیں صوبائی اور ملکی انتظامیہ سے اس سلسلے میں بڑی سخت شکایت ہے۔ کیوں نہ ایسا ہوا کہ صوبے اور مرکز کے اکابر ان واقعات کی اطلاع ملتے ہی موقع پر پہنچتے، عوام کی دلجوئی کرتے، انہیں واقعات کو سامنے لانے کی جرأت دلاتے اور اس وقت تک موقع سے نہ ٹلتے جب تک کہ مظلومین کی دادرسی اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے تقاضے پورے نہ ہو جاتے۔ مگر افسوس کہ جس طرح ڈیرہ والے واقعہ کے بعد گورنر جنرل پاکستان پولیس کو ایک وعظ کہہ کر رہ گئے۔ اب کے بھی ایک بیان دے کر یہ سمجھا گیا ہے کہ فرض ادا ہو گیا۔ آہ مظلوم! انسانیت!

عدالت عالیہ کی بے بسی

ہمارے ملک کا قانون اور عدالتی نظام "انتظامیہ" کے مقابلے میں کچھ ایسا مقام رکھتا ہے کہ بسا اوقات عدالتیں یہ حقیقت جان لینے کے باوجود کہ ایک ظلم ہو رہا ہے، مظلوم کو بچانے میں یا ظالم کا ہاتھ پکڑنے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔ یہ وہ موقعے ہوتے ہیں کہ عدالت کی کرسی پر بیٹھنے والے ابنائے آدم کے ضمیر ان کی بے بسی کا ماتم کرتے رہ جاتے ہیں۔

اس سے پہلے چیف جسٹس پاکستان مرزا ابراہیم اور عطاء اللہ جہانیاں کی حبس کارپس کی درخواست پر یہ ریمارک دے چکے ہیں کہ:

"اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس طرح کے حالات میں عدالت کی ہمدردیاں ملزم کے ساتھ ہونی چاہئیں تاہم جب قانون بنانے والے ہی سارے اختیارات گرفتار کرنے والی طاقت کو سونپ دینا پسند کریں اور عدالت کو کوئی اختیار نہ دیں تو عدالت بے بس ہے ـــــ وہ اہل اختیار جو قانون سازی کے ذمہ دار ہیں انھوں نے عدالتوں کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ نظربندوں (جو سیفٹی ایکٹ کے تحت نظربند کئے جائیں۔ مدیر) کا کچھ بھی بچاؤ کر سکیں۔"

لیکن یہ تو معاملہ تھا سیفٹی ایکٹ کا کہ جو لاقانونی کے قانونی لباس پہننے سے وجود میں آیا ہے۔ آج ہمارے سامنے عام ملکی قانون کے تحت پیش ہونے والی ایک درخواست نظرثانی مقدمہ کے فیصلہ کا ایک ایسا عدالتی ریمارک ہے کہ جو ہر پہلو سے عبرت ناک اور افسوسناک ہے۔ یوں تو پورا فیصلہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ قارئین کے سامنے رکھ دیا جائے۔ مگر جگہ کی قلت کے پیش نظر ہم اس کا مفہوم

بھی عرض کر سکتے ہیں۔

واقعات یوں ہیں کہ موضع لسال ضلع گجرات کے ایک مقتول مسمیٰ باتری کے مقدمہ قتل میں جو دس ملزمین ماخوذ تھے، عدالت سیشن کی طرف سے ان کو بری کر دیئے پر حکومت پنجاب نے اپیل دائر کرنے کی اجازت نہ دی تو مسمیٰ ولی محمد کی طرف سے ہائی کورٹ لاہور میں نظر ثانی کی درخواست پیش کی گئی۔ عدالت عالیہ نے جن اہم حقائق کو اپنے فیصلے میں بے نقاب کیا ہے۔ وہ ذیل کے اقتباسات سے ملاحظہ فرمائیے:-

"یہ ایک جرم ——— واضح طور پر ایک انتخابی قتل ——— کی کہانی ہے، اور پھر یہ قانون کی اس کل کی نا اہلیت کی کہانی ہے جو اس کی سزا دینے کے لئے بر سر عمل تھی۔"

——— فاضل ایڈیشنل سیشن جج کی رائے میں جس نے یہ مقدمہ سنا ہے، مانک اور جہان خان[1] جو چچا بھتیجے ہیں، دونوں اپنی بدمعاشانہ کارروائیوں کے لئے مشہور، معروف مجرموں اور ڈاکوؤں کی خدمات خریدتے رہتے ہیں۔ یہ اس قسم کے اشخاص کو اپنی پناہ میں رکھتے ہیں۔ اور پھر جب کبھی ان کی خدمات کی ضرورت ہوتی ہے تو ان کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں انسانیت کے لئے موجب ننگ ہیں۔

موجودہ اسمبلی کے انتخابات میں جو مارچ ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئے تھے، جہان خان کا چچا مانک میاں گوندل کے حلقۂ انتخاب سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار رکنیت بنکر کھڑا ہوا۔ اس کا مقابلہ ولی محمد آزاد امیدوار نے کیا۔ منڈی بہاؤالدین کی نشست کے لئے خود جہان خان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اور ولی محمد کا ایک رشتہ دار مسمیٰ سید محمد جناح عوامی لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے ہوئے۔ اس مقابلے کے دوران میں باتری (مقتول) نے اپنے بھائی ولی محمد اور اپنے رشتہ دار سید محمد کے لئے سرگرمی سے کام کیا۔ مانک اور جہان خان دونوں نے شکست کھائی اور ولی محمد اور سید محمد مجلس آئین ساز کے رکن منتخب ہو گئے۔ انتخابات کے نتائج کے اعلان کے چند ہی ہفتے بعد، اور زیادہ قطعیت سے کہا جائے تو ۱۲ اپریل ۱۹۵۲ء کو سہ پہر کے وقت موضع لسال کی آبادی کے باہر گولی مار دی گئی۔ دس اشخاص پر جو ایک دوسرے کے اعزہ واقربا ہیں جن میں مانک اور جہان شامل ہیں، اس قتل کے واقعہ کا الزام عائد کیا گیا، بہر دو مسمیان مذکور کی حد تک یہ الزام صرف اس حد تک تھا کہ انھوں نے قتل میں مدد کی ہے جو بقیہ آٹھ ملزموں کے ذریعے عمل میں آیا۔"

بیچ میں یہ بات بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ پولیس کی تحقیقات کے بعد اور اس کے بعد ابتدائی عدالتی تحقیقات سے معاملہ آگے نکلا تو ملزمین سیشن جج گوجرانوالہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ لیکن مقدمہ کی کارروائی ایم اے رحمٰن سیشن جج سیالکوٹ (جو بزمانۂ عہدہ گوجرانوالہ کے ایڈیشنل سیشن جج بھی ہیں) کے سامنے انجام پائی۔ تاریخی مقدمہ کے اس حصے پر عدالت عالیہ کا ریمارک یہ ہے کہ:-

"گوجرانوالہ ڈویژن کے سیشن جج نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر (جن کی بیچ موصوف سے جواب طلبی کی جا رہی ہے) اس اہم مقدمے کی سماعت خود کرنے کو پسند نہیں کیا۔"

پھر آگے کیا ہوا:-

[1] مشہور سابق ایم، ایل، اے جہان خان بسال

"تینوں اسیسران جو سماعت مقدمہ میں شریک تھے، بلا اختلاف اس سے یہ رائے دیتے ہیں کہ الزام کے مطابق جرم تمام مجرموں کے خلاف ثابت ہو گیا ہے"

لیکن ایڈیشنل سیشن جج نے اسیسران سے اختلاف کرتے ہوئے تمام ملزمین کو صاف بری کر دیا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس نتیجے سے عدم اطمینان کی بنا پر صوبائی حکومت سے سیشن جج کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کرنے کی تحریک کی۔ دوسری طرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی تحریک پر صوبائی حکومت کے فیصلے صادر ہونے سے پہلے ہی ولی محمد برادر مقتول نے فیصلہ بریت کے خلاف درخواست نظرثانی ہائی کورٹ میں پیش کر دی۔ ہائی کورٹ نے بری شدہ ملزمین کے خلاف نوٹس جاری کر دیئے مگر:-

"اس صورت حالات کا علم رکھنے کے باوجود صوبائی حکومت نے اپیل کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی تحریک کو مسترد کر دیا"

اب یہ ایک عجیب پیچیدگی ہے کہ عدالت عالیہ ایک فیصلے کو غلط یقین کرنے کے باوجود بے بس ہے کہ اس کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق بدل سکے، کیونکہ یہی صورت ممکن ہے جبکہ اپیل اس کے سامنے دائر ہو، اور اس چیز میں حکومت رکاوٹ بن گئی ہو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ عدالت عالیہ موجودہ فیصلے کو خلاف انصاف قرار دے کر ازسرنو کسی ماتحت عدالت کو کارروائی کرنے پر مامور کرے، لیکن اس میں خلل یہ ہے کہ اب ہر ماتحت عدالت عدالت عالیہ کے ریمارک سے کسی نہ کسی حد تک اثر پذیر ہو کے رہے گی اور یہ چیز قانون و عدل کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ اس پیچیدہ پوزیشن میں گھر جانے پر فیصلے میں جسٹس منیر صاف صاف لکھتے ہیں کہ:-

"اس مقدمے میں جرم جو کیا گیا ہے اس بنا پر سیاسی نوعیت رکھتا ہے کہ مقتول ایک فریق سے تعلق رکھتا ہے جس نے برسر اقتدار پارٹی کا مقابلہ کیا، اور پھر ملزمین میں دو ایسے اشخاص شامل ہیں جنھوں نے برسر اقتدار پارٹی کے ساتھ ہو کر انتخاب لڑا ہے۔ اب مانا کہ ملزمین کو بری کر دیا گیا تھا اسیسران نے متفقہ طور پر ان کو مرتکب جرم قرار دیا ہے۔ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی اپنے عدم اطمینان کی بنا پر یہ خیال کیا کہ اگر حکومت نے اپیل کر دی تو جرم ثابت ہو جانے کا نمایاں امکان موجود ہے۔ پھر جب نظرثانی کی درخواست اس عدالت کے سامنے لائی گئی تو اس نے درخواست کو قبول کرتے ہوئے ملزموں کے نام ازسرنو کارروائی کرنے کے لئے اس توضیح کے ساتھ نوٹس جاری کیا کہ معاملہ کے بعض ایسے اہم پہلو ہیں جن کو سماعت کرنے والے جج نے نظرانداز کر دیا ہے یا غلط طور پر سمجھا ہے۔ اب اگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود گورنمنٹ نے اپیل نہ دائر کرنے ہی کا فیصلہ کیا ہے تو پھر صرف دو ہی نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ یعنی یا تو یہ عدالت حکومت کے اعتماد سے محروم ہے، اور یا یہ کہ حکومت اس مقدمے میں جرم کو ثبوت تک پہنچانے سے پہلو تہی کر رہی ہے۔ دونوں صورتوں میں پوزیشن بڑی نازک ہے"

اس بیش گراں کے آئینے میں ہمارے حکمرانوں، ہمارے "ایکشن بازوں" اور ہمارے مسلم لیگی گماشتوں، سب کے روشن چہروں کے خدوخال خوب اچھی طرح نمایاں ہو گئے ہیں۔ فاضل جسٹس یہاں تک وضاحت کرتے ہیں کہ:-

"میری دانست میں یہ پہلا مقدمہ ہے جس میں حکومت نے ایسا طرز عمل اختیار کیا ہے جو اس کا معمول بھی نہیں ہے۔ میں کوئی منفرد مثال بھی ایسے حافظے میں نہیں لا سکتا جس میں اس عدالت کی طرف سے نظرثانی کا نوٹس جاری ہو جانے کے باوجود حکومت نے اپیل نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہو"

اور اسی وجہ سے:-

"میرا اندازہ یہ ہے کہ اس مقدمے میں کہیں نہ کہیں کوئی قانونی غلطی ہوئی ہے۔ اور صورت حالات جو سامنے ہے وہ ان لوگوں کے تحقیقی نقطۂ نظر کا نتیجہ نہیں ہے جو ایسے معاملات میں حکومت کی طرف سے فیصلے کرتے ہیں"

آخر میں فاضل جسٹس نے ملک کے قانون سازوں اور دستوریہ کو مشورہ دیا ہے کہ :-

"یہ انتہائی اہمیت رکھنے والا مسئلہ ہے کہ انتظامیہ کو انصاف کے وظائف میں دخل انداز ہونے یا رکاوٹ ڈالنے کا اختیار کسی صورت میں بھی حاصل نہیں ہونا چاہیئے"

اس معاملے میں ہم اسلامی نظام کے طالب علم تو یہاں تک جانتے ہیں کہ قانون و عدل سے تعلق رکھنے والے معاملات میں عدلیہ کو اتنا آزاد اور با اختیار ہونا چاہیے کہ وہ نہ صرف یہ کہ جس مقدمے کی چاہے دوبارہ تحقیق کا حکم دے سکے بلکہ اس کے علم میں اگر بالواسطہ طور پر بھی (مثلاً کسی مقدمے کی سماعت کے دوران میں) کسی جرم کا ہونا آجائے تو وہ بطور خود معاملے کو اپنے سامنے طلب کر سکے۔ یہ ایک دردناک صورت حالات ہے کہ قانون وامن اور عدل وانصاف کی نگرانی کرنے والا براہ راست یہ جاننے کے باوجود کہ کسی مظلوم کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا، یا کوئی ظالم کسی کی جان، مال اور آبرو پر علانیہ ہاتھ ڈالنے کے بعد دندناتا پھر رہا ہے۔ محض اس لئے کہ معاملہ کی اصل کنجی عدلیہ کے بجائے انتظامیہ کے ہاتھ میں ہے۔

آخری الفاظ میں تو فاضل جسٹس نے اپنا ضمیر اٹھا کر باہر رکھ دیا ہے کہ :-

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ قانون کے تحت میں اس بے انصافی کا ازالہ نہیں کر سکتا جو اس مقدمے میں کی گئی ہے"

ان اقتباسات سے فیصلے کا خلاصہ اور اس کا اصلی جوہر سامنے آجاتا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جسٹس نیر کے قلم نے یہ فیصلہ لکھ کر پاکستان کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اگر عدلیہ انتظامیہ کی دخل اندازیوں کو اسی طرح پبلک کے سامنے نمایاں کرتا ہے تو دنیائے سیاست پر چھا جانے والی خیانت (Corruption) کا ایک بہت بڑا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو کے رہے گا!

کسی ملک کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ انتظامیہ ایک طرف تو رائے عامہ کے تقاضوں سے روگردانی کرنے والی ہو۔ دوسری طرف عوام جب اپنے کار پردازوں کو بدلنا چاہیں تو انتخابات میں دھاندلیاں کر کے ان کو ناکام بنا دیا جائے۔ اور تیسری طرف عدلیہ کی کارروائیوں میں خلل اندازی کر کے انصاف حاصل کرنے کو بھی عوام کے لیے مشکل بنا دیا جائے۔ اس صورت حالات کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ عوام کا اعتماد نظم ونسق اور قانون سے بالکل اٹھ جائے اور اجتماعی مایوسی اور بددلی کوئی ایسی خطرناک صورت اختیار کر جائے جو نہ باشندگان ملک کے لیے موجب خیر ہو، نہ حکمرانوں کے لئے۔

اقبال کا تصور جماعت

صاحب مضمون کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ مضمون کے ساتھ صرف سیکرٹری
اقبال سوسائٹی ۱۰۔ کچہری روڈ۔ کراچی درج ہے۔

اقبال کے کلام کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقبال کی فکر و نظر میں جماعت کا تصور من و عن وہی ہے جو اسلامی تعلیمات نے سارے عالم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اقبال کا پورا فلسفہ اسلام کا مرہون منت ہے۔ ان کی فکر دقیق نے جب مسلم قوم کی زبوں حالی اور اس کے ادبار کے اسباب پر بینائی حاصل کرنا چاہی تو انھیں قرآن، حدیث، فقہ اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑا۔ بہت غور اور تعمق کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کی قوم محض اپنے دین کی تعلیم سے غفلت برتنے اور بے عمل ہو جانے کے باعث ذلت میں گرفتار ہے ان کے دیدۂ بینا سے اشک ندامت بہنے لگے۔ اور ان کا دردمند دل پکار اٹھا اور اس نے احساسات کو اپنے زبان قلم سے آشکارا کر دیا۔ انھوں نے [illegible] ہر قومی کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ اسلامی تعلیم کے گوناگوں زاویے اور گوشے واضح کر کے بتائے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو پیش کیا اور صحابہ کرام اور اکابرین امت کے قول و فعل اور عمل و اجتہاد کے اصول نمایاں کئے۔ تاریخ اسلام کے ابواب ان کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔

[illegible] اقبال کے تصورات پر مبسوط مضامین اور محققانہ تصانیف آئے دن منظر عام پر آ رہی ہیں۔ بعض ان کے فلسفۂ خودی و بے خودی کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو بعض ان کے مسلک [illegible] و مذہب کے تخیل کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ فلسفیانہ منطق، تحقیقی نکتہ سنجی اور عالمانہ مباحث سے ہٹ کر اگر ہم ان کے کلام کا ایک [illegible] جائزہ لیں تو یہ بات ظاہر عیاں ہو جائے گی کہ ان کا سارا فلسفہ تمام نکتہ سنجی اور پورے مباحث محض ان کے تصور جماعت میں پنہاں ہیں۔ اور اسی کی تصور جماعت کے وہ اجزائے ترکیبی ہیں۔

اقبال کے ہر مسلک کی بابت جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ وہ محض اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے تو ان کے تصور جماعت کی توضیح کے لئے اسی ترتیب و تسلسل اور طرز و انداز [illegible] سے ہم اسلام [illegible] پیش کریں۔ اس مختصر سے مقالہ میں پوری اسلامی تعلیمات کی تشریح اور اس پر اقبال کے تصور جماعت کا انطباق شرح و بسط کے ساتھ [illegible]۔ اس لئے بسہولت تفہیم کی خاطر مندرجہ ذیل مباحث ان کے کلام کی روشنی میں قابل غور ہیں۔ جن کے عناصر ترکیبی سے ایک جامع خاکہ تیار ہو جائے گا۔ (۱) فرد و جماعت (۲) توحید و رسالت (۳) قرآن (۴) حکومت الٰہیہ۔

فرد | اقبال کے تصور جماعت کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ فرد کے متعلق اس کا کیا تصور تھا۔ کیونکہ کل کی تحقیق کے لئے اجزا اور ان کی ترتیب معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جماعت افراد کا مجموعہ ہوتی ہے جب تک افراد کا تجزیہ نہ کر لیں جماعت کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔ عمارت کی مضبوطی اس کے اجزائے تعمیر پر منحصر ہے۔ جب تک اینٹ، مٹی، چونا وغیرہ عمدہ نہ ہو عمارت مستحکم نہیں ہو سکتی۔ فرد جماعت میں اول و آخر ہے۔ اسی کی ہستی سے ظہور جماعت ہے۔ جماعت کا قیام اس کے افراد ہی سے ہے۔ اگر جماعت کا ایک ایک فرد مضبوط و مستحکم ہے تو جماعت لافانی ہو جاتی ہے۔ اقبال کا پورا فلسفۂ خودی اسی فرد و جماعت پر مرتکز ہے۔ چونکہ اقبال کا مخاطب مسلمان ہے اس لئے وہ اسے شاہین سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جو پرندوں کی دنیا کا شہنشاہ ہے اس کا کام فضا پر طاری [illegible]۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اس کا رات دن کا مشغلہ ہے

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا ٭ لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

وہ ایک قلندرانہ شان کا مالک ہے جو اپنی طبیعت میں فقر و استغنا کی قوت رکھتا ہے۔ اسی لئے ؎

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی۔

اقبال اسی شاہین بچہ یعنی مردِ مسلمان کو نصیحت کرتے ہیں کہ تو زمانہ کی ہوا کے ساتھ نہ چل بلکہ زمانہ سے لڑ۔ کیونکہ ؎

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز　　　زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز۔

زمانہ کو چھوڑ کر اپنی ہستی کو پہچان ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی　　　تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل　　　یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

بے ذوقِ نمود زندگی موت　　　تعمیرِ خودی میں ہے خدائی۔

اقبال مسلمان کے لئے اپنی ایک خاص اصطلاح "مومن"[1] بھی استعمال کرتے ہیں، جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث　　　مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

کافر جہادِ زندگانی میں شمشیر پر بھروسہ کرتا ہے اور مومن بے تیغ بھی تو لڑائی سے نہیں ٹلتا ؎

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں　　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

اقبال مسلمان کو خاکِ زندہ[2] بھی کہتے ہیں جو ستارہ کا تابع نہیں ہے۔ اور جس کے مقام کو انجم شناس جان نہیں سکتا۔ غرض مسلمان کو اب اپنی خودی اس قدر بلند کرنا چاہئے کہ خدا ہر تقدیر سے پہلے پوچھے کہ خود تیری مرضی کیا ہے۔ اگر وہ اپنی خودی میں ڈوب جائے تو ؎

ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹیں　　　خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

مگر یہ خودی ہے کیا چیز؟ وہ کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ خود اقبال سے سنئے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم[3]　　　جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

لیکن ہاں! اس سے بڑھ کر ایک اور قوت ہے۔ وہ فقر و استغنا جو امیروں کا امیر اور شاہوں کا شاہ ہے اس کا مقصود قلب و نگاہ کی عفت ہے ؎

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

---

[1] یہ اقبال کی اپنی اصطلاح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کی اصطلاح ہے

[2] خاکِ زندہ کی ترکیب خاص طور پر مسلمان کے لئے نہیں استعمال کی گئی ہے بلکہ یہ من حیث المجموع انسان کے لئے ہے۔

[3] یہ شعر گویا اسی اقبال کا ہے جس نے فلسفۂ خودی پیش کیا لیکن سے لکھتے وقت اس کے سامنے اپنے نظریۂ خودی کی تشریح کرنا تھا۔ فلسفۂ خودی کے اجزاء متفرق مقامات سے تلاش کرنے چاہئیں۔ (مرتب چراغِ راہ)

فرد تنہا از مقاصد غافل است قوتش آشفتگی را مائل است

قوم با ضبط آشنا گرداندش

نرم رو مثلِ صبا گرداندش

پا بہ گل مانند شمشادش کند دست و پا بندد کہ آزادش کند

اسلام میں قومیت کا وسیع اور ہمہ گیر فلسفہ یہ ہے کہ وہ افرادِ عالم کو ایک ہی آدم کی اولاد گردانتا ہے یہی ہے — "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کا
اصول خالص اسلامی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ " - (ہم نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور بھیجا ہے)
اسی کی تفسیر اقبال اس طرح کرتے ہیں ؎

آب و نانِ ماست از یک مائدہ

دودۂ آدم کنفسٍ واحدۃ

خدا کے اس حکم کے بعد ہم دنیا میں یہ دیکھتے ہیں کہ قوموں کے ٹکڑے ٹکڑے محض اس لئے کر دیئے گئے کہ فلاں قوم فلاں مقام پر بستی ہے اور یہ ایک بڑی
غلطی ہے ؎

اے کہ می گوئی متاعِ ما زماست مرد ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

اقبال کہتے ہیں کہ وطنیت ایک لعنت ہے۔ ملت کی اساس وطن پر قائم نہیں کی جا سکتی جن قوموں نے ملتوں کی تقسیم وطن کے لحاظ سے کی ہے
ان کا منشا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے گروہ در گروہ بنا کر ایک کو دوسرے سے بیگانہ کر دیں وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے دوسروں کو برسرِ پیکار
رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کی سب صلاحیتیں آپس ہی کے فساد پر ختم ہو جائیں۔ اور سیاست اپنے ہاتھ سے نہ جانے پائے ؎

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند

تا وطن را شمعِ محفل ساختند نوعِ انساں را قبائل ساختند

مردمی اندر جہاں افسانہ شد آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شد و اقوام ماند

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت

ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت

قوم رنگ و خون اور نسب سے بالاتر ہے۔ اگر قومیں اپنے امتیاز کو رنگ، خون اور نسب کے اعتبار سے قائم کرنا چاہیں تو پھر اس تقسیم کی کوئی حد نہ
[illegible]ل۔ بالآخر ایک قوم دوسری قوم سے نبرد آزما ہوگی جس کا نتیجہ دنیا میں بجز فتنہ و فساد اور لڑائی جھگڑے کے کچھ نہ ہوگا اور امن عالم ہر وقت تہ و بالا ہو
[illegible]ے گا۔ اقبال مسلمان سے کہتے ہیں ؎

نیست از روم و عرب پیوندِ ما نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

قوم تو از رنگ و خوں بالاتر است قیمتِ یک اسودش صد احمر است

گر نسب را جزوِ ملت کردہ ٔ

رخنہ در کارِ اخوت کردہ ٔ

شہ نہ صرف ترجمہ غلط ہو گیا ہے بلکہ آیت کا بے محل استعمال کیا ہی نہیں۔ (مرتب غلام)

توحید: توحید اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے جس مسئلے پر فلسفیانہ بحثیں بہت ہوئی ہیں لیکن اقبال نے اپنے کلام میں اس کو اکثر فلسفیانہ جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ صرف توحید ہی قوموں کی قسمتوں کو بدل سکتی ہے۔ توحید بحث و تحمیص کے لئے نہیں بلکہ عمل کے لئے ہے۔ توحید انسان اور خدا کے درمیان ایک ایسی بردست رشتۂ اتحاد ہے۔

توحید کی قوت عملی اور ہمہ گیر اثر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اگر فرد اس عقیدے کو جزو ایمان قرار دے لے تو پھر وہ آزادی و حریت کے اس بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے لگتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز اس کو زیر نہیں کر سکتی وہ بڑی سے بڑی قوت اور زبردست سے زبردست طاقت سے ٹکرا جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

فرد و جماعت پر توحید کا اثر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ فرد اس مسلک سے مربوط ہو کر لاہوتی کے درجے پر پہنچ جاتا ہے اور جماعت ایک بے پناہ طاقت و جمعیت حاصل کر لیتی ہے اور ان دونوں کو وہ کمال بخشتی ہے کہ فرد کو مظہر جمال بناتی ہے تو جماعت کو مرکز جلال عطا کرتی ہے ؎

فرد از توحید لاہوتی شود — ملت از توحید جبروتی شود

بے تجلی نیست آدم را ثبات — جلوۂ ما فرد و ملت را حیات

ہر دو از توحید می گیرد کمال

زندگی ایں را جلال آں را جمال

توحید کے اثر سے فرد کے دل میں سوائے اللہ کے کسی کا خوف پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ فرعون جیسے جابر و متکبر شخص کے سامنے جاتا ہے تو موسیٰ کا سا دل و جگر لے کر جاتا ہے۔ اور اس کے کانوں میں خدا کی وہی آواز (لا تخف) گونجتی ہے اور اس کے دل کو مضبوط بنا دیتی ہے۔ ؎

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود — قلب او از "لا تخف" محکم شود

بخلاف اس کے توحید سے ناآشنا شخص دنیا کی حقیر سے حقیر چیز سے ڈرتا ہے وہ جس چیز میں ذرا سی مضرت یا فائدہ کی صورت دیکھتا ہے بلا تامل و چون و چرا اپنا سر نیاز اس کے آگے جھکا دیتا ہے۔ وہ ایک خدا کو چھوڑ کر سینکڑوں خدا اپنے لئے تیار کر لیتا ہے وہ اس قدر بزدل اور دنی ہے کہ وہ چیزیں جن کو قدرت نے اس کے زیر کیا ہے اپنا معبود اور اپنی اطاعت کا مرکز بنا لیتا ہے۔ اقبال ازسرِنو مسلمانوں کو توحید کا درس دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں ؎

آہ اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں

حرفِ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَر

حالانکہ خدا تعالیٰ کے اس قول کو کہ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (اسی خدا نے زمین کی ساری چیزیں تمہارے ہی لئے بنائیں) اور وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِہٖ (اسی کے حکم سے رات دن سورج چاند تارے تمہارے لئے مسخر کئے گئے ہیں) دہراتے ہوئے فرشتوں کی زبانی آدم سے کہتے ہیں ؎

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں — یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں — تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

غرض کہ تربیتِ نفس کے لئے توحید اکسیر کا کام کرتی ہے وہ اس کے دل و دماغ کو دائمی سکون و راحت عطا کرتی ہے نہ وہ دنیا کی تنگی سے گھبراتا ہے

ف اللہ کے ساتھ کسی دوسرے اِلٰہ کو نہ پکارو۔

اور وہ ان کی شکایت و شکوہ اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور نہ اقوامِ عالم کی حقیقت سے اتنا متکبر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو بھول کر اپنی طاقت و جبروت پر اترنے لگے۔ بلکہ اس کی طبیعت متوازن ہو کر اعتدال کی راہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس کو اپنی ساری زندگی میں ایسا اطمینان کلی نصیب ہو جاتا ہے کہ وہ موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ خدا سے راضی اور خدا اس سے راضی ہو جاتا ہے اور آخر میں خود خدا کہتا ہے۔ یَآ اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً (اے نفسِ مطمئنہ تو اپنے رب کی طرف راضی خوشی سے آجا)

توحید اجتماعی زندگی میں بھی اپنا عجیب و غریب رنگ دکھاتی ہے۔ توحید ہی سے جماعت کے افراد متحد رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو) اسی کی بدولت افراد اللہ کی رسی کو تھام کر ایک ہو جاتے ہیں اور ایسی قوت بن جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت انھیں توڑ نہیں سکتی۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے افرادِ قوم میں مساوات اور یکسانیت پیدا ہوتی ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

افراد میں مساوات قائم ہونے کے بعد ہی صحیح معنوں میں عدل و انصاف جاری و ساری ہو سکتا ہے۔ "وحدتِ الٰہ" کے ماننے کے بعد "وحدتِ آدم"[1] کا قائم ہونا لازمی ہے۔ آج کل دنیا میں قوموں کی تباہی و بربادی کا اصل راز یہ ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے، نہ آدم۔ ہر ایک کا خدا الگ، نسل الگ اور سب کا باوا آدم الگ ہے۔ وہ اپنی تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات اور اعتقادات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل کے لئے ان کا کوئی مرکز نہیں ہے۔

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے — حرم کا راز توحیدِ امم ہے

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب — کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

پیالے شیشۂ تہذیبِ حاضر سے ملا ہے

مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الّا

رسالت رسالت توحید ہی کا ایک جزو قرار دیا جا سکتا ہے اگر ہم نے خدا کو ایک مانا اور تسلیم کر لیا کہ انسانوں کے لئے شریعت اور قانون خدا ہی بناتا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا نے اپنے سارے احکام اپنے رسول اور انبیاء کے ذریعہ دنیا میں بھیجے۔ خدا اگر چاہتا تو فرشتوں یا کسی مافوق البشر کے ذریعہ اپنا کلام نازل کرتا۔ مگر یہ اس کا طریقہ رہا ہے کہ وہ انسانوں ہی میں سے ایک پر اپنا کلام بذریعہ وحی یا الہام بھیجتا ہے۔ تاکہ وہ خدا کے کلام کو اس کے بندوں تک پہنچائے۔ اور اپنے عمل کے ذریعہ دنیا میں ایک سیدھا راستہ اور صحیح عمل چھوڑ جائے۔

انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رسالت ایک ناگزیر شے ہے کیونکہ رسول عام افراد کے مقابلہ میں ایک برگزیدہ ہستی ہوتا ہے۔ اللہ کے احکام کی تفہیم کا ذریعہ سے ممکن ہے تفہیم کے بعد عمل اس سے زیادہ مشکل ہے جب تک رسول اور انبیاء احکام خداوندی کی بجا آوری کا طریقہ عملی طور پر نہ کر کے دکھائیں انسانوں کا ان کو اختیار کرنا دشوار ہے۔

اسلام رسالتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا میں ظہور پذیر ہوا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے علم و عمل اور اخلاق سے دنیا میں ایک ایسی مثال چھوڑی کہ جب تک دنیا رہے گی سارے عالم کے لئے نمونہ و ہدایت کا کام دیتی رہے گی۔ اقبال کہتے ہیں

از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است

---

[1] "وحدتِ الٰہ" اور "وحدتِ آدم" کے باہمی لازم و ملزوم ہونے کو صاحبِ مقالہ نے محسوس کر کے بڑی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ (چراغِ راہ)

آں کہ شانِ اوست یہدی من یرید | از رسالت حلقہ گردِ ما کشید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما | از رسالت دینِ ما آئینِ ما (رموزِ بے خودی)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ (لوگو! تمہارے لئے خدا کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ تصدیق کرتے ہوئے فرماتا ہے ۔ اِنّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیم (اے رسول! بے شک تو اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر ہے)۔

اقبال اسرارِ خودی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش | تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید | قوم و آئین و حکومت آفرید
ماندِ شب ہا چشمِ او محرومِ نوم | تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز | دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمین تیغِ او | قاطعِ نسلِ سلاطین تیغِ او
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد | مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
در نگاہِ او یکے بالا و پست | با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
لطف و قہرِ او سراپا رحمتے | آں بیاراں ایں بہ اعدا رحمتے

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
مکہ را پیغامِ **لاتثریب**[1] داد

دنیا کے بہترین تعلیم، بلند و بالا فلسفہ اور بڑی بڑی ہدایتیں اپنی کامیاب تاثیر نہیں دکھا سکتیں جب تک کہ اس کا پیش کرنے والا اس پر عمل کرکے اس کی تصدیق نہ کردے۔ افراد اور افراد کی زندگیوں کے لئے دائرۂ عمل اور جادۂ راہ صرف پیغمبر اور رسول ہی پیدا کرتے ہیں اور عمل کی وہ توفیق بہ بخشتے ہیں کہ اگر کوئی اس کو اختیار کرے تو آن کی آن اس کی تقدیر ہی بدل جائے۔ اجتماعی زندگی میں انھیں بزرگ ہستیوں کے نیک اعمال اور بہترین زندگیاں دیرپا اثرات چھوڑتی ہیں۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں وہ کم و بیش انبیا اور رسل کے پورے اعمال یا اُن کے کسی حصے یا جزو پر عمل پیرا ہوکر زندگی کے بڑے مرتبے پر پہنچے ہیں۔

مسلم قوم کے لئے محمد رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ کافی ہے جو اس کو دین و دنیا دونوں کی فلاح و بہبود عطا کرسکتا ہے۔ آپ نے اپنی محنتِ شاقہ اور عملِ مسلسل سے عرب جیسی جاہل قوم کی ایسی تربیت کی کہ وہ ساری دنیا کے رہبر بن گئے۔ آپ نے اپنی انفرادی، اجتماعی اور خانگی زندگی کی ایسی واضح اور بین مثالیں چھوڑی ہیں کہ مسلمان آج بھی اپنی زندگی کے سارے مسائل اور الجھنوں کو محض ان کی پیروی سے حل کرسکتا ہے۔ اقبال توحید و رسالت ہی کو ملتِ محمدیہ کا مقصود تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مقصودِ حیات کے ترک سے قوم کی موت واقع ہوتی ہے۔ ؎

مرگِ فرد از خشکیٔ رودِ حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

---

[1] (لاتثریب علیکم الیوم) آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں۔

قرآن | ہر جماعت اور قوم کے لئے ایک آئین زندگی درکار ہے۔ بغیر اس کے مقصد زندگی کا پتہ نہیں چلتا اور بغیر مقصد کے زندگی محال ہے۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے نبی برحق نے خدا کا وہ کلام پیش کیا جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور یہ ان لوگوں کی ہدایت اور رہبری کرتا ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ مسلمان اسی سے دین و دنیا کی فلاح و بہبود کا راستہ دریافت کرتے ہیں۔ اقبال کلام الٰہی کے بارے میں کہتے ہیں ؎

حرف او را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

(رموز بے خودی)

قرآن کریم ہی نے مسلمانوں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کیا۔ ان کے مقصد زندگی کو ظاہر کیا اور دین و دنیا کے تمام مسائل کو کھول کر رکھ دیا۔ خدا نے ان کو ان کے اختتامی کتاب دی جس کی حفاظت وہ خود کرتا ہے۔ گویا اس نے ایک وفاقی کتاب دیگر ان لوگوں کو بھی عطا کر دیا جن کے ہاتھوں نے اس کتاب کو مضبوطی سے تھاما ہے۔ ؎

امت مسلم ز آیات خداست — اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست

از اجل این قوم بے پرواستے — استوار از نحن نزلنا ستے (رموز بے خودی)

دنیا میں مسلمان بغیر قرآن کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ قرآن ہی ایک ایسا آئین ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ میں قیامت تک رہے گا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اپنے آغاز سے لے کر حشر کے میدان میں جمع ہونے تک، ایک ہی قانون پر عمل کریں گے، ان کا ایک ہی مقصد زندگی ہوگا۔ ایک ہی راہ عمل ہوگی اور ایک ہی آغاز و انجام ہوگا۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا فرض عین یہ ہے کہ وہ قرآن کی حفاظت کریں اور ان کا دین یہ ہے کہ حق کو فاش کیا کریں ؎

گر تو خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

از یک آئینی مسلماں زندہ است

پیکر ملت ز قرآں زندہ است (رموز بے خودی)

حفظ قرآں عظیم آئین تست — حرف حق را فاش گفتن دین تست (جاوید نامہ)

اقبال مسلمانوں کو قرآن کریم سے دائمی طور پر وابستہ دیکھنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں اس کی اہمیت بیان کر کے کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا قرآن کو چھوڑنا گویا آب حیات کو چھوڑنا ہے۔ جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

از دم و زیر حیات آگہ شوی — ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی

برخلاف اس کے آج کل مسلمان نے قرآن کو صرف زینت محراب بنا دیا ہے اور اس سے وہ اتنا بے خبر ہو گیا ہے کہ اب نہ اس کی زندگی کے آئین میں داخل ہے اور نہ دین و سیاست میں اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ آج کل مسلمانوں پر قرآنی تعلیم کا اثر اگر باقی نہیں ہے تو اس کی توجیہ بیان

---

[1] ذٰلک الکتاب لاریب فیہ (یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں)

[2] ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (تم خدا کے طریقے کو کبھی تبدیل ہوتا ہوا نہ دیکھو گے)

[3] تخلیق عالم کے موقع پر خدا تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو پیدا کر کے پوچھا (الست بربکم کہ اے لوگو! کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) تو جواب ملا قالوا بلیٰ (ہاں تو ہمارا رب ہے)

[4] ہدی للمتقین (ہدایت متقیوں کے لئے ہے)

[5] انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (ہم نے یہ کلام نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرتے ہیں)

کہ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ قرآن کا منزلِ مقصود اور ہے اور مسلمانوں کے جدید رسم و آئین اور۔ کیونکہ ان کے دل میں آتشِ شوق باقی نہیں رہی اور اللہ کے پاس کے سینہ میں تعلیمِ مصطفیٰ زندہ ہے ؎

منزل و مقصود قرآن دیگر است — رسم و آئینِ مسلمان دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآن بر نخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد (جاوید نامہ)

حالانکہ قرآن نے دنیا میں کیسے کیسے انقلاب برپا کئے۔ اس نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ کاہن و پاپا کے نقشوں کو باطل کر دیا یہ ایک طرف تو انسانوں کی زندگی کے سامان مہیا کرتا ہے تو دوسری طرف خواجہ ہزار ساز و سامان کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے یہ انسان کی فکر کو کامل بناتا ہے۔ زندگی و موت کا محاسبہ سکھاتا ہے ؎

نقشِ قرآن تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — این کتابے نیست چیزے دیگر است (جاوید نامہ)

اور قرآن کے بغیر ؎

جز بقرآن ضیغمی روباہی است — فقرِ قرآن اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآن اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدم جز بذکر (جاوید نامہ)

چیست قرآن خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ (جاوید نامہ)

برگ و ساز او ز قرآنِ عظیم — مردِ درویشے نگنجد در گلیم
(پس چہ باید کرد ...)

فقرِ قرآن احتسابِ ہست و بود — نے رباب و مستی و رقص و سرود
(پس چہ باید کرد ...)

واقعہ در اصل یہ ہے کہ صدیوں کی غلامی نے مسلمانوں کو قرآن سے بے خبر کر دیا ہے۔ بلکہ اب انھیں غلامی ہی میں مزا آنے لگا ہے۔ اور ان کا خیال ہو گیا ہے کہ نعوذ باللہ یہ کتاب ناقص ہے جو انھیں غلامی کے طریق نہیں سکھاتی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کے نفس میں سوزِ جگر باقی نہیں رہا۔ اس لئے اب قرآنِ سحر میں لطف نہیں آتا ؎

ساز قرآن را نواہا باقی است — محفلِ ما بے مے و بے ساقی است (جاوید نامہ)

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق (ضربِ کلیم)

لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند — در نفس سوزِ جگر باقی نماند
(پس چہ ..... اقوامِ شرق)

اس غلامی نے سرمایہ داری کو مسلمان کا دین بنا دیا۔ اُدھر فقیہہ و ملا قسم کے مسلمان کم نظر و کم سواد ہو گئے۔ حد تو یہ ہے کہ فقیہ کا عالم یہ ہے کہ خود بدل جانے کے بجائے قرآن کے مطالب کو بدل کر اپنے مفید مطلب بنا لیتے ہیں ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں (ضربِ کلیم)

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق (ضربِ کلیم)

اے کہ می نازی بقرآنِ عظیم — تا کجا در حجرہ می باشی مقیم

ہر یکے حاملے قرآن و خبر — در شریعت کم سواد و کم نظر (پس چہ باید کرد)

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب — العجب ثم العجب ثم العجب (جاوید نامہ)

غرض مسلمانوں کو وہ نصیحت کرتے ہیں کہ قرآن کو مثلِ آئینہ اپنے روبرو رکھیں کیونکہ یہ قرآن وہی ہے جس کی قرأت نے عمرؓ جیسے اسلام کے شدید مخالف کی تقدیر بدل دی ۔ اور وہ اس کے ایسے والہ وشیدا ہوگئے کہ اس کی مثال ہی نہیں ملتی ؎

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز — دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز (پس چہ باید کرد)

تو میدانی کہ سوزِ قرأتِ تو — دگرگوں کرد تقدیرِ عمر را (پس چہ باید کرد)

مسلمانوں نے ایک قرآن کو بند کرکے فتنوں کے ہزار دروازے کھول دیئے ۔ ادھر برہمن کا حال یہ ہے کہ اس نے اپنے طاق کو بتوں سے سجالیا ہے اور ادھر مسلمان نے قرآن کو سرِ طاقِ نسیاں رکھدیا ؎

در صد فتنہ را بر خود کشادی — دو گامے رفتی و از پا فتادی

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست — تو قرآں را سرِ طاقے نہادی (پس چہ باید کرد)

غرض مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنی فکر کو قرآن سے روشن کریں ۔ وہ قرآن ہی میں غوطہ زن ہوجائیں ۔ تاکہ وہ جدتِ کردار حاصل کرسکیں ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از امّ الکتاب (جاوید نامہ)

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار (ضربِ کلیم)

اسلام کی مرکزیت یہ ہے کہ اس کا حرم، اللہ اور قرآن ایک ہے ۔ اگر مسلمان بھی ایک ہوجاتے تو اچھا ہوتا ۔ زمانۂ سلف کے مسلمان حاملِ قرآن ہوکر معزز تھے مگر اب یہی مسلمان تارکِ قرآن ہوکر ذلیل و خوار ہوئے ۔ ؎

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک (بانگِ درا)

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر — اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر (بانگِ درا)

حکومتِ الٰہیہ :- اسلام کے بنیادی مسائل توحید، رسالت اور معاد ہیں، جن کا مرکزی تخیل یہ ہے کہ دنیا سے برائیاں مٹیں اور نیکیاں قائم ہوں ۔ برائیوں کو ساقط کرنا اور نیکیوں کو پھیلانا کسی فردِ واحد کے بس کی بات نہیں ۔ یہ کام صرف ایسی جماعت کا ہے جس کے افراد اخلاقیات کے اس بلند درجہ پر فائز ہوں جس کا اسلام نے اپنے احکامات کے ذریعہ اعلان کیا جس کو اصطلاح میں صالح کہا جاتا ہے یہی صالح افراد اپنے کردار و گفتار کی خلاقی طاقت کے ذریعہ انسانی زندگی کو سانچے میں ڈھالتے ہیں اور عوام کو صراطِ مستقیم دکھاتے ہیں ۔ ان صالحین کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہوتا ہے ۔ اور ان کا یہی عمل خدا کے نزدیک عملِ صالح ہے ۔ جب افراد کا عمل صالحیت کے مرتبہ پر پہنچتا ہے تو خدا اُن کو دین و دنیا کی برتری عطا کرتا ہے اور دنیا کی خلافت و بادشاہت انہیں کے لئے مختص ہوجاتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ اپنے اسی منشاء اور اسی سنت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے ۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ ... (جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیا ان کے لئے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین کی خلافت عطا کرے جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی تھی)

۲۔ پھر فرمایا ہے: ان الارض یرثها عبادی الصالحون۔ (زمین کے وارث صرف صالح افراد ہو سکتے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے صالحیت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

یؤمنون باللہ والیوم الآخر ویامرون بالمعروف وینهون عن المنکر ویسارعون فی الخیرات و

اولئک من الصالحین۔ (جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں اور جو نیکیوں کا حکم دیتے ہیں برائیوں کو منع کرتے ہیں اور جو اچھے

کاموں میں جلدی کرتے ہیں وہی نیک اور صالح ہیں)

حسب بالا ارشادات خداوندی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ سے سنت اللہ یہی رہی ہے کہ وہ دنیا کی حکومت صالح افراد کو عطا کرتا ہے

جو دنیا میں اعمال صالح کو قائم کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں حکومت قائم ہی نہیں ہوتی جب تک کہ ملک میں امن قائم نہ ہو۔ برائیاں دفع نہ ہوں اور

نیکیاں نہ پھیلیں۔ حکومت ہی ایک ایسا طاقت ور ادارہ ہے جو دستور اور قانون کی مدد سے اخلاق کی حدیں معین کر کے تمدن کو پھیلاتا ہے۔ اگر اس

حکومتی ادارہ کے افراد اخلاق سے معرا ہوں تو نظام حکومت بھی غلط ہو جاتا ہے اور حکام وقت جماعت کی خدمت کی بجائے اپنے نفس کی خدمت کر کے

ایک فساد پیدا کر دیتے ہیں جس کے باعث نیکیوں کا سرسبز ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے صالح افراد قوم و جماعت کی فلاح و بہبود کے شوق

خودی کو فنا کر کے اور انفرادی انا کی نفی کر کے اجتماعی انا کو پیکر اخلاق بنا دیتے ہیں۔ اسلام کے حکومت الٰہیہ کا بنیادی تخیل اسی مندرجہ اصول پر قائم ہے

اس اسلامی نظریہ کے تحت جب ہم اقبال کے تصور جماعت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کو ایک اسلامی سلطنت کے لئے

بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ شرعی دستور میں زمین کی ملکیت کے بارے میں خدا کے اس قول کے تحت کہ۔

ان الارض للہ یورثها من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔

(زمین کا مالک خدا ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور انجام کار کی کامیابی صرف خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ہے)

خداوندان حکومت سے اپنی ایک نظم "الارض للہ" میں سوال کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نور آفتاب؟

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں! تیری نہیں!

تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں! میری نہیں! (بال جبریل)

مدعا یہ کہ کائنات میں جب سارا عمل دخل صرف خدا کا ہے تو پھر یہ زمین بندوں کی کس طرح ہو سکتی ہے۔

شریعت اسلامیہ کے اسی دستور کو سراہتے ہوئے "ضرب کلیم" میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں۔

پھر فرماتے ہیں ؎

نقشِ باقی اکبار باقی
الحکم للہ الملک للہ (ضرب کلیم)

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری (بانگ درا)

ٹ۔ اقبال کی پریشان خیالیوں میں سے ایک یہ ہے کہ زمین کو وہ انفرادی ملکیت کے دائرے سے خارج سمجھتے ہیں (چراغ راہ)

برخلاف اس کے جن لوگوں نے یا جن قوموں نے اس زمین کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دیا انہوں نے گویا خدا کے وجود کو بھلا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی طاقت اور دبدبہ کے بل پر مخلوقِ خدا کا خون بہایا اور اپنے نفس کو تسکین دینے کے لئے ایسے ایسے جرم کئے کہ انسانیت اب تک ماتم کناں ہے۔ انہوں نے اپنی تلوار کی دھاک سے انسانوں کے گلے کے گلے اپنے زیر کئے لیکن ان کے دلوں میں کبھی کوئی جگہ نہ پیدا کر سکے۔ انہوں نے شہروں اور بازاروں میں بہتیرے نکالے لیکن دلوں کی دنیا ویران کر دی۔ اقبال ہی کے متعلق یوں کہتے ہیں ؎

زیرِ گردوں آمری از قاہری است — آمری از ما سوی اللہ کافری است (جاوید نامہ)

دیدم چو جنگ پردۂ ناموس بردرید — جز لیگ ملوک و خمیم مبین نبود (پیام مشرق)

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ انّ الملوک[1] — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

اصل شاہی چیست اندر شرق و غرب
یا رضائے امتاں یا حرب و ضرب (پیام مشرق)

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری (بانگِ درا)

حکومت الٰہیہ کے کارکنوں کا مقصود ہی اللہ ہوتا ہے ان کا عقیدہ خدا کا یہ ارشاد ہے کہ

لم یکن لہٗ شریکٌ فی الملک (اس کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں)

ہاں اس کو بس زمین پر بس اتنا ہی اختیار ہے کہ خدا نے بندہ کو اپنا نائب بنایا۔ (ھو الذی جعلکم خلیفۃ فی الارض۔ (اسی خدا نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا) اسی نیابت اور خلافت سے بنی آدم دنیا میں بزرگ و برتر بنا۔ ولقد کرمنا بنی آدم (ہم نے آدم کی اولاد کو بزرگ بنایا) خدا کی عطا کی ہوئی یہی بزرگی انسان کو اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکنے نہیں دیتی اب وہ اپنے آقا کے احکام کی بجا آوری کو اپنا مقصد زندگی بنا لیتا ہے۔

آنکہ حیٌّ لایموت آمد حق است — زیستن با حق حیاتِ مطلق است (زبورِ عجم)

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست — حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست (رموزِ بے خودی)

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے — گر مسلمانی نیاسائی دمے (رموزِ بے خودی)

یہ بزرگی یا سروری جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے دی گئی ہے وہ اپنی بڑائی جتانے کے لئے نہیں بلکہ مخلوقِ خدا کی خدمت گری کے لئے ہوتی ہے وہ ملک میں عدل و انصاف قائم کرتا ہے اور خود فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں ؎

سروری در دینِ ما خدمتگری است — عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است (پیام مشرق)

آن مسلمانان کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند

در امارت فقر را افزودہ اند — مثلِ سلمان در مدائن بودہ اند

حکمرانے بود و سامانے نداشت — دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت (پیام مشرق)

---

[1] انّ الملوک اذا دخلوا قریۃً افسدوھا وجعلوا اعزّۃ اھلھا اذلّۃ (بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے معززوں کو ذلیل کر دیتے ہیں)

جب بنی آدم کے دل میں یہ چیز بیٹھ جائے کہ یہ سارا ملک خدا کا ہے تو پھر یہاں کی ہر چیز خدا کی ہے اسی طرح سے حنیفا ہر چیز ایک شخص امانت ہے جس سے جو ایک مسلم و قوم جس کو جزوی سونپی جاسکتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر یہاں کی ہر چیز کو وراثت مال قرار دیں تو یہ کام صرف فیصلہ نہیں ہو سکتی ہے۔ ابلیسیوں کا کام سوائے شور و فساد پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ؎

اے کہ می گوئی متاع ما از ماست — مرد نادان این ہمہ ملک خداست
ارض حق را ارض خود دانی بگو — چیست شرح آیۂ لاتفسدوا!
ابن آدم دل بابلیسی نہاد — من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکار خود نبرد — اے خوش آن کو ملک حق با حق سپرد (جاوید نامہ)

اللہ تعالیٰ نے استخلاف فی الارض کے جو وعدے کئے ہیں وہ کسی قوم سے نہیں کئے۔ بلکہ ایسی جماعت سے کئے ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو خیر امۃ اور اُمۃ وسطاً ثابت کر دے۔ اقبال مسلمانوں کو یہی سبق یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں ؎

می ندانی آیۂ ام الکتاب ؟ — امت عادل ترا آمد خطاب
آب و تاب چہرۂ ایام تو — در جہاں شاہد علی الاقوام تو (رموز بیخودی)

اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (ہم نے انسان کو بہترین اعتدال پر پیدا کیا)
اقبال کا خیال ہے کہ اگر مسلمان خدا کے اس قول کے مطابق ہونا چاہتے ہیں تو انہیں شریعت پر چلنا چاہئے۔ تاکہ ان کی ایمانی قوت کا وہی عالم ہو جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا۔ ؎

از شریعت احسن تقویم شو — وارث ایمان ابراہیم شو (پس چہ باید کرد ۔ ۔ ۔)

ضروری اعلان

ہمیں افسوس ہے۔ کہ "چراغِ راہ" کی اشاعتِ خاص "پاکستان کے پانچ سال نمبر" اگست تک پیش نہ کی جاسکی۔ اس کی بڑی وجہ اہلِ قلم کا عدمِ تعاون ہے۔ اس وقت سات آٹھ مقالات موصول ہو چکے ہیں۔ اور بقیہ وعدے ہیں ۔ ان حالات میں اندازہ یہ ہے کہ مذکورہ اشاعتِ خاص اکتوبر تک پیش کی جاسکے گی۔

(مینجر)

نعیم صدیقی

عورت کا فطری مقام

پچھلے دنوں ایک دلچسپ کتاب پر نظر ڈالنے کا موقع ملا ہے یہ سوئٹزرلینڈ کے ایک ذہین مگر عیسائیت پسند مصنف W. ROPKE کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا اصل ایڈیشن مصنف کی اپنی قومی زبان میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے پانچویں ایڈیشن کا ترجمہ انگریزی زبان میں امریکہ سے "ہمارے دور کا سماجی بحران" (The Social Crisis of Our Time) کے نام سے شائع ہوا W. ROPKE نہ تو سرمایہ دارانہ نظام سے مطمئن ہے اور نہ اشتراکی ہمہ گیر اسٹیٹ پر راضی ہے بلکہ وہ مادہ پرستانہ تہذیب کے دونوں ہی مظاہر کو انسانیت کے لئے موجب مصائب سمجھتے ہوئے ایک تیسرا راستہ (Third way) نکالنا چاہتا ہے۔ تیسرے راستے کے جو خدوخال اس نے پیش کئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ کسی وقت ان کا حسن پیش کر دیں۔ کیونکہ W. ROPKE کے نتائج فکر تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لئے بڑی دلچسپی کا موجب ہوں گے ــــــ آخر آپ حضرات بھی دنیا کے آگے ایک "تیسرا راستہ" پیش کرنے آئے ہیں۔

یہاں ہم اس کا نقطۂ نظر عائلی زندگی کے متعلق بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وہ موجودہ مادہ پرستانہ اور مشینی نظام کی تصویر کھینچتے ہوئے مذہب اور اخلاق کا خلا، اجتماعیت سے پُر کرنے کی خطرناک حرکت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"اس کا سب سے زیادہ قابل تشویش نتیجہ خاندانی نظام کا انتشار ہے جو تیرہ ایک معاشرے کے مریض ہونے کا لازمہ ہے۔ بہ خصوصیت کے ساتھ یہ نمایاں ثبوت ہے اس بات کا کہ "سیاسی اور اقتصادی اجتماعیت" کس بری طرح سے صحت مند انسانی زندگی اور صحیح استوار شدہ سوسائٹی کی جڑوں پر گہرائی تک اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس مادہ پرستانہ اجتماعیت نے معاشی اور سماجی پہلوؤں سے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ جن کے تحت خاندان ــــ جو عورت کا فطری میدان کار ہے جو بچوں کی تربیت کے لئے نہایت موزوں ماحول رکھتا ہے اور کسی قوم کے لئے زندگی کا بنیادی سرچشمہ ہے ــــ کمزور تر ہو کے رہ جانا چاہیے۔ یہاں تک کہ ازدواجی تعلق محض ایک عامیانہ قسم کی معاہدت بن کر رہ جائے جس کو ہر وقت طلاق سے توڑا جا سکے۔ کسان اور پیشہ ور طبقوں کے تعلقات کو دو کنار رکھتے ہوئے نیز ایسی مثالوں کو بھی مستثنیٰ کرتے ہوئے جہاں تعلیم نسواں کی تحریک اور کاشتکاروں کی صنعتوں کے احیاء وغیرہ کی تدبیروں سے اصلاح کی صورتیں پیدا کی گئی ہیں، اور جہاں کہیں بھی دیکھو خاندان محض صارفین (Consumers) کی ایک کوآپریٹو کی بن کے رہ گیا ہے ــــ یا زیادہ سے زیادہ اچھے الفاظ میں اسے ایک تفریحی انجمن امداد باہمی کہہ لیجئے ــــ یا معصوم بچوں سے بالکل بے نصیب اور اگر کوئی بچہ ہوا بھی تو کوئی امکان نہیں کہ سرسری تعلیم سے زائد بچوں کی تربیت کا کوئی اہتمام ہو سکے۔ قومی زندگی کے کاروبار نے [illegible] (Public [illegible]) کے نظریات [illegible] تعلیم و تمدن کی تمام اقسام کو [illegible] کی صحت [illegible] ہیں اور اس طرح وہ انسانی [illegible] کو ایک [illegible] طرز پر ڈھال رہے ہیں اور مگر

کوئی بچہ نہیں۔ یہ عورتیں اسی طرح متوازن نہیں ہوتیں اور دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ اعصاب زدہ ہو جاتی ہیں۔

مگر ہمارے پاکستانی مغرب پرستوں کے محبوب دین " دینِ مغربیت " کا صرف ایک ہی مرتد سامنے آیا ہوتا تو ضمیروں پر پتھر رکھا جا سکتا تھا مگر یہ زمین تنہا دین سے خارج ہستیوں کی کیفیت ہے۔ ایک اور عالم Oswald Schwarz ہے - اپنی کتاب نفسیاتِ جنس میں یہ لکھ چکا ہے کہ :-

> عورت کے نظامِ جسمانی کا ایک بڑا شعبہ خاص طور پر حمل ہی کے لئے تعمیر کیا گیا ہے اور اگر کسی عورت کو اس کی جسمانی اور ذہنی ساخت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے روک دیا جائے تو وہ پژمردہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ ——— لیکن ماں بننے کے ذریعہ وہ ایک تازہ اور دوامی جمال حاصل کرتی ہے۔
> ——— اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مردانہ شخصیت عورت سے انتہائی طور پر مختلف ہے۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ لازماً ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک صنف کا وجود دوسرے سے بنیادی حیثیت سے جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ یہ حیاتی اختلافات جن کی نمائندگی عضویاتی پہلو سے ہوتی ہے، صنفین کے جنسی فرائض ——— ایک طرف سے بارآور کرنا اور دوسری طرف سے بار دار ہونا ——— کے ذریعے ظاہری اور حسّی طور پر قابلِ فہم ہے۔

پھر وہ اپنی بات کی مزید وضاحت کرتا ہے :-

> ہمارے جسم کا ہر عضو اپنا تقاضا پورا کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر اسے اس سے روکا جائے۔ تو پورے نظامِ جسمانی کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عورت کے عورت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بچہ ہو ——— اس وجہ سے نہیں کہ وہ مادرانہ جبلت رکھتی ہے۔ اور نہ خارج سے کسی اخلاقی فرض کے عاید کئے جانے کی بناء پر ——— بلکہ اس کا پورا نظامِ عضویات جب تعمیر ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا ہے کہ اس کے بچہ ہو۔ تو پھر اس کے عضویاتی نظام کو اس مقصد کے پورا کرنے سے باز رکھنے کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ محرومی عورت کی پوری شخصیت پر اپنا بُرا اثر ڈالے۔

دیکھئے ان مغربی حکماء کی تاریک خیالی اور ملائیت کی انتہا ! ——— مگر ان کی یہ جرأت قابلِ داد ہے۔ کہ اپنی غلطی ماننے اور اپنے فکر کے خلاف خود ہی احتجاج کرنے بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر فرانسیسی سرجن کارل تو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ :-

> عورت کے تناسلی تقاضوں کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ تقاضے اس کے مطلوبہ ارتقاء کے لئے ناگزیر ہیں۔ پس عورت کو حمل سے نفرت دلانا ایک لغو کوشش ہے۔ عورت کو وہی کی وہی ذہنی و جسمانی تربیت اور ویسی کی ویسی امنگیں نہ دینی چاہیئں جیسی لڑکوں کو دی جاتی ہیں۔ معلمین کو چاہیئے کہ وہ ذکور اور اناث کی ذہنی و جسمانی خصوصیات اور ان کے فطری تقاضوں کی طرف گہری توجہ دیں۔ کیونکہ ان خصوصیات کا لحاظ کرنا ایک مہذب دنیا کی تعمیر کے لئے نہایت اہم ہے۔

اب ایک تیسرے " رجعت پسند " Anthony M. Ludovici کی بھی سُنئے :-

یہ بات نمایاں طور پر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کہ عورت کے لئے ایک خاص عمر کی حد تک ازدواج کی اہمیت پر اس سے زیادہ زور دیا جائے۔ جتنا کہ اب تک ہم دیتے رہے ہیں۔

اور اس کافر دین مغربیت نے وہ بات بھی کہہ دی ہے جسے سن کر "اپوا" کے فلسفے کا سارا محل گر پڑے گا:—

عورت کے لئے لازم ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کے مقابلے میں ہر دوسری چیز کو ثانوی اہمیت دے ——

ایسے لوگ جو تجرد کو غلط طور پر پیش کر کے اس کی طرف عورت کو دعوت دیتے ہیں۔ اور اسے ترغیب دلاتے ہیں۔ کہ اس کے لئے مادریت سے برتر یا اس کے ہم پلہ کوئی دوسرا مشغلہ موجود ہے۔ وہ نہ صرف عورت کے بلکہ پوری نسلِ انسانی کے دشمن ہیں۔

مگر یہ شخص اتنے پر ہی بس نہیں کرتا۔ وہ عورت سے دشمنی کرنے والے ترقی پسندوں کو ان الفاظ میں خوب جھنجوڑتا ہے کہ:—

عورت جو (فطرتاً) زندگی اور اس کی تکثیر کی مصروفیات میں صریح طور پر شانوں تک ڈوبی ہوئی ہے —— صاف صاف اور بلا تحفظ یہ کہنے دیا جائے کہ —— وہ تمام لوگ جو اسے یہ پٹی پڑھاتے ہیں۔ کہ کوئی دوسرا مشغلہ اس کا اصل مشغلہ ہے اور وہ تمام لوگ جو جدید مسائل کی الجھنوں کے ہوتے ہوئے عورت کو زندگی اور اس کے عملِ تکثیر سے ماوراء کسی اور قسم کی معیاری نسائیت کی کہانیاں سنا سنا کر ذہنی پریشانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ اور بالجملہ وہ تمام کے تمام لوگ جو اسے فریب دیتے ہوئے مرد اور بچے کے معاملے میں اپنا بنیادی موقف درست لئے بغیر کسی طرح کی خوشی، اطمینان اور تسلی کا جھانسہ دلاتے ہیں۔ وہ جھوٹے لپاٹیے۔ بے ایمان اور مجرم ہیں۔

جانے کتنی صدیوں پہلے کا آدمی ہے یہ، قبر پھاڑ کے کوئی پرانا مردہ نرحی اٹھا ہو۔ جو اس روشن اور مہذب دور میں عورت کا یہ سکھانے اٹھا ہے کہ وہ مرد اور بچے کی ہو کر رہے! مگر اس حقیقت کا کیا علاج کہ یہ بالکل اس دورِ جدید کا عالم ہے اور ٹھیک اسی دنیائے مغرب کی مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ جس کی پرستش کو کچھ لوگوں نے اپنے لئے انتہائی سعادت سمجھ رکھا ہے۔ پھر کیا ہم توقع کریں کہ اس "غیر مسلم" کی باتیں سن کر ہمارے مسلمان اکابر کے سر شرم سے جھک جائیں گے؟

آیئے اب ایک ڈاکٹر کا نتیجۂ فکر بھی سن لیجئے۔ ڈاکٹر سولیون (Sullivan) اپنی کتاب Alcohalism میں لکھتا ہے:—

عورتوں کا عام صنعتی کارگاہوں میں بھرتی ہو جانا صرف شادی شدہ ہونے کی صورت میں گھریلو ذمہ داریوں ہی میں خلل نہیں ڈالتا۔ بلکہ یہ لڑکپن کے زمانے میں خانہ داری کا علم حاصل کرنے میں بھی رکاوٹ بنتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طباخی، صفائی، ستھرائی اور بچوں کے رکھ رکھاؤ کے معاملات میں کامل جہالت ہر طرف پھیلتی جا رہی ہے۔ اور اس چیز نے ہمارے ملک کے نچلے محنت پیشہ طبقات سے تعلق رکھنے والی ماؤں اور بیویوں کو انتہائی بے یارومددگار اور فضول خرچ بنا دیا ہے۔ دوسری طرف یہ حالت محنت کار کو جس کی طمانیت عورت پر منحصر ہے۔ اپنے خالی اوقات عام اجتماعی اڈوں پر گذارنے کے لئے مجبور کر رہی ہے۔ بلکہ اس حالت نے اسے اپنی غیر ذائقہ دار اور غیر منہضم غذا کے ساتھ الکوحل کے چٹخارے کو شامل کرنے کے لئے بھی بے چین کر دیا ہے۔

اپنی اس تحقیق کے بعد یہ ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ :-

> کوئی ملازمت جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر عورت کو گھریلو مشاغل سے دور لے جاتی ہے، شرابِ خوری کی عادت کو بڑھانے کا بلکہ مزید یہ کہنا چاہئے کہ پوری نسل کی صحت کے لئے اس لعنت کے اثرات بد میں اضافہ کرنے کا موجب بنتی ہے۔

پھر ایک اور محقق Will Durant اس مسئلہ میں اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :-

> عورت کو صنعت میں لانے کا قدرتی نتیجہ گھریلو زندگی کی تباہی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا پہلا مشغلہ اس سے چھین لیا گیا ہے اور اب "گھر" دلچسپی سے خالی ہو کر رہ گیا ہے اور خود عورت بے مقصدی اور بے اطمینانی کی حالت میں مبتلا ہے۔ گھر جب اس طرح خالی ہو گیا کہ نہ اس میں کرنے کا کوئی کام کیا جاتا تھا اور نہ اس میں زندگی بستی ہو۔ تو اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ مردوں اور عورتوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور اس طرح جو ادارہ دس ہزار سال سے برقرار تھا ایک ہی دو پشت میں تباہ ہو گیا۔

موجودہ غلط تمدن نے عورت سے غلط معاملہ کر کے نتیجہ کیا پیدا کیا؟ اپنے قبلہ ہائے عقیدت اور اپنے اساتذہ کرام ہی کی زبان سے سنئے۔ جارج ریلی اسکاٹ "زناکاری کی تاریخ" میں لکھتا ہے :-

> تاریخ انسانی میں کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ جیسے کہ آج یورپ اور امریکہ کے ہر شہر میں طبقۂ شرفاء کی کثیر التعداد لڑکیاں ہر قسم کے عقلی دلائل سے مسلح ہو کر صنفی تحریک و تسکین کا شکار کھیلنے کے لئے مردوں سے جھک جھک کے ملنے کو تیار رہتی ہیں۔ یہ جدید تمدن کی شوقیہ (بہ مقابلہ پیشہ ور کسبی) بیسوائیں ہیں۔

اسی طرح "محبت اور شادی" (Love & Marriage) کا مصنف پروفیسر سوینسن (Swenson) جنسی فساد پر یوں اظہار خیال کرتا ہے :-

> درمیانہ محنت پیشہ طبقوں کی نوجوان لڑکیوں کی روز افزوں تعداد اپنے لباسوں اور دوسرے آرائشی لوازم کے ذریعے جنسیت سے "نفع اندوزی" کرنے میں بیسواؤں کے ساتھ پوری طرح متعاون ہے۔ ہم اس حقیقت کو صرف مردانہ اور انتہائی درجے کے جاذب فیشنوں ہی سے نہیں دیکھ سکتے ہیں کہ طبقۂ شرفاء کی لڑکیوں کے سرخ کئے ہوئے رخساروں، رنگے ہوئے ہونٹوں اور پالش کئے ہوئے ناخنوں کے طفیل تو یہاں تک اندیشہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ شاید ایک چوتھائی صدی گزرنے پائے گی۔ کہ یہ چیزیں ایک عورت کے خنثٰی ہونے کی علامات بن جائیں گی۔ مختصر یہ کہ طبقۂ شرفاء کی لڑکی اپنے صنفی ودیعہ سے انتفاع کرنے کے لئے پیشہ ور محبت بازوں کی کتاب سے خاصی بڑا کوئی ورق اٹھا لاتی ہے۔

ریلی اسکاٹ مصنف "تاریخ زناکاری" فسادِ معاشرت کے ایک اور پہلو کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے :-

> لڑکیاں شادی کے معاملہ میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کو "موزوں وقت" کے تقاضوں کے مطابق

ہوگی ـــــ ناممکن اس لئے کہ یہ اُن کی حقیقی فطرت کے خلاف ہے۔ اور پھر یہ تاریخ کی رُو کے خلاف ہے۔!

ان خیالات ــــ محض خیالات نہیں۔ گہرے مطالعہ و تحقیق کے نتائج کو ہم اپنے ملک کے متفرنجین کے سامنے رکھ کر پوچھتے ہیں کہ فطرت کے جن مطالبوں کو مادہ پرستی کی وادیوں میں مدتوں ٹامک ٹوئیے مارنے کے بعد مغرب اب محسوس کر رہا ہے ـــ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ بھی یہ سارے ٹامک ٹوئیے مار کر اسے محسوس کریں: اور کیا یہ بات زیادہ مناسب نہ ہوگی۔ کہ آپ پہلے قدم پر ہی سنبھل جائیں۔ ابھی آپ نے کچھ زیادہ راہ تقلید طے نہیں کی ہے۔

آپ سے زیادہ بدنصیب کون ہو گا کہ جبکہ آپ کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سارے خطرات سے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا اور ایک صالح معاشرتی زندگی کے بنیادی اصول اور تفصیلی تقاضے کھول کھول کر بتا دیئے تھے۔ لیکن آپ نے اقوام مغرب کو ان کے خلاف چلتے دیکھ کر یہ سمجھا کہ اسلام کے یہ اصول اور تقاضے اب پرانے ہو گئے ہیں۔ اور اب ان کو لے کے چلنا اپنے آپ کو مذاق بنانا ہو گا۔ اس معاملے میں آپ یہاں تک آگے بڑھ گئے۔ کہ آپ کی قوم کے جو لوگ اسلام کے اصولِ معاشرت کے داعی بننے کی جسارت پر قائم رہ گئے۔ ان کی آپ نے طرح طرح سے تحقیر کی اور ان کو زمانے کے حالات سے بےخبر اور کٹھ ملا قرار دیا ـــ اب دیکھئے کہ آپ کے یورپ کے جدید ترین مفکرین کیا کہہ رہے ہیں:

مَیں ہُوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا!

فرقانِ حمید

شاد عارفی

شاد عارفی نئے دورِ ادب کے لکھنے والوں میں ایک صاحبِ طرز شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہیں آپ نے معاشرے کے کمزور پہلوؤں کو نظم میں پیش کرنے کے لئے واقعہ نگاری کا یہ نیا اسلوب نکالا ہے کہ زیادہ تر متعلقہ کرداروں کی زبان سے وہ مختلف جزئیات کو سامنے لاتے جاتے ہیں اور بیچ بیچ میں ایسے خلا چھوڑتے جاتے ہیں جن کو سامع یا قاری کا ذہن خود بخود پُر کر لیتا ہے اردو شاعری میں شاد صاحب کا یہ بالکل نیا تجربہ ہے (اس سے پہلے صرف قرآن نے تاریخ بیانی میں اس اسلوب کو ایک ناقابلِ رسائی معیار پر استعمال کیا ہے) اور نئے تجربے کرنے والوں کو جو ٹھوکریں فن کی وادی میں کھانی پڑتی ہیں۔ وہ شاد صاحب نے بھی کھائی ہیں۔ مگر اس سے ان کے موجدانہ ذہن کے مرتبہ میں کوئی کمی نہیں آتی۔

شاد صاحب کی یہ نظم (فرقانِ حمید) دیکھ کر پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوا کہ یہ نوجوان شاعر اپنے اکثر معاصرین کی طرح اسلام کے مرکز و محور سے بالکل ٹوٹ کر فضا میں آوارہ نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے بڑی مسرت سے اس نظم کا خیر مقدم کیا۔

شاعر کی طرف سے ہمیں متنبہ کر دیا گیا تھا کہ نظم بغیر کسی ترمیم کے شائع کی جائے۔ سو ایسا ہی کیا گیا ہے۔ البتہ ہمیں جو امور مشورہ کے طور پر عرض کرنے تھے وہ حاشیہ میں عرض کر دیئے گئے ہیں ان میں سے اگر کوئی چیز شاعر کے لئے قابلِ قبول ہو تو فبہا ورنہ وہ چاہیں تو انھیں دیوار پہ دے ماریں۔ ادارہ

جب زباں کاریٔ ابلیس نے پائی تکمیل — نذرِ نسیان و تصرّف ہوئے تورات انجیل
نہ مسیحی رہے باقی نہ بنی اسرائیل — تا بہ کے قصّۂ واژونیٔ ادراکِ عقیل[1]

عقل ٹخنوں میں اُتر آئی تھی بے دینوں کی
کون ہڑبونگ میں سنتا تھا سخن چینوں کی

[1] شاید یہاں "ادراکِ معقول" زیادہ مناسب ہوتا۔ (چراغِ راہ)

تھی نگاہوں میں وہ نیرنگیِ افسونِ ذلیل ۔۔۔ نہ رہی دامِ ضلالت سے نکلنے کی سبیل

دیدہ میں دلائل نہ ثبوت و تاویل ۔۔۔ جگمگانے لگے بت خانۂ[1] آذرِ تمثیل

پتھروں سے ہوئے تخلیق بتانِ محسوس

کٹ گیا رشتۂ انسان و خدائے قدوس

ان بتوں میں وہ عبادت کہ عیاذاً باللہ ۔۔۔ حسبِ موضوع وہ قوت کہ عیاذاً باللہ

بندگی اور وہ بدعت کہ عیاذاً باللہ ۔۔۔ جرمِ ایقان و عقیدت کہ عیاذاً باللہ

نہ ہوا غم جو خدا وقتِ سفر چھوٹ گیا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

الغرض کفر سے معمور تھے اطرافِ زمین ۔۔۔ تھے نئے طرز پہ ہر ملک میں برگشتۂ دیں[2]

عجمی فاشیہ بردار، عرب صدر نشیں ۔۔۔ داخلِ شعر و ادب ہی نہ تھے اصنامِ حسیں

بت اگر محض ہیولیٰ تو پجاری ذی روح

ناطقہ سنگ سے تھا طالبِ امداد و فتوح

ظلمتِ جہل سے تاریک تھا ہر گوشۂ دل ۔۔۔ خود پسندی کو شرِ یرالنفسی تھی شامل

پوجنے والے تھے نااہل، خدا ناقابل ۔۔۔ عقل سیلی زدۂ وہم و گمانِ باطل

استخارے کی ضرورت پہ سہام اندازی

تیر تکوں کے بھروسے پہ حصص افزازی

عزو شانِ بشری ورطۂ ناپاک میں تھی ۔۔۔ "مرگِ آدم" کی جھلک ساغرِ بے باک میں تھی

آبرو خاک بسر، دیدۂ ادراک میں تھی ۔۔۔ عصمتِ زہد و ورع "جادۂ صد چاک میں تھی

[1] مصرع اول زیادہ واضح ہے "کیا ہوا ایک خدا ہاتھ سے گر چھوٹ گیا" [illegible]

[2] یہاں برگشتۂ دیں برگشتگیِ دیں کے معنی میں آیا ہے۔ مصرع کو زیادہ بہتر شکل یہ تھی "اک نئے طرز پہ ہر قوم تھی برگشتہ دیں" [illegible]

امراء القیس کے اشعار زبانوں پہ تھے
بلکہ طاری وہی کردار جوانوں پر تھے

تھی ضرورت کہ زمانہ کو حماقت سوجھے ۔۔۔ دُور کج فہمیٔ تخیل ہو، عظمت سوجھے
تھا مشیت میں کھُلے چشم بصیرت سوجھے ۔۔۔ اور اک مُخبرِ صادق کے بدولت سوجھے

میں ہوں وہ مُخبرِ صادق "وہ صحیفہ میں ہوں
جس نے باطل کئے ادیانِ ضعیفہ میں ہوں

میرے حرفوں سے ضیا بار ہیں پیغامِ خدا ۔۔۔ میرے الفاظ کے پردوں میں ہیں احکام خدا
مجھ سے ظاہر ہوئے مخلوق پہ انعامِ خدا ۔۔۔ حامل سِرّ و معانی ہی نہیں ـــ نامِ خدا

صادق الوعد ہوں فرمانِ خداوندی ہوں
مختصر یہ کہ میں فرقانِ خداوندی ہوں

مجھ کو اللہ نے تفویض کیا اپنا کلام ۔۔۔ یعنی سونپے گئے مجھ کو بھر کے پیام و احکام
مجھ میں اعجازِ فصاحت ہے بلاغت اتمام ۔۔۔ کعبۂ قلبِ مسلماں ہے مری جائے قیام

جلوۂ طور نگاہوں پہ عیاں کرتا ہوں
جو مرے علم کے اندر ہے بیاں کرتا ہوں

میرا ہر قول بجا ناطق و کامل گویا ۔۔۔ میں نے تاریکیٔ گمراہ کا رستہ کھویا
دل میں کینہ کی جگہ تخم محبت بویا ۔۔۔ اُس کو ٹوکا جو سر زانوئے غفلت سویا

[1] زمانہ [illegible] حماقت کو ... "زمانہ کو حماقت سوجھے" [illegible] ... کیا سوجھے؟ (چراغ راہ) [2] یہ مقام ایسا شدید مجبوری کا مقام نہ تھا کہ ... "ادیانِ ضعیفہ کو باطل کیا" کی جگہ "صحیفۂ ضعیفہ باطل کئے" کا غیر محاوراتی انداز اختیار کیا جاتا۔ (چراغ راہ) [3] کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ "ضیا بار ہے پیغام خدا" کے کرخلاف ... میں "پیغام خدا" کو ترجیح دی جائے۔ "پیغام" عشقِ [illegible] ... کی حیثیت سے ... نہیں ہو سکتا (چراغ راہ)
[4] یہاں بھی [illegible] ... کے بجائے ... گیا ہے۔ علاوہ بریں انعام ظاہر ہونے کا معاملہ محل نظر ہے (چراغ راہ)
[5] مجھ کو یا واقعی؟ (چراغ راہ) ... "تاریکیٔ گمراہ" کی ترکیب محل نظر ہے (چراغ راہ)

کیا ارشاد نبیا ہے تو ہوشیار رہو
عملی طور پہ دنیا سے خبردار رہو

ہاتھ سے دامنِ اخلاقِ رذیلہ چھوڑ دو   ماسوا کے درِ بے فیض پہ سر مت پھوڑ دو
طرفِ قبلۂ ذیشاں رُخِ سجدہ موڑ دو   قادر و خالق و قیوم سے رشتہ جوڑ دو

ہے وہی واجب منشائے متینِ سجدہ
نہ اُٹھے اس کی حضوری سے جبینِ سجدہ

جس نے آدم کی فرشتوں پہ جتائی تعظیم[1]   خاک کو جس نے کیا اوجِ ثریا پہ مقیم
جس نے مٹی کے کھلونوں میں بھری عقلِ سلیم   واحد و حاضر و ناظر ابدی حی و قدیم

حکما جس کے لئے عجز پہ مجبور ہوئے
فلسفی دور ہوئے دور ہوئے، دور ہوئے![2]

میرے دربار میں ہمدوش ہیں سلطان و غلام   میں سمجھتا نہیں آزادیٔ انساں تہہِ دام
صورت و رنگ کی تفریق سے مجھ کو کیا کام   مجھے افعال سے مطلب ہے خواص و چہ عوام

فرد ہو جاؤ مساوات میں ہمدردی میں
داب اعدا سے خلل آئے نہ پامردی میں

بات ایسی ہو کہ ٹوٹے نہ کوئی دل جس سے   سعیٔ منزل کہ قدم چوم لے منزل جس سے
صداقت ہو کہ حیراں ہو باطل جس سے   جرأت ایسی ہو پلٹ جائے مقابل جس سے

غمِ محکومی و افتاد گوارہ نہ کرو
تن بہ تقدیر[3] متانت سے کنارہ نہ کرو

[1] تعظیم کی جگہ "مناسب تھا عدہ تسلیم تھا تا عظمت جتانے کا مفہوم نہیں دیتا (چراغ دہلوی) [2] یہاں اندازِ بیان کا حسن سادگی بہت کامیاب ہے (چراغ دہلوی)
[3] حتمی یہ تقدیر کا مدعا معروف اعلیٰ سے متضاد ہے (چراغ دہلوی)

مجھ سے پوچھو

عاصی کرنالی

رات کی ظلمت میں لو دینے لگے سینے کے داغ
اب مناسب ہے کہ گل کر دو ستاروں کے چراغ
آدمی کے خانۂ دل میں ہے ظلمت کا فراغ

آدمی کے لب پہ روشن ہیں تبسم کے چراغ
اب تو ہر چاکِ گریباں اک پرِ پرواز ہے
اب تو دیوانے کی نظروں میں نہ ویرانے نہ باغ
گرچہ مشکل ہے خدا کی جستجو اس دور میں
آج لیکن اس سے مشکل تر ہے انساں کا سراغ
جس کی کرنیں رات کی ظلمت میں بجھ کر رہ گئیں
وہ کوئی تارا ہے یا پیشانی گردوں کا داغ
باغ کے کانٹوں کو الزامِ خلش یونہی نہ دو۔
مجھ سے پوچھو کس قدر نازک ہے پھولوں کا دماغ
جس قدر چاہے بشر کی ذہنیت چھینٹے اڑائے
اس طرح فطرت کے دامن پہ کہاں لگتا ہے داغ

کاروانِ نمود!

ابوالامتیاز ع س مسلم

مضمحل ہو کر سمٹتا جا رہا ہے آفتاب
نیند سے بوجھل ہو جیسے فاختہ کی چشمِ خواب

سو رہی ہے رفتہ رفتہ شورشِ دنیائے دول
جھٹ پٹا برسا رہا ہے اپنا خواب آور سکوں

جلوہ گر ہیں کچھ ذخیرے متاع و مال کے
سامنے پھیلے ہیں حلقے خواہشوں کے جال کے

اک مسہری پر سجا ہے کبر کا جھوٹا وقار
ہنس رہی ہے گلشنِ ہستی کی مصنوعی بہار

صف بصف رنگین حُلّے، ریشمیں اور زرنگار
جیسے رومانی فضاؤں میں ہو پریوں کی قطار

سرد سلیپر، گرم شالیں، کہکشاں گوں ساریاں
جنہیں ہیں سلمے ستارے کی خنک چنگاریاں

نازنیں منقّش دامن میں سنہری جھالریں
جھلملیں لٹکی ہوں جیسے حلقۂ قندیل میں

نرم گدے، گدگدے قالین خواب آور لحاف
میز کرسی، کوچ، صوفے، شہ نشیں، بیچے غلاف

جن میں تصویریں مناظر کی ہیں اور گلکاریاں
بعض میں ماحولِ صحرا، بعض میں مرغابیاں

قدِ آدم آئینہ اک بھاری بھرکم پاندان
پیکدان، حقہ، سلفچی، عطر دان اور مرتباں

مخمل و کمخواب کے، زربفت کے، اطلس کے تھان
کر رہا ہے تبصرہ ان پر ہر اک پیر و جواں

کانچ اور چینی کے ساغر، سونے چاندی کے گلاس
تشنگی بجھ جائے جس سے ان میں ایسا انعکاس

فرش پر آراستہ ہیں شوخ درخشندہ ظروف
چرخ کے صفحہ پہ جیسے چاند تاروں کے حروف

خوبصورت جانماز اک رحل سے لپٹی ہوئی
ہے برائے بیت وہ بھی اک طرف رکھی ہوئی

الغرض اک جزدان میں ہے یہاں قرآن بھی
تاکہ لوگوں کو یقیں ہو ہیں یہ با ایمان بھی

نیز آرائش عجب گلدان اور فانوس بھی
رسم کے گندے صنم خانے میں ہیں ناقوس بھی

استری، بجلی کے پنکھے، پاؤں کی سنگر مشین
پھول سے رومال، مفلر، چیسٹر اور بے قیمتی جین

سینٹ، پاؤڈر، وسلیں، عینک، گھڑی، موزے، میاں
اک دکان کھولی گئی ہے حکمِ قدرت کے خلاف

اس اثاثہ کے سوا ہیں ساز و آلاتِ طرب
مرثیہ مذہب کا ہے، تفریح ہے جس کا لقب

وائلن، طبلے کی جوڑی بھی، گراموفون بھی
رسم کی چوکھٹ پہ دین و آبرو کا خون بھی

میں یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا
میری غیرت کا پسینہ اشک بن کر بہہ گیا

یہ جہیز انبارِ حرص و آز کی تصویر ہے
جس کا ہر نقشِ جلی اسراف کی تفسیر ہے

خواب کے وہمی مناظر کا طلسمی سلسلہ
یا مسلسل حسرتوں کا ایک جھوٹا قہقہہ

اک ناجائز نمائش شفقت و احساں کی ہے
بر ملا توہین گویا دخترِ انساں کی ہے

دیکھ کر خوش ہو رہا ہے اک نکیلا آدمی
جس کی آنکھوں میں فسردہ ہے شرارِ زندگی

اس کے چہرہ سے جھلکتا ہے غمِ ... مرگِ ضمیر
اس کی آنکھوں سے نظر آتا ہے ذہنِ نابصیر

روح اندھی، فکر ناقص، جہل پروردہ دماغ
سر میں شہرت کا جنوں ہے، فرض کا سینے میں داغ

وائے دولت کا جنازہ مفلسی کے دوش پر
کیوں نہیں گرتی ہے بجلی ان کے عقل و ہوش پر

للہ الحمد یہ سجاوٹ یہ غرور رائگاں
منزلِ فانی میں ان کا یہ مزین کارواں

نوفشاں یہ سیکڑوں سوغات کا انبار دیکھ
عرصہ ہستی میں آب و رنگ کا بازار دیکھ

کس طرح دیتی ہے مست دعوتِ ادبار دیکھ
آنے والی پستیوں کے دور سے آثار دیکھ

اس بہارستان میں بوئے خزاں پاتا ہوں میں
سینہ عشرت میں پلتی اک فغاں پاتا ہوں میں

ایک لافانی سبق

حفیظ رزاقی

جب فضا ساکت ہوئی تو اک حباب بحر کو — کیا ستم ہے قوتِ طوفاں پہ شک ہونے لگا
صرصرِ باطل چراغِ حق کی دشمن ہو گئی — اہرمن کو عظمتِ یزداں پہ شک ہونے لگا

اک مجاہد نے اٹھائی ہاتھ میں شمشیرِ حق — جرأتِ حیدر تھی اس میں صبرِ ایوبی بھی تھا
ماہرِ ضربِ کلیمانہ تھا وہ عیسیٰ نفس — اس کے سوزِ دل میں پنہاں سازِ داؤدی بھی تھا

مثلِ اسمٰعیل تھا وہ پیکرِ صبر و رضا — اس کے اخلاق و مروت میں تھی شانِ احمدی
اس کے دل میں جذبۂ ایثارِ ابراہیم تھا — اس کو کہتے تھے جہاں والے حسین ابنِ علیؑ

زعمِ باطل نے ستم کی انتہا کر دی مگر — ابنِ حیدر پر نہ ڈالی جا سکی کوئی کمند
کربلا کا سانحہ معراجِ ضبط و شکر ہے — سرنگوں باطل ہوا اور پرچمِ حق سربلند

طے کرے انسان لاکھوں ارتقائی منزلیں — مٹ نہیں سکتا جہاں سے رنگِ تصویرِ حسینؑ
جب کبھی چھا جائیں گی ظلم و ستم کی بدلیاں — جگمگائے گا فضا کو نورِ شمشیرِ حسینؑ

عظمتِ انسانیت کی آخری منزل ہے یہ — ظلم کا قصہ نہیں آہ و فغاں کے واسطے
پیش کرتی ہے حیاتِ تاجدارِ کربلا — ایک لافانی سبق سارے جہاں کے واسطے

"ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی" (علامہ اقبالؒ)

بازیٔ دل

کوثر نیازی

(یہ غزل اگرچہ میرے زمانہ جاہلیت کی پیداوار ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں ناجائز شعر کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ بعض اشعار جو سرسری نظر میں قابلِ اعتراض نظر آتے ہیں میں نے ان میں ظاہری معنوں کی بجائے، دراصل کچھ اور مفہوم ہونے کی کوشش کی ہے۔ (کوثر)

خود فریبی دل نے مارا ہے — ہم نے سمجھا تھا وہ ہمارا ہے
چشمِ بینا ہی یاں نہیں ملتی — حسنِ قسمت تو آشکارا ہے
اک غمِ دوست سے رہوں محفوظ — اور ہر غم مجھے گوارا ہے
میں یہ سمجھا کہ آپ ہی ہوں گے — جب کسی نے مجھے پکارا ہے
کتنا انجان بن کے پوچھا ہے — "تم نے دن کس طرح گزارا ہے"
خانۂ زادِ حیات اُف! توبہ! — دامنِ صبر پارا پارا ہے
آپ کے لطف پہ ہے اس کی نگہ — دل کو کتنا بڑا سہارا ہے
کس نے ان سوگوار پھولوں کو — خون سے سینچ کر نکھارا ہے
کتنے دارا تھے کتنے اسکندر — نشۂ سب موت نے اتارا ہے
کشتیٔ دل ترا خدا حافظ — دور کوسوں ابھی کنارا ہے
تجھ سے اے دوست کیا کروں شکوہ — میرا گردش میں جب ستارا ہے

بازیٔ دل میں ہم نے اے کوثرؔ
اپنا سامانِ زیست ہارا ہے

ہوتی آئی ہے کہ"—

ارشد کاظمی

ناروا بات کو بدبخت روا کہتے ہیں
یہ وہی لوگ ہیں جو بت کو خدا کہتے ہیں

ان کی باتوں پہ نہ دھر کان یہ کیا کہتے ہیں
"ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں"

لکھ دیا نام مرا اہلِ وفا میں لیکن
دیکھنا یہ ہے کہ جلاد سے کیا کہتے ہیں

میری بے باک طبیعت کیلئے مشکل ہے
ان کی ہر بات پہ کہنا کہ "بجا کہتے ہیں"

میں سمجھتا ہوں جسے جورِ مسلسل ارشد
وہ اسے شیوہ و انداز و ادا کہتے ہیں!

✱

شیشہ بازیاں

محمد نثار

اخلاص ہو تو کیفِ حضوری بھی ہو نصیب
ورنہ یوں کسی کو لاکھ پکارا کرے کوئی

آتی ہے پھر ندائے "الستُ بربکم"
پھر جرأت جواب دوبارا کرے کوئی

ساحل سے کھیلنے کے اشارے تو سہل ہیں
موجوں سے کھیلنے کا اشارا کرے کوئی

گوشے میں بیٹھ بیٹھ کے اعلانِ حق چہ خوب
طوفاں میں ہاتھ پاؤں تو مارا کرے کوئی

یہ دانش و خرد ہیں فقط شیشہ بازیاں
پھر جرأتِ شکستن خارا کرے کوئی

برہم رہے گی شانۂ اسلام کے بغیر
زلفِ حیات لاکھ سنوارا کرے کوئی

یہی جنوں ہے تو ۔۔۔

عبدالمجید مجید

جو تیرے درد کا حامل نظر نہیں آتا
وہ دل خدا کی قسم دل نظر نہیں آتا

ہوا نہ گردشِ دوراں سے عشق روبہ زوال
جو حق ہے وہ کبھی باطل نظر نہیں آتا۔

کسی کی بات دلوں میں اثر نہیں کرتی
کسی میں جذبۂ کامل نظر نہیں آتا

حرم سے، دیر سے خوش خوش پلٹنے والوں میں
کوئی رسیدۂ منزل نظر نہیں آتا

نہ کوئی قدرِ وفا ہے نہ قیمتِ ایثار
جہاں ہے حسن وہاں دل نظر نہیں آتا

یہی جنوں ہے تو منزل کے بعد منزل ہے
اور اختتامِ منازل نظر نہیں آتا

رہنے بھی دو!

بے زبانی اور محبت کی زباں! رہنے بھی دو
دل کے شعلے گھُٹ کے بن جائیں دھواں رہنے بھی دو

راہبرِ منزل نقوشِ راہ سب ہیں راہ زن!
راہبرِ منزل، نقوشِ کارواں رہنے بھی دو

ہیں نئے انساں کی نظروں کے تقاضے بھی نئے
اب یہ فرسودہ زمین و آسماں رہنے بھی دو

جب قفس میں آشیاں تعمیر کر سکتے ہیں ہم
تم یہ اظہارِ سلوکِ باغباں رہنے بھی دو

ہر قدم جلوے نئے ہیں ہر نفس نکہت نئی
شادماں میں کیا رہوں تم شادماں رہنے بھی دو

حسن کا مقصد، طلب کا راز، معیارِ وفا،
ہے یہ سب کچھ چیستاں در چیستاں رہنے بھی دو

*

شیشہ و سنگ

مبتلا ہمدانی

مرِ فرنگ دیکھتا ہوں میں
کچھ نئے رنگ دیکھتا ہوں میں

درسِ قرآں کا دور ختم ہوا
نغمہ و چنگ دیکھتا ہوں میں

ل جو فخرِ وطن تھے آج نہیں
باعثِ ننگ دیکھتا ہوں میں

رخشِ خدمت کہ سب سے آگے تھا
اب اُسے لنگ دیکھتا ہوں میں

تاجِ برطانیہ کے سائے میں
سب کو یکرنگ دیکھتا ہوں میں

سن رہا ہوں میں امن کے پیغام
جنگ ہی جنگ دیکھتا ہوں میں

خیر و ارب کشیدہ خاطر ہیں
شیشہ و سنگ دیکھتا ہوں میں

پھر شکن در شکن جبینیں ہیں!
چشمِ خونرنگ دیکھتا ہوں میں

مختصر یہ کہ غم نصیبوں کو
پھر جنوں رنگ دیکھتا ہوں میں

خود کو آزاد سمجھ کے بھی بے کل
زیست کو تنگ دیکھتا ہوں میں

*

طالب حجازی

اسرارِ بقا

ہر سمت اسیرانِ غرض جلوہ نما ہیں
آزاد منش لوگ گرفتارِ بلا ہیں

اصحابِ خرد نفع و ضرر سوچ رہے ہیں
اربابِ جنوں تیرے اشارے پہ فدا ہیں

کس کس کی کرے ذوقِ نیاز آج پرستش
انسان نہیں اتنے کہ اب جتنے خدا ہیں

خامہ ہو کہ شمشیر صحافت ہو کہ تقریر
ہم چاہتے ہر شعبے میں تیری ہی رضا ہیں

مومن کی فراست ہی فقط توڑ ہے اُن کا
طاغوت کے پاس آج جو آلاتِ دغا ہیں

پوشیدہ نہیں مردِ مسلماں کی نظر سے
مستور شہادت میں جو اسرارِ بقا ہیں

*

ایمان کے چشمے اور بھی ہیں

نعیم صدیقی

یاں مے ہی جو خانہ ساز نہیں تو بادہ خانے اور بھی ہیں
اس شہر میں ساقی اور بھی ہیں خم اور پیالے اور بھی ہیں

ان بے عصمت چہروں سے بچ! یوں آنکھوں کو ناپاک نہ کر
آفاق بھرا ہے جلووں سے آنکھیں ہوں تو جلوے اور بھی ہیں

اس زہد پہ بھی تم لٹتو ہو؟ الحاد سے جس کی سازش ہے
دھوکا ہی جو کھانا چاہو تو ماحول میں دھوکے اور بھی ہیں

یہ ٹھیک حصارِ ملت کے ہر دروازے پر پہرے ہیں
اے کاش کہ ہوں دروازے ہی! افسوس کہ رخنے اور بھی ہیں

اے شیخ ہرج ہی کیا اس میں، ایماں بھی رہے اور کفر بھی ہو!
گھبراہٹ کیا؟ اک تو ہی نہیں اس رب کے بندے اور بھی ہیں

دو گرہیں کھول کے سمجھے ہو اب دامِ غلامی ٹوٹ گیا
اس دام کے بندھن اور بھی ہیں، اس جال کے حلقے اور بھی ہیں

وہ حسن جو ہر سو عریاں ہے وہ اتنا ہی پنہاں بھی ہے
اک جہل کا پردہ نوچ لیا! پر علم کے پردے اور بھی ہیں

ہیں ایسی بھی دنیائیں جو مومن کی نظر سے روشن ہوں
خورشید درخشاں کیا جانے! سینوں کے اندھیرے اور بھی ہیں

جس راز کے افشا ہونے پر اے جانِ جہاں تم جھڑتے ہو
اب یہ ہے نتیجہ جھڑنے کا۔ اس راز کے چرچے اور بھی ہیں

ذلت کے گھر کی چوکھٹ پر کیوں ماتھے لوگ رگڑتے ہیں؟
سجدے ہوں اگر بے تاب بہت تو کعبے قبلے اور بھی ہیں

اک موج کا ہی قصہ تو نہیں، گرداب سے کم ساحل بھی نہیں
یہ جیون نیا بچ نکلے! یاں موت کے گھیرے اور بھی ہیں

کچھ رنگ و نسب کے سودائی، کچھ قوم و وطن کے متوالے
سلمان سے جا کر پوچھ کبھی اس دیس میں رشتے اور بھی ہیں

گو رند بکا ترے تقوے پر اور ملا بزدل ہے مانا!
الحاد سے کہہ دو ہاں تجھ سے ٹکرانے والے اور بھی ہیں

یہ کفر نگاہی چیز ہی کیا! ہم نے تو بہت کچھ دیکھا ہے
اے چشمِ تباں! اک تو ہی نہیں طاغوت کے فتنے اور بھی ہیں

تعارفِ کتب و جرائد

کئی ماہ سے ایسے وجوہ و اسباب درپیش رہے کہ تعارفِ کتب و جرائد" کے لئے چراغِ راہ کے صفحات میں جگہ نہ نکل سکی۔ اب بہت سی چیزیں برائے تبصرہ" جمع ہیں۔ مجبوراً انتہائی اختصار سے کام لیا جا رہا ہے۔

تدبرِ قرآن ● مؤلفہ جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی ● شائع کردہ : مکتبہ چراغ راہ کراچی ● قیمت تین روپے چار آنے۔
یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے اور اس میں کچھ بحثوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اصلاحی صاحب جن کا موضوعِ فکر و تدبر سالہا سال سے قرآن ہی رہا ہے اپنی اس کتاب کے ذریعے قرآن کے ان نوجوان پیاسوں کو وہ کنجیاں بہم پہنچانا چاہتے ہیں جن کے ذریعے ابتدائی لازمی تیاری کے بعد وہ خزائنِ قرآنی کے قفل خود کھول سکیں۔ اس طرز پہ لکھی ہوئی اتنی مفید کتاب ابتک موجود نہ تھی۔ طباعتی محاسن کا معیار ذوق کیلئے تسکین بخش ہے

ترجمہ رسالہ اصولِ تفسیر ● مؤلفہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ● ترجمہ و توضیح از جناب خالد انصاری صاحب اثوارہ بھوپال ● قیمت آٹھ آنے
علامہ ابن تیمیہ ملتِ اسلامیہ کے درجۂ اول کے مفکرین میں سے ہیں۔ اس رسالے میں آپ نے وہ اصول کمالِ اختصار کے ساتھ مرتب فرمائے ہیں جن کو قرآن کی تشریح و توضیح میں پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ اس رسالے کا اردو ترجمہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے طباعتی معیار اچھا ہے۔

دین کی باتیں ● مولفہ ابو سلیم محمد عبدالحی صاحب ● شائع کردہ۔ مکتبہ الحسنات، رام پور، یوپی ● قیمت دو روپے چار آنے۔
مکتبہ الحسنات نے تعلیم بالغان کے لئے جو اسلامی نصاب شائع کیا ہے، یہ کتاب اس کی ایک تکمیلی کڑی ہے۔ اسے پڑھنے سے دین کا اجمالی مگر جامع تصور حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلام، ایمان، عملِ صالح، ارکانِ اسلام، اخلاق، حقوق، سیاست اور دین کی خدمت کے مختلف عنوانات کے تحت اسلام کا نظامِ فکر و عمل بڑی آسان زبان میں بیان کر دیا گیا ہے۔ عورتیں اور بچے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بالغان کی رعایت سے قلم جلی رکھا گیا ہے

اسلام اور فطرت ● مولفہ شیخ عبدالعزیز شاویش (مصری)، ● ترجمہ جناب ابو تمکین افتخار احمد صاحب ● شائع کردہ : عباسی کتب خانہ جونامارکیٹ کراچی ● قیمت دو روپے آٹھ آنے ——— مستشرقین نے جہالت اور تعصب کے تحت اسلام کو مغرب میں جس غلط انداز سے پیش کیا ہے اس کے پیشِ نظر مؤلف نے "الاسلام دین الفطرۃ" نامی کتاب لکھ کر عوامِ مغرب کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہوا اور اب یہ اردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے۔

مسائل و احکام ● ترجمہ محمد سلیمان صاحب کیلانی ● ناشر مکتبہ اسلامیہ، حضرت کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ ● قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنہ
احادیث کا مشہور حنفی انتخاب "بلوغ المرام" کام کی چیز ہے کیونکہ یہ مجموعہ فقہ کے تقاضوں کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ اسی کا اردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل ● از جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی ● شائع کردہ : مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (پاکستان) ذیلدار پارک اچھرہ لاہور ● قیمت
یہ وہ فکر پرور اور جذبہ انگیز تعمیری تقریر ہے جو مولانا مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نے جماعت کے اجتماعِ عام (۱۱ نومبر ۱۹۵۱ء) میں فرمائی۔ اس میں مسلمانوں کے ماضی و حال کا بڑی باریکی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے اور اصلاح و ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل قوم کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اشاعتِ عام کے لئے مکتبہ نے اس کی قیمت صرف چار آنے رکھی ہے۔ چاہئے یہ کہ ہر لکھا پڑھا پاکستانی اسے بغور پڑھے اور دوسروں کو پڑھائے۔

دستورِ حکومتِ اسلام ● مرتبہ "س۔ ڈ" ● ناشر نامعلوم ● قیمت نامعلوم۔
پاکستان کے لئے یہ ایک دستوری خاکہ ہے۔ بنیادی فکر اسلامی ہے، مگر دستوریات اور دستوری زبان سے مرتب ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔

بدعت تحقیق کی روشنی میں ● مؤلفہ محمد عطاء اللہ صاحب سلفی ● ملنے کا پتہ: نور الرحمٰن صاحب، ادریشل جنرل اسٹور، عطا بازار، رنگیر گرہ، دکن ● قیمت درج نہیں

اپنے موضوع پر مفید معلومات افزا مقالہ ہے۔ دینِ حق کے ہر پیرو کو فتنہ کے بہت بڑے دروازے بدعت سے آگاہ ہونا چاہئے، اور یہ کتاب اس میں مدد دے گا۔

سو شعروں کا سلسلہ ● مرتبہ محمود علی خاں صاحب جامی ● شائع کردہ: مکتبۂ شاہد، پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ● قیمت فی مجموعہ صد شعر ۶ آنے

سو شعروں کا یہ سلسلہ مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا تھا، اب یہ اس کا نیا ایڈیشن ہے جگر اور مومن کے سو سو شعروں کے جیبی پمفلٹ ہمارے سامنے ہیں۔ انتخاب سلجھا ہوا اور طباعتی معیار قابلِ تحسین ہے۔ علاوہ بریں مکتبہ شاہد میر، غالب، فانی اور اکبر کے سو سو شعروں کے سیٹ بھی پیش کر رہا ہے

حقوقِ انسانی ● از محترمہ رقیہ علامہ خلیل عرب ● شائع کردہ: پاکستان میمن خواتین ایجوکیشنل سوسائٹی ● ملنے کا پتہ: ریاض سنز ناشران و تاجران کتب نکل روڈ۔ کراچی

رقیہ صاحبہ سلجھی ہوئی اسلامی فکر کی مالک ہیں اور موصوفہ نے اپنی اس تازہ تالیف میں سیدھے سادے طریق سے انسان پر خدا کے دین کی طرف سے عائد ہونے والے دوسروں کے حقوق کو بیان کیا ہے اور ضمناً بعض اہم بحثیں چھیڑی ہیں۔ استدلال کتاب و سنت سے کیا گیا ہے۔

اخلاقی کہانیاں ● مرتبہ: جناب افضل حسین صاحب ایم اے ایل ٹی ناظم درسگاہ جماعت اسلامی ہند۔ رامپور ● ناشر: مکتبہ جماعت اسلامی ہند

بچوں کے لئے اخلاقی کہانیوں کا یہ سلسلہ چار حصوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں نبی صلعم، صحابہ کرام اور ائمہ امت کی سیرت کے سبق آموز واقعات مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۳ر، حصہ دوم ۳ر، حصہ سوم ۵ر، حصہ چہارم ۵ر۔

عام معلومات ● مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم، اے، ایل، ٹی، ناظم درسگاہ جماعت اسلامی ہند۔ رام پور ● ناشر: مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ رام پور ● قیمت حصہ اول ۴ر، حصہ دوم ۴ر

طلبہ میں مسلم ذہن کو نشو و نما دینے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو حواس سے کام لینا اور ضروری معلومات سے مسلح رہنا بھی سکھایا جائے۔ اسی مقصد کے تحت یہ مصور سلسلہ مرتب کیا گیا ہے۔

قانونِ محکم ● از جناب تاباں صاحب راشدی باجالی القادری ● ملنے کا پتہ: مکتبہ قادریہ، نمبر ۲۲ خانقاہ شریف لین، کلکتہ ۱۴ ● قیمت ایک روپیہ چار آنے

کتاب مذہبیت، اور خصوصاً اسلام کے حق میں لکھی گئی ہے، مگر طرزِ فکر و ترتیب ایسا ہے، کہ راقم سے پڑھی نہ جا سکی۔ رنگین گرد پوش سے آراستہ ہے

جانبِ نور ● از قلم شیخ حسن البناء شہید (مصری) ● پیشکش از جانب مجلس نشر و اشاعت اخوان المسلمین (مصر)

یہ شیخ حسن البناء شہید کے ایک مختصر سے رسالہ کا اردو ترجمہ ہے جس میں نظام اسلامی کی دعوت پورے استدلال اور پورے جذبات کے ساتھ پیش کی گئی ہے

صحیفۂ اہل حدیث کا حدیث نمبر ● بادارت جناب عبد الجلیل صاحب دہلوی ● مقام اشاعت مسجد، اے ایم، کراچی ● قیمت اشاعتِ خاص تین روپے، چندہ سالانہ للعہ

یہ ضخیم اشاعتِ خاص منکرینِ حدیث کے طرزِ فکر اور ان کے غلط نظریات کی تردید کے لئے پیش کی گئی ہے۔ اس میں حدیث، اس کی دینی اہمیت اور اس کی حجیت وغیرہ موضوعات پر کئی بلند پایہ علماء اور اہل قلم کے قیمتی مقالات شامل ہیں۔ یہ مجموعہ زیرِ مطالعہ ہے، ابھی کوئی تفصیلی رائے دینا مشکل ہے۔

المسلمون ● بادارت جناب سعید رمضان صاحب ● مقام اشاعت: ۲۰۳۔ شارع النیل بالروضۃ القاہرہ

یہ گراں بہا عربی ماہنامہ اپنے پورے طباعتی محاسن کے ساتھ الاخوان المسلمین، مصر کی فکر کا ترجمان ہے۔ اسلامی نظریات کو واضح کرنے اور نظامِ اسلامی کے بارے میں غلط فہمیوں کو صاف کرنے میں یہ مجلہ بہت سے اہل قلم کی کاوشوں کو ساتھ لئے ہوئے میدانِ عمل میں سرگرم جہاد ہے۔

العلم ● بادارت سید الطاف علی بریلوی ● سہ ماہی ترجمان، آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سندھ مدرسہ۔

الحمراء ● بادارت جناب حامد علی خاں صاحب ● دفتر اشاعت: ۹ ڈیل ٹاؤن، لاہور ● چندہ سالانہ چھ روپے، فی پرچہ آٹھ آنے۔

مکاتیب زنداں

● مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے اپنی اسیری کے دوران میں مرکزی جیل ملتان سے لکھے

● اس مجموعے میں تینوں حضرات کی زندگی کا مختصر خاکہ۔ گرفتاری کا پس منظر اور میاں طفیل محمد صاحب کی لکھی ہوئی جیل کی ڈائری "گرفتاری سے رہائی تک" بھی شامل ہے۔

● حکیم محمد شریف امرتسری (حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ) نے اس مجموعے کو مرتب کیا ہے۔

صفحات ۲۰۸ ۔ مجلد حسین گرد پوش

قیمت ــــ صرف ۲ روپے

مکتبۂ چراغِ راہ، کراچی

خالی بوتل

نہایت ضروری

ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ہم اس سال بھی "روح افزا"
کی جتنی مانگ تھی اسکے مطابق تیار نہیں کر سکے اس سے فائدہ اٹھاکر
کراچی اور بیرون کراچی کے بعض شربت فروشوں نے نہ صرف یہ کہ روح
افزا سے ملتے جلتے نام رکھکر لوگوں کو مغالطہ میں ڈالا بلکہ روح افزا کی
خالی بوتلوں میں اپنے گھٹیا شربت بھرکر روح افزا کے نام سے فروخت
کیے اور اس وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوئی۔ بہرحال سال آئندہ کے
لیے ہم اس قسم کی بے عنوانیوں کا بندوبست کر رہے ہیں۔

عام اطلاع کے لیے شائع کیا جاتا ہے کہ روح افزا کی بوتلیں ہمدرد
دواخانہ کی پیٹنٹ اور رجسٹرڈ بوتلیں ہیں۔ انکو بھرنا اور فروخت کرنا قانون کو ہاتھ
لینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ایسے دکاندار جو روح افزا کی خالی بوتلیں بھر رہے ہیں مطلع رہیں

الاخوان المسلمون

اور

ان کی دعوت

شہید راہ حق البنا کے ایک خطبہ کا ترجمہ جو آپ نے ۱۹۳۱ء میں

الاخوان المسلون کے پانچویں اجلاس میں دیا تھا

ترجمہ:۔ طٰہٰ یٰسین، رفیق دارالعروبہ - راولپنڈی

مندرجات

- ــــ دو لفظ از مولانا مسعود عالم ندوی
- ــــ عرض مترجم
- ــــ تمہید
- ــــ جماعت الاخوان کی تاسیس
- ــــ الاخوان المسلون کا اسلام
- ــــ ہماری فکر کی جامعیت
- ــــ دعوت الاخوان کی بعض دوسری خصوصیات

(۱) فقہی اختلافات سے دوری (۲) اکابر و ارباب جاہ سے بے نیازی (۳) سیاسی جماعتوں اور انجمنوں سے اجتناب (۴) ٹھوس تعمیری اور تدریجی طریق عمل (۵) خاموش عملی کام (۶) نوجوانوں کا دعوت کی طرف کھنچ آنا (۷) شہروں اور دیہات میں دعوت کا سرعت سے پھیلنا (۸) مقصد اور طریق کار (۹) الاخوان اور تشدد انقلاب (۱۰) الاخوان اور حکومت و اقتدار (۱۱) الاخوان اور دستور مصر (۱۲) الاخوان اور قانون (۱۳) اتحاد قومی، اتحاد عربی اور اتحاد اسلامی (۱۴) الاخوان اور خلافت (۱۵) الاخوان اور اسلامی جماعتیں (۱۶) الاخوان اور الشبان (۱۷) اور سیاسی جماعتیں (۱۸) الاخوان اور مصر الفتاة (۱۹) الاخوان اور یورپی حکومتیں (۲۰) خاتمہ

صفحات ۱۱۸ ــــــــــ قیمت:۔ ایک روپیہ چار آنے (عـہ)

مکتبہ چراغ راہ، کراچی

حاذق نروائن پلز

حبِّ خاص

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل بیرسٹر پروفیسر اور طالب علم اصحاب کے واسطے آبِ حیات کا کام دیتی ہیں۔ اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنی ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک	۱۰ یوم	۲۰ یوم	۴۰ یوم
پیکنگ	۲۰ گولی	چالیس گولی	۸۰ گولی
قیمت	-/-/2	-/12/3	-/-/7

حاذق ہسٹریا پلز

یہ گولیاں خاص و کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصولوں پر تیار کی جاتی ہیں۔ عورتوں کی مشہور بیماری ہسٹریا یا اختناق الرحم بچوں کی مرگی (ام الصبیان) کے لئے لاثانی دوا ہے۔ اس کے علاوہ عام کمزوری، ضعف ہضم، اختلاج قلب (دل کی دھڑکن) کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ یہ دواخانہ ہذا کی ایسی بے نظیر ترتیب ہے جس پر طب یونانی جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے۔

قیمت فی شیشی ۴۰ گولی پانچ روپے (مہر)

حاذق دواخانہ (رجسٹرڈ) مقابل ماما پارسی گرلز ہائی اسکول بندر روڈ کراچی

ننھے بچوں کا بہترین ٹانک
بہارِ اطفال
جسے
آپ کے عظیم طبی ادارہ
اشرف میڈیکل ہال
نے پیش کیا
یہ دل پسند شربت ننھے بچوں کی
• کمزوری • لاغری • دق الاطفال (سوکھاسان)
• اسہال • نزلہ • اور پھیپھڑوں کی کمزوری
کے لئے عجیب الاثر ہے۔
(قیمت ـــــ ایک شیشی ایک روپیہ)
اشرف میڈیکل ہال (رجسٹرڈ)، لائل پور

FORTNIGHTLY

STUDENTS' VOICE

ORGAN OF

Islami Jamiat-e-Tulaba, Karachi

STANDS FOR

★ Islamic Revolution in all walks of human life

★ Liberation of mankind from all fetters of man's domination over man

★ Advocacy of the legitimate demands and aspirations of the student community

STUDENTS' VOICE

The only English journal of Pakistan's students

★ Contains valuable articles about Islam, Islamic history, the modern ideologies of the world and current affairs

★ Enjoys the literary co-operation of many leaders of thought in Pakistan and other countries of the Muslim world

★ Has its special correspondents abroad in U. K., U. S. A., France, Egypt, Syria and Ceylon

★ Publishes newsletters about activities of students all over Pakistan

Eight Pages PRICE ONE ANNA

Annual subscription (for 16 issues) Re. 1

SPECIAL INDEPENDENCE NUMBER APPEARING

ON 17TH AUGUST TWELVE PAGES PRICE TWO ANNAS

Office: 12/18, BUNDER ROAD, KARACHI.

Only Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, Karachi.
Printer & Publisher Ghulam Muhammed M. Chaudhri

چراغِ راہ
کراچی
ستمبر ۱۹۵۸

اسلامی ادب کا علمبردار

چراغ راہ

ستمبر ۱۹۵۲ء

۱۰

قیمت ۸/

جلد ۵ ——— شمارہ ۱۰

چندہ سالانہ ———

پاکستان ... بھارت

مندرجات

دفتر چراغ راہ ۹ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

میو چیکا

ہم مطالبہ کرتے ہیں

قرارداد مقاصد کو جس میں پوری مملکت کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا کلمہ پڑھا گیا تھا اپنے اندر جو دینی تقدس اور جو دستوری قدر و قیمت رکھتی ہے اگر اس کا احساس کرنے والی قیادت برسرِ عمل ہوتی اور اگر ہمارے ارکانِ اسمبلی اس کے تقاضوں کو سمجھ سکتے، اگر وہ اسکے منشا کو اخلاص و دیانت سے پورا کرنا چاہتے اور اگر وہ قرارداد مقاصد کے سانچے میں نظامِ حیات کو ڈھالنے کی مہارت بھی رکھتے ہوتے تو اب کسی اور مطالبے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مگر حالات کی شہادت یہ ہے کہ قرارداد مقاصد پاس ہو جانے کے بعد ابھی ایک اور مطالبے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر یہ تاثر جن وجوہ سے پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہیں ..

"۱) ـــــ قرارداد مقاصد سے پہلے دستور سازی میں تاخیر و التوا کی جو پالیسی کام کر رہی تھی قرارداد مقاصد کے بعد اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں رہی۔ پہلے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ دستور سازی کا رُخ معین نہیں ہے۔ لیکن اب تو وہ قطعی طور پر معین ہو چکا ہے۔ اب تو منزلِ مقصود سامنے آچکی ہے اب آخر رفتارِ اقدام کی سستی کے معنی کیا ہیں؟ اب تو تاخیر کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ ہمارے دستور گروں کو دستور کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے کہ ایک قوم کے بناؤ اور بگاڑ میں کیا دخل حاصل ہے دستور ایک ریاست کے لئے راہِ ارتقا تجویز کرتا ہے۔ دستور قوم کے لئے ضابطۂ عمل معین کرتا ہے، دستور جمہوریت کے حقوق و فرائض کو طے کرتا ہے، دستور ذرائع و وسائل کو کسی نصب العین پر مرتکز کرتا ہے۔ دستور ایک خاص نقشۂ تعمیرِ زندگی کے لئے متعین کرتا ہے، تو پھر اگر کسی قوم کا دستور نہ بنا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ منتشر تقاضے کرے گی۔ صحیح سمت کی بجائے کسی غلط سمت میں کرتی رہے گی۔ ظاہر بات ہے کہ زندگی تو ایک رواں دواں طاقت ہے۔ اور ہمارے اکابر و عمائد اگر تذبذب کی ٹھنڈی فضاؤں میں زندگی کی روانی سے آنکھیں بند کئے پڑے رہیں گے تو اس سے زندگی اپنی حرکت روک نہ دے گی۔ آپ اگر زندگی کے سامنے اسلام کی شاہراہ نہیں لائیں گے۔ تو کفر کے راہوں پر ارتقا کرے گی۔ آپ اگر اسے قرآن کا دستور بنا کے نہیں دیں گے تو وہ فرنگی دستور پر نشوونما پاتی رہے گی۔ آپ اگر اسے آگے کی طرف نہیں لے چلیں گے تو وہ پیچھے کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ آپ کی خاطر زندگی رُک کر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ بنا بریں دستور ایک کاغذی کارروائی نہیں بلکہ قوم کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس کے صلاح و فساد کا مسئلہ ہے، اس کے بناؤ اور بگاڑ کا مسئلہ ہے۔ اس کی تعمیر اور تخریب کا مسئلہ ہے۔

ایک قوم کے لئے اس سے زیادہ مہلک کوئی صورتِ حالات نہیں ہے کہ اسے کئی سال کے لئے دستور سے محروم رکھا جائے۔ اور اسے مجبور کر دیا جائے کہ وہ اندھا دھند اپنے ذرائع و وسائل کو ایسے مقاصد اور ایسے طریقوں پر صرف کرتی رہے جن کے بارے میں یہ طے ہو کہ آئندہ اس کے مقاصد اور طریقے یہ نہیں ہوں گے۔ اس کی تعلیم، اس کا قانون، اس کا معاشرتی ماحول، اس کا دفاع، اس کی خارجہ پالیسی۔ اس کے مسائل صلح و جنگ، اس کے بین الاقوامی تعلقات، اس کا کلچر، اس کا اخلاق، اس کا معاشی نظام جدھر چاہے اپنی شاخیں پھیلاتا چلا جائے اور کوئی نقشہ اس کے سامنے نہ ہو۔
لیکن اگر ہمارے حضرات کو دستور کی اہمیت کا واقعی کوئی اندازہ ہے تو پھر تاخیر کے معنی بجز اس کے اور کیا رہ جاتے ہیں کہ قوم سے کوئی داؤ

کیسا دستور مطلوب ہے؟

(۲) ہمارا خیال پہلے یہ تھا کہ شاید سابق دستوری سفارشات کا جو حشر ہوا ہے۔ اس کے بعد ارباب اقتدار کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی اور اب وہ سیدھی طرح مسلمانوں کے متفقہ مطالبے کا احترام کریں گے لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی کہ کچھ نقاب پوش قلم فروشوں کو کرائے پر حاصل کر کے عوام کے اندر اسلامی دستور کے مسائل کے بارے میں انتشار پھیلانے کی ایک خطرناک مہم شروع کر دی گئی ہے۔ ان حضرات کے کارناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی خدمات حاصل کی گئی ہیں اس مقصد سے کہ قرارداد مقاصد میں نقب لگا کر ایک سیکولر اسٹیٹ کا دستور بنانے کی فضا تیار کر دیں۔ ان کی مدد سے قوم کے ساتھ یہ چال بازی کی جائے کہ نام کو تو خدا کی حاکمیت کا اقرار دستور کے آغاز میں کر لیا جائے لیکن جہاں تک قانون سازی اور زندگی کی تعمیر کا تعلق ہے، خدا کو بالکل غیر دخیل بنا کے چھوڑ دیا جائے۔

ہماری یہ رائے سوئے ظن کی تعریف میں آ سکتی تھی لیکن دو چیزوں نے ہمارے شبہات کو قوی کر دیا ہے۔ ایک یہ کہ ان نقاب پوش قلم فروشوں کے پیچھے سے ایک مرتبہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے حاکمیت الٰہی کے بارے میں ایسی فلسفہ طرازی کی ہے کہ جس سے ان کی اصل ذہنیت کو بے نقاب کر دیا ہے موصوف کی فکر کا سارا نچوڑ یہ ہے کہ خدا کو بس بتوں کے ہاں کے "مہادیو" کے مقام پر رکھا جائے یعنی اس کو بس ایک وجود اور اس کی حاکمیت کا اعتراف کر لینے کے بعد عملی زندگی کے بنانے بگاڑنے کے سارے اختیارات دستوری حیثیت سے اپنے ہاتھ میں رکھے جائیں۔ دوسرے یہ کہ حال ہی میں نتھیا گلی کے مقام پر ایک سائل کو جواب دیتے ہوئے سردار عبدالرب صاحب نشتر نے یہ جو فرمایا کہ ہم لوگ یہاں یہ طے کرنے بیٹھے ہیں کہ پارلیمنٹ کی نشستیں کتنی ہوں، ان کا طریق انتخاب کیا ہو، گورنروں اور وزراء کے اختیارات کیا ہوں وغیرہ، ہم یہاں اسلامی شریعت طے کرنے نہیں بیٹھے ہیں، اس جواب سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہماری دستوریہ کے بڑے بڑے ذمہ دار ارکان تک اس ابتدائی حقیقت ہی سے ناواقف ہیں کہ مذکورہ بالا دستوری مسائل سے اسلامی شریعت کا تعلق کیا ہے۔ یا اگر واقف ہیں تو پھر تجاہل عارفانہ سے کام لے کر گریز کی ایک حسین صورت اختیار کر رہے ہیں۔

علاوہ بریں یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم نے جو مایوس کن تقریر فرمائی ہے وہ جس طرح بعض دوسرے قومی مسائل میں مایوس کن ہے، اسی طرح دستوری مسئلے میں بھی اس نے قوم کو روشنی بہم نہیں پہنچائی بلکہ اور اندھیرا پھیلا دیا ہے۔

(۳) ہم یہ حقیقت بھی پوری طرح محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری قوم اسلام سے انتہائی جذباتی محبت و عقیدت رکھنے کے باوجود اسلام سے خصوصاً اسلامی دستور کے مسائل سے بالکل ناواقف ہے اور اسی بنا پر مخالفین اسلام کے لئے موقع ہے کہ وہ عوام کو انتشار میں مبتلا کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کریں۔

ان تین وجوہ کے پیش نظر یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ پہلے مطالبے کے مقابلے میں ایک مفصل مطالبہ سامنے لایا جائے اور اس ذریعہ سے ایک طرف دستور سازوں اور حکمرانوں کے سامنے وہ متعین امور رکھ دیئے جائیں جن کا ہونا قوم کے مطلوبہ اسلامی دستور میں لازمی ہے تاکہ صحیح معنی میں اتمام حجت ہو جائے؛ اور دوسری طرف پہلے سے قوم کو مطلوبہ دستور کے خد و خال کی پوری پوری تعلیم دے کر اتنا تیار کر دیا جائے کہ وہ ایک غیر اسلامی دستور کے سامنے آتے ہی اپنے مطالبے کے معیار پر پرکھ کر فوری فیصلہ کر سکے کہ دستور قابل قبول ہے یا اسے اس کے خلاف بے زاری کا اعلان کرنا ہو گا۔

انہی دو مقاصد کے لئے نو نکاتی مطالبہ (جو پہلے ہشت نکاتی مطالبہ کہا جاتا تھا) قوم کے اصل میں ہے۔
ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ اس مطالبے کی کسی قدر وضاحت کر دی جائے تاکہ عوام اس کی حقیقت کو بآسانی سمجھ سکیں۔ نیز مخالفین کو اس کے خلاف انتشار پھیلانے کے مواقع نہ مل سکیں۔ یہاں مختصراً اس کی تشریح کی جاتی ہے۔

"دستور ساز اسمبلی پاکستان کا نیا دستور ۱۹۵۲ء کے ختم ہونے سے پہلے بنا دے"

دستور سازی کے کام میں تاخیر و التوا کی معذرت اور اس کے وجہ تشویش ہونے پر ہمیں یہاں کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ بھارت اور پاکستان کی تاریخ آزادی ایک ہے، دونوں مسافر ایک دوراہے سے الگ ہو کر ایک ہی وقت پر آزادی کی طرف گامزن ہوتے ہیں، مگر تعجب کی بات ہے کہ بھارت دستور بنا کر بلکہ اسے عملاً نافذ کر کے اور اپنا نظامِ زندگی اس پر استوار کر کے کبھی کا فارغ بھی ہو چکا۔ اور یہاں ہنوز روزِ اول کا معاملہ ہے:

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

آج تک تاخیر کے لئے جو عذر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ وہ صرف ایک ہے —— یہ کہ ہم چونکہ ایک ایسا دستور بنا رہے ہیں جس کی کوئی نظیر کہیں موجود نہیں ہے، لہٰذا اس کام پر دیر لگنی ہی چاہئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جہاں تک اسلامی دستور کا تعلق ہے اس کے اصول پوری طرح واضح ہیں۔ اور اگر وہی واضح نہیں ہیں تو پھر کہنا یہ چاہئے کہ خود اسلام ہی واضح نہیں ہے۔ نعوذ قرآن بھی واضح نہیں ہے، اور خدا اور رسول کی ہدایت بھی واضح نہیں ہے۔ اور اگر اسلام بجائے خود اتنا غیر واضح ہے تو پھر تاخیر کا کیا سوال، پھر تو سرے سے دستور بننے کی توقعات ہی سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہئے —— لیکن واقعہ یہ ہے نہیں۔ اسلام جن اصولوں پر اجتماعی زندگی اور نظامِ ریاست کو استوار کرنا چاہتا ہے۔ وہ حد درجہ واضح ہیں ان پر عملاً ایک ریاست ہمارے اسی ملت کی تاریخ کے اوائل میں چل چکی ہے اور ان کے بارے میں متقدمین نے بڑا وسیع علمی لٹریچر چھوڑا ہے۔ اور خود اردو زبان میں بھی اسی پانچ سال کے عرصہ میں اسلامی دستور کے موضوع پر سوچنے والے بعض مفکرین نے قابلِ لحاظ مواد بہم پہنچا دیا ہے۔ اصولیات جب طے ہوں تو خارجی ڈھانچے کے تجویز کرنے میں سالوں کی مدت لگنے کی کوئی وجہ نہیں۔

دوسری طرف اگر مسئلہ کسی لادینی دستور کے بنانے کا ہو تو پھر معاملہ محض نقل مارنے کا ہے، آپ امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور بھارت وغیرہ کے دساتیر کو سامنے رکھتے اور کچھ ادھر سے، کچھ ادھر سے لے کر بھان متی کا کنبہ جوڑ دیتے۔ آخر اس کام میں دیر کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔

دیر نہ تو خالص اسلامی دستور کے بنانے میں ہو سکتی ہے اور نہ خالص لادینی دستور کے بنانے میں، دیر ہو سکتی ہے تو صرف ایک منافقانہ دستور کے بنانے میں ہو سکتی ہے۔ یہ کام واقعی بڑا مشکل ہے کہ قوم کی مرضی کے خلاف کوئی دستور مرتب کر کے اس کے سر تھوپنا بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اسے مطمئن کرنا بھی مدِ نظر ہو۔ اسلام سے فرار بھی مطلوب ہو اور دستور میں اسلامیت کو ثابت کرنا بھی منظور ہو، خدا کی حاکمیت کا ایک طرف اقرار بھی کرنا ہو اور دوسری طرف اس میں نقب لگانے کی اسکیم بھی سامنے ہو۔ ایسے کاموں میں ہمیشہ پیچیدگیاں پیش آیا کرتی ہیں اور ایسے کاموں میں ہمیشہ دیر لگا ہی کرتی ہے۔

بہرحال قوم کے نزدیک یہ عذرِ تاخیر مسموع نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ سال پورے کرنے کے بعد دستوریہ کو مزید چار ماہ کی مہلت دے کر مطالبے کے ذریعہ اسے پابند کیا ضروری ہے کہ وہ ۱۹۵۲ء کے خاتمے تک دستور سامنے لے آئے۔ اس سے زیادہ تاخیر ناقابلِ برداشت ہوگی —— ایک ریاست کے کروڑوں شہری آخر کب تک شہری حقوق کے تعین کے بغیر جی سکتے ہیں اور کب تک وہ اس حالت کو گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کی آزادی دستوریہ کے ارکان کے پاس رہن رکھی رہے۔

"ملک کا قانون اسلامی شریعت ہوگی" (شق ۱)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سوچا یہ جا رہا ہے کہ کسی طرح خدا کی حاکمیت کا انکار کر کے شریعت سازی کا حق اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے اور اپنے عملی اختیارات کو خدا کے تسلط سے بالکل آزاد کر لیا جائے۔ بس اس خطرے کے سدباب کے لئے یہ تشریح کرانا ضروری ہے کہ ملک کا سارا قانونی نظم اسلامی شریعت کے عین مطابق ہوگا۔

مطالبے کی اس شق سے زیادہ سادہ اور واضح شق کوئی نہ ہوگی۔ لیکن سب سے زیادہ اسی شق کے خلاف انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کوشش میں ہر وہ عنصر شریک ہے جو اجتماعی زندگی کو اسلام سے آزاد رکھنا چاہتا ہے۔ اس کوشش میں قادیانی بھی شریک ہیں، اس میں منکرین حدیث کا بھی حصہ ہے اس میں افرنگیت مآب خاندان بھی شریک ہیں اور اس میں سب سے زیادہ پارٹ لینے والے وہی نقاب پوش قلم فروش بھی ہیں جو شریف آدمیوں کے طریقے سے سیدھے سیدھے سامنے آنے کے بجائے فرضی ناموں سے اخبارات میں اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔

اس سوال کے سامنے لانے کا انداز ایسا ہے کہ جس سے گمان یہ ہوتا ہے کہ گویا قوم کی اکثریت اسلامی شریعت کے تصور[1] کے بارے میں پریشان خیالی میں مبتلا ہے اور کچھ ناقابلِ حل اختلافات ہیں کہ جو مختلف عناصر کے درمیان حائل ہیں۔ لیکن امر واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے باہم ہزار فقہی اختلافات رکھتے ہوں مگر وہ ہمیشہ اسلامی شریعت کے تصور پر مجتمع رہے ہیں۔ اسلامی شریعت ہر گروہ کے نزدیک مجموعہ ہے کتاب و سنت کا۔ یہ حضرات کہہ سکتے ہیں کہ یوں تو بات مجمل رہتی ہے لیکن ان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جن فرقوں کے اختلاف کا غلط تصور دلا رہے ہیں ان سب کے علماء نے کراچی میں جمع ہو کر دو ہی روز کے اندر ۲۲ اصولوں کا ایک مفصل خاکۂ دستور تیار کیا۔ اور پورے اتفاق رائے سے اس پر دستخط ثبت کر دیئے۔ گویا ملک کی ۹۰ فیصدی مسلم اکثریت کے مذہبی فرقوں کے نمائندوں نے واضح کر دیا کہ ان کے نزدیک اسلامی شریعت کیا ہے۔ اور وہ کس طرح کا دستور چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت کے تصور کا اختلاف نہ تو اہلِ حدیث کی طرف سے سامنے آتا ہے، نہ دیوبندیوں یا بریلویوں کی طرف سے نہ شیعوں کی طرف سے، نہ کسی اور فقہی گروہ کی طرف سے۔ لیکن اس اختلاف کا ڈھول پیٹا جاتا ہے، تو ان لوگوں کی طرف سے جن کو سرے سے شریعتِ اسلامی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ آخر آپ کو حق ہی کیا پہنچتا ہے کہ اس طرح کا سوال پیدا کریں اور اس پر بار بار کا ہنگامہ برپا کریں۔ آپ اگر شریعتِ اسلامی کو ماننے والوں میں سے ہیں تو ان کے تو سارے گروہ ایک تصور پر مجتمع ہو چکے ہیں۔ آپ ذرا یہ فرمائیے کہ ان میں سے کس گروہ سے آپ کا تعلق ہے، اور اگر آپ شریعتِ اسلامی کے سرے سے مخالف ہیں تو آپ کو شریعت کے تصور کی بحث میں پڑنے کے بجائے اس ملک میں بحیثیت ایک اقلیتی گروہ کے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ لیکن اگر آپ شریعت اسلامی پر قائم بھی رہنا چاہتے ہیں اور اس کا کوئی انوکھا تصور بھی آپ نے ایجاد کیا ہے تو آپ کا فرض یہ ہے کہ اپنے تصور کو لے کر میدان میں آئیے۔ اور نقاب اتار کر آئیے اور لوگوں کو اپنا ہم نوا بنائیے پھر اگر آپ بازی جیت لے جائیں تو آپ کا حق پہنچتا ہے۔ لیکن اگر آپ میں اس کی ہمت نہیں ہے تو اس ملک میں اسلامی شریعت کا وہی تصور کارفرما ہوگا جس پر ملک کی اکثریت متفق ہوگی۔ جو اکثریت ایک تصور پر متفق ہے۔ اسی اکثریت کے مطالبے کے تحت قراردادِ مقاصد میں اسلامی شریعت کو ایک متعین چیز کی حیثیت سے قبول کیا جا چکا ہے۔ اب آخر نیا دیا جلانے سے کیا فائدہ؟

[1] اس مسئلے پر ہم مستقل اشاعت میں ایک مفصل نوٹ لکھ چکے ہیں مگر یہ مضمون بحث کے سلسلے میں ان باتوں کو پھر بیان کر دینا ضروری معلوم ہوا۔ (ادارہ)

دستوری حیثیت سے اسلامی شریعت کے ملک کا قانون قرار پانے کے معنی یہ ہیں کہ پھر یہاں جتنی قانون سازی ہوگی اور جتنے قانونی فیصلے ہوں گے اور عدالتوں میں جتنی کارروائیاں ہوں گی ان سب کے لئے استدلال کی بنیاد خدا کی کتاب اور رسول اللہ صلعم کی سنت اور خلفائے راشدین کے قائم کردہ نظائر اور آئمہ مجتہدین کے اجتماعی فیصلوں پر ہوگی۔ قانون و عدالت کے لئے فی الحقیقت خدا اور رسول کے فرمودات ہوں گے!

اسلامی شریعت کا نام آتے ہی کچھ لوگوں پر جیب بوکھلاہٹ طاری ہوتی ہے تو وہ فوراً "تھیاکریسی" کے خطرے کا ڈھول پیٹ دیتے ہیں۔ وہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی شریعت کی سیڑھی لگا کر ملائی طبقہ برسر اقتدار آنا چاہتا ہے اور عوامیت اور جمہوریت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہ دعوے کرنے کے بعد وہ فوراً یورپ کی تھیاکریسی کی تاریخ کے تاریک ابواب کھول کھول کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، اور تصور یہ دلاتے ہیں کہ بس وہی چیز پاکستان میں لائی جا رہی ہے۔ یہ لوگ کبھی تو الزام گول مول رکھتے ہیں اور کبھی بے تاکر صاف صاف لفظوں میں جماعت اسلامی کو ملاازم کی کوششوں کا طعنہ دے کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، بلکہ بعض کا تو مارے بغض کے یہ حال ہے کہ وہ مولانا مودودی کا نام لے کر یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص مدعی ہے کہ میں ہوں عالم، میں ہوں اپنے دور کا واحد مفکر اسلام اور میں ہوں مزاج دان نبوت، لہذا پاکستان کی باگ دوڑ میرے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ حالاں کہ اس مغالطہ انگیز بلکہ مجرمانہ پراپیگنڈے کے علمبردار اگر اتنی تکلیف کرتے کہ وہ جماعت اسلامی کے لٹریچر پر ایک نگاہ ڈال لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ جماعت جمہوریت اور انتخابیت اور شورائیت کو بنیادی اصولوں کے طور پر لے کے چلی ہے اور خود اس کا نظم جماعت جس منہج پر چل رہا ہے وہ سو فیصدی عوامیت کے جوہر کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔ اگر زیادہ تکلیف نہ کی جائے تو کم سے کم جماعت کے دستور کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اسی سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس جماعت کے ہاں اجتماعی نظم کا کون سا تصور کارفرما ہے، ملایانہ یا عوامی؟

ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا دستور جماعت اتنا زیادہ جمہوری ہے (Ultra Democratic) ہے کہ اس کی مثال پاکستان کی کسی جماعت کے ہاں نہ ملے گی، بلکہ دنیا کے بیشتر ریاستی نظام اس مقام سے پیچھے ہیں۔ دستور جماعت کو بھی چھوڑیئے۔ آپ "دو دستوری خاکے" اٹھا کر دیکھئے۔ ان میں آپ کو وہ دستوری خاکے ملے گا جو جماعت اسلامی کے لٹریچر کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اسے دیکھ کر بتایئے کہ کیا واقعی کوئی ملایانہ نظام اور کوئی تھیاکریسی اس خاکے کے بل پہ قائم ہو سکتی ہے۔ پھر آخر ہوائی پراپیگنڈے سے کیا فائدہ؟ ہاں اگر ان حضرات کے نزدیک کسی نظام میں خدا اور رسول کا نام آنے اور ان کے فائینل اتھارٹی قرار پانے سے ملائیت اور تھیاکریسی قائم ہوتی ہے۔ تو پھر ان کے ذہنی اشکال کو رفع کرنا کسی استدلال سے ممکن نہیں ہے، پھر تو ان کے دماغ اسی دن درست ہو سکتے ہیں جب کہ اسلامی نظام عملاً برپا ہو جائے گا۔

"کوئی ایسی قانون سازی نہ کی جائیگی جو شریعت کے احکام یا اصول کے خلاف ہو" (شق ۳)

بظاہر جیسا معلوم ہوتا ہے کہ شق ۲ کے بعد یہ شق غیر ضروری ہے لیکن فی الواقع یہ غیر ضروری نہیں بلکہ اشد ضروری ہے۔ اسلامی شریعت ایک شاہراہ تو وہ ہے جس میں قانون سازی خود خدا اور رسول نے کر دی ہے اور کوئی نہ کوئی صریح حکم یا اشاراتی ہدایت ایک معاملے میں موجود ہوتی ہے اور ایک مسلم ریاست پابند ہے کہ وہ ایسے احکام اور اشارات کے آگے اپنے اختیارات کا سر تسلیم خم کر دے۔ مگر ایک دائرہ ایسا بھی

جن میں حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر ہمیشہ کے لئے واضح یا اشاراتی احکام نہیں دیئے گئے۔ بلکہ اسلامی ریاست کو حق دیا گیا ہے کہ وہ اس دائرے میں حسبِ ضرورت قوانین و احکام کو نافذ کرے۔ اس دائرہ میں اگر کوئی پابندی ہے تو صرف یہ کہ جو قوانین و احکام نافذ کئے جائیں ان کی بنیاد مصلحتِ اسلام اور مفادِ مسلمین پر ہو اور وہ کسی حال میں شریعت کے واضح اور اشاراتی اوامر و نواہی سے متصادم نہ ہوں۔

اس دائرہ میں اگر دستوری طور پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے اور بدقسمتی سے زمامِ کار غیر مخلص لوگوں کے ہاتھ میں ہو تو ایک طرف وہ شریعت کے اوامر و نواہی کو قانون بنا کر نافذ کرنے کے بعد دوسری طرف سے ایسے من مانے فیصلے کر سکتے ہیں جو ان اوامر و نواہی سے قدم قدم پر ٹکرائیں اور نتیجۃً شریعت کا سارا منشا تباہ ہو کے رہ جائے۔ مثلاً ہمارے موجودہ حکمرانوں سے پوچھئے تو بلبل چودھری کے رقص میں بھی مصلحتِ مسلمین ہے۔ اور عورتوں کی بے پردہ پریڈوں میں بھی مفادِ مسلمین ہے۔ بنا بریں یہ ضروری ہوا کہ از روئے دستور قانون سازی کے دوسرے دائرے کے گرد اس پابندی کا جنگلہ کھڑا کر دیا جائے کہ جو قانون سازی کو مصلحتِ اسلام اور مفادِ مسلمین کے حقیقی تقاضوں تک محدود رکھے اور اگر کوئی غلط فیصلہ کیا جائے تو وہ از روئے دستور ناقابلِ نفاذ ہو۔

"تمام ایسے قوانین کو منسوخ کیا جائیگا جو شریعت کے احکام یا اصول کے خلاف ہوں" شق ۲

اس شق کا منشا یہ ہے کہ اب تک جن غیر اسلامی قوانین نے اسلامی اصول و مقاصد کے نشوونما پانے کا راستہ روک رکھا ہے۔ ان کو ختم کرنے کی دستوری گارنٹی بہم پہنچ جائے اور ایسا نہ ہو کہ ایک طرف شریعت کے قوانین نافذ ہو رہے ہوں اور دوسری طرف پرانے غیر اسلامی قوانین کا عمل دخل بھی برقرار رہے اور دونوں کے تصادم سے شریعت کے مقاصد کو نقصان پہنچے۔ اسلامی قوانین کا نفاذ پوری طرح بغیر اس کے ہو ہی نہیں سکتا کہ سابق قوانین کو ان کے راستے سے ہٹا یا جائے۔ بخلاف اس کے آدھا تیتر آدھا بٹیر کی کیفیت پیدا ہو جائے تو نظامِ شریعت کی افادیت کبھی نمایاں نہ ہو سکے گی۔ اس شق کے دستور میں شامل ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ آئندہ بھی اگر کبھی کوئی غیر اسلامی قانون ملک پر مسلط کیا جانے لگے گا تو دستور اس میں روک بن سکے گا۔

"حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ ان برائیوں کو مٹائے جنہیں اسلام مٹانا چاہتا ہے اور ان تمام بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے" (شق ۴)

یہ دفعہ بھی دراصل غیر مخلص لوگوں کے ہاتھوں سے اسلامی ریاست کے مقاصد کو بچانے کے لئے مطالبے میں رکھی گئی ہے۔ ورنہ پہلے خود قرآن اسلامی ریاست سے جو بنیادی مطالبے کرتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے اور اسے شریعت کے صریح احکام میں جگہ حاصل ہے اور پھر قراردادِ مقاصد میں اس چیز کو زبانی ہی قبول کر بھی لیا گیا ہے۔ مگر جو ضرورت اس کو دستور کی ایک دفعہ بنانے کی داعی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی اسلام دشمن طاقت برسرِ اقتدار آجائے تو ایک طرف وہ قانون کے دائرے میں شریعت کو نافذ کر کے دوسری طرف تعلیم و تربیت کے ذرائع و وسائل کو بالکل خلافِ شریعت مقاصد میں لگا سکتی ہے اور اس طرح سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتی ہے۔ نظامِ زندگی کا سارا قانون پر مشتمل نہیں ہوتا اور نہ صرف قانون ہی کے بل پر تشکیل پاتا ہے۔ بلکہ زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں تعلیم و تربیت کے ذرائع اور کلچرل و سوشل معاملات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ زندگی کے صلاح و فساد میں ایک قوم کا نظامِ تعلیم اور اس کے [illegible]

ہم مطالبہ کرتے ہیں۔

اور کالج اور یونیورسٹیاں بڑا اہم پارٹ ادا کرتی ہیں۔ اس کی قومی تقاریب اور اس کے مظاہرات کا اس میں بڑا حصہ ہوتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن اور سینما بھی اس میں بڑا اثر رکھتی ہے۔ مختلف محکموں کے ٹریننگ کورس اور تربیتی مراکز کا مجموعی ماحول اور ضابطۂ ملازمت اس میں دخیل ہوتا ہے اور پھر اکابر حکومت اور عہدہ داروں اور افسروں کا انداز عمل قومی ذہنیت کی تشکیل میں دور رس تاثیر رکھتا ہے۔ اگر یہ اندیشہ واقعی ہو جائے کہ قانون کا دائرہ شریعت کی تحویل میں دینے کے بعد حکومت تربیتی ذرائع کو شریعت کے منشا کے بالکل خلاف استعمال کرنے لگ جائے تو تنہا قانونی نظام ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اور نہ اس سے کوئی مفید نتائج نکل سکتے ہیں۔ اسی اندیشہ کے سد باب کے لئے یہ ضروری ہوا کہ دستوری طور پر یہ بھی طے ہو جائے کہ حکومت تمام تربیتی ذرائع کو اسلام کی مطلوبہ بھلائیوں کے پھیلانے اور اس کی ممنوعہ برائیوں کے سد باب کرنے کے لئے استعمال کرے گی۔ اس دفعہ کے دستور میں شامل ہو جانے کے بعد ناگزیر ہے کہ قانون اور تعلیم و تربیت کے دونوں دائروں میں ہمارا نظام حیات بالکل ہم آہنگ ہو جائے اور اگر دونوں دائروں میں کہیں کوئی منافات پیدا ہو تو دستوری طور پر گرفت کی جا سکے۔

"لوگوں کے شہری حقوق (تحفظ جان و مال، آزادی تحریر و تقریر، آزادی اجتماع، آزادی نقل و حرکت) کو ان کا جرم کسی عدالت میں ثابت کئے بغیر اور ان کو صفائی کا موقع دیئے بغیر سلب نہ کیا جائے گا" (شق ۸)

سیاست کے لئے سب سے بڑی وجہ جواز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ بغیر اس کے لوگوں کے شہری حقوق نہ دیئے جاتے ہیں اور نہ ان کا تحفظ ممکن ہے۔ حکومت کا وجود انسان کے قابل اگر ہے تو اس لئے تو ہے کہ اس کے گروں پر بیٹھنے کے بعد ایک ایک فرد کے شہری حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن انسانیت کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ دنیا کے بعض کمینہ حکمرانوں نے مختلف بہانوں سے عوام کے شہری حقوق چھین لینے کے ڈھنگ ڈھونڈ رکھے ہیں اور ڈاکہ ڈالنے کے عجیب و غریب ہتھکنڈے ایجاد کر کے اپنے پیچھے چھوڑے ہیں۔ آج معمورۂ ارضی کا بہت ہی کم حصہ ایسا ہمارے سامنے ہے کہ جہاں انسانی کو شہری حقوق کی سلامتی حاصل ہے۔ خود ہمارے ہاں تو حال اتنا پتلا ہے کہ آزاد اقوام کے سامنے ہمارے لئے سر اٹھانا مشکل ہے یہاں تو جان و مال اور آبرو کا تحفظ بھی پوری طرح عوام کو حاصل نہیں رہا۔ کجا کہ آزادی تحریر و تقریر!

یہ ہماری تاریخ آزادی کا شرمناک باب ہے کہ ہمارے ملک کے ایک بھرے شہر سے ایک شہری کو غائب کر دیا جاتا ہے اور ہمارے حکمران عالم سے بیچارا نا آموز کنارا، یہ پتہ تک نہیں چلا سکتے کہ وہ کہاں گیا۔ ہمارا اشارہ شمس الحق کے واقعہ کی طرف ہے جو لائل پور شہر میں پیش آیا۔

پھر ہماری تاریخ کا یہ ایک اور شرمناک باب ہے کہ دھیرو کے ضلع لائل پور میں خود امن کے محافظوں نے بستی کو گھیرے میں لے کر مردوں اور عورتوں کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک کیا لیکن کوئی طاقت ذمی جان کی داد رسی کر سکتی ہے۔ پھر ہماری تاریخ کا یہ ایک اور شرمناک باب ہے کہ چک ۲۲۲ ضلع جھنگ کی جانوں اور مالوں اور عصمتوں پر خود مسلمان پولیس کے ہاتھوں ایک قیامت گزر گئی اور کوئی نہ مقام حالات کی تحقیقات کرتا اور مظلوموں کے زخموں کو پوچھتا۔ پھر ہماری تاریخ کا یہ بھی ایک شرمناک باب ہے کہ پاکستان کی ایک ریاست کا والی کسی دستور و قانون کے بغیر حکومت کرتے ہوئے اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کی جانوں پر تصرفات کرتا ہے۔ ان کو ریاست بدر کرتا ہے۔ ان کو قید و بند میں ڈالتا ہے۔ ان پر یکساں شاہی انداز سے جرمانے کرتا ہے۔ عوام اس کے پنجے میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں جیسے کہ قصاب کے سامنے بکریاں اور بکریاں بے بس ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی نہیں جو اس سے پوچھ سکے کہ یہ جتنے حق میں کئے جاتے ہیں؟

یہ تو ہوا انسانیت کے ایک بنیادی حق کا معاملہ! اس کے بعد دنیا کے سب سے بڑے سیاسی حق کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انسانی ذہن خیالات و افکار کا سرچشمہ ہے اور اس سرچشمہ سے خیالات و افکار کی پیدائش کو کسی جبر سے نہیں روکا جا سکتا۔ خیالات و افکار اگر پیدا ہوتے ہیں تو اسی لئے تو پیدا ہوتے ہیں کہ ان کو ظاہر کیا جائے اور دوسروں تک ان کو منتقل کیا جائے۔ تاکہ انسانیت ان میں سے وہ کچھ اخذ کرے جو اس کے لئے مفید ہے۔ بخلاف اس کے اگر خیالات و افکار کو ظاہر کرنے سے لوگوں کو روکا جائے یا ذہنوں کو بالجبر سوچنے سے باز رکھا جائے تو یہ انسانی فطرت سے جنگ ہے، اور انسان کو اس پر مجبور کرنا ہے کہ وہ اپنی فطرت سے جنگ کرے۔ انسانی فطرت سے جنگ کرنا کبھی بھی انسانیت کے لئے موجب خیر نہیں ہوا۔ چنانچہ صدیوں کے تجربات کے بعد دنیا نے آدمی کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ وہ سوچنے اور خیالات پیدا کرنے اور ان کو دوسروں تک منتقل کرنے میں آزاد ہے اور اس آزادی کا تحفظ ہونا چاہیئے۔ یہ وہ حق ہے کہ آدمی سے اسے سلب کر لینے کے بعد آزادی کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ اور اس حق کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اختلاف کا حق اور تنقید کا حق بھی تسلیم کر لیا۔ اور یہ سارے حقوق اولاد آدم کے بالکل فطری حقوق ہیں۔

مگر حکمران طاقتوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ ان کا اقتدار دوامی ہو۔ چنانچہ جو کوئی بھی ایک مرتبہ مسندِ حکومت پر بیٹھا ہے۔ وہ پھر آسانی سے اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا ہے چنانچہ اقتدار کو دوامی بنانے کی خواہش ہی کے تحت آدمی سے آزادی رائے، اظہارِ خیالات، اختلاف اور تنقید کی آزادیوں کو سلب کرنے کے طریقے ایجاد ہوئے ہیں۔ ہماری پوری تاریخ بربریت و درندگی اسی ایک خواہش کے محور پر گھومتی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا بڑے سے بڑے فراعنہ و نماردہ بھی انسان کے سیاسی حق کو جبر و تشدد سے پامال کر کے اپنے اقتدار کو دوامی بنانے کی ہوس پوری کرنے میں کامیاب ہو سکے؟ جواب نفی میں ہے۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے زبانوں سے تبدیلی کا پیغام سننا گوارا نہیں کیا۔ ان کو بالآخر یہ پیغام تلوار کی زبان سے سننا پڑا ہے اور جنہیں قلم کی نوک کے لکھے ہوئے الفاظ میں اپنی قسمت کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔ ان کے نامہ ہائے تقدیر پھر تیروں کی نوکوں سے لکھے گئے ہیں۔ اور جنہیں ووٹ کے ذریعے اپنے مقام سے ہٹ جانا قبول نہیں ہوا۔ ان پر تقدیر الٰہی نے بندوق کی گولی استعمال کی ہے۔ اس طرح کے ہزاروں تلخ تجربات کے بعد نظام جمہوریت میں انسان کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ ایک حکومت۔ ایک حکمران، ایک نظام حیات اور ایک تہذیب کے خلاف رائے دے سکتا ہے اور اسے بدلنے کے لئے رائے عامہ کو ہموار کر سکتا ہے۔ اور حکمران طاقتوں نے خیر اسی میں دیکھی کہ وہ پُرامن تبدیلی کے لئے دروازے کھلے رکھیں۔ اور فطرتِ انسانی کے خلاف جنگ نہ چھیڑیں۔

مگر نہ جانے ہمارے ہاں کیوں حکومت زمانے کے موجودہ موقف سے دو ہزار سال پیچھے چلنے پر مصر ہے۔ یہاں ایک طرف یہ اہتمام ہے کہ ریڈیو کی قومی طاقت برسرِ اقتدار گروہ کا اجارہ بنی رہے۔ دوسری طرف اس کا بندوبست ہے۔ کہ پریس کو خرید کر بھی، اور ڈرا دھمکا کر بھی خوشامدی بنا کے رکھا جائے۔ حد یہ کہ ایڈیٹروں پر بسا اوقات لکھے لکھائے ایڈیٹوریل ایک دفتر سے القا کر دیئے گئے۔ اور ان سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ وہ ان کو اپنی طرف سے شائع کریں۔ اور یہ شائع ہوئے۔ اور پھر یہ کہ ایک دفتر کے ٹیلیفون سے اے۔ پی۔ پی کو بھی اور اخبارات کے دفتروں کو بھی بارہا کسی خاص جماعت کے متعلق یا کسی خاص واقعہ کے متعلق خبریں دینے کے لئے کوئی پالیسی متعین کر کے دی گئی۔ اور وہ پالیسی نافذ ہوئی۔ اسی القا کے تحت بارہا اخبارات نے کسی خاص جماعت یا کسی خاص واقعہ کی خبروں کا بلیک آؤٹ کیا اور بارہا کسی کی حمایت میں اور کسی کی مخالفت میں صحافتی مہم چلا کر حکمرانوں کے حسب منشا فضا تیار کر کے دی۔

لیکن اختلاف اور تنقید کے حق کو دبانے کے لئے صرف انہی تدابیر پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ انگریز کے بنائے ہوئے انہی کالے قوانین کو جن پر خود ہمارے حکمران تین حرف بھیج چکے ہیں۔ مستقلاً اپنے قصرِ اقتدار کا "پاں" بنا لیا گیا۔ تمام صوبوں میں صوبائی

سیفٹی ایکٹوں کی سنگینیں تان دی گئی ہیں۔ اور ان سب سے اوپر مرکز کے سیکورٹی ایکٹ کی گلوٹین لگا دی گئی ہے۔ ان قوانین کے ذریعہ مفاد ملت اور امن عامہ اور ریاست کے تحفظ کے نام پر ایسے بے پناہ اختیار حاصل کر لئے گئے ہیں۔ کہ شہریوں کی سیاسی آزادی چند افراد کے پاس مال مرہونہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان قوانین کے ہوتے ہوئے حق بات کہنے اور حکمرانوں سے اختلاف کرنے کی جس کسی نے بھی جرأت کی ہے تلواروں کی چھاؤں میں اور سولی کے تختے پر کھڑے ہو کر کی ہے۔ بے شمار وہ لوگ ہیں کہ جو ناحق جیلوں میں ڈالے گئے اور بے شمار وہ جرائد ہیں کہ جو ان کالے قوانین کی چھریوں سے ذبح کئے گئے۔ اور پھر ایک عام خوف کی حالت ہے جس کا سایہ پڑنے کی وجہ سے عوام پر ذہنی جمود اور بے بسی کی کیفیت طاری ہے۔

تنی ہوئی سنگینوں کے سائے میں انتخابات منعقد کئے جاتے ہیں کہ جن میں ساری افادیت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ آزادیٔ رائے کی فضا بحال کی گئی ہو۔ آزادیٔ رائے کو سولی پر چڑھا دینے کے بعد انتخابات منعقد کرنے سے فائدہ؟ — ہو سکتا ہے کہ اس کے باوجود بھی انتخابات مفید ہوں۔ مگر اپنے اقتدار کو دوامی بنانے کی بپانی خواہش کے تحت برسر اقتدار پارٹی کی حکومت پہلے یہ کرتی ہے۔ کہ فہرستیں غلط بناتی ہے۔ پھر حلقہ بندی اپنے امیدواروں کے مفاد کو سامنے رکھ کر کرتی ہے۔ پھر سرکاری افسروں کو والنٹیئر بنا کر استعمال کرتی ہے اور پھر رہی سہی کسر جعلی ووٹوں سے پوری ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے انتخابات کا تجربہ پنجاب اور سرحدی صوبے اور ریاست بہاولپور میں کرنے کے بعد عوام اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ امیدواروں کی کامیابی و ناکامی کا دارومدار ان کی مرضی پر نہیں بلکہ حکمرانوں کی مرضی پر ہے نمائندوں کا تعین عالم بالا میں پہلے سے ہو چکتا ہے۔ اور عوام کا دل بہلانے کے لئے انتخابی ڈرامہ بعد میں کرایا جاتا ہے۔

آزادیٔ رائے کا جو حال آج ہو رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے — کہ ضلع لاہور کے دیہات میں جب پنچایت سازی کی مہم جماعت اسلامی کے کارکنوں نے شروع کی تو ان کے پیچھے پولیس لگا دی گئی۔ لوگوں کو دھمکایا جانے لگا۔ اور بعض نوجوانوں کے نام دس نمبریوں کی فہرست میں درج کرنے کی کارروائیاں ہونے لگیں۔ اس پر احتجاج کیا گیا۔ تو پنجاب کی حکومت نے روک تھام کی۔ سب سے تازہ واقعہ یہ سنئے — کہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ایک کارکن کو دیہات میں دعوت کے کام پر پولیس کی طرف سے تنبیہ کی گئی۔ اور دھمکایا گیا ہے۔

اور سیاسی آبرو کے تحفظ کا عالم یہ ہے کہ ملک و قوم کے کسی بڑے سے بڑے خادم و محسن کو دو پیسے کا ایک صحافی۔ ایک ان پڑھ سیاسی ورکر، ایک معمولی درجے کا پولیس مین، بلکہ ایک راہ چلتا چھوکرا پوری بے تکلفی سے غدار اور تخریب پسند اور ہندوستان کا جاسوس کہہ سکتا ہے۔ لوگوں کی سیاسی آبرو صرف اکابر ہی کا کھلونا بنی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ سوسائٹی کے پست ترین لوگوں کے لئے ایک مال غنیمت ہے۔ اس معاملے میں ہر شخص خود جج ہے۔ اور ہر پارٹی خود عدالت ہے۔ اور ہر فلاں اور فلاں خود قانون ہے!

یہ آزادی رائے دوسروں کے ہاں تو محض سیاسی فلاح و بہبود کے لئے مطلوب ہو گی، مگر اسلام میں یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے شرعی فریضے کا لازمی تقاضا ہے۔ اسلام اپنی ریاست کے ہر شہری — پر یہ فرض عائد کرتا ہے۔ کہ اپنے اکابر کو، اپنے اجتماعی نظام کو ہمیشہ نگاہوں میں رکھے اور جہاں کوئی غلطی محسوس کرے، اس کے خلاف آواز بلند کرے اور جہاں کسی بھلائی میں کمی محسوس کرے، وہاں اس کی تکمیل کا مطالبہ کرے۔ وہ ہر باطل کو لازماً باطل اور حق کو لازماً حق کہے۔ وہ نیکی کے حق میں اور بدی کے خلاف زور لگائے۔ وہ زندگی کی گاڑی کو صراط مستقیم سے انحراف نہ کرنے دے۔ وہ اگر رائے دے تو اچھے لوگوں کے حق میں دے اور برے لوگوں کے خلاف دے — پس ایک اسلامی ریاست میں آزادیٔ رائے کو بحال کرنا خود شرعی ضرورت ہے اور اس کا

سلب کرنا مداخلت فی الدین ہے۔

بالیقین اسلام ایک مسلمان کی زبان و قلم کو کھلی چھٹی نہیں دیتا۔ کہ وہ جو کفر چاہے بکے اور جس شر کو چاہے پھیلائے۔ وہ تقریر و تحریر کی قوتوں کو بہر حال اپنے مقاصد کے تابع رکھتا ہے۔ اور ان مقاصد سے اگر کوئی زبان یا کوئی قلم انحراف کرے تو وہ اس پر گرفت کرتا ہے۔ مگر یہ گرفت کرنا کسی وزیر اور کسی پولیس آفیسر کا کام نہیں۔ اسلام کی عدالت کا کام ہے۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے ماننے والوں کے جان و مال اور آبرو کے تحفظ کے حقوق کی طرح سیاسی حقوق پر بھی کوئی دراز دستی باضابطہ عدالتی کارروائی کے بغیر روا رکھی جائے۔ یہ اختیار نبی صلعم نے کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔ یہ اختیار خلفائے راشدین نے کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔ تو اور کون ہوتا ہے جو لوگوں کے جان و مال اور ان کی آزادیٔ خیال پر اپنے لئے وہ اختیار چاہے جو صرف اللہ تعالےٰ ہی کے لئے خاص ہے۔ اسلام کا اصول حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ ــــ لا یؤسر الرجل فی الاسلام الا بالعدل ــــ یعنی اسلامی نظام میں کسی شخص کو عدالتی کارروائی کے بغیر قید میں نہیں رکھا جاسکتا۔ یہی الفاظ ہمارے دستور میں شامل ہو جانے چاہئیں۔ تاکہ وہ ہاتھ بندھ جائیں جو لوگوں کے شہری حقوق پر ڈاکے ڈال کر اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کے خوگر ہوں۔ حکومت اگر کسی شہری کی کسی حرکت یا اس کے کسی قول یا اس کی کسی تحریر کو، اسلام یا حکومت یا عوام کے مفاد کے خلاف پاتی ہے۔ تو وہ عدالت کے سامنے آکر اس پر الزام لگائے۔ الزام کے حق میں شہادتیں لائے۔ اور جواب میں ملزم کو صفائی پیش کرنے کا حق حاصل ہو۔ پھر اگر الزام ثابت ہو جائے۔ اور وہ قانون شریعت کی رو سے قابلِ سزا ہو۔ تو بے تکلف سزا نافذ کر دی جائے۔ لیکن اگر الزام ثابت نہ ہو سکے تو کسی شہری کی طرف انگلی اٹھانے کا اختیار بھی پولیس تو کجا ہمارے ملک کے گورنر اور وزیر اعظم تک کو بھی حاصل نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ الٹا جو کوئی کسی کی نیت پر بے جا حملے کرے اور اس پر بلا دلیل الزامات عائد کرے۔ اس کے خلاف ایک شہری توہین کا دعوےٰ دائر کرنے کے قابل ہو۔

بغیر اپنے شہری حقوق کو محفوظ کرائے ہم نہ آزاد ہو سکتے ہیں۔ اور نہ اسلام کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس شق کا دستور میں شامل ہونا ہمارے نزدیک ضروری ہے ::

(باقی آئندہ)

جذبات کے دھارے

تبسم ریز ہو جاتے فطرت کے شہپارے
تری تنویر سے تابندہ ہیں شمس و قمر تارے

نہ سمجھا آج تک انساں کہ کیا ہے عقدۂ عالم
خرد کے گھس گئے ناخن جنوں نے دست و پا مارے

تصور سے ابھی تک لرزہ براندام ہے دجلہ
نہ جانے تیز ہیں کتنے مرے جذبات کے دھارے

تعلق تیرگیٔ شام کا ہے صبح روشن سے
عبث مایوس ہوتے ہیں غمِ ایام کے مارے

مری آہِ شرر انگیز نے یہ کر دیا ثابت
کہ قلب برف و شبنم میں بھی پوشیدہ ہیں انگارے

مجھے بخشی گئی روزِ ازل تقدیر سیمابی
ثوابت بن نہیں سکتے مری قسمت کے سیارے

خدا رکھے سلامت میرے احساسات کا احساں
یہی تو ہیں کسی کی یادِ پارینہ کے گہوارے

جشنِ یومِ حرّیت

(۱)

پھر یہ سطوت اُڑے! یہ نورپاش قمقمے!
یہ برق ریز قہقہے! یہ حشر خیز چہچہے!
یہ سحر ناک زمزمے! یہ کیف بخش ولولے!
ہزار کھو کھلے سہی! یہ طنطنے! یہ ہماہمے
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو مفت نہ آئیگا
تو نغمہ ہائے شوق کے سُر دلوں میں سرملائے جا
یہ جشنِ یومِ حرّیت منائے جا، سنائے جا

(۲)

اگرچہ جانتا ہوں میں! یہ سیم و زر کا جشن ہے
یہ جشنِ آدمی نہیں! یہ بام و در کا جشن ہے
یہ ہاؤ ہو کا جشن ہے! یہ شور و شر کا جشن ہے
یہ دل کا جشن ہے کہاں، فقط نظر کا جشن ہے
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو مفت نہ آئیگا.
علم اٹھائے تو بھی چل، لپک! قدم بڑھائے جا
یہ جشن یومِ حرّیت منائے جا، منائے جا

۳

اٹھو! اٹھو! بڑھو بڑھو! عجیب دھوم دھام ہے
زمانہ نئے ہیبت ہے! زمانہ بے لجام ہے
خوشی ہوئی ہے فرض ہاں! ملال اب حرام ہے
ہنوز مرغِ آرزو اگرچہ زیرِ دام ہے
— مگر مرے رفیقِ دیں!
یہ دن تو پھر نہ آئیگا
اگرچہ زیرِ دام ہے! خوشی سے پھڑپھڑائے جا
یہ جشنِ یومِ حریت منائے جا، منائے جا

۴

اگرچہ دیکھتا ہوں میں ریاستِ سوات میں
قدم قدم پہ بھیڑیے ہیں آدمی کی گھات میں
تمام قافلے کی باگ راہ زن کے ہات میں
وفا کی جنس لٹ گئی جفا کی تیرہ رات میں
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو پھر نہ آئیگا
ہزار زخم کھا کے بھی جو ٹیس اٹھے، دبائے جا
یہ جشنِ یومِ حریت منائے جا، منائے جا

۵

اگرچہ ایک گاؤں میں قیامتیں گزر گئیں
نسائیت کی چولیاں بری طرح تر گئیں
گلِ حیا کی پتیاں ادھر ادھر بکھر گئیں
کہ باڑھ ہی کی جھاڑیاں تمام کھیت چر گئیں
— مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو پھر نہ آئیگا
اگرچہ آنکھ میں ہوں اشک، پھر بھی مسکرائے جا!
یہ جشنِ یومِ حریت، منائے جا، منائے جا!

(۶)

حقوقِ شہریت کا ہے جگر یہاں چھدا ہوا
ادب کی شاہ رگ پہ ہے چھرا سا اک دھرا ہوا
زباں زباں کٹی ہوئی! قلم قلم بندھا ہوا
فغاں فغاں دبی ہوئی! نفس نفس گھٹا ہوا
مگر مرے رفیقِ دیں!
یہ دن تو پھر نہ آئیگا
پیئے بھی جا جگر کا خون! مزے سے غم بھی کھائے جا
یہ جشنِ یومِ حریت، منائے جا منائے جا

۷

نہ جانے کتنے دل یہاں حیات کے مزار ہیں
نہ جانے کتنے جسم یاں زمیں کے تن کا بار ہیں
کہ بھوک ہی کے لئے جو چیتھڑا خسکار ہیں
نہ جانے کتنے پیرہن ہنوز تار تار ہیں
مگر مرے رفیقِ دیں!
یہ دن تو پھر نہ آئیگا
نمائشوں کی اوٹ میں حقیقتیں چھپائے جا
یہ جشنِ یومِ حریت منائے جا، منائے جا

۸

لٹی لٹی گھٹی گھٹی، گھلی گھلی جوانیاں
یہ زرد زرد، سرد سرد، مردہ زندگانیاں
گلی گلی میں گامزن یہ دکھ بھری کہانیاں
یہ حال! اور اس میں پھر بڑوں کی لن ترانیاں
مگر مرے رفیقِ دیں!
یہ دن تو پھر نہ آئیگا
مظاہرے کی لاج رکھ، اکڑ کے دندنائے جا!
یہ جشنِ یومِ حریت منائے جا، منائے جا!

۹

یتیم ہیں مگر انھیں کوئی بھی پوچھتا نہیں
ہزارہا ابھاگنیں کہ جن کا آسرا نہیں
مریض بے شمار وہ کہ جن کی یاں دوا نہیں
خوشی کا یہ محل نہیں، سکوں کی یہ فضا نہیں
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو پھر نہ آئیگا
حسین سبز باغ کچھ نگاہ میں سجائے جا۔
یہ جشنِ یومِ حریت منائے جا، منائے جا۔

۱۰

عجیب انقلاب ہے! نظام لاجواب ہے
یہ شاہد و شراب ہے! یہ بربط و رباب ہے
یہ حسن بے نقاب ہے! یہ عشق سو حجاب ہے
یہ طاعتِ رسولؐ ہے! اقامتِ کتاب ہے
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو پھر نہ آئیگا
یہاں تلک بھی بہک کے - ابھی فریب کھائے جا!
یہ جشنِ یومِ حریت، منائے جا منائے جا!

۱۱

چمن تمام غم زدہ! کلی چٹک نہیں رہی!
گلوں کا رنگ اُڑ گیا، چمک دمک نہیں رہی
نسیم ہوگئی ہوا، ذرا مہک نہیں رہی
تڑپ قفس میں بلبلیں، کہیں چہک نہیں رہی
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو نت نہ آئیگا
خوشی کے گیت گائے جا! مزے سے تان اُڑائے جا
یہ جشنِ یومِ حریت! منائے جا، منائے جا

۱۲

--------- --------- -

فضا اداس اداس ہے، محل بجھے تو کیا ہوا
دلوں پہ اک ہراس ہے! اگر بجھے تو کیا ہوا
حیات غرقِ یاس ہے، دیئے جلے تو کیا ہوا
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو نت نہ آئیگا
حیاتِ غرقِ یاس ہے، اگر دیئے جلائے جا!
یہ جشنِ یومِ حریت منائے جا، منائے جا!

۱۳

یہ فصلِ گل عجیب ہے! بہار بھی، خزاں بھی ہے
یہ شور و شر عجیب ہے، نغمہ بھی، فغاں بھی ہے
یہ دین بھی ہے کفر بھی، یہ ایں بھی ہے یہ آں بھی ہے
جدید بھی، کہن بھی ہے! یہ پیر بھی، جواں بھی ہے
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو نت نہ آئیگا
جو کھو سکے سو کھوئے جا، جو پا سکے سو پائے جا
یہ جشنِ یومِ حریت منائے جا، منائے جا

۱۴

پسی ہوئی ہے ہر قدم! ہیں دین کی لعائتیں
یہ غم خوردہ سی زمیں! یہ سینہ چاک آئتیں
ادھر سے کچھ عنائتیں! ادھر سے کچھ عنائتیں
بڑے کمینہ طبع ہیں! بڑی ذلیل فائتیں
مگر مرے رفیقِ دیں
یہ دن تو نت نہ آئیگا
فضا کا ہے مطالبہ زباں کے پھاگ اٹھائے جا
یہ جشنِ یومِ حریت منائے جا، منائے جا

اے ساقی!

کوثر نیازی

جن فضاؤں پہ تھا جنت کا گماں اے ساقی!
خاک اُڑتی ہوئی دیکھی ہے وہاں اے ساقی!

ہر عمل ۔ روحِ حیاتِ ابدی سے خالی
ہر نفس ہجرِ حیاتِ گزراں اے ساقی!

گلشنِ دہر کی مسموم بہاریں توبہ!
دل ہر برگ سے اُٹھتا ہے دھواں اے ساقی!

آہ! یہ روح کی آواز کی قاتل دُنیا
چھوڑ دوں تجھ کو تو ملتی ہے اماں اے ساقی!

اب تو انسان کو محبوب ہوئی خوں خواری
"بادہ خواری" کے مزے آج کہاں اے ساقی!

کیا میں گردِ رہِ منزل سے لپٹ کر رو دُوں
لوگ تو جانبِ منزل ہیں رواں اے ساقی!

آج اشرار میں ممتاز نظر آتے ہیں
وہ جو تھے قبلۂ اشرافِ جہاں اے ساقی!

آج بھی اُن کے مظالم میں ہے قوت باقی!
آج بھی میرے عزائم ہیں جواں اے ساقی!

دیکھیے کون ہو جو عدل کو قائم کر دے
چشمِ مظلوم ہے اب تک نگراں اے ساقی!

حاجتیں جتنی ہوئیں وقف ترے در کے لئے
وہ گداگر ہیں شہنشاہِ جہاں اے ساقی!

میں جسے منفعتِ کون و مکاں سمجھا ہوں
اہلِ دنیا اُسے کہتے ہیں "زیاں" اے ساقی!

ذکر بھی جس کا طبیعت کو ہلا دیتا تھا
وہ مصائب بھی ہیں اب راحتِ جاں اے ساقی!

قلبِ شاعر میں جو اخلاص تو پیدا ہو جائے
شعر میں جوہرِ شمشیر و سناں اے ساقی!

چارلس ڈبلیو فلپس کا کیس

جیلانی بی اے

کباڑ کی دکانوں میں کتابیں تلاش کرنا میرا محبوب مشغلہ ہے اس سے لذتِ جستجو ہی نہیں جس شوق کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ ان کباڑ خانوں سے مجھے ایسی ایسی نادر کتابیں ملی ہیں کہ انہیں دیکھ کر ایک شائقِ ادب کی رال ٹپک پڑے۔ اس غرض کے لیے میں نے ایک کباڑیے سے باقاعدہ دوستانہ بھی گانٹھ رکھا ہے جیسی کتابوں کا کوئی بنڈل اس کے ہاتھ آتا ہے وہ فوراً مجھے بلا لیتا ہے۔

"ابھو ابھی، ہسٹری اور لٹریچر کی بڑے مزے کی کتابیں ملی ہیں۔ دیکھتے جانا"

وہ کرنالوی ہے۔ نام کو ایک حرف نہیں جانتا لیکن مجھ ایسے شائقین سے کتاب کی نوعیت دریافت کر کے گاہک پر ایسا رعب جماتا ہے کہ بے چارہ جھگڑا کرنے کی بجائے منہ مانگی قیمت ہی دے کر جاتا ہے۔ چند دن ہوئے میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ مجھ کو کچھ ایسی جلدی تھی کہ میں اس کی دکان پر بھی نہ رکا۔ مگر اس نے گزرتا دیکھ کر اپنا لڑکا بھیج کر مجھے بلوا لیا۔

"بابوجی، چلے ہی جاتے ہیں؟ کتابوں کا ایک بنڈل ایک صاحب کی کوٹھی سے ملا ہے۔ ذرا دیکھنا تو کس مزے کی کتابیں ہیں۔ میں نے وہ بنڈل ابھی تک نہیں کھولا۔ میں نے سوچا بابوجی آئیں گے۔ انہی سے کھلواؤں گا" اور اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ میں کسی اور کے سامنے کھولتا تو وہ کتابوں کے متعلق غلط علم دے کر اسے دھوکے میں ڈال دیتا۔ یوں اسے گاہکوں کے سامنے صرف خفیف ہی نہیں خسارہ بھی اٹھانا پڑتا اور میں تو اس کا معتمد دوست تھا۔ اگرچہ خود مجھ سے بھی نفع لینے میں اسے کبھی تامل نہ ہوا تھا۔

دھول سے اٹے ہوئے گراموفون کے نیچے سے اس نے ایک چھوٹا سا بنڈل نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ کتابیں احتیاط سے دبیز کاغذ میں لپٹی خوب اچھی طرح بندھی ہوئی تھیں۔ ان کی پھیلاوٹ اور سخت گانٹھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مدت سے یونہی بندھی پڑی تھیں۔ اور بیچنے والے نے بغیر کھولے دیسی کی دیسی اٹھا کر ردی خریدنے والے کے حوالے کر دیں۔ کتابیں نہایت اچھی حالت میں تھیں۔ سب کی سب نفسیات کے متعلق تھیں اور ایک ہی شخص کی تھیں۔ اس کا نام ایچ جیمین تھا۔ نام کے ساتھ کہیں شملہ درج تھا کہیں دہلی اور کہیں کہیں بمبئی۔ وہ پروفیسر تو نہیں تھا کیونکہ پروفیسروں کی کتابیں پڑھی کم اور نشان زدہ زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ فوج کی انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں ہوگا۔ کتابوں اور مصنفین کے ناموں ہی سے پڑھنے والے کے شوقِ علم اور ذہانت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

انہیں کتابوں کے اندر ایک خوبصورت اور میلنے سائز کی نوٹ بک بھی برآمد ہوئی۔ اس میں مریضوں کی کیس ہسٹریاں درج تھیں۔ میں نے نوٹ بک کا پہلا صفحہ دیکھا اس پر ایچ جیمین کی بجائے جیک کاڈ ایم ڈی لکھا تھا۔ اور اس کے نیچے وہی آثار میں نہیں جان سکا کہ جیمین کے ہاتھوں تھا کہ اس معلومِ نفسیات دہلی کی نوٹ بک کیونکر آگئی۔ یا تو وہ اس کا قرابت دار ہوگا۔ یا کسی زمانے میں اس کا یونیورسٹی کا استاد۔ ان دونوں کے درمیان اتنے گہرے روابط پیدا ہو گئے ہوں گے کہ اس نے جیمین کے شوقِ علم کے پیشِ نظر اپنی ذاتی نوٹ بک تک اس کو دے دی۔ یا پھر جیک کار جیمین کا دوست ہوگا وہ ایک نوٹ بک سے ایک کتاب مرتب کرنا چاہتا ہوگا اور جیمین سے مشورہ لینے کے لئے نوٹ بک

نیویو گی جو اس کے پاس ہی پڑی رہ گئی۔

بہرحال نوٹ بک نہایت دلچسپ اور علمی مواد سے پُر ہے بجیک کا صرف ڈاکٹری نہیں اپنا ذوق بھی دکھتا ہے مریض کے حالات کے ساتھ ساتھ اس کے ذاتی اشارات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس مواد سے مزید کوئی کتاب مرتب کرنا چاہتا ہوگا۔ میں نے اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے ایک کیس بالخصوص اس لائق ہے کہ اسے نوٹ بک ہی میں دفن نہیں رہنا چاہئے۔ اسے مناسب صورت دیتے ہوئے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

★

"دستمبر

نام مریض: چارلس ڈبلیو ٹلیپی

عمر: چوالیس سال

پیشہ: اسسٹنٹ ڈائرکٹر۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری۔

مرض: عصبی اختلال مع شہر دکالوس

وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو چہرے کے بعد سب سے پہلے اس کے غیر متناسب لمبے بازوؤں نے میری توجہ کھینچی وہ طویل قامت نہ تھا۔ لیکن وہ اوسط سے مزید اونچا تھا۔ اس کی پیشانی پر دو عمودی شکنیں کھنچی ہوئی تھیں جو ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ دنیا سے بیزار ہے اور اس کے باطن میں ایک غضب پل رہا ہے جس کو باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا۔ کرسی پر بیٹھ کر وہ اس طرح کسمسانے لگا جیسے اس کے ضیق النفس کا گمان ہونے لگا۔ اس کے چہرے کا تناؤ اس کے اعصاب کے تناؤ کی دلیل تھا۔ اس کا رنگ سیدھا ہوگا مگر اب سیاہی مائل تھا۔ ناک ستواں، وہ اس کے چہرے کو یقیناً معقول اور متناسب بنا سکتی تھی۔ اگر اس کے چہرے پر زخم کا وہ نشان نہ ہوتا جو اوپر کے ہونٹ سے بائیں رخسار کی ہڈی تک پھیلا ہوا ہے اس سے ہونٹ اوپر کھنچ گیا تھا کہ چہرے کا بایاں حصہ ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ اس گھاؤ سے چہرہ نہایت کمروہ بن گیا تھا۔ اس نے سر سے ہیٹ نہیں اتارا تھا۔ مگر تجربی اندازہ ہوتا تھا کہ ماتھا بالکل سپاٹ ہوگی۔ اس کی آنکھیں گول مگر نگاہ تیز اور چبھنے والی تھی البتہ لمبی اور پرگوشت انگلیاں ٹھیک ذہین وحساس دماغ کی غمازی کر رہی تھیں۔

وہ ایک گہرے لسواری رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا جس پر جابجا شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ نیلگوں نکٹائی اگرچہ قیمتی تھی لیکن اس کے سوٹ کے ساتھ زیب نہ دیتی تھی۔ کالر کا کنارہ پسینے سے میلا ہو رہا تھا۔

وہ رنجیدہ، افسردہ اور تھکا ماندہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بوجھل پپوٹے اور تھکی ہوئی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ مدت سے میٹھی نیند نہیں سو سکا۔ جب وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے میرے چہرے کے غیر معاندانہ ہونے کا یقین ہو گیا تو اس نے آہستہ سے اپنا ہیٹ اتارا اور اپنی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھول دیں۔ اس کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ اور اس کی نگاہوں کا اضطراب بھی گھٹ گیا۔

جب وہ بولا تو معلوم ہوا کہ اس کا زخم متورم ہے اس کی آواز میں خشونت تھی۔ اس کے لب ولہجہ سے مجھے احساس ہوا کہ وہ بولنا نہیں چاہتا۔ مجبوراً بول رہا ہے۔ اس کا پورا طرزِ عمل بیزاری ظاہر کر رہا تھا اور یہ رویہ اس کی اعلیٰ عہدہ داری سے کسی صورت آدمی نکار نہ کھاتا تھا۔

چارلس ڈیوڈ فلپس کا کیس

اس کی آنکھوں میں تیزی پھر لپک آئی

"ڈاکٹر میں کچھ مدت سے ایک ہی خواب بار بار دیکھ رہا ہوں میں نہیں جانتا کیا وجہ ہے۔ میرا معدہ اتنا قوی نہیں تاہم بالکل بگڑا ہوا بھی نہیں ہے۔ مقویات معدہ اور مسہل کے باوجود وہ خواب پھر دکھائی دینے لگتا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔ اس نے اپنی مٹھیاں پھر بھینچ لیں۔

"یہ ایک عجیب و غریب خواب ہے" وہ گویا اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ "میں نے دیکھا کہ کائنات ایک ایسی فضا میں لپٹی ہوئی ہے جس کا رنگ ——————" وہ یہاں رک گیا۔ گویا رنگ کی نوعیت بیان کرنے کے لئے کوئی لفظ ڈھونڈھ رہا ہے۔ "گہرے نیلے رنگ میں سرخ رنگ ملا دیا جائے تو اس امتزاج سے جو رنگ پیدا ہوگا بس اس رنگ کی فضا میں ساری کائنات لپٹی ہوئی تھی۔ یک بیک سماں پر ایک شہاب نمودار ہوا جو ایک بے آواز دھماکے کے ساتھ پھٹا۔ اس کی روشن دم سے ایک ایسی زہریلی گیس نکلی کہ ساری کائنات بیک لحظہ خاکستر ہو گئی۔ دنیا کی ساری آبادی سے صرف ایک میں ہی بچا۔ کیونکہ میں اس حادثہ عظیم کو پہلے ہی سے بھانپ گیا تھا۔ اس ہلاکت سے بچاؤ کے لئے میں نے ایک محفوظ کمرہ تیار کر کے اس میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے سلنڈروں کا اتنا وافر ذخیرہ بہم پہنچا لیا تھا کہ میں بیرونی ہوا سے کم از کم چھ ہفتوں کے لئے بالکل بے نیاز ہو سکتا تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ شہاب اپنی ہلاکت سامانیوں کے ساتھ زمین کی فضا سے گزر چکا ہے تو میں نے اپنے پہرے کا دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا۔ دنیا ویران اور سنسان ہو چکی تھی۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ زمین لاشوں کے انبار سے اٹی ہوئی تھی۔ اکثر لاشیں ایسی تھیں کہ جن کے چہروں پر درد موت مرتسم ہو کر رہ گیا تھا۔ انسان کے منہ منجمد چیخ کی صورت میں کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ سناٹا اور تنہائی کاٹ رہے تھے لیکن ان کی کاٹ کا مجھ پر کوئی اثر نہ تھا۔ میں یہ ضرور محسوس کر رہا تھا کہ وہ کاٹ رہے ہیں لیکن خود اس سے غیر متاثر تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مجھ کو اس کی ذرہ برابر پرواہ نہ تھی کہ اس اجاڑ دنیا کا میں ہی واحد باشندہ ہوں"۔

بظاہر تو اگر وہ اس دنیا اور اس کے نظام کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کی انگلیاں میز کے کنارے پر مضطربانہ رقص کر رہی تھیں۔ وہ اپنے باطن کو مزید بے نقاب نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ موضوع اس کے لئے باعث آسودگی نہ تھا پھر اس نے اپنے تشابہ زخم کو کھلا پایا۔ میں سلیپ میں بیٹھا اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے جذبات کے سامنے شعوری طور پر سپر ڈالنا نہ چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کمزوری سے متعارف تھا۔ وہ اپنی غلط روش کو محسوس کر رہا تھا لیکن اسے قبول نہ کر رہا تھا۔

وہ پھر بولا۔ "جب میں خواب دیکھتا ہوں تو معاً میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ میں خواب میں بھی جذبات کا کوئی شدید تھپیڑا کیوں محسوس نہیں کرتا۔ حالانکہ میری عقل چاہتی ہے کہ ایسی حالت میں مجھے مزید متاثر ہونا چاہئے۔ اس دہشت ناک اور دردناک منظر کو دیکھ کر میرے جذبات کو مزید مچلنا چاہئے البتہ خواب گزر جانے کے بعد میں سخت ہیجانی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میری نیند بالکل اڑ جاتی ہے۔ بس ایک اونگھ سی طاری رہتی ہے جس میں مسلسل یہ احساس رہتا ہے کہ کوئی دروازے پر کھڑا ہے حالانکہ مجھ کو اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہئے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ نہ تو کوئی دروازے پر کھڑا ہے اور نہ میں اٹھ کر دروازہ کھولنے کی سکت اپنے اندر پاتا ہوں۔ لیکن اس احساس سے فارغ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے اس کے انقباض کو رفع کرنے کی مزید کوشش کی۔

"میں بالکل فارغ البال ہوں۔ کسی قسم کا کوئی معاشی غم مدت سے میرے قریب نہیں پھٹکا۔ البتہ میرا بچپن اور لڑکپن بڑی عسرت میں گزرے ہیں"

"آپ کے والدین حیات ہیں؟"

"والد تو وفات پا چکے ہیں البتہ والدہ زندہ ہے۔ اس کی گزر اوقات میرے والد کے ترکے پر ہے۔ میرے والد کیمسٹ تھے۔ جہاں تک والدہ کا تعلق ہے، میں ہر ضرورت کے وقت اس کی امداد بخوشی کرتا ہوں"

"وہ کہاں رہتی ہے"

"وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی ہے جس کا خاوند گلاسگو کی کسی فولاد کی فرم میں ملازم ہے" کچھ وقفہ کے بعد اس نے خود ہی کہا۔ "وہ مجھ سے بہت کم ملتی ہے۔ کیونکہ خود میرے پاس بھی اتنا وقت نہیں"

میں نے اسے بے خبری کے عالم میں پکڑنے کے لئے اچانک سوال کیا۔

"آپ آج کل کسی زہریلی گیس پر تو تجربہ نہیں کر رہے ہیں؟"

وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس شغل میں لگ گیا تھا"

"آپ کی مذہبی تعلیم کہاں تک ہے؟"

"میں مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوں۔ اسکول میں بھی کبھی ادھر متوجہ نہ ہوا تھا"

"کیا آپ خدا کو مانتے ہیں؟"

"میں نے خدا کے متعلق کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ مگر ان دنوں کبھی کبھی ادھر خیال ڈھلک جاتا ہے۔ شاید وہ غلطی نہ ہو جس کو میں ہر دانے پر کھڑا محسوس کرتا ہوں۔ بعض اوقات تو میں بالکل یہی سمجھنے لگتا ہوں"

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا۔ لیکن اس کا چہرہ اور بھی گھناؤنا ہو گیا۔ زخم کا نشان بڑھ گیا۔ اور بھینچے ہوئے ہونٹوں سے ٹیڑھے میڑھے دانت نمودار ہو گئے۔ ایسے چہروں کے لئے خاموشی ہی موزوں حرکت ہے"

پھر میں نے سوال کیا۔ "کیا آپ اپنی موجودہ روش سے مطمئن ہیں؟"

اس کا جواب اس نے یہ دیا "مجھے دوسروں کی طرح زندگی میں کیڑے نکالنے کا کوئی حق نہیں تاہم میں یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تہذیب اور ثقافت سب فریب ہے اس کی بنیاد ریاکاری پر ہے۔ میں بعید کوشش دھیرے دھیرے اپنے آپ کو کسی محفل میں لے جاتا ہوں۔ لیکن چند لمحوں کے بعد میں وہاں سے نکل بھاگنے کی خواہش کی تاب نہیں لا سکتا۔ موسیقی مجھے پسند نہیں، ناچ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ البتہ جدید روسی موسیقی مجھے کسی حد تک گوارا ہے"

"اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہاں کا جینا ہی ناپسند ہے؟"

اس نے آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کر نظر دیوار پر جمالی۔ "میں جیتا تو ہوں۔ لیکن یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جینے کی تکلیف کیوں دی گئی ہے؟ حیات کا مقصد کیا ہے؟"

اس کی انگلیاں پھر مضطربانہ رقص کر رہی تھیں۔ چہرے پر تکلیف دہ بے چینی اور آنکھوں میں تیزی پھر چمکنے لگی۔ وہ اب چلا جانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے رخصت دے دی۔

چارلس ڈبلیو فلپس کاکس

۱۵ ستمبر

چارلس ڈبلیو فلپس کے سوانح زندگی کو سامنے رکھنے سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی ایک مایوس محبت کی سی زندگی ہے جو اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے میں ناکام ہو کر اس کو معدوم دیکھنا چاہتا ہے اس کی پوری شخصیت ایک مرکز پرست کرنا گئی تھی۔ اور وہ مرکز نفرت اور بے زاری کا تھا وہ اس دنیا میں اپنی جگہ نہ پا کر اُسے ناپسند کرنے لگ گیا ہے اور اب وہ اسے مٹا دینا چاہتا ہے۔

اس کے لئے صرف یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ خوبصورت نہیں۔ بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ وہ بدصورت ہے۔ ویسا ہی بدصورت ہے جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا تو اس کے بھائی اُس کی بدصورتی کی وجہ سے مُنہ نے اپنے قریب پھٹکنے نہ دیتے۔ وہ دور سے کھڑا دوسرے بچوں کو کھیلتے دیکھتا مگر اُن کے کھیل میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے تمام حوصلے پست اور ولولے سرد ہو گئے۔ وہ پانچ برس کی عمر تک کوئی کھیل نہ کھیل سکتا تھا جب اسکول میں کسی کھیل میں شریک ہونا پڑتا تو وہ اپنی نااہلیت کی وجہ سے کھیل کرکرا کر دیتے پر گونا معقول کی ملامت کا نشانہ بنتا گھر میں بھی اُسے ناپسند کیا جاتا کہ وہ اکثر اپنی بھدی حرکتوں سے برتن توڑ دیتا۔ یا کوئی اور نقصان کر دیتا اس کی بہنیں خوبصورت تھیں اس لئے ہر مہمان کی نگاہیں انہیں پر پڑتیں اور وہ بدستور ماسکو نگاہ سے اوجھل رہتا۔ تعلیم میں بھی اس کی بہنیں اس سے سبقت لے گئیں اور اس کا باپ اکثر اس کے کان اینٹھ کر کہتا۔

"گدھے تو لڑکیوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ ذرا سوچ تو سہی تو کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا نام روشن رکھنے کے لئے تجھ کو ابھی کیا کچھ کرنا ہے۔" ایک ماں کی آغوش تھی جس میں اُس کو قدرے آسودگی میسر آتی۔ مگر وہ بھی کانٹوں بھری سیج محسوس ہونے لگتی جب لڑکیاں اپنی دلفریب اور پیاری پیاری اداؤں سے ماں اور باپ دونوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتیں۔

اس کا بچپن بقول اس کے "خاردار جھاڑیوں" سے اٹا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک غیر واضح دباؤ کے تحت پستا رہا۔

جب وہ کچھ ہوشیار ہوا تو اس نے اپنی بے وقری اور تحقیر محسوس کی اس پر اس نے اپنی دنیا آپ بنانی شروع کر دی اس دنیا میں وہ اپنے آپ کو بڑا اور عظیم دیکھتا۔ وہ ہمیشہ اپنے سے کم سن بچوں کے ساتھ کھیلتا اور انہیں خوب پیٹتا۔ ہمسائے کی بطخوں کے پر نوچتا اور چھوٹے چھوٹے بلوں کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں اس طرح کھینچتا کہ وہ چیختے چلاتے اور اُن کی گول گول سیاہ آنکھیں اُبل پڑتیں۔

اپنے باپ کو بوتلوں اور نلکیوں کی قطاروں میں کام کرتے دیکھ کر وہ بھی اپنے باپ سا بننے کی کوشش کرتا، وہ مریضوں کو بے بسی کی حالت میں دکان پر آتے دیکھتا اور سمجھتا کہ اس کا باپ اُن پر حاوی اور قادر ہے کیونکہ وہ ہمیشہ نحیف آواز میں اُس سے دوائی طلب کرتے باپ کی نقل اتارتے ہوئے اس نے بھی گرد و نواح کے کتوں بلوں کو ادویات دینی شروع کر دیں۔ اور دو تین کو واقعی عدم آباد پہنچا دیا۔

شباب نے اسے اپنے دوستوں سے بالکل جدا کر دیا۔ کیل اور مہاسوں نے اس کے چہرے کی رہی سہی آب و تاب بھی ستیاناس کر کے رکھ دی۔ وہ اکثر سوچ میں ڈوبا آہیں بھرتا اور غمگین صورت بنائے رہتا۔ چونکہ کیمسٹری مشکل مضمون تھا۔ طلبا ادھر کم آتے تھے اس لئے اُس نے وہی مضمون اختیار کیا اس سے اس کے بچپن کا شوق بھی پورا ہو گیا۔ وہ سارا سارا دن کیمیائی معمل میں گھسا رہتا اور مادی مسائل پر تجربے کرتا رہتا۔ یہاں اس کی قابلیت کے جوہر کھلنے لگے پھر بھی نہ تو اُسے کوئی انعام ملا، نہ

اس نے کسی کو اپنی آغوشِ محبت میں لینے کی کوشش کی۔ ایک دن تجربہ کرتے ہوئے گیس کی نلکی پھٹ گئی اور اس زور کا دھماکہ ہوا کہ معمل کی چھت اُڑ گئی۔ اس کے منہ پر زخم آگیا اور وہ دو مہینے ہسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ جب وہ یہاں سے فارغ ہوا تو اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ گھناؤنا ہو چکا تھا۔ ایک لمبا نشان اس کے بائیں رخسار پر ابدی لعنت کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ مگر وہ اس سے خوش تھا کہ اُسے کم آمیزی کا ایک اور بہانہ مل گیا ہے۔

اب وہ تھا اور معمل۔ صبح سے لے کر گئی رات تک وہ اس میں بند رہتا۔ اس کی محنت رفتہ رفتہ ثمر لا رہی تھی اور اُسے ایک جگہ سے اتنی رقم مل گئی کہ اس نے اپنی تعلیم کا سارا خرچ اپنے باپ کو ادا کر دیا۔ اس طرح وہ اس بارِ احسان سے بھی سبکدوش ہو گیا۔ اب کوئی مصروفیت ایسی باقی نہ تھی جس کے سبب وہ اپنے گھر سے تعلق قائم رکھنے کی خواہش اپنے دل میں پاتا۔ وہ کسی لڑکی کو نہ جانتا تھا۔ چوبیس برس کی عمر تک وہ جنسی لذت سے شناسا نہ ہو سکا۔ اُسے سینما کا شوق تھا نہ رقص کا۔ اس کا کام اور معمل کے تجربات تھے۔ جب ان سے فارغ ہوتا تو کبھی مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا کبھی قدیم ہیکل کی سیر کو۔ کرکٹ گیلری سے حظ اٹھانے کا اُسے کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اُسے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری میں ایک جگہ مل گئی۔ اور وہ بہت جلد اپنے دل پسند کام میں منہمک ہو گیا۔ وہ دن رات تک کام کرنے والا شخص تھا۔ اس لئے حکام بالا اس کے کام کی تعریف کرتے۔ اُسے دولت بھی مل گئی اور آسائش بھی۔ مگر کوئی دوست نہ ملا۔ وہ لباس سے بے پروا تھا۔ اس کا لباس اکثر تیزاب سے جلتا رہتا اور جب تک کہ وہ مکمل طور پر پھٹ نہ جاتا اُسے اپنے جسم سے جدا کرنے کا خیال نہ آتا۔

میری تجویز کے مطابق اس نے اب اپنا لباس بدلا ہوا تھا۔ نیا سوٹ ہلکے نیلے رنگ کا تھا۔ اور ٹائی سیاہی مائل۔ کالر بھی اُجلا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے نئی وارڈروب بھی خرید لی ہے اور بقول اس کے اسے اس نئی زندگی کا ہلکا سا سرور بھی محسوس ہوا۔ مگر چہرے کی افسردگی، نفرت اور بیزاری کی علامات ہنوز دور نہ ہوئی تھیں۔ اس کے پپوٹے ابھی بھاری تھے اور آنکھوں میں سوزش بھی پائی جاتی تھی۔ اس کے نرخرے کا ورم کافی دور ہو چکا تھا۔

میں نے مسکن اور خواب آور ادویات کے جاری رکھنے کی تاکید کی۔

۲۲ ستمبر

وہ پھر مشوش آیا اور اس کے چہرے پر ویسی ہی دہشت ٹپک رہی تھی۔ جیسی کہ پہلے روز تھی۔

اس نے بتایا کہ خواب آور اور مسکن ادویات سے پہلے چند روز تو کافی افاقہ رہا۔ یہاں تک کہ اسے گمان گزرنے لگا کہ مرض کی گھٹا اب چھٹا ہی چاہتی ہے لیکن پھر ایک دن ایک ایسا خواب آیا کہ بس ساری قوتِ صحت دو گنے مرض میں مل گئی۔ یہ خواب مضمون میں پہلے خواب کے مماثل تھا لیکن اپنی کیفیت میں اس سے شدید۔

اس نے دیکھا کہ آسمان سے ایک نورانی شہاب کی طرح ٹوٹی اور فضائے زمین کے اوپر آن کر رک گئی۔ گویا کہ فیصلہ کر رہی ہے کہ کہاں گرے۔ پھر ایک دم جھپٹی اور اس کی گردن پر آن گری۔ اس کا دھڑ جسد سے خاک پر گرا اور ڈھیر ہو گیا۔ لاش کے منہ سے نہ تو چیخ نکلی نہ کراہ۔ وہ اپنی لاش دیکھنے کے لئے آگے بڑھتا ہے لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کی لاش کی بجائے اس کا محبوب جگی موٹر کے نیچے کچلا پڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کے دل میں زبردست اطمینان سی پیدا ہو گئی۔ حالانکہ ایسی کیفیت اُسے اپنی لاش دیکھ کر نہ ہوئی تھی۔

میں اس مقام پر رک گیا ۔ یہ مزدوری شروع تھا ۔ میں جمی کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنی چاہتا تھا ۔

جمی ایک لمبے قد کا بھورے بالوں والا خوبصورت کتا تھا جو اسے اپنے مقتول ماموں سے ملا تھا وہ پادری تھا اور جب اس کے حواس درست نہ رہے تو بعض لوگ اسے مجذوب سمجھنے لگ گئے وہ بہت کم آمیز آدمی تھا اور جب اس کے قریب چار آدمی جمع ہو جاتے تو وہ آہستہ سے اپنے ہمہ وقت رفیق جمی کو اشارہ کرتا اور ایک طرف نکل جاتا ۔ اس نے کبھی کسی شخص کو خود بلایا نہ خطاب کیا تھا جب تک کہ وہی اسے بلائے یا خطاب نہ کرے ۔ صرف چارلس ایسا تھا جسے وہ خود بلا کر اپنے ساتھ سیر کو لے جاتا ۔ شاید اس لئے کہ اس نے بھانپ لیا تھا کہ چارلس بھی اسی کی مانند انسانی محبت اور خلوص کا مردود ہے ۔ تینوں قوسی منزل کو چلے جاتے اور گھاس کی ٹڈیوں کو دیکھتے رہتے ۔ رفتہ رفتہ ایک فاتر العقل بوڑھے پادری ایک بچے اور ایک کتے کے درمیان رشتہ مودت کے گہرے جذبات پیدا ہو گئے ۔ چارلس جب پڑھائی اور تنہائی سے اکتا جاتا ، ماں باپ کی سرزنش سے دل برداشتہ ہو جاتا تو اپنے ماموں کے پاس چلا آتا ۔ وہ اسے محبت بھرے تبسم سے خوش آمدید کہتا اور پھر ایسی باتیں شروع کر دیتا جن کا مفہوم اس کی فہم سے بالا تھا ۔ مگر ایسی باتیں سننے سے اسے خاص حظ ملتا کہ وہ اسے بچہ سمجھ کر نہیں بلکہ بڑا سمجھ کر باتیں کرتا ۔

ایک دن پادری نے جمی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا

" دوست اسے اپنے پاس رکھنا اور اس طرح رکھنا جس طرح میں نے اسے رکھا ۔ اب حج بیت المقدس کو جا رہا ہوں ۔ میں اسے تمہارے حوالے اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھ کو تم پر اعتماد ہے ۔"

چارلس یہ سن کر بڑا خوش ہوا اور اپنے آپ کو ذمہ دار آدمی سمجھنے لگا ۔

" ماموں ! فکر مت کرو ، میں اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز جانوں گا ۔"

دوسرے یا تیسرے روز وہ چلا گیا اور پھر کبھی نہ لوٹا ۔ چارلس اس سے اداس ہوا لیکن جمی کی نگہداشت نے اس کی توجہ پکڑ لی اب صرف دو دوست رہ گئے لیکن ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے غم کے عالم میں جمی کو پا کر اسے سکون حاصل ہوتا اور وہ یہ سمجھنے لگتا کہ اسے جمی کی خاطر ضرور جینا چاہئے ۔ وہ اکثر سوچتا ۔ " دنیا کو میری پروا اور ضرورت نہیں ۔ جمی نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ میرا وجود بھی کسی مصرف کے لئے ہے کم از کم کوئی ایک ہستی تو اس دنیا میں ایسی ہے جس کو میری طلب ہے "

اس کے چہرے پر نفرت اور بیزاری شام کے دھندلکے کی طرح چھا رہی تھی ۔

" لیکن یہ فریب خیال مجھ سے اس وقت چھین لیا گیا جب ایک روز میں نے جمی کو خاک و خون میں لتھڑا سڑک پر پڑا پایا اس کے ریشمی بال خاک سے گدلے اور خون سے آلودہ ہو رہے تھے ۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں اور بے نور آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ میں نے اسے بلایا مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی ۔ میں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا ۔ مگر اس کا شعلہ محبت گل ہو چکا تھا ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کونسی چیز تھی جو اس میں سے نکل چکی تھی یک بیک اس کی آنکھوں کی بے نور ٹھنڈک نے میرے دل کو یخ کر دیا میرے دل میں اک خطرہ اپنا پھن اٹھائے کھڑا ہو گیا ۔ یہ دھید نہ پذیر ہے جس چیز نے اسے نگل لیا ہے وہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گی ، یہ دن اور اس کے اندر جل رہی ہے ۔ وہ تو مہمان نخیف ہے لیکن میں مرنا نہیں چاہتا تھا ۔ جمی کی سی موت مجھے نہیں چاہئے تھی ۔"

اس کی آواز بھرا گئی ، وہ رک گیا پھر بولا ۔ " کئی دنوں تک میں آدم کے بیٹے کے اس اٹل انجام سے بچ نکلنے کے ذرائع سوچتا رہا ۔"

اس نے اپنی نفسیات کمال وضاحت سے پیش کر دی تھی حقیقت میں وہ اپنی غلط فہمی اور اس اٹل اور تلخ حقیقت کے درمیان مصالحت کرنا چاہتا تھا مرنا مزید تھا لیکن اپنی ناخوشگوار موت سے پہلے وہ اس دنیا کو بھی خوشگوار نہیں دیکھنا چاہتا ہے ناخوشگوار صرف اسی کے لئے کیوں ہے دوسروں کو بھی اس میں شریک ہونا چاہئے۔ مدت العمر کے بعد اسے ایک رفیق ایک جلتے پناہ اور ایک زندگی ملی تھی۔ بے رحم دنیا نے وہ بھی اس سے چھین لی جب دوسرے اسے محروم نہیں دیکھنا چاہتے۔ تو دوسروں کی چہک ملے کیونکر سہی جاتے۔ دوسروں کا تبسم، سرور اور عیش اس کے لئے کیوں قابل برداشت ہو۔

پھر اس کا فلسفۂ زندگی یہ بن گیا "میں دنیا کو کھیل کر کرا کر دوں گا۔ اگر مجھے بھی کھیلنا نہ آیا"

"ڈاکٹر" اس نے التجا کی۔ "مجھے کہیں سے میٹھی نیند منگا دو۔"

۲۹ ستمبر۔

وہ بے خوابی کی بدستور شکایت کرتا ہے۔ میری تجاویز پر عمل پیرا ہونے کے باوجود وہ ویسی ہی درماندگی اور ڈولیںگی محسوس کرتا ہے۔ خواب آور اور مسکن ادویات سے کبھی کبھار افاقہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب مرض عود کر تا ہے تو سب کیا کرایا دھرا رہ جاتا ہے وہ مرض کے پہلے ہی میں تو پھوڑ دیتا ہے۔ بڑی دقت یہ ہے کہ جو شخص ہمارے پاس آتا ہے وہ یہ خیال سے کر آتا ہے کہ ہمارے پاس جادو کا ایک ڈنڈا ہے جس کو ہم یونہی ہلائیں گے۔ اس کا سارا مرض کافور ہو جائے گا۔ وہ خود تو انگلی تک ہلانا گوارا نہیں کرتے حالانکہ جب تک مریض اپنی مدد آپ نہیں کرتا اُس وقت تک فطرت اس کی مدد نہیں کرتی۔ اپنی ناؤ کے کھویا وہی تھیں ہم تو صرف ہدایات و اشارات دے سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کا رخ صرف وہی موڑ سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے اس کی تکلیف جنسی نہیں مجلسی ہے جو معاشرے کے ساتھ غیر متوافق رویہ سے پیدا ہوئی ہے وہ اپنے آپ کو اپنے نفس سمیت معاشرے کے سانچے میں نہیں ڈھال سکا۔ نظریۂ لی بی ڈو یہاں منطبق نہیں ہوتا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ یہ نظریہ صرف اس کیس پر نہیں بلکہ کسی بھی کیس پر منطبق نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس نظریہ کی بنیاد غلط مفروضہ پر رکھی گئی ہے۔

بائیس برس کی پریکٹس میں بلا مبالغہ ہزاروں مریض میرے زیر علاج رہے ہیں لیکن جو شواہد میں نے ان کے امراض سے جمع کئے ہیں۔ اُن سے میرا یقین حق الیقین کو پہنچ گیا ہے کہ جنس آدمی کی زندگی میں مادی کی نہیں بلکہ مظہر کی حیثیت رکھتی ہے وہ اس کے ذریعہ اپنی شخصیت اور اپنے مقصدِ زندگی کا عکس دکھاتا ہے۔ افعالِ جنسی انسان کے دوسرے افعال کی طرح محض افعال ہیں۔ جن کے آئینہ میں اس کی منزل کا نشان دیکھا جا سکتا ہے وہ بجائے خود منزل نہیں اور نہ انسان کی زندگی کا مقصد۔ اور یہ منطق تو میری سمجھ سے قطعی بالا ہے۔ کہ انسان کا ہر عظیم تخلیقی عمل جنسی گرسنگی ہی کا مرہون ہوتا ہے۔ اگر بدن کی ہر طلب شاعری اور مصوری پیدا کر سکتی ہے تو روگ پیاس سے تڑپ کر کیٹس کی سی ایک سوفٹ کیوں نہیں لکھ دیتے یا بھوک سے نڈھال ہو کر لی نارڈ و ڈی ونچی یا مائیکل انجلو کے سے کمالات کیوں نہیں دکھا دیتے۔

میں نے اس کی زندگی کو مزید کریدا۔ "آپ اپنے پیشہ سے اب اکتا تو نہیں گئے ہیں؟"

"نہیں میری زندگی کا یہی تو ایک سہارا ہے میں اپنی سب کلفتیں اس وقت بھول جاتا ہوں جب کیمیاوی ملکیوں کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہوں۔"

(غلام محمد نے ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ سے چھپوا کر شائع کیا)

"اس کے علاوہ کون سا مشغلہ آپ کا دل پسند ہے؟"

"میں پہلے کام سے فارغ ہو کر کبھی کبھار دل بہلانے کو مچھلیاں پکڑنے یا قریبی جنگل میں سیر کو نکل جایا کرتا تھا۔ لیکن جب سے اضمحلال پیدا ہو گیا ہے میں باہر جانے کی بجائے گھر ہی پر بیٹھ کر مطالعہ کرتا رہتا ہوں یا کتا سے کھیل کر تھکن اتار لیتا ہوں"

"آپ کس موضوع کی کتابیں پسند کرتے ہیں؟"

"تاریخ بالخصوص جنگ، جاسوسی ناول"

میں نے اس کی طرف دیکھا وہ بڑے سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تاریخ میں کون کون سی شخصیت بالخصوص آپ کو متاثر کرتی ہے؟"

"نیپولین بونا پارٹ" اس نے فی الفور جواب دیا۔ اس کی سیرت کا ہر پہلو ایک ہی سمت کی طرف اشارہ کر رہا تھا اُن کے کارنامے پڑھ پڑھ کر وہ انہیں اپنے تصور میں اس طرح بسائے ہوئے تھا کہ اب وہ اس کی خیالی زندگی کے اجزائے لاینفک بن چکے تھے وہ انہی کے دماغوں سے سوچتا اور اُنہی کے اعضا سے عمل کرنا چاہتا تھا۔ اُن کی زندگیوں کی ہر دریافت شدہ تفصیل اس کو ازبر تھی۔ لیکن جاسوسی قصے وہ آرسین لوپن یا شرلاک ہومز کے کارنامے معلوم کرنے کے لئے نہیں پڑھتا تھا۔ بلکہ اس باغی کے منصوبوں اور چالوں سے حظ اٹھانے کے لئے پڑھتا تھا جو معاشرے کا ناک میں دم کر دینا چاہتا تھا۔ جو ڈسپوزل کا بیان اور اس کے مناظر اس کو بالخصوص محظوظ کرتے اور جب باغی معاشرہ عدالت میں مجرم ثابت ہونے اور کیفرِ کردار تک پہنچنے کے لئے پیش کیا جاتا تو وہ عدالتی کارروائی پڑھے بغیر کتاب بند کر دیتا۔ وہ انجام معلوم نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ اطاعت اور امداد قانون کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں۔ اصل کارنامہ قانون کا توڑنا اور نظام کا تہس نہس کرنا ہے اور اس کو انجام دینے کے لئے بڑے دل گردے اور عظیم دماغ کی ضرورت ہے۔

تکمیل مرقع کے لئے اب میں فوٹو کو دیکھنا چاہتا تھا

جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے مکرّر پوچھا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے" میں نے یہ مشورہ دوستانہ لہجہ اور تبسم اور مزاح کے ملے جلے جذبے کے ساتھ دیا۔

اس نے میری طرف دیکھا اُس کے بھیانک چہرے پر سیاہی پھیلنے لگی

"مجھ کو اگر اس فعل کا مطلب معلوم ہو جائے تو شاید میں کسی وقت آمادہ ہو جاؤں پھر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کوئی ہے مجھ سے شادی کرنے والی؟"

میں نے اچانک کہا "میرا مطلب کسی حسین عورت سے نہیں بلکہ کسی ایسی عورت سے ہے جس کو یقین ہو چکا ہو کہ وہ حسین نہیں"

وہ چپ ہو گیا۔ بات اس کے ذہن میں کھٹک گئی تھی اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر نکل گیا۔

---

۱۴ ستمبر

فوٹو ایسٹین ہتی نرفاکس ٹیریئر وہ تو سپنیل قسم کی کسی حقیر نسل کی کتیا تھی اس کے جسم سے جا بجا بال اُڑے ہوئے تھے گویا کسی ڈھالی میں پھنچ گئے ہوں۔ قریب سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ آثار خارش کے تھے اس کا رنگ خاکستری اور اس کے

جسم پر کپکپی طاری ہوئی تھی کیونکہ اندھیرے کمرے میں روشنی میں تو اس کو جلد کی اصلی رنگت سے صرف کچھ اختلاف تھا شاید اس کی صفائی کی طرف کبھی خیال نہیں کیا گیا تھا۔ وہ زبان نکالے اندر داخل ہوئی اور اپنے پیچھے بجلی کی کشاں فرش پر ثبت کر تی گئی۔
"بیٹھ جاؤ فوراً" اس نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ اور وہ ایک کر برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بس یہ تھا اس کا حصہ سوائے دلبستگی۔
اس نے پھر اپنی وحشت اور بے خوابی کا ذکر کیا۔
"ڈاکٹر اب معاملہ حد برداشت سے گزر رہا ہے میں یہ سمجھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کوئی ہستی میرے دروازے پر کھڑی ہے اور مجھے اندر کر دروازہ کھولنا چاہیے۔ حالانکہ تنے ہی یقین کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ نہ تو وہاں کوئی ہے اور نہ میں اٹھ کر دروازہ کھولنے کی سکت رکھتا ہوں۔ لیکن یہ کسی کی موجودگی کا احساس مجھ کو اتنے جا رہا ہے بعض اوقات میں غصے سے کھولنے لگتا ہوں اور مجھ کو یوں گمان ہونے لگتا ہے کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھوں گا۔ اور کسی کو ہلاک کر دوں گا۔ میرا خیال ہے معاملہ صرف اسی صورت میں ختم ہوگا کہ یا تو میں ختم ہو جاؤں۔ یا وہ" وہ جس کا مجھے علم نہیں۔ وہ جو میرے دروازے پر کھڑا ہے"
اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا گویا پسینے کے قطرے چاند پر جم گئے تھے۔
"وہ اتنا مہذب ہے کہ دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا۔ مبادا میری نیند میں خلل ہو۔ لیکن وہ اتنا وحشی ہے کہ اپنی موجودگی کا یہ مسلسل احساس دے کر مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے"
اس نے اپنے علم کی بے بسی پر تاسف سے سر پھیرا۔ کاش! اسے کچھ معلوم ہو جاتا۔

★

اس کیس کے نوٹ یہاں تک پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مریض پھر نہیں لوٹا۔ تین مہینے بعد کی تاریخوں میں یک بیک یہ لکھا ہے۔

"چارلس فلپس کے ڈوب جانے کی اطلاع ملی۔ مجھے بلا بھیجا گیا۔ جب میں اسپتال پہنچا تو اس کا معالج اس کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ ڈوبنے سے تو بچا لیا گیا لیکن اس صدمے سے بچایا نہ جا سکا تھا اس کے اعصاب اور دماغ پر اس کا بہت برا اثر پڑا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اسے اس وقت میری کیا ضرورت تھی۔ مجھ سے زیادہ اسے کسی وکیل غالباً کی ضرورت تھی۔ لیکن جب اس سے مل لیا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھ کو بلانے سے اس کا کیا منشا تھا۔ وہ مجھے یہ بتا کر اپنا جی ہلکا کرنا چاہتا تھا کہ اس کو پریشان کرنے والے عقدے حل ہو گئے ہیں وہ زندگی کا مطلب پا گیا تھا۔
گو پیٹ میں پانی پڑ جانے کی وجہ سے وہ تکلیف میں تھا۔ تاہم اس نے اپنے بشرے کی بشاشت کو اس سے ملوث نہ ہونے دیا۔ زخم کے نشان کے باوجود اس کا چہرہ اطمینان قلبی سے منور ہو رہا تھا۔ بلند کھڑکی کے غیر شفاف شیشوں میں روشنی کی دھندلی لہریں اس کے پلنگ اور اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اپنی نقاہت کے باوجود اس نے میرے استقبال کے لیے اپنا سر سرہانے سے اٹھایا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی فتنہ اس کے پلنگ کے نیچے دبکی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنے آقا کی طرح سر اٹھایا لیکن شناسا جان کر اپنا سر پھر پھیلے ہوئے پنجوں پر رکھ دیا۔
ہسپتال والے اس کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے کہ نہر کے کنارے سیر کرتے ہوئے اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ نہر میں گر گیا۔
وہ میرے توسل سے مزید تفصیل معلوم کرنا چاہتے تھے۔
اس نے نحیف مگر صاف آواز میں کہا۔ "اس کا زخم تو قدم معلوم نہیں ہوتا تھا۔" ڈاکٹر میں کل رات سے اطمینان کی نیند سویا ہوں

چارلس ڈبلیو ظہیر بیگ۔

ایسی شدید بیسی کبھی بچپن میں کرسمس کی رات ہوا کرتا تھا۔ اب کے نہ تو مجھے کسی کا انتظار تھا نہ کھٹکا۔ جو دروازے پر کھڑا تھا وہ اندر آگیا۔ اور میں نے معلوم کر لیا کہ وہ کون ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "تم پہلے ہی کیوں نہ اندر چلے آئے مجھے اتنی اذیت کیوں پہنچائی" اس نے جواب دیا "تم مجھے اذیت کے بغیر پہچان نہ سکتے تھے۔ اگر میں پہلے ہی روز اندر داخل ہو جاتا تو تم مجھے ضرور نکال دیتے۔"

میں اس اجمال کی تفصیل دریافت کرنا چاہتا تھا کہ زبان ہی سے معلوم ہو گیا کہ وہ علم کے ماورا کی باتیں تھیں۔ میرا فرض اس وقت اس کے جی کو ہلکا ہونے میں مدد دینا تھا۔ جب وہ سانس لے چکا تو اس نے اپنی داستان شروع کی۔

(یہاں یہ اشارات نہایت مختصر ژولیدہ اور مبہم ہیں۔ ان کو قابلِ قبول صورت میں پیش کرنے کے لئے میں نے حشو و حذف سے کام لیا ہے۔ میرا خیال ہے اس دخل در معقولات کو معاف کیا جائے گا)

اس نے کہا "مجھ پر بے خوابی اور بے چینی کا پہلا حملہ اس وقت ہوا جب میں ایک زہریلی گیس کے متعلق سوچ بچار کر رہا تھا۔ عہدِ شباب سے میرا مقصود کوئی ایسی گیس یا بادل تیار کرنا تھا جس سے پورا جنگی بیڑا یا فوج کا سالم دستہ آنِ واحد میں تباہ ہو جائے۔ اس گیس کا کچھ کچھ سراغ مجھے دوران تجربات مل چکا تھا۔ میں صبح سے لے کر آدھی رات تک لیبارٹری میں کام کرتا رہتا۔ لیکن خیال کو عرفان کے درجے تک پہنچانا کوئی آسان کام نہیں اس سے میرے ذہن و اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑا عصبی کمزوری کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں لیکن میں اپنی دھن میں ایسا مست تھا کہ مجھے اپنے وجود تک کی سدھ بدھ نہ تھی۔ اور میں یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اگر تکلیف ورم دماغ کی صورت اختیار نہ کر لیتی۔ میری نیند تو پہلے ہی کم ہو چکی تھی۔ پھر ضعفِ اعصاب اس حد تک پہنچ گیا کہ میں اپنی توجہ دو منٹ تک کسی مرکز پر نہ ٹھہرا سکتا تھا۔ اس مرض کے باوجود میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنی جاپانی تجربات کو عمل میں لاتا رہا۔ جب میں کھڑا ہو کر کام نہ کر سکتا تو لیٹ جاتا۔ لیکن ورم بڑھتے بڑھتے دماغ کے پردوں تک جا پہنچا۔ تو میں بالکل بے بس ہو گیا۔ میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میرا سوچنا تک بند ہو گیا۔ میں فرطِ غم اور جھنجھلاہٹ سے اپنا سر پیٹتا سارا مسئلہ صرف ایک عقدہ کشائی کا محتاج تھا وہ بآسانی ہو سکتی تھی۔ اگر میرے پاس سوچنے والا دماغ اور کام کرنے والے اعصاب ہوتے۔ میں جھنجھلا کر فطرت کو کوستا۔ حیلے بہانے کام نہ چلتا تو مجبور کے ساتھ مادی فطرت قوت کے سامنے دست بدعا ہو جاتا۔ مگر کام یوں بھی نہ بنتا۔"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور مجھ سے پوچھا۔

"کیا تمہیں بھی کبھی انسانی مجبوری کا تجربہ ہوا ہے۔ یہ اٹل ہے مگر کتنی تلخ۔ اس کی کڑواہٹ سے صرف وہی آگاہ ہے جس کو اس کا تجربہ ہوا ہے"

یہ صحیح ہے شاید یہی وہ فصیل ہے جس کے اندر انسان محبوس ہے۔ شاید فطرت نے انسان کے اختیار کی حفاظت کے لئے بنایا ہے۔ آدمی فصیل سے باہر کے منظر کے لئے للچاتا ہے لیکن وہ ان تک پہنچ نہیں سکتا اور یہی امر اس کے لئے باعثِ الم بنتا ہے۔ وہ یہ سوچتا تھا کہ وہ ایسی گیس تیار کر کے اپنا نام تاریخ میں منتقل کر سکتا تھا۔ وہ اس ایجاد سے سیاستِ عالم کا رخ بدل سکتا تھا۔ لیکن لبِ بام تک پہنچنے کے باوجود وہ بام تک نہیں پہنچ سکتا تھا

وہ اس مرض کو اول اول زیادہ تشویش ناک نہیں سمجھتا تھا۔ طبی علاج سے اسے کافی فائدہ پہنچا تھا۔ اس کے ورم بھی وہ بھول گئے اگرچہ وقتاً فوقتاً پھر عود کر آتے۔ لیکن وہ علاج کی دسترس سے باہر نہ تھے طبی علاج سے اس کا وزن دس پونڈ بڑھ گیا۔ دو ماہ کے مکمل آرام کے بعد جب وہ سینی ٹوریم سے باہر نکلا تو اس نے سمجھ لیا کہ وہ تندرست ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے کامیابی کے ساتھ مبارکباد پیش کی۔ بھوک بھی کھل کر لگنا شروع ہو گئی۔ بدن میں پھرتی آ گئی اور دھوپ ویسی ہی سنہری دکھائی دینے لگی

لیکن جونہی وہ لیبارٹری میں داخل ہو کر کام کرنے لگا اس کے ذہن کا حصول کمٹ سے خلا میں گر پڑا اور پھر وہ دیسے کا دیسا رہ گیا۔

وہ پھر صالح کی طرف متوجہ ہوا لیکن پیروی ہوا جس کی خاطر وہ علاج کے لئے جو کھوں سے گزر رہا تھا۔ بالآخر اس نے طبی علاج چھوڑ دیا وہ ذہین آدمی تھا۔ اتنے معالجے کے بعد وہ سمجھ گیا تھا کہ خرابی کی جڑ بدن میں نہیں کہیں اور ہے۔ بدن تو ایک منظر ہے جس پر انسان کے اندر دوسرے نظر نہ آنے والے عوامل کے اثرات نظر آجاتے ہیں۔

نفسیاتی علاج کی طرف وہ اس وقت آیا جب مدت مرض سات برس ہو چکی تھی۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ اس علاج کو شروع کیا۔ اس نے معالج کی ہر ہدایت اس کے ظاہری و باطنی مفہوم کے ساتھ پوری کی اور اس کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو گیا کہ اس کی مراد یہاں بھی نہ ملے گی اس نے غلط دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

اس نے کہا۔ "تحلیل نفسی فریب نفس کی سائنس ہے اس کی پناہ اس وقت لی جاتی ہے جب کسی ٹھوس اور حقیقی لائحہ عمل سے بچنا مقصود ہو جس طرح نائٹ کلب کے اندر آدمی اپنے ہی لذت و الم سے محفوظ ہوتا ہے۔ اسی طرح تحلیل سے وہ اپنے داغ ہائے نفس کریدکرید کر بس ایک لذت زخم فرسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس تحلیل و تجزیہ سے کبھی کسی کو یہ معلوم ہوا ہے کہ آدمی کی زندگی کیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے؟ ایک محل کے اندر رکھی ہوئی اشیا کو ٹٹول کر کوئی نہ تو معمار بن سکتا ہے اور نہ مالک مکان کا نام معلوم کر سکتا ہے اس تلاش و تجسس سے زیادہ سے زیادہ جو حقیقت بے نقاب ہوتی ہے وہ بس اپنی ہی جہالت ہے یہ کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور زیادہ سے زیادہ اس ہیجان بن سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ یہ چیز یہاں نہیں وہاں رکھ دو اور جو وہاں رکھی ہے اسے یہاں نکال دو۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔

میں اس سے بحث کرنا نہیں چاہتا تھا وہ مسرت کی آغوش میں تھا۔ اس وقت اسے جمہوریت کے عطا کردہ حقوق سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا حق تھا۔ مگر ایک چیز میں اس کے بغیر نہ رہ سکا وہ یہ کہ اس کی تحقیق "تربیعانہ" نہ تھی۔ یاس دو نومیدی نے اسے بے جان نہ بنا دیا۔ ایک قدم پر رک جانے کی بجائے وہ تصوف کی طرف مبذول ہو گیا۔ میرا خیال ہے اس نقطہ سے اس مقام کی بخوبی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ جہاں وہ اس وقت تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر منظم علم کے ماورا سرزمین تصوف ہے۔ یعنی جو لوگ محض اس زمین میں گھومنا ہی اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں وہ بھٹکے ہوتے ہیں وہ بیمار تھا لیکن مفلوج نہ تھا بھٹکا نہ تھا۔ وہ اپنے مرض کا علاج ڈھونڈ رہا تھا اور اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس عظیم شاہراہ پر پہنچ گیا تھا۔ جس کو "زندگی" کہتے ہیں۔

یاس نے اس کی کم آمیزی اور مردم بیزاری کو نقطۂ کمال تک پہنچا دیا وہ اپنی اس خادمہ کی موجودگی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا جو پچھلے پندرہ برس سے اس کا کھانا پکا رہی تھی۔ وہ کسی کی شکل سے ملنا نہیں چاہتا تھا جب صبح کے وقت خادمہ اس کا ناشتہ لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوتی تو وہ سرخ ابلی ہوئی اور بوجھل آنکھوں سے دروازہ کمرے کے اندر ہی دیکھتا ہوتا۔ اگر وہ کھڑکیوں کے پٹ کھولنا یا پردہ سرکانا چاہتی تو وہ اسے دہشت سے روک دیتا۔ گویا وہ کسی سرخوشی میں ڈوبا ہوا ہے گویا اس کی آنکھوں اور دماغ پر غنودگی کا باریک بادل چھایا ہوا ہے۔ اس نے داڑھی مونڈنے میں بھی لاپرواہی برتنی شروع کر دی اس سے اس کا چہرہ اور بھی گھناؤنا اور مکروہ ہو گیا۔

شام کو کبھی کبھار جب وہ اپنے مطالعہ گاہ میں بند پڑا ہوتا اور متصل مکان سے پیانو کی آواز ہلکے ہلکے نغمے تھے اور نسوانی قہقہوں کو اپنے دامن میں سمیٹے۔ تیرتی ہوئی اس کی بند کھڑکیوں کے دھندلے شیشوں سے ٹکراتی تو وہ جھپٹ کر اٹھ بیٹھتا

اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ اسے کون اذیت پہنچا رہا ہے؟ کون اس کی تنہائی دھوئیں کے پردوں کو چیر رہا ہے؟ ہمسائے کے ڈرائنگ روم کا نظارہ کھڑکی میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ مرکوز روشنی میں پیانو کے اوپر مرمریں انگلیاں تیزی سے نغمے بجا رہی تھیں۔ سنہری گیسوؤں میں زریں لہریں مجسم رہی تھیں۔ چہرے کا صرف ایک رخ ہی دکھائی دیتا تھا۔ کانوں میں ایک بُندا نیلے تارے کی طرح چمک رہا تھا اور نعلین ہونٹوں کا ایک گوشہ گلِ لالہ کی پنکھڑی کی طرح کھلا نظر آتا تھا۔ ننھے منے بچے پیانو کے گرداگرد مسعود حلقہ میں ناچ رہے تھے۔

ایسے نظارے اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھے وہ زور سے کھڑکی بند کر دیتا۔ نغمے اور قہقہے گھٹ جاتے۔ لیکن ان کے کانوں میں ان کا ارتعاش پھر بھی باقی رہتا۔ اس کی آنکھیں انھیں شام کی دھندلی طرح کھڑکی کے شیشوں سے لپٹے دیکھتیں۔ اس کے کمرے کی تنہائی اور سناٹا اور بھی گہرا ہو جاتا وہ ایسی آوازیں سننے سنسان محل میں سننا چاہتا تھا مگر وہ نہیں سن سکتا تھا۔ وہ ایک چمن تھا جس کے باغ میں چڑیاں نہیں چہچہاتی تھیں۔ وہ بڑے صوفے پر گر جاتا اور اس کے ذہن میں ایسے ایسے سوالات اُبھرنے لگتے کہ اسے ایک دم اپنے حواس باختہ ہو جانے کا گمان گزرنے لگتا۔ اگر وہ بدصورت پیدا کیا گیا تھا تو پھر اسے اپنے کام کی تکمیل سے کیوں روک دیا گیا تھا۔ وہ کون سی طاقت ہے جو اس عظیم جبر کو اختیار کے پیرائے میں پیش کر رہی ہے۔ وہ کون ہستی ہے جس کی چھیڑ چھاڑ سے آدم کی اولاد اذیت و کوفت اٹھا رہی ہے؛ جب وہ اپنی بے بسی پر غور کرتا تو اس کا سینہ جذبۂ غیض سے مملو ہو جاتا۔ وہ اپنی بے بسی اور مجبوری سے بے اعتنا نہیں ہو سکتا تھا اس مرض نے اس کے رستے ہوئے درد جگا دئیے تھے وہ گھنے سکوت سے دنیا کے ہنگامے سے الگ تھلگ اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ یہاں بھی پکڑ دیا گیا۔ وہ جو کام کرنا چاہتا تھا اس کا تعلق تعمیر سے تھا لیکن اس کے ہمسائے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا تعلق تخریب سے ہے۔ اس نغمے سے کیا حاصل جس کی موجیں کوئی ٹھوس فائدہ پہنچائے بغیر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ اور انھیں مضبوط اعصاب اور سکونِ قلب بخش گیا تھا کہ وہ آدمی کی توانائی ان بے مصرف ذریعوں سے ضائع کریں۔!

اس کے ساتھ ہی دروازے پر کھڑی ہوئی ہستی کا احساس اور بھی شدید ہو گیا۔ اٹھ کر دروازہ کھولنے کی سکت اور بھی کم ہو گئی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب اس کی اذیت اور کشمکش کا خاتمہ ہونا تھا۔ اس روز صبح سویرے سے اس کے ہمسائے کے پائیں باغ میں چہل پہل تھی۔ آدمی اور عورتیں ٹکڑیوں میں کھڑے خوش گپیاں اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ لیکن اسے اس کا علم کھڑکیوں پر چھائی ہوئی بیل کے سایہ کی حرکت سے ہوا۔ گرجا گھر کا گھنٹہ بج رہا تھا۔ اسے یاد آ گیا آج اتوار ہے۔ اس نے اٹھ کر اپنی میز پر پڑی ہوئی ڈائری پر نظر دوڑائی۔ مصروفیت کا کوئی نشان نہ تھا۔ خالی صفحہ اس کے دل پر تیر کی طرح لگا۔ اس نے ڈائری کی طرف پشت کر کے پائپ سلگایا۔ دھواں کڑوا معلوم ہوا لیکن وہ پیئے گیا۔ اس کے لئے کوئی اور کام نہ کر سکتا تھا۔ رات سے اس کے حلق کی نالی پھر متورم تھی۔ اس کے دونوں شانوں کے درمیان تھکن کے گچھے لگے ہوئے تھے۔ اس کی زبان پر صفرا کی کڑواہٹ پھیلی ہوئی تھی جب کہ اس کے دل میں اپنا منصوبہ گیس پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی زبردست امنگ مچل رہی تھی۔ میز پر اس کی پانچ سالہ تحقیق کے فائل ایک گٹھے کی صورت میں بندھے ہوئے پڑے تھے۔ اس کے ہاتھ بے اختیار گٹھے کی طرف اٹھ گئے۔ وہ انھیں کھول کر بیٹھ گیا۔ ہر ورق اور اس کی ہر تحریر اس کے سامنے اس زمانے کا منظر کھڑا کر دیتی کہ جس میں وہ لکھی گئی تھی ان مناظر کے ساتھ وہ جذبات اور حسیات بھی زندہ ہو گئے جو اس وقت اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ گیس کا ہیولا دھندلا جس روز اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس روز وہ

کتنا مسرور تھا آج وہ۔ خلاف معمول کام بند کر کے انسٹی ٹیوٹ کے قہوہ خانے میں گیا اور کھڑکی کے قریب بیٹھ کر خوشبودار کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سامنے کے تالاب میں نہانے والوں کا نظارہ لیتا رہا۔ اس نے اندازہ لگایا ٹھیک دو برس گزر چکے ہیں۔ گیس کا منصوبہ نصف مکمل ہو چکا ہے۔ تجربات اس کے خیالات کی تصدیق کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر تیز تیز قدم اٹھاتا لیبارٹری میں داخل ہوتا ہے اور اس سے ہاتھ ملاتے وقت اس کی کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وزارت دفاع کا سیکرٹری تھا جس نے بتایا کہ وزارت اس کی رفتار ترقی کو بڑے غور سے ملاحظہ کر رہی ہے۔ اخبارات میں اس کی سرگرمیوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ اس نے دوسری فائل کھولی۔ منصوبہ تین چوتھائی مکمل ہو چکا ہے۔ اس کا دل اس وقت کے جذبات کے وجود سے مسرور ہو رہا تھا۔ صرف ایک الجھن ہنوز مانع تھی۔ بہت گیس کے ضائع ہونے سے پہلے آتش گیری کا انسداد!

اس کا دل ڈوب گیا۔ آخری فائل کے آخری صفحہ پر اس کی نگاہ جمی ہوئی تھی۔ اور اس کا دماغ بے حس و حرکت تھا۔ اس کا ذہن متحیر تھا کہ اسے کیا سوچنا اور کیا ہونے کے متعلق سوچنا ہے۔ اس نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکا دیا اور یک بیک اسے محسوس ہوا کہ امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ جسے وہ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ تو عین اس کے مقابل اور اس کی دسترس میں تھا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ سکتا تھا۔ خوشی سے پھولا اور ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہتا ہی تھا کہ پیانو ایک شور کے ساتھ بجا اور خوشی کے نغمے بہنے لگے۔ ان کی لہریں شعاع امید کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔ روشنی گل ہو گئی اور پھر وہی گھٹا ٹوپ۔

یک بیک خون کا ایک تھپیڑا اس کے دماغ سے ٹکرایا۔ وہ مجنون ہو گیا اس نے وحشیانہ انداز سے ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑکی کھولی۔ اس کے ہمسایہ کی خانہ آبادی ہو چکی تھی دولہا اور دلہن براتیوں کے جلوس کے ہمراہ پیش گھر میں داخل ہو رہے تھے جہاں پر تکلف ضیافت ان سب کی منتظر تھی۔ اس نے اپنی فائلوں کا وزنی گٹھا اٹھایا اور نو منکوحہ جوڑے کا نشانہ تاک کر ان پر زور سے دے مارا۔

وہ یہاں رک گیا اس کے چہرے پر باطنی اضطراب کے آثار ہویدا ہو رہے تھے۔ اس نے پانی طلب کیا اور اس سے اپنے ہونٹ تر کئے۔

"میں ان پر بم پھینکنا چاہتا تھا۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ وہ اس وقت مجھے میسر نہ آیا۔ میں یک بیک سخت نقاہت محسوس کرنے لگا۔ میں ضرور گر پڑتا اگر میں کھڑکی کو تھام نہ لیتا۔ میرے سر سے خون رفتہ رفتہ اتر رہا تھا۔ میرے ہوش ٹھکانے لگ رہے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے یہ کیا کیا؟ اب مجھے دوسرے جنون نے آن دبوچا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور جلدی سے مکان سے باہر نکل آیا۔ مجھ کو کچھ معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نہر کے کنارے آ کر رک گیا۔ میں نے گرد و پیش ایک نگاہ ڈالی۔ اور پانی میں کود پڑا"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اعصابی خلل والوں سے ایسی حرکتیں بعید اور غیر متوقع نہ تھیں۔

"ڈاکٹر تم سن کر محظوظ ہو گے جب میں ڈوبنے لگا اور میرا سانس پانی سے اکھڑنے لگا۔ تو میں بے اختیار بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ گویا میں ڈوبنا نہیں چاہتا تھا"

وہ زیر لب مسکرا رہا تھا گویا خود اس کے اس مذاق سے حظ اٹھا رہا ہو۔ پھر اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"ایکا ایکی میں نے محسوس کیا کہ کسی نے مجھ کو میرے کالر سے پکڑ لیا ہے اور مجھ کو کشاں کشاں کنارے کی طرف لے جا رہا ہے۔ میں اس وقت اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔ اس لئے مجھے کچھ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا ہوا اور میں کہاں تھا

البتہ میں نے ایک نظر اپنے بچانے والے کو ضرور دیکھ لیا۔"

میں اس کو معلوم کرنے کے لئے اس کے اوپر جھک گیا۔ اس کی آواز میں نقاہت آگئی تھی اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

" ڈاکٹر جانتے ہو کس نے مجھے بچایا ہے، میری ڈوڈا نے "

اسے گھر سے اس غیر معمولی ہیئت میں نکلتے دیکھ کر ڈوڈا نے خطرہ محسوس کیا اور اس کے پیچھے ہولی۔ جب اس نے پانی میں چھلانگ لگائی تو یہ بھی اس کے پیچھے کود پڑی اور اس کو کالر سے پکڑ کر ڈوبنے سے بچائے رکھا۔ پھر کسی راہگیر نے انہیں دیکھ لیا ہوگا اور دونوں کو بچا لیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس سے قبل میں کبھی بھی ایسے کھردرے اور کرخت چہرے پر ایسے نرم اور پرسوز آنسوؤں کا تصور نہ کر سکتا تھا۔

وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا " ڈوڈا نے مجھ کو وہ کچھ دیا جو دنیا کا کوئی عالم یا فلسفی مجھ کو نہ دے سکا اس بے زبان حیوان نے نگاہوں میں مجھ کو وہ کچھ سمجھا دیا جو دنیا کا سارا منظم علم بہ ہزار رعب طنطنہ اور گہرائیوں کے ساتھ مجھے نہ بتا سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ زندگی مرنے کے لئے نہیں جینے کے لئے ہے، جیتی جان کا یہی تقاضا ہے"

اس کی آنکھوں میں نور کی اک نئی چمک پیدا ہو گئی۔ ہسپتال کی بلند کھڑکیوں کے دھندلے شیشوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ سورج اب افق کو چھو رہا ہے۔ اور دن کی موجوں سے پیپڑوں میں ٹھنڈک سی لپ رہی تھی۔

"ڈاکٹر یہ حقیر سا حیوان کسی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ نہیں اسے فلسفے کی الجھنیں معلوم نہیں، اسے منطق اور جرح و تعدیل کا علم نہیں ہے۔ پھر وہ کونسی چیز تھی۔ جس نے اسے مجھے بچانے پر اکسایا اگر وہ میری طرح انسانی علم حاصل کئے ہوئے ہوتی اور کسی انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہوتی تو وہ مجھے ڈوبتا دیکھ کر ضرور تازہ دم محسوس کرتی کہ اس بے معنی اور بے مقصد دنیا کا ایک مہمل جزو ختم ہوا۔ جب میں کنارے پر لایا گیا اور کچھ عرصہ کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا۔ وہ بیٹھی میری طرف ایسی محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی ماں اپنے پیارے بچے کی طرف دیکھتی ہے"

آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو چکا تھا

"پھر خود میرا اپنا بدن کیوں اپنے آپ کو بچانے کے لئے پھڑپھڑایا۔؟ ڈاکٹر کیا عقل ایک بدن کے اندر ایک مدت تک رہتے ہوئے بھی اس کی فطرت سے واقف نہیں ہو سکتی؟"

میں خود سوچ میں ڈوب گیا۔ عقل و بدن کا یہ تضاد کیوں ہے؟ ہم اسے محسوس کرتے ہیں لیکن زبان پر نہیں لا سکتے۔ عقل کہتی ہے، دنیا میں رشید خود ہی کا ذخیرہ اسے نگلنے والے موجودوں کی نسبت کم ہے بہتا ضبط علامت ہو۔ اگر کوئی خودکشی کرتا ہے تو یہ فعل قابل ملامت نہیں بلکہ اس نقطہ خیال سے عین منشا ہے۔ لیکن اس قسم کی باتیں کرنے والے کبھی خود بھی خودکشی کریں گے؟ کبھی اپنے بچے کو مرتا دیکھ سکیں گے؟ وہ کبھی اپنے لئے ادنیٰ قسم کی غذا پسند کریں گے؟ جالس کی عقل و جذبات اسے ہلاکت کی طرف لئے جا رہے تھے لیکن اس کا بدن اس سے بچنا چاہتا تھا۔ عقل و جذبات کے غلبے کے باوجود وہ اس کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔

ہسپتال میں اسے وہ فائل بھی پہنچا دی گئی جو اس نے اپنے بھائی کے گھر بھیجی تھی۔ فائل پہنچانے والے نے

چارلس ڈبلیو ٹیمی کالکس

بعد معذرت فائل اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا

"موسیو چارلس، یہ فائل ہمیں آپ کے صدر دروازے کے قریب جھاڑی میں گری ملی۔ میرا خیال ہے یہ فائل آپ کی میز یا آپ کے کمرے کی کھڑکی سے کسی حادثہ یا اتفاق سے گر گئی ہوگی۔ جب ہم نے اسے دیکھا تو اس کی اہمیت سمجھتے ہوئے اسے پورے احتیاط سے آپ کے حوالے کر رہے ہیں۔ ہم سب آپ کی صحت کے متمنی ہیں ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمارا ہمسایہ عظیم سائنس دان ہے"

چارلس نے کہا "ڈاکٹر! زندگی بھی عجیب ہے۔ یہ سب کچھ اب ایک طربیہ دکھائی دیتا ہے۔ جب میں نے فائل وہاں کھڑکی سے پھینک دی اس صدر دروازے کا دروازہ بھی کھل گیا۔ جو اتنی مدت سے مجھے پریشان کر رہی تھی۔ وہ دوشیزہ اپنے پورے حسن کے ساتھ میرے سامنے آ گئی۔ لیکن اب وہ مجھ نہیں چاہتی تھی۔ اب وہ علم میرے کام کا نہ تھا اور نہ میں اسے دوسروں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اب وہ چارلس نہیں رہا تھا جو زندگی کو ہلاک کرنے کا متمنی تھا۔ مدید چارلس زندگی کو بچانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے فائلوں کا گٹھا نذر آتش کر دیا۔ انسانی تاریخ میں ان فائلوں کا جلنا نہایت اہم واقعہ ہے لیکن اس کا کسی کو علم نہیں۔ دنیا تو ایک بات کو صرف شہرت سے جان سکتی ہے عمل کی اہمیت سے نہیں۔"

اس نے مجھے کھڑکی کھولنے کا اشارہ کیا۔ وہ زیادہ باتیں کرنے سے ضعف سا محسوس کرنے لگا۔ جونہی کھڑکی کھلی ایک چھوٹا سا پرندہ کھڑکی کے اوپر چھائی ہوئی بیل پر آ بیٹھا۔ بیل میں چھوٹے چھوٹے سرخ پھول جھانک رہے تھے۔ باغیچہ کے تختے پر چند بچوں کے کھیلنے اور خوشی سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں سورج کی روشنی کے آخری تار سبز بیلوں پر تھرتھرا رہے تھے اور باغ کے کسی گوشے میں کوئل نغمہ ریز تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا کہ وہ بھی اس منظر پر ایک نظر ڈال سکے۔

وہ خوشی سے چیخا "ڈاکٹر! زندگی موت کے لئے نہیں۔ اسے ضرور بچایا جائے!"

شام ہو چکی تھی اور ہسپتال روشنی سے جگمگا رہا تھا برآمدوں میں نرسوں کے ہلکے پھلکے قدموں کی بے آواز چاپ سنائی دینے لگی۔

اس نے مجھے رخصت کرتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"ڈاکٹر! میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن جس طرح ہضم شدہ غذا دفع ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اسی طرح سمجھی ہوئی بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی"

وہ اس وقت پرسکون تھا جب میں اس کے کمرے سے نکلا۔

دوسرے دن شام کو مجھے ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ وہ اسی روز تین بجے بعد دوپہر مر گیا۔ اس نے وصیت میں تاکید کر دی تھی کہ اس کی ساری جائداد ریڈ کراس کے حوالے کر دی جائے۔

"بھورے کتے"

نعیم صدیقی

گورے آقا کے سدھائے ہوئے بھورے کتے!
یہ نشاناتِ کہن ذلتِ محکومی کے!
آدمیت پہ یہ خونخوار بپھر کر جھپٹے!

●

پیرہن اس طرح چیرا ہے کہ تن ننگا ہے!
کھپلیاں اس طرح گاڑی ہیں کہ خوں رستا ہے
بوٹیاں اس طرح نوچی ہیں کہ جی کڑھتا ہے

●

امن قانون کے خنجر سے ہوا ہے گھائل
چر لیا باڑ نے خود کھیت کا سارا حاصل
کشتیوں کے لئے گرداب ہوا ہے ساحل

●

ایک ماں اپنے حرم خانے سے بلوائی گئی
بے بسی قہر کے دربار میں اُف لائی گئی
کپڑے نوچے گئے کیا، کھال ہی کھنچوائی گئی

●

حملہ آور ہوئے ہر سمت سے خونی غنڈے
برسرِ عام ادھڑتے ہیں حیا کے بخیے!
اُڑ گئے شرم کے گھونگھٹ کے فضا میں پرزے

●

سامنے ماں کے وہ بیٹے کا اترتا ہے لباس
آج مذہب ہوا بے حال، شرافت بے آس
سہ گیا عجز سے غیرت کا تڑپ کر احساس

●

ایک ہی ایک نہیں؟ اور بھی کچھ مائیں ہیں!
بیٹیاں، بہوئیں ہیں، آپائیں ہیں، خالائیں ہیں!
جیسے قصاب کے قابو میں یہ کچھ گائیں ہیں

•

جس گریباں کو بھی دیکھو وہ بصد چاک ہے آج
جس بھی دیدے پہ نظر ڈالو وہ نمناک ہے آج
بربریت ہے کہ پوری طرح بے باک ہے آج

•

آج ویرانی ہے چھائی ہوئی گلشن گلشن
آج بجلی کے نشانے پہ ہے خرمن خرمن
آج شعلوں کے تسلط میں ہے دامن دامن

•

سامنے مرد کے عورت کا سکوں لٹتا ہے
مرد سنگین کے سائے میں کھڑا گھٹتا ہے
رنگ اک رخ پہ ابھرتا ہے تو اک مٹتا ہے

•

وہ مناظر کہ کھلی آنکھیں جنہیں سہ نہ سکیں
دیکھ پائیں تو پھر اوسان بجا رہ نہ سکیں
اور بتائیں جنہیں لفظوں میں کبھی کہہ نہ سکیں

•

آج تہذیب کی، اخلاق کی شامت بولی
آج نوچی گئی عصمت کی مقدس چولی
وہ جو ان ہوتی تھی، اس دیس میں آخر ہولی!

•

آج قرآن کی آیات پڑی ہیں پامال،
آج تاریخ شرافت کی ہوئی ہے کنگال
ادب و شعر کی دنیاؤں میں آیا بھونچال

•

یہ جفا کار کوئی دشمن خونریز نہ تھے
یہ کوئی سکھ نہ تھے، ہندو نہ تھے، انگریز نہ تھے
یہ مسلمان تھے، ہلاکو نہ تھے، چنگیز نہ تھے

•

اپنی تہذیب کی درگاہ کے درباں یہ ہیں
اپنے ناموس کے، عزت کے نگہباں یہ ہیں
جن کے پہرے میں ہے اخلاق کا ایواں یہ ہیں

•

انھیں کافر نہ کہو! پر یہ مسلماں بھی نہیں
یہ مسلماں تو کجا! ہائے یہ انساں بھی نہیں
کیسے انساں، یہ سلجھے ہوئے حیواں بھی نہیں

•

بھوکے کتے ہیں یہ اس قوم کے ناندوں پالے
پھرتے ہیں ٹھاٹھ سے پٹے یہ گلے میں ڈالے
بوٹیاں نوچ کے آقاؤں کی کھانے والے

•

بھوکے کتو! تمہیں ماؤں نے جنا تھا کہ نہیں؟
کسی چھاتی سے کبھی دودھ پیا تھا کہ نہیں؟
ماؤں نے تمہیں گودی میں لیا تھا کہ نہیں؟

•

کیا تمہاری بھی کوئی اپنی بہن ہے کہ نہیں؟
گھر جو رکھتے ہو تو کیا اس میں دلہن ہے کہ نہیں؟
کوئی گل پیرہن و غنچہ دہن ہے کہ نہیں؟

•

آج اُن سب کے حجابات کو پھاڑا تم نے
آج اُن سب کا ہی ناموس اُجاڑا تم نے
آج اُن سب کے ہی جوڑے کو اُکھاڑا تم نے

•

ماؤ بہنو! نہ کرو جانوں کو رو رو کر ہلکان
ظلم کرتا ہے خود اپنے ہی فنا کا سامان
جور کی ناؤ کے اندر سے اٹھیں گے طوفان

•

مجمعِ عالم میں جھکتی ہوئی نظروں کو سلام
حشر آنچل نے پہ رکتی ہوئی سانسوں کو سلام
شبنمِ اشک سے بھیگی ہوئی پلکوں کو سلام

•

بھوکے کتے

گرچہ چھائی ہوئی یاں قوتِ اغیار بھی ہے!
اوپر ان سب کے مگر عرش کی سرکار بھی ہے
وہ کہ غفار ہے! جبار بھی، قہار بھی ہے!

●

اس کے قانون میں کوئی بھی اُلٹ پھیر نہیں
مصلحت کے لئے کچھ دیر ہو، اندھیر نہیں
جب اجل آن پہنچتی ہے تو پھر دیر نہیں

●

نشۂ پندار کا خوب اچھی طرح چھانے دو
ظلم کے جام کو پوری طرح بھر جانے دو
جور کے پیڑ تو اُگ آئے ہیں پھل آنے دو!

●

روحِ انسان کو دبا ہی تو نہیں رہنا ہے
نت یونہی صیدِ جفا ہی تو نہیں رہنا ہے
سر پہ یہ دَور سدا ہی تو نہیں رہنا ہے!

●

دن مصیبت کے سہی، پھر بھی یہ کٹ جائیں گے
تلخ حالات سہی! جلد پلٹ جائیں گے
تاج لُٹ جائیں گے، یہ تخت اُلٹ جائیں گے

●

نئے ایام کی آمد کے گجر بجتے ہیں
صبحِ الہام کی آمد کے گجر بجتے ہیں
دَورِ اسلام کی آمد کے گجر بجتے ہیں

●

ماؤ بہنو! اٹھو اب ظلم کے آگے تن جاؤ
آنے والے نئے طوفان کی لہریں بن جاؤ
آزمائش کی ہر اک چھلنی سے اب چھن جاؤ

●

بھوکے کتوں سے کہو وقت بدل جائے گا
بھوکے کتوں سے کہو روزِ حساب آئے گا
بھوکے کتوں سے کہو رنگ عمل لائے گا

●

حلقۂ ادب اسلامی لاہور میں پڑھی گئی

●

مالی! مالی!

نعیم صدیقی

برسوں سویا! اٹھ اب مالی!   فصلِ بہاری آئی، آئی

مالی! ——— مالی!

چڑیوں کی چہکار سہانی   کوئل کی ہے کوک نرالی

مالی! ——— مالی!

دیکھ فضا، یہ مہکی مہکی   دیکھ گھٹا یہ کالی کالی!

مالی! ——— مالی!

جنگل تک میں پھول کھلے ہیں   تیرا چمن ہے خالی خالی

مالی! ——— مالی!

تو نے اپنا باغ نہ سینچا   تو نے اس میں کھاد نہ ڈالی

مالی! ——— مالی!

بھولا بسرا خواب سراسر   گھاس کی سبزی! پھول کی لالی!

مالی! ——— مالی!

جو بھی روش ہے سو ہے ویراں   ٹوٹی مینڈیں! سوکھی نالی!

مالی! ——— مالی!

نیلا ٹ دھاری چھائی ایسی   سرو و سمن کی جان نکالی۔

مالی! ——— مالی!

ٹ ۔ آکاش بیل

مالی! مالی!

مسلی روندی جائیں کلیاں — کانٹوں کا یاں رتبہ عالی

مالی! ——— مالی!

کوئی کونپل جب بھی پھوٹی — باڑ نے آگے بڑھ کر کھالی

مالی! ——— مالی!

کُنجوں میں اب اُلّو بولیں — ہر بلبل پنجرے میں ڈالی

مالی! ——— مالی!

جھکڑ میں ہو اُکھڑے پودے — ہو نہ سکی پھر ان کی بحالی

مالی! ——— مالی!

تیرے چمن نے پانچ برس میں — ایک دوامی پت جھڑ پالی

مالی! ——— مالی!

اوس بہا کر آنسو چپکے — مفت میں اس نے جان گھلا لی

مالی! ——— مالی!

جو بھی ترا تھا فرض، بھلایا — جو بھی گھڑی تھی کام کی ٹالی

مالی! ——— مالی!

بیج عمل کا ایک نہ پھوٹا — سبز سہی کچھ باغ خیالی

مالی! ——— مالی!

رُت یہ نمو کی چار ہی دن ہے — آناً فاناً جانے والی

مالی! ——— مالی!

برسوں سویا! اُٹھ اب مالی! — فصلِ بہاری آئی، آلی

مالی! ——— مالی!

اندھیرا ہے

نعیم صدیقی

چمک رہے ہیں شمس و قمر، اندھیرا ہے
پہنچ رہی ہے جہاں تک نظر، اندھیرا ہے

بے نصیبیِ سحر کی! صدیاں گزر گئیں اس میں
ٹھٹھر گئی ہے امیدِ سحر! اندھیرا ہے

ظلامِ دہر سے اک آن کشمکش کر کے
شہید ہو گئے لاکھوں شرر! اندھیرا ہے

پڑے ہیں خاک پہ شاہیں تو بوم و خفاش
لپک رہے ہیں ادھر سے اُدھر، اندھیرا ہے

درونِ حد تو ابھی ٹمٹما رہا ہے چراغ
مگر نہ جا نکلے بیرونِ حد، اندھیرا ہے

یہاں پہ قافلے والوں کا ہو تحفظ کیا
یہاں تو آپ ہیں گم راہ بر! اندھیرا ہے

جو کوئی کرمکِ شب تاب بھی چمک اٹھے
چمکنے لگتی ہے دنیا، ادھر! اندھیرا ہے

قدم قدم پہ یہاں ٹھوکریں ہیں، رہزن ہیں
یہ وادیاں ہیں بڑی پُر خطر! اندھیرا ہے

چھپا کے چہرہ، بکھیرے ہوئے ہے زلفوں کو
جہانِ شوق میں وہ فتنہ گر! اندھیرا ہے

ہزار قمقمے روشن نظر تو آتے ہیں
مگر بعالمِ قلب و جگر، اندھیرا ہے

ہے شہریار کے ہاں رہن صبحِ آزادی
نہ جانے کب سے غریبی کے گھر! اندھیرا ہے

چراغ بن کے چمکتے تو ہیں میرے آنسو
چمکتے ہیں مرے آنسو مگر! اندھیرا ہے

مثالِ برق کبھی تو ذرا چھلک جاتی
تمہارے لطف کی بس اک نظر! اندھیرا ہے

سکوں نصیب میں لکھا نہیں؟ مسافر ہیں
نکل تو آئے ہیں، جائیں کدھر! اندھیرا ہے

صنم کدے کو تو چھوڑو، سناؤ کعبے کی!
اُدھر تو دیکھ بھی آئے! اِدھر اندھیرا ہے

فسادِ ظلمتِ دوراں سے بس خدا کی پناہ
ہے بھیڑیوں کے حوالے بشر! اندھیرا ہے

ہر ایک اپنی ہی بپتا کو رو رہا ہے یہاں
کسی کو کیا ہو کسی کی خبر! اندھیرا ہے

یہ کشمکش ابھی انجام کو نہیں پہنچی
اُلجھ رہے ہیں ابھی خیر و شر! اندھیرا ہے

فلک سے لاکھ شعاعوں نے یورشیں کیں بھی
ابھی زمیں کی اس گنبد پہ اندھیرا ہے

بجھے نہ مشعلِ ایماں تو فکر کیا آخر
فضائے عالمِ خاکی میں گر اندھیرا ہے

ہے شرق و غرب کے مابین گردشِ ایام
رہا ہے پہلے اُدھر، اب اِدھر اندھیرا ہے

ہزار طرح کے اوہام حملہ آور ہیں
خود اپنے آپ سے لگتا ہے ڈر، اندھیرا ہے

جو شمعِ خانہ تھی، روتا ہے شمع دان اسے
اب انجمن میں تو رونق ہے، گھر اندھیرا ہے

جبینِ سجدہ نہ جانے کہاں کہاں گھس کر
ابھی ملا ہے تیرا سنگِ در! اندھیرا ہے

خدا سمجھ کے یہاں لین دین کیجئے گا!
بکے ہیں سنگ بنامِ گہر، اندھیرا ہے

گرہ کٹوں کی تو بن آتی ہے اندھیرے میں
رکھو گرہ کو ذرا تھام کر! اندھیرا ہے

اماں ہے تو تہی دامنی کو حاصل ہے
بلائے جاں ہے یہاں سیم و زر! اندھیرا ہے

نظر جو آتی ہے کچھ روشنی تو زنداں میں
وگرنہ قسمتِ ہر بام و در، اندھیرا ہے

سراغِ مقصدِ آدم نہیں ملا اس کو
بھٹک رہا ہے ابھی تک بشر، اندھیرا ہے

جنوں کو مشعلِ الہام لے کے آنے دے
ٹھہر بھی جا! دانشِ شوریدہ سر! اندھیرا ہے

سوستان

مصنفہ: میکس ڈیٹ بی
مترجم: مشتاق بھٹی ایم اے

(صحرائے افرنگ کا نخلستان)

یہ مضمون محض معلومات افزا ہونے کی وجہ سے چراغ راہ کے صفحات میں نہیں لیا جا رہا ہے۔ بلکہ اسے اہمیت دینے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی قوم اور مملکت کی زندگی کے عجیب و غریب پہلو ہمارے سامنے لاتا ہے جو ہمارے موجودہ فسادی دور میں ایک جزیرۂ امن بنی کھڑی ہے۔ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے بھی اس قوم اور مملکت کے حالات میں بڑے قیمتی سبق موجود ہیں۔ ہم مترجم کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے چراغ راہ کے لیے یہ کاوش کی۔

پیمانہ ایک انچ = ۲۰ میل

شمالی

جرمنی

مغرب

مشرق

سوستان

جھیل جنیوا

اطالیہ

اطالیہ

جنوب

فن کاری کی بدولت سوستان دوسرے ملکوں کی نسبت خاصا مشہور ملک ہے۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ سوستان[1] زیادہ تر ایلپس[2] کے چالوں پر مشتمل ہے اور یہ کہ ایلپس کے پہاڑ سپید برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوہستان ایلپس طلوع سے چوٹی تک گھنے جنگلوں سے چھایا ہے۔ اور دوسرے اس کا رنگ گہرا سبز اور ارغوانی نظر آتا ہے۔ سوستان کی وادیاں، جھیلیں اور اس کے خوشنما سبزہ زار رنگین قالین کی طرح تھوڑی تھوڑی اونچی نیچی پہاڑیوں پر دور دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ چونکہ اس کی سرحدیں جنوب میں جھیل ماجیور[3] کے اُدھر علاقے سے جا ملتی ہیں اس لئے یہاں کے نخیل کے درخت بھی اتنے ہی شاندار ہیں جتنے کہ چنار کے درخت۔

امن کے شیدائی چونکہ اپنے اجتماعات اکثر سوستان میں کرتے نظر آتے ہیں اس لئے ایک عام غلط فہمی

عسکریت } پیدا ہو جاتی ہے۔ سوستانی عافیت کوش نہیں وہ جنگجو بلند ایک قوم ہیں جن کے ملک کی سرحدیں مستحکم ہیں جن کے پاس محاصرے کے تدارک کے لئے کافی ذخیرے ہیں اور جو سر سے پاؤں تک مسلح ہیں۔ اگر سوستان چاہے۔ تو اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر آٹھ لاکھ تربیت یافتہ فوجی جوان ——— فرانس سے تقریباً دگنے ——— میدانِ جنگ میں لا سکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم چھڑنے کے وقت اس نے عملاً اپنی فوجوں کو کئی منٹ پیشتر مجتمع کر کے انگلستان کو مات کر دیا تھا۔ اور اگرچہ یہ جنگ میں شریک نہ ہوا تاہم اس نے اپنی غیر جانبداری کے اعلان کو واضح تر کرنے کے لئے تقریباً بیس طیارے مار گرائے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ کہانی بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگ کے آخری دور میں اتحادیوں کے چند طیاروں کو سوستان کے طیارہ شکن مقام سے ایک لاسلکی پیغام ملا "تم سوستانی علاقے کے اوپر پرواز کر رہے ہو!"

"ہم جانتے ہیں" ہوابازوں نے جواب دیا

"اگر تم یہاں سے چلے نہ گئے تو تمہیں نشانہ بنا دیا جائے گا" سوستانیوں نے تنبیہ کی۔

"ہم جانتے ہیں" ہوابازوں نے پھر جواب دیا۔

سوستانیوں نے طیارہ شکن توپوں کو داغ دیا اور ہوابازوں نے فوراً لاسلکی پیغام بھیجا۔ "تم بہت بلندی پر نشانہ لگا رہے ہو"

سوستانیوں نے جواب دیا۔ "ہم جانتے ہیں"

---

[1] سوستان یعنی سوئٹزرلینڈ۔ وسطی یورپ میں ایک وفاقی جمہوریہ ہے جس کا سیاسی نظام اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا بھر میں منفرد ہے۔ اس میں پچیس ریاستیں جنہیں کینٹن کہا جاتا ہے شامل ہیں۔ اس کا رقبہ ۱۵،۹۴۰ مربع میل اور آبادی چالیس لاکھ سے زیادہ ہے علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے جس میں گھنے جنگل ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں برف پوش ہیں اور ان سے سیل رخ بہتے رہتے ہیں۔ اس میں بہت سی جھیلیں ہیں۔ سب سے بڑی جھیل جنیوا ہے۔ یہ ملک گھڑیاں اور صنعت و حرفت کے لئے مشہور ہے۔ گھڑی سازی اور ریشم بافی مشہور صنعتیں ہیں۔ برن دارالحکومت ہے۔ (مترجم)

[2] ایلپس (Alps) یورپ کے سب سے اونچے ۶۰۰ میل لمبے اور ۱۳۰ میل چوڑے پہاڑوں کے سلسلے کا نام جو جھیل جنیوا سے کر دانیا تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی سب سے بلند چوٹی ۱۵،۷۸۲ فٹ ہے یہ تمام پہاڑ گھنے جنگلوں سے اٹے پڑے ہیں اور قدرتی نظاروں کے لئے مشہور ہیں۔ (مترجم)

[3] ماجیورے (MAGGIORE) سوستان اور اطالیہ کی ایک جھیل ہے جو کوہستان ایلپس کے دامن میں واقع ہے۔ ۳۷ میل لمبی قریباً ۶ میل چوڑی ہے۔ اس کا رقبہ ۸۱ مربع میل ہے۔ یہاں کے قدرتی نظارے نہایت حسین ہیں۔ موسم نسبتاً گرم ہے۔ (مترجم)

سوستان کی غیر جانبداری صرف سیاسی ہے۔ یہاں رائے آزاد ہے۔ اور اس کا اظہار آزادی سے کیا جاتا ہے اور اس عالمگیر جنگ میں عام طور پر رائے عامہ نازیت کے سخت خلاف تھی۔

قدیم زمانے میں سوستانی بہترین، دلیر ترین، خونخوار ترین اور سب سے زیادہ قابل اعتماد سپاہی خیال کئے جاتے تھے وہ پیشہ ور سپاہی تھے اور اپنے پیشے کے اصولوں کے انتہائی پابند یعنی وہ اپنے عہد کے مطابق قتل کرتے اور قتل ہو جاتے لیکن لالچ میں آکر کبھی ایک طرف سے دوسری طرف نہ جاتے۔ تاہم ان میں ایک نقص تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ تنخواہ میں اضافے پر اصرار کرتے کچھ اس سبب سے اور کچھ جذبۂ قومیت کے عروج کی وجہ سے سوستانی ذہانت کی اس پہلی نمایاں پیداوار کی برکت ختم ہو گئی لیکن آج بھی ۲۰۰ سوستانی بہادروں کا ایک دستہ پاپائے روم کی محل سرائے کی زینت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس شہرہ آفاق بہادری کی ہی ایک یادگار باقی رہ گئی ہے جس کا مرقع۔ سپارٹالہ کے بہادروں سے لے کر آج تک کوئی نہیں ہوا۔

جس چیز نے سوستانیوں کو بین الاقوامی سیاست سے کنارہ کش کر دیا ہے۔ وہ ان کی عملی ذہانت ہے۔ حالانکہ کوئی شک نہیں اُن کی جغرافیائی حیثیت کے پیش نظر سیاست میں حصہ لینا ممکن تھا۔ اور ان کے ہمسایوں کو بھی اس میں باہمی مفاد نظر آتا تھا لیکن اُن کی تحمل مزاجی اور حقیقت بینی نے کنارہ کشی کو ہی بہتر سمجھا۔

معاشی نظام

سوستان کے معاشی نظام کی بنا بھی اسی عملی ذہانت پر ہے ان کے پاس کوئی سمندر ہے نہ کوئی فالتو قدرتی سامان اور نہ ہی کسی قسم کے وسائل دولت سوائے آبی قوت یا کام کرنے کی اہلیت کے، یہ اہمیت اس قدر عظیم الشان ہے اور اتنی عمدگی سے مستعمل ہے کہ تقریباً ناقابل کاشت سوستان کا معیار زندگی دنیا بھر میں غالباً سب سے زیادہ بلند ہے۔ اور دولت کی منصفانہ اور خوش گوار تقسیم کے معاملے میں تو بنی نوع انسان کی ساری تاریخ میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ سوستان بھر میں کوئی تنگ و تاریک گندی گلی نہیں۔ کوئی فقیر نہیں، کوئی اَن پڑھ نہیں اور کوئی قلاش نہیں۔ البتہ وہاں کے پہاڑی دہقان ضرور غریب ہیں۔ وہ بھی اس لئے کہ وہاں کی چٹانیں غریب ہیں، لیکن قلاش وہ بھی نہیں۔

بعض اہل علم کا بیان ہے کہ سوستان میں ایک بھی بالکل مزدور نہیں کارخانے صرف بڑے بڑے شہروں میں ہی قائم نہیں۔ بلکہ جابجا دیہات میں بھی پھیلے ہوئے ہیں صنعتی کارکنوں کا ایک بہت بڑا حصہ زرعی زمینوں کا مالک ہے۔ معاشی بدحالی کے زمانے میں وہ اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے ہیں اور کھیتی باڑی میں لگ جاتے ہیں۔ پچھلے تیس سال سے ملک بھر میں کوئی بڑی ہڑتال نہیں ہوئی۔ وہاں کے تجارتی اتحادیے دکانیں بند کرنے کے خلاف ہیں اور وہاں کے اشتراکی، حکومت کی ہمہ گیر ملکیت کے مخالف۔ دونوں اپنے آپ کو اتنا محفوظ سمجھتے ہیں کہ انہیں اختیارات کی نسبت آزادی کی زیادہ فکر ہے۔

پُرسکون نخلستان

۱۲۹۱ء سے لے کر جب کہ "آلپس" کے تاسیس نے ایک جھیل کے کنارے بلند سبزہ زار پر اکٹھے ہو کر اس بات کی قسم کھائی کہ وہ اپنی آزادی کے دشمنوں کے خلاف ہمیشہ متحد رہیں گے۔ سوستانی دنیا بھر میں آزادی کے بہترین شیدائی ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ یورپ بھر میں ہی ایسے لوگ ہیں جنہیں دولت کی فکر نہیں اُن کی حیثیت اس مضطرب اور بے چین براعظم میں ایک پرسکون نخلستان کی سی ہے۔

لہ سپارٹا۔ قدیم یونان کی ایک ریاست اور شہر کا نام جہاں کے لوگ بہادری اور جفاکشی کے لئے ضرب المثل ہیں۔ ۴۸۰ ق م میں [illegible] کے مقام پر سپارٹا کے مٹھی بھر جانبازوں نے ہزاروں ایرانیوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا۔ یہ واقعہ تاریخ میں غیر فانی حیثیت حاصل کر چکا ہے

یہاں ہر سال کم و بیش پندرہ لاکھ سیاح سیر و سیاحت کے لئے آتے ہیں پہلے وہ صرف فطرت کے حسن و جمال کی جستجو میں آیا کرتے تھے اور اب وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس فطری زندگی کی تلاش میں آتے ہیں جو آج تک اپنی فطری دلکشی پر قائم ہے۔

ہل رلنگ کہا کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ سوستانی دونوں عظیم جنگوں سے الگ تھلگ رہا۔ بلاشبہ یہ بھی ایک سبب ہے لیکن سوستان کی خوشحالی پہلی جنگ عظیم سے بھی بہت پرانی ہے۔ بلکہ اپنے معاشی ماہرین کی رائے ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے لوگ ہر شے پر باضابطہ حکومت کے عامیانہ مذاق کی مخالفت کرتے ہیں۔

سیاست کے معاملے میں سوستانی غیر معمولی طور پر تحمل مزاج واقع ہوئے ہیں۔ جیسے بتایا گیا تھا کہ سوستان

حقیقی خود مختاری

ہر دلعزیز خود اختیاری حکومت کے معاملے میں دنیا بھر کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس قول کی صداقت کو اپنے کے لئے مجھے خود وہاں جانا پڑا۔ صرف یہی نہیں کہ وہاں کوئی بادشاہ یا آمر نہیں بلکہ کوئی صدر یا وزیر اعظم بھی نہیں۔ ملک کا انتظام سات آدمیوں کی ایک مجلس شوریٰ کے سپرد ہے جس کا صدر نشین ہر سال نئے سرے سے چنا جاتا ہے اور وہ کسی طرح بھی خاص اختیارات کا مالک نہیں ہوتا۔ مگر اس بات کا پتہ لگانا ہو کہ صدر نشین کون ہے تو اس کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ شہر برن میں دیوان حکومت کے پاس [illegible] وقت پر کھڑے ہو جائیں اور دیکھیں کہ علی الصبح کون ٹرام یا بائیکل سے اتر کر دفتر میں داخل ہوتا ہے بس وہی صاحب صدر نشین ہوں گے ایک دفعہ جب مجلس شوریٰ کے ایک رکن سے پوچھا گیا کہ آپ ہمیشہ تیسرے درجے میں کیوں سفر کرتے ہیں تو اس نے جواب دیا اس لئے کہ کوئی چوتھا درجہ نہیں ہے۔

سوستانی عملی طور پر شان و شوکت کو پسند نہیں کرتے جیسا کہ اکثر جمہوریت پسند چوری چھپے کرتے ہیں۔ سوائے جنگ کے زمانے کے اُن کی فوج کا کوئی جرنیل نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے وہ بھی صرف ایک۔ ملک کے تمام صحیح الجسم آدمی ملک کی فوج ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک تربیت یافتہ سپاہی ہے اور ہر ایک کے گھر میں ایک فوجی وردی ایک بے زنگ بندوق اور کارتوس موجود ہوتے ہیں (انقلابیوں کے لئے ایک جنت بشرطیکہ کسی چیز کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ہو) ہر اتوار آپ کو سارے سوستان میں بندوقوں کے چلنے کی آوازیں، چرواہوں کے سحر آفرین نغموں اور گائیوں کی بجتی ہوئی گھنٹیوں کی خوش آئند سروں میں گھلتی ملتی سنائی دیں گی۔ یہ اس بات کی علامت ہیں کہ سوستانی فوج اپنے ملک کے دفاع کی تیاری کر رہی ہے۔

ہر دوسرے اتوار کو بلکہ یوں کہیے کہ اکثر تمام مرد انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور اپنی رائے دیتے ہیں خواہ یہ مسئلہ جمعیت اقوام میں شرکت کا ہو یا کسی جامعہ کی بنیاد رکھنے کا اور خواہ یہ کسی نئے محلے کی کوڑا گاڑی کی خرید کا مسئلہ ہو۔ درحقیقت سوستانی ہر بات کا فیصلہ عام انتخابات پر کرتے ہیں حتیٰ کہ معمولی مدرسین کا تقرر بھی انتخابات کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ حق قانون سازی اور استصواب اُن کی سیاسی زندگی کی جان ہیں۔ یہ طریقے مجلس عام کے اس پرانے سسٹم کا نعم البدل ہیں کہ ہر ریاست کی پوری آبادی کسی مرغزار یا جائے عام پر اجتماع ہوتا تھا اور ہر معاملے کا فیصلہ ہاتھ اُٹھا کر کیا جاتا تھا۔ پانچ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں جمہوریت کی یہ براہ راست شکل ابھی تک موجود ہے۔

سوستانیوں کے لئے سیاست خود اختیاری کے کام کی مصروفیت اس قدر زیادہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی سوچی سمجھی رائے

---

۱ برن (Berne) سوستان کا ایک مشہور شہر جو اپنی ہم نام ریاست کا دارالحکومت ہے اور ۱۸۴۸ء سے سارے ملک کا دارالحکومت بھی ہے۔ یہ شہر دریائے آرے کے کنارے واقع ہے [illegible] سوستان کے [illegible] شہر ہے۔ آبادی تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار ہے۔ (مترجم)

پیسے کماتے ہیں کے لئے ان لاتے ہیں۔ ممکن ہے اگر بہر صورت یا دوسرے تیسرے روز ساتھ خاندان کو جا کر راتے دیں چیسے تو کھانا کہاں سے ملے۔
پیری کلیز[1] کے بعد سے لے کر آج تک شاید کہیں شہریت کو بھی اتنی سنجیدگی دی گئی اور شاید ہی شہری ذمہ داری کو اس قدر شدت سے محسوس کیا گیا

کڑا انضباط

اس میں کوئی شک نہیں کہ عمل ذہانت ہر دوسری خوبی کی طرح کچھ عرصے کے بعد اکتا دیتی ہے اور ترکِ اختیار کی جنبش کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس لئے عجیب نہیں کہ نوجوانوں کو سوستان کی زندگی بے انتہا افسردہ اور بے کیف نظر آئے شاید یہ زونگلے[2] اور جان کیلون[3] کا اثر ہو۔ جو سارے ملک پر چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ سوستان کی فضول پسند خواتین بھی اپنے زرق برق ملبوسات اور قیمتی جواہرات کو سیاحت پیرس کے لئے تو سنبھال رکھتی ہیں لیکن گھر پر پہننے کا خیال بھی نہیں کرتیں۔

شاید یہی متشدد لوگ قواعد و ضوابط کی دقت و پریشانی کے ذمہ دار ہیں۔ اگر آپ سوستان میں بے وقت پیانو بجائیں تو آپ کا ہمسایہ خواہ وہ موسیقی سے لطف اندوز ہی ہو رہا ہو اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے حکام کو اطلاع کر دے گا۔ آپ ایک ہفتہ سے زیادہ کسی دوست کے ہاں قیام نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر آپ ایسا کرنا چاہیں تو اس کے لئے حکومت کو حالات اور تواریخ سے تحریری طور پر مطلع کرنا ضروری ہے حتیٰ کہ ضیافتوں میں بھی قواعد و ضوابط کا خیال رکھا جاتا ہے شاید اسی کا رد عمل ہو کہ زیورک[4] میں جو تکلیف دہ طور پر ایک علمی شہر ہے ہر سال ایک جشن بہاراں منایا جاتا ہے۔ صبح چھ بجے سے گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد دوسری صبح تک ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ جس طرح چاہے رنگ رلیاں منائے اور جو چاہے کرے۔ بانل[5] شہر میں ایک دفعہ اس جشن کے موقعہ پر ایک معزز شہری بالکل عریاں ناچتا پھرا اور پھر بھی اُسے کسی نے گرفتار نہ کیا۔ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس قسم کے قواعد ضروری ہوتے ہیں۔
سوستانی قواعد اگرچہ پریشان کن ہیں لیکن نامعقول نہیں وہ کسی اقتدار اعلیٰ کی طرف سے نافذ نہیں ہوتے بلکہ وہ عقل و فہم کا نتیجہ ہیں اور سوستانیوں نے اپنے اوپر خود عاید کر رکھے ہیں۔

---

[1] پیری کلیز (Pericles) پیدائش ۴۹۵ ق م۔ وفات ۴۲۹ ق م ایتھنز (یونان) کا ایک ممتاز سیاست دان دلیر سپہ سالار اور جادو بیان مقرر جس نے ایتھنز کو ترقی و خوشحالی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اس نے نہ صرف شہر کے ظاہری حسن کو دوبالا کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ اسکو شہریت و تمدن کا مرکز بنا دیا۔ آخر مرض طاعون سے وفات پا گیا (مترجم)

[2] زونگلے (Zwingli) پیدائش ۱۴۸۴ وفات ۱۵۳۱ سوستان میں اصلاح دین کی تحریک کا زبردست مبلغ جس نے بڑے شد و مد سے نئے نظریات کی تبلیغ کی اور بعد میں رومن کلیسا کے معتقدین کے ہاتھوں مارا گیا (مترجم)

[3] جان کیلون (John Calvin) پیدائش ۱۵۰۹ وفات ۱۵۶۴ سولھویں صدی کا ایک ممتاز مصلح جس نے ایک مبلغ کی حیثیت سے پیرس میں شہرت حاصل کی۔ لیکن آخر وہاں سے نکال دیا گیا۔ بعد میں سوستان میں جینوا کے مقام پر آباد ہو گیا۔ جہاں اس نے نئے نظریات کی تبلیغ جاری رکھی۔ اس کے نام پر کیلون دینی جماعت کی بنیاد پڑی جو اپنے خشک زہد کی بنا پر دوسرے پیروؤں سے نمایاں ہے اس کی تصنیفات ۵۲ جلدوں میں ہیں۔ (مترجم)

[4] زیورک (Zurich) سوستان کا سب سے بڑا اور مشہور شہر جو اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت ہے۔ آبادی تقریباً ۳½ لاکھ ہے۔ کاغذ، ریشم، مشینوں اور سوتی پارچہ جات کے لئے مشہور ہے۔ (مترجم)

[5] بانل (Basle) سوستان کا ایک مشہور شہر جو اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت ہے۔ تبلیغی مجلس کا مرکز ہے۔ آبادی تقریباً [illegible] ہے۔ کاغذ، [illegible] شراب اور [illegible] کے لئے مشہور ہے۔ (مترجم)

سوستان میں ایک مسافر کو تعجب ہوگا کہ یہ جو کہتے ہیں ... ملک میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن جوں جوں آپ فرانسیسی بولنے والے علاقے
کی طرف چلتے جائیں۔ یا جنوب میں آفتابی سرزمین کی طرف جہاں ایلپس کے پہاڑ اٹلی میں داخل ہوتے ہیں جائیں خشونت و عبوست کا احساس
کم ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ جب آپ لکارنو[1] یا اسکونا[2] میں داخل ہو جائیں تو سوستان بھی اتنا ہی زندہ دل اور رنگین نظر آتا ہے جتنا کہ خود فرانس۔

عملی اہمیت میں سوستانیوں کا کوئی ثانی نہیں۔ شاید ہی کوئی پیر مغاں ... آباد ہو۔ جہاں سے اگر آپ کو اچانک ضرورت پڑے تو ملک کے
کسی گوشہ میں کسی شخص کو ٹیلیفون نہ کر سکتے ہوں۔ آپ زیورک میں پانچ بج کر پچاس منٹ پر خط ڈاک میں ڈالیں اور آدھ گھنٹے سے پیشتر خط اپنی منزل
مقصود پر پہنچا دیا جائے گا۔ سوستانی اپنے ملک کا تمام کاروبار اس طرح چلاتے ہیں جس طرح کوئی صحیح مشین چلتی ہے۔

رواداری

اس میں شک نہیں کہ یہ صرف عملی فطانت ہی نہیں ہے۔ اس میں وہ جذبہ رواداری بھی شامل ہے جو انسانی مسائل
دیگر مسائل کی بوقلمونی کے جادوانی احساس کا مظہر ہے جس سے سوستان کی زندگی ایک پرسکون ندی کی طرح محو
خرام ہے۔ اس چھوٹے سے ملک[3] میں چار مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور چار مختلف قومیں ایک دوسرے کے دوش بدوش دوستانہ ماحول
میں زندگی بسر کرتی ہیں اگرچہ جرمنی سوستان میں فرانسیسی مدرسے ہیں اور فرانسیسی سوستان میں جرمنی مدرسے اور نہ ہی اطالوی سوستان میں فرانسیسی
یا جرمنی مدرسے ہیں لیکن کوئی اس بات کی پروا نہیں کرتا۔ کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ نسلوں کے متعلق تمام بے ہودہ مفروضات یہاں باطل ہو جاتے ہیں اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگجو قومیت کا ہونا قطعاً غیر ضروری ہے اور لوگ اس سے بھی زیادہ فراخ دل ہو سکتے ہیں۔ جرمنی بول چال کے شہر زیورک
سے چلنے والی گاڑی کا جرمن بولنے والا ڈرائیور جب فرائی برگ[4] میں جو نصف جرمن اور نصف فرانسیسی بول چال کا شہر ہے پہنچتا ہے تو اس سٹیشن
پر اپنی زبان بدل لیتا ہے بس معمولی معمولی باتوں کے سوا اور کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

وفاقیہ سوستان کی تشکیل اس لئے ہوئی کہ ایسا کرنا عملی طور پر ممکن تھا۔ یہی ایک واحد طریقہ تھا جس سے مختلف ریاستیں اپنی آزادی
برقرار رکھ سکتی تھیں۔ اس کا قیام صرف حب الوطنی کے جذبات پر ہی مبنی نہیں بلکہ مذکورہ حقیقت کے عقلی اعتراف کی بنا پر بھی ہے
اسی کی بدولت سوستانی ایک مضبوط متحدہ قوم بن گئے ہیں لیکن جان پہچان کی خاطر سوستانیوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ کسی ریاست
یا علاقے سے اپنی وابستگی کا اظہار اتنا ہی برملا کر سکیں جتنا کہ پورے ملک سے۔

صفائی اور تزئین

اخلاقی اور جسمانی ہمت، عملی ذہانت اور رواداری روحانی دنیا کے وہ بلند مقامات ہیں جو سوستان سے
رخصت ہوتے ہوئے سب سے آخر تک نظر آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس مسرت و انبساط کی تشریح کے لئے جو
وہاں رہنے سے حاصل ہوتی ہے اتنا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سوستانی دنیا بھر کی بہترین صفائی پسند قوموں میں سے ہیں۔ وہ
ہر منزل کا خوش نما مزین استعمال کرنے والے ہیں۔ انہیں کھلی فضاؤں سے محبت ہے۔ برف کے تودوں سے پیار ہے اور جنگلی پھولوں سے

---

[1] لکارنو (Locarno) سوستان کا ایک قصبہ اور تفریح گاہ جو جھیل ماجوری کے سرے پر اطالیہ کی سرحد پر واقع ہے آبادی تقریباً پانچ ہزار۔ (مترجم)

[2] اسکونا (Ascona) سوستان کا ایک قصبہ جو لکارنو کے جنوب میں جھیل ماجوری کے کنارے واقع ہے یہ بھی سیر و سیاحت کا مرکز ہے۔ (مترجم)

[3] سوستان کی چالیس لاکھ آبادی میں سے ۲۹ لاکھ انسان جرمن زبان یا متعلقہ بولیاں بولتے ہیں ۸ لاکھ تیس ہزار فرانسیسی زبان، دو لاکھ چالیس ہزار اطالوی زبان اور ساڑھے ۴ ہزار رومانش زبان بولتے ہیں جو پرانی لاطینی سے نکلی ہوئی ہے۔ (مصنف)

[4] فرائی برگ (Fribourg) سوستان کا ایک قصبہ جو اپنی ہم نام ریاست کا دارالحکومت ہے اس کی آبادی تقریباً چھبیس ہزار ہے معلق پل کی وجہ سے مشہور ہے۔ (مترجم)

امن ہے۔ اُن کے شہر جھیلوں کے کناروں پر یا تیز رفتار دریاؤں کے ساتھ ساتھ نہایت نفاست سے آباد ہیں۔ اُن شہروں میں کثرت سے نزہت گاہیں اور چمنستان ہیں اور وہ اس قدر پاکیزہ اور صاف ستھرے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان شہروں کی آبادی مقصدِ فطرت کے دیہاتی حسن کو گھٹاتا نہیں بلکہ اس میں چار چاند لگاتا ہے۔

کوئی سوستانی اتنا بدتمیز نہیں کہ وہ کسی حسین اور پاکیزہ مقام پر سیر و تفریح کے بعد ردی کاغذات کا ڈھیر اور نارنگیوں کے چھلکے چھوڑ جائے۔ انہیں بچپن سے ہی مدرسے میں یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ "کوہستان الپس کو صاف رکھو اور وہ واقعی صاف رکھتے ہیں"۔ اس جمالی حسنِ ترتیب کے علاوہ وہ اخلاقی لحاظ سے بھی بے حد منضبط ہیں وہ بے دریغ اور پرجوش دیانت کے حامل ہیں۔ اگر آپ کو آسانی سے کوٹ اور ہیٹ لٹکانے کے لئے کوئی اور جگہ نظر نہ آئے تو آپ نہایت اطمینان سے قریب کے لالٹین کے کھمبے کے ساتھ لٹکا کر چلے جائیں۔ کوئی دوسرا شخص اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

عظیم الشان شاہکار

میں نے سوستان کے قدرتی مناظر کے حسنِ کامل کے متعلق تقریباً کچھ نہیں لکھا کیونکہ اسے سب لوگ جانتے ہیں۔ یہ ایک حسین اور کیف آور نغمہ ہے جسے تمام دنیا گا رہی ہے۔ تاہم اس مضمون سے اس کے حیرت انگیز حسن کا احساس کم نہیں ہو جانا چاہئے۔ اس کائناتِ ارضی پر شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جو اپنی بوقلمونی اور رسائی حسن میں سوستان کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ لیکن حسنِ فطرت کی اس دلکشی کے باوجود میرے لئے وہاں کے لوگ نسبتاً زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ بعض سنکی حسن پرست انھیں "یکسانیت زدہ" کہتے ہیں اور اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ سوستانیوں نے آج تک فن و ادب کا کوئی شاہکار پیدا نہیں کیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے وہ عظیم المرتبت چالیس لاکھ انسان پیدا کئے ہیں جو باقی دنیا کے برگزیدہ اور منتخب چالیس لاکھ انسانوں کے برابر ہیں اور انہوں نے فنونِ ادب کے شاہکاروں سے زیادہ عظیم الشان شاہکار وہ معاشرہ پیدا کیا ہے جس میں افلاس، خشر کینہ، نمود اور تعلّی کا نام و نشان بھی نہیں۔

آئندہ شمارے کی ایک جھلک

• **سویم بجلی** ——— • **افسانہ** ———

ہم مطالعہ کرتے ہیں (قسط دوم) ادارہ — ڈسک ذہم — نعیم صدیقی

• **مقالات** ——— • **ایک بحث** ———

ایک دینی ادیب اور فلسفی — جمیل بلیاوی — کیا علقۂ ادب اسلامی میں جمود کا شکار ہے؟ مختلف احباب

• **استفسارات** ———

الاکمال کے مسلمانوں کا سیاسی رول — ادارہ — نقدِ حدیث — مولانا امین احسن اصلاحی

• علاوہ ازیں ★ ہم نوٹ ★ نظمیں ★ تعارف کتب وغیرہ وغیرہ

تعارفِ کتب و جرائد

مکاتیب زنداں ۔ مرتبہ حکیم محمد شریف صاحب ● شائع کردہ: مکتبہ چراغ راہ، کراچی ○ قیمت مجلد دو روپے

یہ مجموعہ ہے سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کے ان حکمت آموز اور ولولہ انگیز خطوط کا جو ان حضرات نے ۱۹۴۸ء کی نظر بندی کے زمانے میں ملتان جیل سے اپنے اعزہ و احباب کو لکھے تھے۔ مرتب چونکہ مولانا مودودی کے قدیم رفقاء میں ہیں اور مستقل معالج بھی اس لئے مولانا کے متعدد خطوط حکیم صاحب ہی کے نام ہیں۔ حکیم صاحب نے اپنے ذوق کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تینوں حضرات کے جیل سے لکھے ہوئے خطوط کو بڑی محنت سے جمع کیا اور بڑے سلیقے سے مرتب کر کے وہ اس گنجینۂ حکمت و ادب کو سامنے لائے ہیں۔ مرتب نے بڑا اہتمام کیا ہے کہ ایک نوٹ میں "نظر بندی" کا پس منظر واضح کر دیا۔ علاوہ بریں "نظر بندی سے رہائی تک" میں میاں طفیل محمد صاحب نے آپ بیتی اس شان سے بیان کی ہے کہ تاریخ کی تاریخ ہے اور فسانے کا فسانہ! ہمیں خوشی ہے کہ یہ مجموعہ ظاہری محاسن طباعت کے لحاظ سے بھی پسندیدہ ہے۔

الاخوان المسلمون اور ان کی دعوت } ○ از شیخ حسن البنا شہید ○ ترجمہ: طٰہٰ الہاشمی، رفیق دار العروبہ للدعوۃ الاسلامیہ ○ ناشر: مکتبہ چراغ راہ کراچی ○ قیمت ایک روپیہ چار آنے

"الاخوان المسلمون" عرب ممالک کی وہ نوجوان اور انقلاب پسند اسلامی تحریک ہے کہ جسے جانے بغیر کوئی شخص بھی مشرق وسطیٰ کی رفتار موجودہ صورتِ حالات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ دنیا کے اس حصے میں آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔ "الاخوان المسلمون" کو جاننا اہل پاکستان کے لئے اس لئے بھی ضروری ہے کہ جس طرح خود پاکستان میں احیائے اسلام کی ایک منظم تحریک برپا ہو چکی ہے، اسی طرح عربی دنیا میں احیائے اسلام کا علم بلند کرنے کی سعادت اخوان کو حاصل ہے۔

پیشِ نظر کتاب تحریک کے داعئ اول حسن البنا شہید کی ایک جامع تقریر پر مشتمل ہے جو ۱۹۳۸ء میں ایک بڑے اجتماع میں کی گئی تھی۔ اس تقریر کو پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا صحیح صحیح اندازہ ہوا کہ اخوان کوئی جذباتی جماعت نہیں ہیں، بلکہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ لے کر اور ایک ٹھوس اور ہمہ گیر دینی فکر لے کر یہ جامع تبدیلی برپا کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔

اس تقریر کو پڑھ کے بے اختیار جی چاہا کہ برعظیم ہند کے "خارجیت گروں" کو خبر دی جائے کہ جماعت اسلامی کو آپ جن بنیادوں پر خارجیت کا الزام دیتے تھے، وہ تو جماعت اسلامی اور اخوان دونوں میں مشترک نکلیں۔ تفصیلات تو اصل تقریر پڑھ کر معلوم کی جا سکتی ہیں، ہم یہاں "خارجیت" کا ایک ہی نمونہ پیش کرتے ہیں۔

"اسلامی قوانین حکومت طاقِ نسیاں میں ہیں اور غیر قوانین کو ان سے کوئی علاقہ ہی نہیں!
ان حالات میں مصلحین اسلام کا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور حکومت و اقتدار
کے لئے کوئی اقدام نہ کرنا صریح اسلامی جرم ہے"!

یہ کتاب اپنی ظاہری محاسن کے ساتھ سامنے آئی ہے۔

اپنی طاقت کی حفاظت کریں

جب آپ کی صحت کمزور ہو اور جسم میں خون کم ہو تو

مشہور عالم،

مفرّح فولادی

استعمال کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ مقبول اور مقوی دوا آپ کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کھوئی ہوئی توانائی واپس لاتی ہے۔

قیمت فی شیشی :- ــــــــــــــ دو روپے آٹھ آنے

ای زمین معدہ من مرنجان - دگر ہر چہ رنجیدہ رنجیدہ باشد

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے

کہیں . . . .

معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کر دیں

ہَضمی

ایک بہترین سفوف معدہ ہے جو فعل ہضم کو قدرتی طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور معدہ کو ہر خرابی سے محفوظ رکھتا ہے۔ حفظ ماتقدم

ملاقات ہے اس لئے ہضمی کا استعمال کیجئے تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے مرد و عورت دونوں کیلئے یکساں مفید ہے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنے

مرکز:- حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ۱

• ـــــــ قرآن بہت آسان ہے

• ـــــــ قرآن بہت مشکل ہے

دونوں ہی باتیں اپنی جگہ درست ہیں

ان میں کوئی تضاد نہیں ہے

اس حقیقت کو مولینا امین احسن اصلاحی نے اپنی گراں بہا تصنیف

"تدبر قرآن"

میں علمی و تحقیقی انداز سے نمایاں کیا ہے

اور یہ بھی بتایا ہے کہ :-

قرآن مجید میں تدبر کرنے کا طریقہ کیا ہے ؟ ــــــ اس کام میں کن آداب و شرائط کا اہتمام ضروری ہے

تفسیر کی کتابوں میں سے کون سی کتابیں کس حد تک مفید ہیں ؟ عربی ادب کی کس درجہ کی استعداد قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے ؟ لغت کی کون سی کتاب مطالعۂ قرآن کے وقت پیش نظر رکھنی چاہیئے

نحو، بلاغت، تاریخ اور حدیث سے قرآن مجید کو کس حد تک تعلق ہے ؟

دوسرا ایڈیشن۔ ترمیم و اضافے کے ساتھ۔ قیمت ۳/۴/۰

FORTNIGHTLY

STUDENTS' VOICE

ORGAN OF

Islami Jamiat-e-Tulaba, Karachi

STANDS FOR

★ Islamic Revolution in all walks of human life

★ Liberation of mankind from all fetters of man's domination over man

★ Advocacy of the legitimate demands and aspirations of the student community.

STUDENTS' VOICE

The only English journal of Pakistan's students

★ Contains valuable articles about Islam, Islamic history, the modern ideologies of the world and current affairs ;

★ Enjoys the literary co-operation of many leaders of thought in Pakistan and other countries of the Muslim world

★ Has its special correspondents abroad in U. K, U. S. A., France, Egypt, Syria and Ceylon

★ Publishes newsletters about activities of students all over Pakistan.

Eight Pages } PRICE ONE ANNA

Annual subscription (f[illegible] issues) Re. 1

SPECIAL INDEPENDENCE NUMBER APPEARING

ON 17TH AUGUST TWELVE PAGES PRICE : TWO ANNAS

Office: 12/18, BUNDER ROAD, KARACHI.

Printed at Nazir Printing Press, McLeod Road, Karachi & Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, Karachi.

Printer & Publisher Ghulam Mohammed M. Chaudhri

چراغِ راہ
اکتوبر ۱۹۵۲

مندرجات

اکتوبر ——— ۱۹۵۲ء

قیمت ۸ر

جلد ۵ ——— شمارہ ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان	بھارت
۸ روپے	معہ

دفتر چراغِ راہ ۹۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

ہم مطالبہ کرتے ہیں

"لوگوں کو حق ہوگا کہ انتظامیہ یا مقننہ اگر اپنے حدود سے تجاوز کرے تو وہ ملک کی عدالتوں سے چارہ جوئی کر سکیں۔" (شق نمبر ۶)

یہ شق منطقی نتیجہ ہے اس تصور کا کہ مالک الملک نہ تو پارلیمنٹ ہوگی اور نہ انتظامی عہدہ دار، بلکہ اصل مالک الملک اللہ تعالیٰ ہے اور معیارِ غلط و صواب اس کا قانون ہے۔ ریاست کے شہری بھی اس کے بندے ہیں اور حکمران بھی اس کے بندے ہیں اور دونوں کے دونوں اس کی شریعت کے سامنے ایک ہی طرح کی مطیعانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مدعا اس شق کا یہ ہے کہ اگر کوئی اسمبلی یا مرکزی پارلیمنٹ دستور کے تقاضوں کے خلاف کوئی قانون بنا دے یا انتظامیہ کوئی خاص پالیسی اختیار کر کے کوئی ناجائز اقدام کر بیٹھے یا کسی کے حقوق میں بے جا دخل اندازی کر دے تو ایک سیدھا سادھا دستوری اور قانونی طریقہ ایسا موجود رہنا چاہیے کہ ایک غلط قانون، ایک غلط فیصلے اور ایک غلط پالیسی کا فوراً سدِ باب کیا جا سکے۔ بالفاظ دیگر جب ریاست کے عوام اور حکمران طاقت کے درمیان کسی خاص معاملے میں ایسا اختلاف واقع ہو جائے جو دستوری نوعیت رکھتا ہو تو بجائے اس کے کہ اس اختلاف کو احتجاجی مظاہرات سے شروع کر کے سول وار تک لے جایا جائے، ملک کا عدلیہ دونوں کے درمیان حکم بنے۔ اور دستور کی ترازو پر تول کر وہ فیصلہ دے دیا کرے کہ کسی مختلف فیہ مسئلے کی نوعیت کیا ہے۔ وہ قابلِ نفاذ ہے یا نہیں:

یہ بڑا ہی اہم مسئلہ ہے کہ جس طرح دو شہریوں کے درمیان جب کوئی قانونی اختلاف ہو جاتا ہے تو سوسائٹی اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے عدالت کا طریقہ اختیار کرتی ہے، کیا اسی طرح اُن دستوری اختلافات کو حل کرنے کا عدالتی دروازہ نہیں کھلا ہونا چاہیے جن میں ایک فریق حکومت (اس کا ادارۂ قانون ساز یا اس کی ہیئت انتظامیہ) اور دوسرا فریق پبلک یا پبلک کا کوئی ایک فرد ہو۔ اس کا جواب اگر نفی میں دیا جائے، تو سیاسی دنیا کی ایک سخت ترین پیچیدگی سامنے آ جاتی ہے۔ یعنی پھر یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف حکومت اپنے آپ کو فوق الفوق اتھارٹی محسوس کرتے ہوئے اور جملہ اجتماعی ذرائعِ قوت پر قابض ہوتے ہوئے اور پوری قوم کی ترجمان ہوتے ہوئے اپنے فیصلے اور اپنے طرزِ عمل پر زور دیتی ہے، اور دوسری طرف رائے عام ہوتی ہے کہ جو اپنے آپ کو حکومت کے نظم و نسق سے بالاتر اصل کار فرما قوت سمجھتی ہے اور بنا بریں وہ دستور کے خلاف اپنے حقوق پر ہاتھ ڈالنے والے کسی امر کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتی۔ اس کا نتیجہ تصادم نکلتا ہے۔ یہ تصادم اگر معمولی احتجاج سے رفع ہو جائے تو خیر، ورنہ نوبت ہمہ گیر مظاہروں تک پہنچتی ہے۔ اور احتجاج اور مظاہروں کو دبانے کے لیے حکومت نظم قوت میں لاٹھیاں، سنگینیں اور مشین گنیں اور [illegible] لا کے میدان میں آ جاتی ہے۔ اس مرحلے پر پہنچ کر بھی

معاملے کا تصفیہ کسی اور شکل میں نہ ہو جائے تو پھر سول وار کے طوفان سے قوم کو نہیں بچایا جا سکتا۔ ان خطرات و مہالک سے بچنے کے لئے بہترین شکل یہ ہے کہ حکومت اور شہریوں کے درمیان واقع ہونے والے دستوری اختلافات کو سلجھانے کے لئے عدلیہ کو منصف ٹھہرایا جائے اور دونوں فریق عدلیہ کے فیصلوں کا احترام کریں۔ پس اس شق کا مفہوم یہ ہے کہ عدالتوں میں پارلیمنٹ کے فیصلوں اور انتظامیہ کے احکام کو چیلنج کیا جا سکے۔ اور ایک اعلیٰ سے ادنیٰ شہری کی طرف سے کیا جا سکے۔ بجز اس کے عوام کی آزادی کا کامل تحفظ ممکن نہیں ہے۔ یہ چیز اگر دستور میں شامل ہو جائے تو مقننہ اور انتظامیہ کو ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا، بصورت دیگر حکومت کے ہر غلط فیصلے کے خلاف ایک عام شہری بھی عدلیہ سے فیصلہ حاصل کر کے اسے کالعدم بنا سکتا ہے۔

عدلیہ انتظامیہ حکومت کی مداخلت سے آزاد ہوگی (شق ۵)

انصاف کے تقاضے پورے کرنے والے ادارہ کے لئے اپنے وظیفہ کو صحیح طور پر انجام دینا بغیر اس کے ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ کسی خاص طاقت کے حق میں بندھے ہوئے نہ ہوں اور جہاں اس کے اختیارِ فیصلہ میں کوئی اور طاقت بھی شریک ہو گئی ہو وہاں عدل کی میزان کے پلڑے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

ہمارے ہاں بھی صورتِ حالات بدقسمتی سے یہی ہے کہ عدلیہ کے ہاتھ انتظامیہ نے باندھ رکھے ہیں اور وہ اس کے وظائف میں مختلف طریقوں سے دخیل ہو سکتی ہے۔

مثلاً ہمارے مرکز اور صوبوں کے ذمہ دار لوگ اگر خیانت کے مرتکب ہو رہے ہوں تو کوئی عدالت براہِ راست ان کا معاملہ ہاتھ میں نہیں لے سکتی، بلکہ معاملہ گورنر جنرل یا صوبائی گورنر کی منظوری سے پیش ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عدالت اس قسم کے مقدمات میں براہِ راست سزا نہیں دے سکتی۔ بلکہ اپنی تحقیقات کو گورنر جنرل یا صوبائی گورنر کے سامنے پیش کرنے پر اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سیفٹی قوانین کے تحت عدالت کو حق نہیں کہ وہ کسی نظر بند کو گرفتار کرنے اور اس [illegible] کرنے والی طاقت سے معلوم کر سکے کہ وجوہِ نظر بندی اور دلائل الزام کیا ہیں۔ اسی طرح سیکورٹی ایکٹ کے تحت جو بورڈ کام کرے گا وہ باختیار خود ملزم کو طلب کر کے اس سے شہادتِ صفائی نہیں لے سکتا۔ پھر اکثر قوانین ایسے ہیں کہ جن کے تحت حکومت کے کارکن جو اقدامات چاہیں کریں، عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا ہی نہیں جا سکتا۔ ان حالات عدالتوں کا بے بس ہو جانا واضح ہے۔

ہماری عدالتوں کو خود ہماری بے بسی کا احساس ہے۔ ہم چند حوالے اس حقیقت کی شہادت کے لئے پیش کرتے ہیں جن کا ذکر اتفاق سے گزشتہ ماہ میں پہلے بھی آ چکا ہے۔

سیفٹی ایکٹ کے دو نظر بندوں کی ہیبیس کارپس کی درخواست پر فیصلہ دیتے ہوئے چیف جسٹس نے یہ ریمارک دیا ہے کہ:۔

"اب یہ بات اچھی طرح کھل چکی ہے کہ عدالت اس قسم کے مقدمات میں کلی طور پر بے بس ہے!"

پھر گجرات کے انتخابی قتل کے عبرتناک واقعہ پر چیف جسٹس نے اپنے قلم سے جو ریمارک لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو ترجمان ماہ [illegible])
اس کا یہ فقرہ ملاحظہ ہو:۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ قانون کے تحت میں اس بے انصافی کا ازالہ نہیں کر سکتا جو اس مقدمہ میں کی گئی ہے"

اس بے بسی کی حالت سے نکلنے کے لئے اسی ریمارک میں چیف جسٹس نے یوں اپیل کیا ہے:۔

"یہ انتہائی اہمیت رکھنے والا سنت ہے کہ انتظامیہ کو انصاف کے وظائف میں دخل انداز
ہونے یا رکاوٹ ڈالنے کا اختیار کسی صورت میں بھی حاصل نہیں ہونا چاہئے۔"

اور سب سے آخر میں ایک مثال لیاقت علی خان کے قتل کی تحقیقات کرنے والے کمیشن کی تحقیقاتی رپورٹ؎ میں بھی قابلِ توجہ ہے۔

"یہ قیاس جو ہماری تحقیقات کے آغاز ہی سے ہمارے کانوں میں پھونکا جا رہا ہے
یہ ہے کہ سید اکبر نے مذہبی جنونیت کی حالت میں وزیرِاعظم کو قتل کیا ہے"

یہ فقرہ غمازی کر رہا ہے موجودہ صورتِ حال کے عدالتی کاروائیوں میں خلل انداز ہونے کی۔ آخر اس کے لئے وجہ جواز کیا ہے کہ ایک تحقیقاتی کارروائی کے لئے ایک کمیشن بیٹھتا ہے اور کوئی ہے جو اس کمیشن کے کانوں میں یہ پھونکتا ہے کہ اس قتل کا اصل محرک مذہبی جذبہ ہے۔ جسے ملک میں ہوا دی جا رہی ہے۔ اس کا مقصد واضح ہے کہ وزیرِاعظم کے قتل جیسے گھناؤنے اور بزدلانہ فعل کی ذمہ داری بالواسطہ طور پر کچھ لوگ ایسی طاقتوں پر ڈال کر پروپیگنڈا کی فضا ان کے خلاف بنانا چاہتے تھے جو سیاسی طور پر ان سے اختلاف رکھتی ہیں اور ان کے اقتدار کو چیلنج کر رہی ہیں۔ لیکن ایک بات کو اس طرح کمیشن کے کانوں میں پھونکنے سے تحقیقاتی رپورٹ کی عبارت پر جو اثر پڑا ہے اس پر ہماری نہیں خود مرحوم وزیرِاعظم کی بیوہ کی رائے ملاحظہ فرمائیے :۔

"جرم کی مجموعی نوعیت بجائے خود وزیرِاعظم کے قتل کی ایک مکمل طور پر منظم سازش کی طرف
اشارہ کر رہی ہے اور کوئی شخص جو عقلِ عام کی ایک رمق بھی رکھتا ہو اس قیاس پر مطمئن نہیں ہو
سکتا کہ سید اکبر نے وزیرِاعظم کو مذہبی مجنونیت کی حالت میں قتل کیا ہے"

کہ وزیرِاعظم کا قتل اور کہاں مذہبیت کے خلاف بعض لوگوں کا رجحان کہ جسے وہ کمیشن کے کانوں میں پھونکتے رہے ہیں اور اس طرح تحقیقاتی رپورٹ میں ایک ایسے نتیجے کے داخل کرنے کا موجب ہوئے ہیں جس کے لئے صحیح مقام پروپیگنڈا کی دنیا ہے۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر عدلیہ کے کام میں انتظامیہ مداخلت کرے اور اس کے کانوں میں کوئی طاقت ور چیز پھونکے کی مجاز بھی ہو تو انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام جو خالص اور بے لاگ عدل کا دین ہے۔ اس نے دنیا کے سارے عقل پرستوں سے پہلے یہ مثال قائم کی کہ عدلیہ کو کسی عام شہری اور خلیفۂ وقت کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا موقف عطا کیا۔ اور کسی بڑی سے بڑی طاقت کو یہ حق نہ دیا کہ وہ عدلیہ کے ہاتھ باندھ سکے یا اس کے کانوں میں کچھ پھونکے۔ اسلام میں قاضی اور جج اپنے عدالتی معاملات میں اپنے آپ کو خدا کے سوا کسی کا جواب دہ نہیں سمجھتا اور کتاب و سنت کے سوا اس کے فیصلوں پر کوئی اور اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں ایک ہی نظامِ عدالت ہوتا ہے اور خصوصی عدالتیں نہیں ہوتیں۔ اسلام میں ایک ہی قانون سب کے لئے ہوتا ہے، عام شہریوں اور سرکاری ملازمین کے لئے الگ الگ قوانین نہیں ہوتے۔ اسلام میں قانونِ الٰہی میں کوئی متعفنہ نقب لگا کر حکمران طبقے کے لئے خصوصی تحفظات حاصل نہیں کر سکتی۔ اسلام میں یہ جائز نہیں ہے کہ مرافعات کی سماعت و عدم سماعت کا فیصلہ عدلیہ کی بجائے انتظامیہ کرے۔ اسلام میں اس کی گنجائش نہیں کہ کسی جج کو انتظامیہ کی طرف سے ہدایات دی جائیں۔ اسلام یہ تسلیم نہیں کرتا کہ عدلیہ کے مطالبے پر انتظامیہ اپنے کاغذات کو اخفا میں رکھ سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظامِ عدالت سے زیادہ آزاد نظامِ عدالت کبھی وجود میں نہیں آیا اور ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان اس کی برکت سے بہرہ اندوز ہو۔

حکومت اس بات کی ضامن ہوگی کہ ملک میں کوئی شخص
بنیادی ضروریاتِ زندگی غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم

؎ تحقیقاتی کمیشنوں کا مسئلہ کوئی باقاعدہ عدالتی کارروائی تو نہیں مگر پھر بھی اس میں کوئی مداخلت قابلِ برداشت معلوم نہیں ہوتی

سے محروم نہ رہے ۔

(شق ۸)

اس شق کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ایک آزاد ریاست کے شہریوں پر ترقی کے دروازے کھولنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ان کو مواقع ترقی کی یکسانی equality of opportunities حاصل رہے ان کی صلاحیتوں میں ان کے حالات میں، ان کی مالی حیثیتوں میں، ان کے دماغی معیاروں میں فرق ہو سکتا ہے اور اس فرق کو مٹانا انسان کے بس میں نہیں ہے لیکن فطری اونچ نیچ کے ان سارے پہلوؤں کے ہوتے ہوئے اگر ان پر کامیابی کے دروازے یکساں کھول دیئے جائیں تو پھر کوئی اونچ نیچ کسی شہری کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی ۔ یہ مواقع کی یکسانی جہاں نہیں ہوتی - - - - - - - وہاں دوسری آزادی کی ساری برکات ایک طبقہ سمیٹ لے جاتا ہے اور بس چند خاندان ہوتے ہیں کہ سارے کے سارے مناصب نمائندگی اور ایکسپورٹ امپورٹ کے سارے لائسنس اور ریاست کی جانب سے ملنے والے سارے فوائد اور اچھی اچھی ساری ہی ملازمتیں ان کا اجارہ بن جاتی ہیں اور ان سے باہر اگر کسی کو کچھ ملتا بھی ہے تو ان کو انہی خاندانوں کی جانب سے یا تو سفارشیں لے کے تحفے تحصیل یا پھر بڑی بڑی رشوتیں دے سکیں جہاں یہ حالت پائی جائے وہاں آزادی کا سورج چمکتا ہے لیکن اس کی ساری شعاعیں چند بڑے گھروں میں لٹ جاتی ہیں اور عوام کے جھونپڑے بدستور تاریک رہتے ہیں وہاں خوشحالی کی نہریں بہتی ضرور ہیں لیکن ان سے سیراب صرف تناور درخت ہوتے ہیں کوئی نوخیز پودا ایک قطرہ پانی نہیں پا سکتا ، وہاں ترقی اپنے خزانے لٹاتی ضرور ہے لیکن یہ خزانے انہیں لوگوں کے حصے میں آتے ہیں جو محتاج نہیں ہوتے ۔ اور جو پہلے سے محتاج ہوتے ہیں وہ جوں کے توں محتاج رہتے ہیں

تمام شہریوں کے لئے مواقع کی یکسانی پیدا کرنے کیلئے دو باتیں ضروری ہیں :

ایک یہ کہ ترقی کا مدار لوگوں کی ذاتی قابلیت وصلاحیت پر ہو نہ کہ سفارشوں اور رشوتوں پر ۔

دوسرے یہ کہ معاشی دوڑ میں گر پڑنے والوں کو بروقت سہارا دینے کا اجتماعی نظم کارفرما رہے ۔ ایک غیر حکومت کو تو واقعی اس کی فکر نہیں ہو سکتی کہ کون معاشی دوڑ میں گر پڑا کس کے چوٹیں آئیں کون ناکارہ ہو گیا کون بالکل کچل گیا لیکن اپنی حکومت اور خصوصاً اسلامی حکومت اس ذمہ داری سے اپنے آپ کو بری نہیں کر سکتی ۔ ایک اسلامی ریاست میں اگر کوئی بچہ یتیم ہو کر والدین کی سرپرستی سے محروم ہو گیا ہو تو کوئی بندوبست ہو نا چاہئے کہ وہ پھر پاؤں پر کھڑا کر دیا جائے اگر کوئی مزدور اپنے اعضا کارخانے کی مشین کا لقمہ بنا چکا ہو تو کوئی بندوبست ہونا چاہیے کہ وہ اطمینان سے جی سکے ۔ اگر کوئی مزارعہ بے دخل کر دیا گیا ہو تو کوئی بندوبست ہونا چاہیے کہ وہ از سرِ نو کام پر لگ سکے ۔ اس طرح کے سوشل انشورنس کا ایک اجتماعی بندوبست اگر اسلامی ریاست کے تحت برسرِ عمل ہو تو پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ مواقعِ ترقی صرف چند خاندانوں کا اجارہ بن کے رہ جائیں پھر تو ایک ادنیٰ شہری کا بچہ بھی اپنی قابلیت کے زور سے ملک کے گورنر جنرل کے بچے کو پیچھے چھوڑ سکتا ہے ۔

مطالبے کی یہ شق محض اس زمانے کے معاشی رجحانات کا ردِ عمل نہیں ہے ۔ بلکہ اسے ہم نے عین تقاضائے اسلام سمجھ کر اختیار کیا ہے اس شق کی بنیاد خود قرآن کے منصوص اشاراتی احکام پر ہے جو اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کے لئے رہنما اصول دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان اور مقبولینِ بارگاہ کے لئے جن نمایاں اوصاف کو گنوایا ہے ۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ :

وفی اموالِھم حقٌ للسائل والمحروم (الذٰریٰت ع) دوسری جگہ ہے : والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (المعارج ۔ ا ع) ان آیات سے ذہن فوراً زکوٰۃ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے لیکن ان کا مدعا زیادہ وسیع ہے چنانچہ علامہ ابن حزم جو کٹر ظاہری ہیں یعنی الفاظِ قرآنی سے ہٹ کر دور از کار تاویلیں کرنے کے سخت خلاف ہیں ان مواقع پر یہ تفسیر کرتے ہیں کہ معاشرہ کے جو سائل و محروم نہیں ہیں ان کے اموال میں اللہ نے سائلین اور محرومین کا اتنا حق رکھا ہے جتنا اگر ان کو پہنچ جائے تو وہ سائل و محروم نہ رہیں یعنی ان کی ضروریات کی کفالت ہو جائے ۔ اور یہ حق اغنیاء سے لے کر سائلین و محرومین کو پہنچانا اسلامی ریاست پر بدرجہ اتم واجب آتا ہے ۔

بجز اس کے ہم آیت لے کو داخل نہیں کر سکتے کہ :

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ ۚ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝

اس آیت میں فے (وہ اموال و املاک جو براہ راست میدان جنگ میں حاصل نہ ہوں بلکہ محض یلغار کے نتیجے میں فی الجملہ اسلامی حکومت کے قبضہ میں آئیں) کی آمدنیوں کو اسلامی بجٹ کے تحت صرف کرنے کے لئے حسب ذیل مصارف طے کئے گئے ہیں کہ:

(۱) اللہ کے لئے یعنی اللہ کے دین کے فروغ کے لئے (۲) رسول اللہ صلعم کے لئے یعنی بحیثیت صدر حکومت آپ کی اور آپ کے اقربا کی کفالت کے لئے (۳) یتیموں مسکینوں مسافروں کے لئے (۴) دین کے لئے خانہ بدر ہونے والوں کے لئے (۵) مقامی مواجیت مندوں کے لئے (۶) بعد کی نسلوں کے مفاد کے لئے۔

یہی وہ آیت تھی جس کو سامنے رکھ کر حضرت عمرؓ اور آپ کے رفقائے شوریٰ نے عراق کی زمینوں کو مسلمانوں کے مجموعی مفاد کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور یہ آیت (نیز آیت زکوٰۃ اور آیت غنائم) گواہ ہے کہ اسلامی بجٹ کی ایک مستقل مد معاشی حدود میں گر پڑنے والوں کو سہارا دینا ہم پہنچانا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات کے سامنے آجانے کے بعد کسی مزید استدلال کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ ان آیات کی کوئی دوسری تاویل کر لی جائے۔ اس لئے ہم ان کے مفہوم کو قطعیت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے نبی صلعم اور خلفائے راشدین کے تعامل سے استدلال کرتے ہیں۔ آں حضور نے ہر محتاج اور ہر سائل کی اعانت کی ہے بشرطیکہ بیت المال میں یا ذاتی ملک میں کچھ موجود ہو، اور پھر حکومت کے صدر کی حیثیت سے جو پالیسی بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے والا اگر جائداد چھوڑے تو وہ اس کے ورثا کا حق ہے لیکن اگر وہ قرض چھوڑے اور یتیم بچے اور بیوہ عورت چھوڑے تو ان کا ضامن میں ہوں۔ اسی پالیسی کو لے کر خلفائے راشدین چلے اور چونکہ حضرت عمرؓ کے عہد میں ریاست کے وسائل ابتدائی مشکلات کے دور سے آگے نکل گئے تھے اس لئے آپ ہی کے عہد میں ملک میں کفالت عامہ [illegible] کا وظیفہ ریاست نہایت کمال کے ساتھ انجام دے سکی۔ اور ہر ہر بچے ہر ہر یتیم اور ہر ہر بیوہ کی کفالت کی ذمہ دار ریاست تھی، یہاں تک کہ اگر کوئی ذمی بھی کمانے کے قابل نہیں رہتا تھا تو وہ بیت المال سے وظیفہ پاتا تھا۔ کسی گھر میں کھانے پینے کی کوئی دقت ہوئی تو امیر المومنین اپنی پیٹھ پر خوراک لادے خود پہنچے اور اگر کسی مسافر کی بیوی کو حالت مدینہ میں زچگی کا مرحلہ پیش آیا تو اپنی اہلیہ کو نرسنگ کے لئے ساتھ لے گئے، اور اگر کبھی قحط پڑا تو اپنے آرام اور اپنی نیند کو حرام کر لیا اور اچھے کھانے سے اپنے معدے کو محروم کر دیا۔ آخر یہ چیزیں کیا محض بطور نفل اور محض رحمدلانہ جذبات کے تحت تھیں؟ ہرگز نہیں ——— اس ذمہ داری کو انجام دیتے ہوئے خلفائے راشدین آخرت کی بازپرس کے خوف سے لرزتے تھے۔ یہ ذمہ داری انکی نگاہ میں خالص شرعی و دینی ذمہ داری تھی۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز اس ذمہ داری کے تقاضے سے راتوں کو چونک چونک

کے بستر پے ٹھٹھر جاتے تھے اور اپنی اہلیہ سے کہتے تھے کہ میں کیسے آرام کر سکتا ہوں جس کے سر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ذمہ داری ہے۔ کہ ان میں سے اگر کوئی ایک رات کے لئے بھی بلاوجہ قید میں رہا یا ان میں سے کوئی بھوکا رہا تو اس کے لئے عند اللہ جواب دہ میں ہونگا۔

خدا کی کتاب اور رسول کی سنت اور خلفائے راشدین کے نظائر کا مطالعہ جو مسلمان بھی کرے گا وہ اس حقیقت کو مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلامی ریاست کے بڑے بڑے بنیادی مقاصد وجود میں سے ایک یہ ہے کہ وہ معاشی دوڑ میں گر پڑنے والوں کو سہارا دیکر اس قابل بنائے کہ وہ کامیابی اور ترقی اور خوش حالی کے مواقع سے استفادہ کر سکیں۔

محض رفاہِ عام کے اداروں سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ضرورت مند افراد کو جہاں شخصی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں اجتماعی ادارے ضرورت پوری نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اسلام کے قائم کردہ نمونے کے دنیا سے مٹ جانے کے بعد عصر حاضر کی اکثر حکومتوں کو سوشل انشورنس کی اسکیمیں اختیار کرنی پڑیں۔ سوویٹ روس اور برطانیہ دونوں نے اپنے اپنے طرز پر افراد کو سہارا دینے کا اجتماعی نظم ہمارے سامنے قائم کر رکھا ہے اور امریکہ اور دوسرے ممالک میں بھی یہ کوششیں ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہیں۔ اس طرح کا انتظام ہمارے ہاں کی معاشی پیچیدگیوں کا بہترین حل بھی ہے۔

اگر بے باپ کے بچے کا والی بیت المال ہو، اگر بے روزگار کا کفیل بیت المال ہو، اگر مسافر کا میزبان بیت المال ہو، اگر مریض کا چارہ گر بیت المال ہو، اگر غریب ان پڑھ بچوں کا معلم بیت المال ہو، اگر مفلوک الحال مجردین کے لئے نکاح کے مصارف کا انتظام کرنے والا بیت المال ہو، اگر بھوکے کا پیٹ بھرنے والا ننگے کو کپڑا فراہم کرنے والا اور بے ٹھکانا شہریوں کو ٹھکانا فراہم کرنے والا بیت المال ہو تو معاشی بدحالی کی پیدا کردہ بے چینیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور کمیونزم کو شکست دینے کی اس سے بہتر کوئی اسکیم نہیں ہو سکتی۔ جس دن یہ اہتمام ہو جائے گا اس دن پہلی مرتبہ ہمارے ملک کا عام آدمی یہ محسوس کرے گا کہ اس کے لئے بھی آزادی آئی ہے اور اس کے لئے بھی انقلاب ایک نئی زندگی لایا ہے۔

یہ شق ایسی ہے کہ خاص طور پر بعض لوگوں نے اعتراضات کا نشانہ بنانے کے لئے اسکو منتخب کیا ہے اور اعتراضات اس انداز سے اٹھاتے ہیں کہ جن سے مخاطب یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ شق حالات اور زمانے سے ناواقف لوگوں نے مرتب کر دی ہے۔ مگر اس کے مالہٗ و ماعلیہ کو سمجھا ہے اور نہ سمجھنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ان معترضین کی رائے میں اسٹیٹ کا کفالتِ عامہ کی ذمہ داری لینا بغیر قومی ملکیت کے اصول کے ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر ان کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ موجودہ دور کے بجٹ سسٹم میں اس طرح کی کسی اسکیم کو اختیار کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ پھر ان کا سوال یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ اور عشر کی آمدنی اس مقصد کے لئے کفایت کیونکر کر سکے گی؟

ہم گزارش کرتے ہیں کہ یہ شق سوچے سمجھے بغیر نہیں لی گئی۔ بلکہ سب کچھ دیکھ بھال کر اسے مطالبے کا جزو بنایا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس شق کے تقاضے پورے کرنے کے لئے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ عوام سے ضروریاتِ زندگی کی قیمت میں ان کی سیاسی آزادی طلب کر کے ان کو قومی ملکیت کے باڑے میں ہنکا دیا جائے۔ کیونکہ ریاست یہ ذمہ داری نہیں لے رہی کہ وہ ہر ایک کو اپنی طرف سے روزگار دے اور اپنی طرف سے تنخواہیں دیا کرے گی اور ہر ایک کے لئے ایک سے رہن سہن کا انتظام کر دے گی۔ وہ تو صرف اہل حاجت کی اعانت کا ایک سسٹم قائم کرنا چاہتی ہے کہ اس سسٹم کے ذریعے گر پڑنے والوں کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے۔ خود قومی ملکیت کی جنت ابھی ابھی اس کام کے لئے ملک کی مجموعی پیداوار دولت کا زیادہ سے زیادہ ۲ ۱/۲ فیصدی صرف کیا جا رہا ہے اور برطانیہ میں یہ تجربہ بغیر قومی ملکیت کی جانب پر مسلط کئے تجربہ کیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ حکومت اس مقصد کے لئے اور آمدنیاں بھی حاصل کر سکتی ہے۔ موجودہ زمانے کے بجٹ سسٹم کو بھی ہم نے سامنے رکھا ہے اور ہماری رائے یہ ہے کہ عشر اور خراج کی آمدنی موجودہ مالیہ سے زیادہ ہی ہوگی۔ چنانچہ پیش نظر یہ ہے کہ موجودہ مالیہ کی آمدنی کے برابر رقم تو حکومت فی سبیل اللہ کی مد کے تحت فوجی اور سول ضروریات کے لئے بدستور خرچ کرتی بھی رہے تو بھی اعانتِ عام کے لئے بڑا فنڈ بن سکتا ہے۔ اسی طرح عام کاروباری ٹیکسوں سے زکوٰۃ کی آمدنی زیادہ ہی رہے گی۔ بہر حال بجٹ سسٹم میں تغیرات ناگزیر ہیں

اور آمد و صرف دونوں کا نقشہ بدل جائے گا۔

ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی ہے کہ ہمارے ملک کی دولت کی مجموعی رفتار پیدائش اور اس کے مطابق فی کس آمدنی کا اوسط معیار مدد جبکہ ہے اتنا کم کہ اگر موجودہ دولت کو مساویانہ طور پر بھی پورے شہریوں میں بانٹ دینے کا سسٹم اختیار کر لیا جائے تو بھی بنیادی ضروریات زندگی کو معیاری طور پر پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہذا اس شق کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک طرف ملک کے ذرائع وسائل کو پوری طرح استعمال کر کے قومی دولت میں اور اس کی رفتار افزائش میں اضافہ کیا جائے اور ملک کے مجموعی معیار زندگی کو رفتار افزائش دولت کے پیچھے پیچھے لے چلا جائے اور دوسری طرف ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری قومی دولت جتنی کچھ بھی ہے۔ اس میں حاجت مند عوام کا حصہ لگا کر تقسیم دولت کے نظام کو درست کر دیا جائے۔ تاکہ ساتھ ساتھ جتنی ترقی ہو اس سے صرف خوش حال لوگ ہی متمتع نہ ہوتے رہیں بلکہ عوام بھی اس میں سے حصہ پائیں ہم اپنی قومی دولت کی موجودہ رفتار پیدائش کے پیش نظر یہ ہرگز تصور نہیں کر سکتے کہ ہم اپنے عوام کی بنیادی ضروریات زندگی امریکہ و برطانیہ کے معیار زندگی کے مطابق پوری کر کے دے سکیں گے بلکہ ہمارے پیش نظر صرف یہ ہے کہ نظم و نسق کسی نہ کسی طرح حکومت مائی باپ بن کر شہریوں کے پورے کنبے کو سنبھال لے چلے جوں جوں مجموعی معیار ترقی کرے گا۔ اہل حاجت کی دست گیری کا نظام بھی اپنا معیار بلند کرتا جائے گا۔

ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی ہے کہ کفالت عامہ کا یہ نظام جس کا تقاضا شق ۔۔۔ کرتی ہے ابتداء ہی سے اپنے پورے جوبن پر نہیں آسکتا بلکہ اسے بروئے عمل لانے کے لئے ایک نئی مشینری کے قیام ایک نئے بجٹ سسٹم کی ترویج اور خصوصیت سے ایک نئی ذہنیت کے فروغ پر کچھ نہ کچھ وقت لگے گا۔ چنانچہ ہمارا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ دستور کے نفاذ کے پہلے ہی روز اس شق کے تقاضے صد فی صد پورے ہونے لگ جائیں۔ بخلاف اس کے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ریاست اس کو اپنا فرض ماننے اور اسے اپنا رہنما اصول قرار دے کر ملک کے ذرائع و وسائل کو اور اس کی فضا کو عوام کی اس عظیم الشان خدمت کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے میں فوراً لگ جائے۔ یہاں تک کہ قدم بقدم چل کر دو چار پانچ سات سال میں سوشل انشورنس کا یہ سسٹم پوری طرح بروئے عمل ہو جائے۔

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیتوں کی فہرست میں شامل کر کے ان کے لئے بھی جداگانہ انتخاب کے ساتھ آبادی کے لحاظ سے نشستیں مقرر کر دی جائیں (شق ۹)

یہ شق مطالبے میں حال ہی میں شامل کی گئی ہے۔ اب تک ہم قادیانیوں کے معاملے کو حل کرنے کا یہ طریقہ موزوں سمجھتے تھے کہ پہلا ایک اسلامی دستور وجود پذیر ہو جائے اور موجودہ سیکولر دستور میدان سے ہٹ جائے اس تبدیلی کے نتیجے میں قادیانیت کی آکاس بیل کو اکثریت کے درخت پر پھیلنے کا جو موقع غیروں کے سہارے حاصل تھا خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لیکن حالات کی ایک کروٹ نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم اس مسئلے کو اسلامی مطالبے کا جزو بنا کر قوم کی مشترک جدوجہد سے جلد از جلد ایک نتیجے پر پہنچا دیں۔ وہ کروٹ یہ تھی کہ قادیانیت کے خلاف جو تحریک چل رہی تھی وہ ملتان فائرنگ کے بعد ایسے ناخوشگوار حالات سے دوچار ہوئی کہ مسلمانوں میں بے دلی اور مایوسی کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی کیونکہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے آگے ان کو لے چلنے والی طاقت کوئی نہ تھی۔ جن لوگوں سے وہ کوئی امید لگا سکتے تھے وہ دولتانہ صاحب کی اس تقریر پر داد دے رہے تھے جس کا مرزا بشیر الدین محمود نے دل سے خیر مقدم کیا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے عوام کو وہ عناصر خراب کر رہے ہیں جو اشتعال دلا کر تحریکیں چلانے کے عادی ہیں مگر اشتعال کے بعد حالات پر قابو پانا جن کے بس میں کم سے کم اب بالکل نہیں رہا۔ اس موقع پر اگر مسلمانوں کو بددلی کا شکار ہو جانے دیا جاتا تو نہ صرف قادیانی فتنہ ہمیشہ کے لئے تسلط پاتا بلکہ ہمارے عوام میں کسی مقصد کے لئے کام کرنے کی تڑپ ہی کئی سال کے لئے ختم ہو جاتی۔ چنانچہ ایک جائز اور معقول اور برحق مطالبہ جس پر پوری قوم جمع ہو چکی ہے۔ ہمیں اس کا مستحق نظر آیا کہ اسے قوم کے اسلامی دستوری مطالبے کا جزو بنا دیا جائے۔ اور ایک ہی مطالبے

تمام عناصر کو مجتمع کر دیا جائے۔ جو ہمارے تمام مسائل کو حل کرنے والا ہے۔

اب یہ تو بالکل الگ بات ہے کہ کسی کو ہمارا طریق تحریک پسند آئے یا نہ آئے، لیکن ہم قوم کو یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ اور چاہے کوئی آپ کا ساتھ دے یا نہ دے ہم نے اگر ایک مرتبہ آپ کے ایک مطالبے کو سامنے رکھ لیا ہے تو اب انشاء اللہ آخر دم تک اس مطالبے کو لے کر چلیں گے۔ اگر ہمیں آپ کبھی ساتھ چھوڑتا ہوا پائیں تو آپ ہر وقت ہمارا گریبان نوچ کر ہم سے بازپرس کر سکتے ہیں۔

ہمارے بعض خیر خواہ اس طرح کی باتیں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عوام میں سستے طریق سے مقبول بننے کے لئے قادیانی مسئلہ کو ہم نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ مگر وہ ذرا سا تامل کریں گے تو حالات ان کے شبہ کی خود ہی تردید کر دیں گے۔ اگر ہم اس طرح کے موقع پرست لوگ ہوتے تو اس مسئلہ کو اپنانے کے لئے بہترین وقت وہ تھا جب وہ مین اپنے عروج پر تھا اور ٹھیک اسی موقع پر دوسرے تمام موقع پرست لوگ آگے بڑھے ہیں۔ لیکن بخلاف اس کے ہم نے اس مسئلہ کو مطالبے کا جزو اس وقت بنایا ہے جب اس مسئلے پر اٹھی ہوئی تحریک کا شیرازہ بکھرنے لگ گیا تھا۔

یہاں دو حرف قادیانیوں سے بھی کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آپ حضرات کو یہ سوچنا چاہئے کہ جتنی صفات کسی اقلیت میں ہو سکتی ہیں وہ سب آپ میں سالہا سال سے مسلمان اکثریت کے خلاف کارفرما رہی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ علیحدگی پسندانہ ذہنیت سے پیدا ہونے والے تعصب کے تحت آپ حضرات نے معاشی میدان میں جو روش اختیار کر رکھی ہے اس نے معاملہ کو ایک حد تک قبل تقسیم کے ہندو مسلم مسئلے کی شکل دے دی ہے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ مسلم اکثریت پر جس طرح آپ انگریز کی پشت پناہی سے مسلط رہے ہیں آئندہ بھی مسلط رہ سکیں۔ آپ کو علیحدہ ہونا پڑے گا اور اس حادثے سے آپ کو وہ سہارے نہیں بچا سکتے جن پر آپ کو بڑا بھروسہ ہے۔ پھر آخر ہنستے مسکراتے الگ ہونے سے کیا یا بدستِ دگرے دست بدست دگرے کے طریق پر الگ ہونا آپ کو زیادہ پسند ہے؟ آپ کی روش ایک طرف اکثریت میں اشتعال بڑھا رہی ہے اور دوسری طرف آپ اکابر ملت کے دامن میں پناہ لے کر ان کو ایک غلط مروت پر مجبور کر رہے ہیں اور رائے عام کو ان کے خلاف مشتعل کرنے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ آپ کی اس روش کے نتیجے میں کوئی اچھا مستقبل رونما نہیں ہوگا۔ اور اس کی ذمہ داری بہرحال آپ پر ہوگی۔ آپ اگر صلح صفائی سے اپنی حقیقی پوزیشن کو اس ملک میں دستوری حیثیت سے آج ہی قبول کر لیں۔ تو اس میں خود آپ کا بھی بھلا ہے اور قوم و ملک کا بھی! یہ ہم آپ کو صراحتاً بتلائے دیتے ہیں کہ مسلم اکثریت آپ کو اپنے اندر نہیں رکھ سکتی، نہیں رکھ سکتی اور کبھی نہیں رکھ سکتی!

یہ ہے اس مطالبے کی تشریح جو ہمارے سارے مسائل کا ایک جامع حل ہے۔ اس کے ذریعہ ہمارا حال بھی سنورتا ہے اور مستقبل بھی۔ ہماری دنیا بھی بنتی ہے، ہماری آخرت بھی، ہماری اپنی زندگی بھی سنورتی ہے اور ہماری آئندہ نسلوں کی بھی۔

ہم نے اس مطالبے میں اپنی قوم کے پرانے طریق کار کو بدل دیا ہے کہ جب کبھی کوئی کانٹا چبھے تو ساری لڑائی اس کانٹے کے خلاف لڑ ڈالی جائے، پھر دوسرا کانٹا چبھے تو اس کے خلاف معرکہ آرا ہوا جائے، اور اسی طرح قدم قدم پر ایک ایک کانٹے سے الجھتے ہوئے عمریں گزار دی جائیں۔ اس طریقے کے بجائے ہم نے یہ سوچا ہے کہ جس شجرۂ خبیثہ سے سارے کانٹے جھڑتے ہیں۔ اس جھاڑی کو اکھیڑ کر اس کی جگہ ایک ایسا شجرِ طیبہ نصب کیا جائے جس سے سایہ ملے جس سے پھول جھڑیں اور جس سے پھل حاصل ہوں۔ ہم نے روزمرہ کے مسائل کے خلاف تحریکیں چلانے کے بجائے ملک کے دستور اور ملک کے مجموعی نظامِ زندگی کی اصلاح کے لئے ایک جامع تحریک برپا کر دی ہے ہم پوری زندگی کو اور اس کے مسائل کو بحال کرنے کی اسکیم لے کر اٹھے ہیں۔

یہ مطالبہ اگرچہ ابتدائی طور پر ہماری طرف سے پیش کیا گیا ہے مگر یہ نہ کسی خاص شخص کا مطالبہ ہے - - - - - - - - -
نہ کسی خاص پارٹی اور گروہ کا اور نہ کسی خاص طبقے اور عنصر کا۔ بلکہ یہ پوری ملتِ پاکستان کا مطالبہ ہے اس مطالبے پر ملک کے کونے کونے میں دستخط ہو رہے ہیں۔ ریزولیوشن پاس ہوئے ہیں۔ تقاریر اور جلسے ہو رہے ہیں اور فضا ثابت کر رہی ہے کہ یہ فی الواقعہ قوم کے دل کی آواز ہے !

ہمیں اس امر پر افسوس ہے کہ ہمارے حکمران انگریز آقاؤں کی طرح آج بھی قوم کے دل کی آواز اس کے دل کی دھڑکنوں سے سننے کے بجائے اور اس کے رجحانات کی نبضوں پر ہاتھ دھر کر براہِ راست ہوا کا چڑھاؤ معلوم کرنے کے بجائے سی۔آئی۔ڈی کی رپورٹوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں، اور آج بھی ان کی روش یہ ہے کہ یہ کسی مطالبے کو اس وقت تک اہمیت دینے پر تیار نہیں ہیں جب تک اس کے حق میں ایک ایسا طوفان نہ اٹھ جائے جس کی روک تھام میں یہ حضرات بالکل بے بس ہو جائیں۔

ملتان فائرنگ گواہی دیتی ہے کہ رائے عامہ کے تقاضوں کو یہ حضرات آج بھی ایک غیر حکومت کی طرح دفعہ ۱۴۴ اور اشک آور گیس اور لاٹھیوں اور گولیوں کے زور سے دبانے کی ٹیکنیک چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم کی اس تقریر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو یومِ آزادی کے موقع پر نشر ہوئی ہے اس تقریر پر قوم نہ جانے کیا کیا امیدیں لگائے بیٹھی تھی لیکن قوم کو بتایا گیا کہ یہ جو تم اسلامی دستور کے مطالبے کے حق میں جلسے اور ریزولیوشن اور محضر نامے پیش کر رہے ہو اسے حاکم بالا کوئی وقعت دینے پر تیار نہیں ہے

یہ بے نیازانہ اور قاسن کر قوم یہ جاننے کے لئے قدرتی طور پر مضطرب ہو گئی کہ آخر اور کس زبان میں آپ بات سننے کو تیار ہیں؟ جو طریقہ آپ کو پسند ہو وہ اختیار کیا جائے۔

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جو کچھ تمہیں کہنا ہو اسمبلیوں کے ذریعہ کہو ! مگر لوگ کن اسمبلیوں کے ذریعے اپنی آواز آپ کو سنا سکتے ہیں؟ کیا ان اسمبلیوں کے ذریعہ جن کے ارکان دھن، دھونس، دھاندلی اور دھوکے کی سیڑھیاں لگا لگا کر ایوانوں میں پہنچے ہیں؟ کیا واقعی ان اسمبلیوں کے ذریعہ بھی عوام کے دل کی آواز بلند ہو سکتی ہے؟ اگر یہ اسمبلیاں جعلی نہیں ہیں تو ذرا یہ بتایا جائے کہ جس مطالبے کی آواز آج قریہ قریہ گونج رہی ہے اس سے اسمبلیوں کی فضائیں کیوں خالی ہیں؟ - یہ چیز ایک روشن ثبوت ہے اس بات کا کہ جو لوگ آج بظاہر احوال عوام کی نمائندگی کے مناصب پر سرفراز ہیں وہ ان کے حقیقی نمائندے نہیں ہیں۔ لیکن آپ یہ بات نہ مانئے اور ہم بھی تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ اسمبلیاں بالکل نمائندہ اسمبلیاں ہیں۔ پھر بھی اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رائے عامہ اسمبلیوں سے برتر ایک چیز ہے اور اسے حق پہنچتا ہے اور وہ اپنا مطالبہ بجائے نمائندوں کی زبان سے سامنے لانے کے خود اپنی زبان سے سامنے لائے اور ملک کی قیادت کا فرض ہے کہ وہ رائے عامہ کی آواز کو سنے۔

اگر قیادت عوام کی آواز کے لئے اپنے کان بہرے کر کے بیٹھ رہنا چاہتی ہے اور من گھڑت عذرات کے ذریعے اپنے آپ کو یہ فریب دینا چاہتی ہے کہ اسلامی مطالبہ عوامی مطالبہ نہیں ہے تو ہم اس بارے میں اسے بروقت متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی طاقت رائے عامہ کو ٹھکرا کر کامیاب نہیں ہو سکی ہے اور آپ بھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ یہ مطالبہ کوئی وقتی ہنگامہ نہیں ہے، یہ قوم کی صد ہا سالہ تمناؤں کا ظہور ہے اور اس کی جڑیں ہماری ساری تاریخ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے خلاف لڑنا قوم کی فطرت سے، اس کی تاریخ سے، اس کی روایات سے، اس کے سارے لٹریچر سے بلکہ عین اسلام کے تقاضوں سے لڑنا ہوگا! سوچ لیجئے کہ اتنی بڑی لڑائی لڑنے کا آپ بل بوتا ہے بھی!

اب ہم اپنا روئے سخن عوام کی طرف پھیرتے ہیں ۔

بزرگو اور عزیزو! بوڑھو اور جوانو! مردو اور عورتو: ——— یہ مطالبہ کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ پورے کے پورے نظام کو بدلنے کے لئے ایک اقدام ہے ۔ اس قسم کے مطالبے اگر کامیاب رہتے ہیں تو ملکوں اور قوموں کی کایا پلٹ جاتی ہے ۔ تاریخ بہت بڑا موڑ مڑتی ہے ۔ زندگی کا ہر شعبہ نئی اٹھان اٹھنے لگتا ہے اور کتنے ہی اونچے ہوتے ہیں جو نیچے ہو جاتے ہیں اور کتنے ہی نیچے ہوتے ہیں کہ ہوا پر چلے جاتے ہیں، ایسے مطالبے صفِ اول کے لوگوں کو بسا اوقات اٹھا کے پیچھے پھینک دیتے ہیں اور صفِ آخر کے لوگوں کو صفِ اول میں لے جا کے کھڑا کر دیتے ہیں ۔ اتنے وسیع الاثر مطالبے منوا لینا کوئی کھیل نہیں ہوتا ۔ بلکہ ایسے مطالبوں کے لئے جانے کیا کیا بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں اور کیا کیا معرکے لڑنے پڑتے ہیں ۔ ایسے مطالبوں کی پشت پر اپنے اوقات، اموال اور آراموں کی قربانیوں کو جمع کر دینا پڑتا ہے ۔ ایسے مطالبوں کے لئے بڑی بڑی چوٹیں کھانی پڑتی ہیں ۔ بڑے بڑے جان جوکھم مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ بڑے بڑے ارمانوں کا خون کرنا پڑتا ہے - - - - - - - - - - - - - - - - اس حقیقت کے شعور کے ساتھ آپ اُٹھ کھڑے ہوں اور مطالبے کو سینے سے لگا کر آگے بڑھیں، خلوص اور جانفشانی سے کام کرنے والوں کے لئے دنیا آج تک کوئی رکاوٹ فراہم نہیں کر سکی ۔

آگے کے مراحل پر سوچنا ابھی چھوڑ دیجئے اور صرف موجودہ مرحلے کی ذمہ داریوں کو سامنے رکھ کر کام کیجئے ۔ مطالبے کا پہلا مرحلہ یہ ہے ۔ کہ پوری قوم کو اس کے حق میں یک آہنگ کر کے دکھا دیجئے اور ایک ایک بستی، ایک ایک مسجد، ایک ایک محلے، ایک ایک ادارے، ایک ایک جماعت اور فرقے سے اس آواز کو بلند کرا دیجئے ۔ کوئی مسلمان بلکہ کوئی غیر مسلم بھی ایسا نہ رہے کہ جس کے دستخط اس مطالبے کے حق میں موجود نہ ہوں ۔ اس مرحلے کو کامیابی سے طے کر لینے کا فائدہ یہ ہوگا کہ قبل از وقت ہم اپنے اکابر پر جمہوری لحاظ سے اتمامِ حجت کر دیں گے ۔ اور ان کے لئے اس عذر کا موقعہ نہ چھوڑیں گے کہ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری قوم کی تمنائیں کیا تھیں اور اس کے جذبات کے تقاضے کیا تھے ۔ بجائے اس کے کہ ایک غلط چیز آنے کے بعد اس کے خلاف کوئی اقدام بالکل بروقت ہی کیا جائے، زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ قبل از وقت بتا دیا جائے کہ ہم چاہتے کیا ہیں ۔ پھر اگر قومی مطالبے سے کوئی انحراف کرتا ہے تو سیاسی، اخلاقی، دنیوی اور دینی حدود پر بعد کے نتائج کا وہ خود ذمہ دار ہے ۔ باقی رہی یہ بات کہ اگر اس مرحلے کے کام کو بخیر و خوبی انجام دینے سے ہمارے دستور سازوں کی آنکھیں نہ کھلیں، تو کیا ہوگا ۔ تو اس کا دو حرفی جواب یہ ہے ۔ کہ جو کچھ ایک غلط دستور کو یا لیڈر ایک قوم کے اوپر مسلط کرنے کی کوششوں کی مخالفت میں اسلام اور جمہوریت اور عقل کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے، وہی آپ کو کرنا ہوگا قبل از وقت کسی حالت کو فرض کر کے سوچنا صحیح طریقِ کار نہیں ہے اور پھر ہماری توقع ہے بھی یہی کہ ہمارے اکابر اتنے سرپھرے نہیں ہو سکتے کہ جب قوم یک آہنگی سے ایک مطالبہ ان کے سامنے رکھ دے تو وہ پھر اس کو پامال کرنے کی ٹھان لیں ۔

خیالاتِ پریشاں

مرعاد نظیر

اب کس لئے مغموم ہے انسان؟ نہیں معلوم
تاریک ہے کیوں صبحِ درخشاں؟ نہیں معلوم
کیا بات ہے؟ احساس پہ کیوں پڑ گئے پردے؟
کیوں دشمنِ انساں ہے یہ انساں؟ نہیں معلوم
اے گردشِ تقدیر! خدا را یہ بتا دے!
سایہ بھی ہے کیوں جسم سے گریزاں؟ نہیں معلوم
ایمان کی ضو پڑ گئی کس واسطے مدھم؟
کیوں ختم زمانہ سے ہے ایقاں؟ نہیں معلوم
اب کس لئے مسموم ہیں گلشن کی فضائیں؟
ہر باغ ہے کیوں گورِ غریباں؟ نہیں معلوم
روحانیت اس باغ سے کب ہو گئی رخصت!
یہ ملا ہمیں صاحبِ عرفاں! نہیں معلوم
ایسے بھی ہیں جذبے جو ابھرنے نہیں پاتے
ہیں کتنے خیالات پریشاں؟ نہیں معلوم
دل جن کے ہیں زخمی انہیں کیا غنچۂ گل سے؟
کیوں آج ہے یہ جشنِ بہاراں؟ نہیں معلوم

خدا کی پناہ

خوشتر فیض آبادی

نیتِ دشمناں خدا کی پناہ
اپنی خوابِ گراں! خدا کی پناہ
آج انسانیت کے سینے سے
اٹھ رہا ہے دھواں! خدا کی پناہ
کفر و الحاد کی گھٹائیں ــــ اور
غفلتِ مومناں! خدا کی پناہ
ہیں گرفتارِ مصلحت بینی
اپنی آزادیاں! خدا کی پناہ
جنگ باز اور سازشی ٹھہرے
امن کے پاسباں! خدا کی پناہ
کس طرف جا رہا ہے اے خوشتر!
وقت کا کارواں! خدا کی پناہ!

نیّا ڈانواں ڈول

ضیاء محمد ضیاؔ

بھولی بھٹکی دنیا کو پھر سیدھی راہ پہ لانا ہوگا
انسانوں کے سینوں میں پھر حق کی جوت جگانا ہوگا

جتنے دیکھے لوبھ کے بندے تن کے ستھرے من کے گندے
من اُجلا ہوتا ہے کیسے؟ اب یہ راز بتانا ہوگا

چار گھڑی کا ہے یہ بسیرا اونچ تو کب تک بیٹھ رہے گا
مورکھ بھونرے آخر اک دن پھولوں سے اُڑ جانا ہوگا

خون کسی کا چوس کے جس نے دُنیا میں دھن مال بنایا
اُس ظالم کو اپنی گردن پر یہ بوجھ اُٹھانا ہوگا

پریتم! تیرے پریم پجاری کب سے درشن کو بیٹھے ہیں
من مندر میں آکر اک دن اپنی دید کرانا ہوگا

پاپ کا ساغر ٹھاٹھیں مارے رات اندھیری دور کنارے
نیّا ڈانواں ڈول ہے میری اس کو پار لگانا ہوگا

اراکان کی سیاسی صورتِ حالات
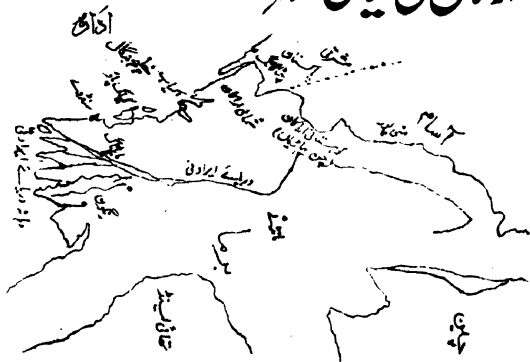
مشرقی پاکستان اپنے محل وقوع کے لحاظ سے بعض خاص سیاسی پیچیدگیاں رکھتا ہے اس کے مغرب اور شمال میں انڈیا اور جنوب… ں ہندو ریاستیں ہیں اور مشرق میں برما کی حکومت ہے انڈیا کی طرف سے مغربی بنگال کا جو علاقہ مشرقی پاکستان سے ملحق ہے وہ متشدد… انقلاب اور شر انگیز سازشوں کے لئے تربیت یافتہ مزاج بھی رکھتا ہے اور اس علاقے میں تقسیم بنگال کے خلاف ایک رجحان بھی ظاہری… ں سطح کے نیچے سانس لے رہا ہے۔ علاوہ بریں مشرقی و مغربی بنگالوں کے درمیان بے محابا آمد و رفت کا سلسلہ بڑی اچھی آڑ ہے مفسد… کے لئے کہ وہ ادھر سے ادھر آ کر فتنے کے جال پھیلاتے رہیں۔ مشرقی جانب برما کی حکومت ہے جو اگرچہ پاکستان سے بھی ڈپلومیٹک تعلقات رکھتی ہے لیکن اگر اس کے سامنے انڈیا اور پاکستان میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا سوال کبھی دو ٹوک فیصلہ طلب کرنے کے لئے آ کھڑا ہو تو وہ انڈیا کو پسند کرے گی۔ اس کی بڑی وجہ مذہب اور کلچر کی یگانگت اور تعصب زدہ عناصر کا جذبہ مسلم دشمنی ہے جو مسلمانوں کی ایک آزاد ریاست کے وجود میں آ جانے پر اور گہرا ہو گیا ہے اس سے زیادہ بڑی تشویش ناک صورت حالات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے دونوں پہلوؤں کے مذکورہ بالا علاقے کمیونسٹوں کی خاص جولانگاہ ہیں اور ان کا عمل یہ ہے کہ ان کے لئے ایک ایسا آزاد خطۂ ارضی کسی حد… قابل برداشت نہیں ہے جو اسلامی اصولوں پر نظامِ زندگی کو استوار کر کے کمیونزم کے لئے یلغار کے راستے مسدود کر دے۔ جنا…

طرف سے کمیونسٹ ایک ہی ہدف مقصود سامنے رکھ کر کام کر رہے ہیں ۔ اگر خدا نخواستہ ان کے عزائم کبھی کسی موقع پر ایک طرف سے بروئے عمل آ جائیں تو عین وہی موقعہ ہوگا کہ دوسری طرف سے بھی فتنہ کا سیلاب سرحدوں میں آ گھسے ۔ ایسے نازک مرحلے میں مشرقی پاکستان کو بیک وقت دو محاذوں پر کشمکش کرنی ہوگی ۔

یوں بھی کمیونسٹ انقلاب کے لئے پاکستان کی فضا اتنی جلدی سازگار نہیں کی جا سکتی (بلکہ اگر اسلامی دستور نفاذ پذیر ہو جائے اور نظام اجتماعی اسلامی اصولوں پر ڈھل جائے تو شاید فضا کبھی سازگار ہو ہی نہ سکے) جتنی جلد انڈیا اور برما میں ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ بحالات موجودہ کمیونسٹوں کے منصوبہ میں تدریج کا رُخ یہ ہے کہ پہلے انڈیا اور برما پھر پاکستان ! انڈیا اور برما میں اگر آگ پوری طرح بھڑک اٹھے تو پھر بیچ میں مشرقی پاکستان کو بچائے رکھنا وقت کی قیادت کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ ہوگا ۔

اپنے اس غبار آلود سیاسی مستقبل کو سامنے رکھ کر سوچیے تو پھر آپ کو اندازہ ہو سکتا کہ اراکان کا خطہ اور اس کی سیاست پاکستان کے لئے کیا اہمیت رکھتی ہے ۔ مگر بات بڑی حیرت ناک ہے کہ پاکستان کے مسلمان اس خطے کے بارے میں آزادی کے بعد اتنی سی معلومات بھی نہیں رکھتے جتنی غلامی کے زمانے میں حاصل رہتی تھیں ۔ مغربی پاکستان تو بہت دور رہا ، مشرقی پاکستان کے لوگ بھی اپنے ایک پڑوسی علاقے کے سیاسی حالات کو نہیں جانتے اور جاننے کی کوئی کوشش نہیں کرتے ۔ کبھی کبھار اکا دکا کوئی خبر اگر اخبارات میں آتی بھی ہے تو اول تو کسی نہ کسی طاقت کے پروپیگنڈے کے سانچے میں ڈھل کر آتی ہے ۔ بلکہ بسا اوقات بالکل گھڑی ہوئی ہوتی ہے اور اگر وہ خبر صحیح معنوں میں خبریت اپنے اندر رکھتی بھی ہو تو وہاں کی مجموعی صورتِ حالات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس کے ماله و ماعلیہ کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔

بنا بریں ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ "چراغِ راہ" کے ذریعہ اراکان کی سیاسی صورتِ حالات کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کر دیں ۔

محلِ وقوع، رقبہ اور آبادی } اراکان کا علاقہ مشرقی پاکستان کے جنوب مشرق میں واقع ہے اور شمالاً جنوباً سمندر کے ساتھ ساتھ ایک چوڑی پٹی کی طرح چلا آیا ہے ۔ برما سے اس علاقے کو جداگانہ طور پر ممیز کرنے کا فریضہ اراکان یوما کا سلسلہ کوہ سرانجام دیتا ہے ۔
اس کا رقبہ ۱۴۵۰۰ مربع میل ہے ۔ اراکان چار انتظامی اضلاع میں بٹا ہوا ہے جو بڑی حد تک آبادی کی نسلی تقسیم بھی کر دیتے ہیں ۔
کل آبادی ۱۱ لاکھ ۱۸ ہزار ہے ۔ آبادی کی اوسط گنجانیت ۶۲ افراد فی مربع میل بتائی جاتی ہے مگر از روئے حساب ۷۷ افراد فی مربع میل معلوم ہوتی ہے ۔

پورا علاقہ چار انتظامی اضلاع میں منقسم ہے ۔
پہلا کوہستانی اراکان جس میں چن اور ممرو قبائل آباد ہیں ۔ دوسرا اکیاب جس کا ایک حصہ شمالی اراکان جو دریائے کلادان کے مغرب میں ہے مسلم اکثریت پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ جو اس دریا کے مشرقی کنارے پر واقع ہے "مشرقی اکیاب" کہلاتا ہے ۔ اور ماگھ اکثریت پر مشتمل ہے ۔ مجموعی طور پر اس ضلع میں مسلمانوں اور ماگھوں کی آبادی ۲،۴ لاکھ ہے ۔ یعنی دونوں برابر برابر تعداد میں ہیں ۔ تیسرا کیاک پائیو ہے جس کی ۲ لاکھ آبادی میں ماگھوں کی بڑی اکثریت ہے ۔ چوتھا سنیڈووے ہے جو بالکل جنوب میں واقع ہے اور اس کی ایک لاکھ کی مجموعی آبادی میں ۹۰ ہزار برمن اور ۱۰ ہزار مسلم کامان آباد ہیں ۔
آبادی میں نسلی تناسب حسب ذیل ہے :-

(۱) ماگھ	۶ لاکھ	(۲) مسلمان	۴ لاکھ
(۳) برمن	۹۰ ہزار	(۴) برمی بولنے والے مسلمان	۱۰ ہزار
(۵) قبائل	۱۸ ہزار		
میزان	۱۱ لاکھ ۱۸ ہزار		

اراکان اور گزشتہ جنگ عظیم } گزشتہ جنگ عظیم میں جب جاپان کا برما پر تسلط ہوا تو اراکان کے ماگھ - بدھ مت کے پیرو ہونے کی وجہ سے فوراً جاپان سے مل گئے - جاپان نے ان کو اپنا آلۂ کار بنایا اور انھیں پوری طرح مسلح کر دیا - لیکن اراکان کے مسلمان جاپانی فاشزم کے آگے جھکنے پر آمادہ نہ ہوئے - اور انگریز نے محسوس کیا کہ یہی ایک طاقت ہے جو اس کے کام آسکتی ہے - چنانچہ انگریز نے ان میں اسلحہ تقسیم کیا اور ان کو جاپان کے خلاف لڑا دیا - مسلمانوں کی ایک قلیل سی تعداد جاپان کے زیر اثر بھی چلی گئی - لیکن حالات نے بعد میں جب پلٹا کھایا تو وہ بالکل تباہ ہو کے رہ گئے - مسلمانوں کی اکثریت جو جاپان کے خلاف معرکہ آرا ہوئی - اس نے جاپانی فوج کے بے پناہ مظالم برداشت کئے اور بظاہر اس جذبے سے برداشت کئے کہ وہ اپنی آزادی کا تحفظ کر رہے ہیں - نیز ان سے وعدہ یہ بھی کیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد شمالی اراکان کو برمی یونین کے تحت ایک خود مختار علاقہ بنا دیا جائے گا -

جنگ ختم ہوئی - جاپان کا قبضہ برما سے اٹھ گیا - بلکہ اس کے اقتدار کا پوری طرح خاتمہ ہو گیا - مگر اراکان کے مسلمانوں کی مراد پوری نہ آئی - بلکہ حالات ان کے لئے اور زیادہ ناسازگار ہو گئے - انگریز نے ان کو محض وعدۂ معشوقانہ کے سبز باغ پر ٹرخا دیا اور اراکانی مسلمانوں کی قسمت کو آزاد برما کے ہاتھ چھوڑ کر وہ رخصت ہو گیا -

ماگھ اور مسلمان } ماگھوں کی اکثریت بودھ مت کی پیرو ہے - لیکن جہاں تک مذہبی نقطۂ نظر کا تعلق ہے بدھ مسلم مسئلہ کی قسم کی کوئی چیز برما یا اراکان میں موجود نہیں ہے - لیکن ماگھ نسلی طور پر مسلمانوں کے ساتھ ایک گہرا تعصب رکھتے ہیں - جس نے دونوں قوموں کو کبھی باہم قریب نہیں ہونے دیا - بلکہ الٹا ماگھوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک غیر مختتم کشمکش ہمیشہ جاری رہی ہے - اس کشمکش میں سیاسی حیثیت سے چاہے ماگھ فوقیت یافتہ رہے ہوں - لیکن سماجی اور عملی لحاظ سے مسلمانوں نے ہمیشہ اپنا زور بازو دکھائے رکھا - یہی مستقل کشمکش وہ محرک ہے جس نے اراکان کے مسلمانوں میں برمی فیڈریشن کے تحت ایک آزاد ریاستی یونٹ کے مطالبے کو نشو و نما دی - اور قدرتی طور پر یہ مطالبہ مزید کشمکش کا موجب بنا - پھر جب جاپانی تسلط کے دور میں ماگھ جاپان کے جھنڈے تلے جا کھڑے ہوئے اور مسلمانوں نے انگریز کے پلڑے میں اپنا وزن ڈال دیا تو فریقین کے رجحانات کا فرق اور بھی ابھر آیا - پھر جب انڈیا کے مسلمانوں میں تحریک پاکستان چلی تو اراکان کے مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ماگھوں کو اور بھی چڑ پیدا ہوئی - یہاں تک کہ جب تحریک پاکستان کامیاب ہو گئی تو ان کو اراکان کے مسلمانوں کے مطالبے میں بھی پاکستانیت کی بو محسوس ہونے لگی - اب ماگھوں کا عناد مسلمانوں کے خلاف اپنی آخری حدِ اشتعال کو پہنچ گیا -

اراکان سے جاپانی تسلط اٹھنے کے بعد کامل انارکی جیسی ہوئی تھی - بلکہ اب تک حکومت برما کی کوئی باقاعدہ فوج اور پولیس اس علاقے میں موجود نہیں ہے - اور نہ قانون کی عملداری ہے بلکہ جاپانیوں کے مسلح کئے ہوئے ماگھ ہی فوج بھی ہیں ، پولیس بھی اور حکومت بھی - اس انارکی کی حالت سے فائدہ اٹھا کر ماگھوں نے مسلمانوں کے خلاف بربریت کا ایک طوفان اٹھا رکھا ہے - یوں سمجھئے کہ ایک باقاعدہ سول وار ہے جو ماگھوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑی جا رہی ہے - اس سول وار کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری نسل کو تباہ کر کے رکھ دیا جائے - کچھ کو تلوار کے گھاٹ اتار کر اور کچھ کو ملک بدر کر کے -

کمیونزم } اراکان کے مسلمان لاقانونی کے ماحول میں نہ صرف ماگھوں کے نسلی جذبات اور سیاسی تعصبات کا

ہتھکار ہیں۔ بلکہ ان کی بدقسمتی سے ملک جنگ کے بعد تیزی سے کمیونزم کا آلۂ کار بن گئے ہیں۔ کمیونزم کے فلسفے اور اس کے انقلابی طریق کار نے ان کو اناکتوں کا ساتھ دینا سکھا دیا ہے اور اس کے ذریعے ان کے جو بین الاقوامی روابط قائم ہو گئے ہیں ان کے بل پر چین وغیرہ کی طرف سے ان کو جدید ترین اسلحہ اور دوسرے ضروری ذرائع و وسائل حاصل ہو رہے ہیں۔ مسلمان کچھ تو نسلی تعصب کے ردِ عمل کی وجہ سے اور کسی حد تک اپنے مذہبی رجحانات کی وجہ سے کمیونزم کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں، بلکہ وہ اسکی مدافعت کرنے کا تہیہ رکھتے ہیں۔ اندریں حالات وجوہ کشمکش میں ایک اور قومی سبب کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس وقت مسلح ماگھ کمیونسٹوں نے اراکان کو اس طرح کی اندھی نگری بنا رکھا ہے جس کی ایک مثال ملنگانہ کے علاقے میں پیش کی جا چکی ہے۔

ایک طرف مسلمانوں کے خلاف نسلی منافرت، دوسری طرف سیاسی تعصبات، تیسری طرف کمیونزم کی مسلمان دشمنی اور ان سب کی پشت پر ایک لمبی تاریخ کشمکش نے ایسے حالات پیدا کرنے کا موجب ہو گئی ہے کہ جو بیان دو سے پر کر دیں۔ مسلمانوں کی جانوں پر کھلے بندوں حملے ہوتے ہیں۔ ان کی دکانیں لوٹی جاتی ہیں، ان کے مکان جلا دیئے جاتے ہیں، ان کی عورتوں پر حملے کئے جاتے ہیں اور ستم یہ کہ حکومت ان کا بچاؤ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ B.T.F اور U.M.P نامی فوجی تنظیمیں فضا پر پوری طرح مسلط ہیں۔ اور ان میں مسلم دشمن ماگھ پوری طرح چھائے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی کمزور پوزیشن ظاہر بات ہے کہ جہاں وحشت و بربریت کا ہمہ گیر طوفان اٹھ رہا ہو اور جہاں حکومت ایک مظلوم عنصر کا بچاؤ کرنے میں بے بس ہو گئی ہو، وہاں حفاظتِ خود اختیاری کا فریضہ فطری طور پر خود مظلوم کے اوپر ہی آ پڑتا ہے۔ مسلمان مجبور ہیں کہ ظلم کی مدافعت جو کچھ کہ وہ خود کر سکتے ہوں کریں۔ لیکن وہ ہیں بہرحال کمزور! کمزوری کی ایک وجہ تو ان کی عددی قلت بھی ہے۔ لیکن دوسری بڑی وجہ حکومت کا ان سے مخالفانہ معاملہ ہے۔ مثلاً B.T.F اور U.M.P اور دوسری بے قاعدہ اور باقاعدہ فوجی تنظیموں میں مسلمانوں کو کوئی نمائندگی حاصل نہیں۔ پولیس سروس میں سے چن چن کر مسلمانوں کو نکالا جا رہا ہے اراکان کے ایڈمنسٹریشن کی حصہ داری سے بھی مسلمانوں کو سو فیصدی محروم رکھا گیا ہے۔ برما یونین مرکزی گورنمنٹ میں اراکانی مسلمانوں کا کوئی ایک نمائندہ بھی موجود نہیں ہے۔ خود اراکان کی وکل حکومت میں کسی ایک اہم منصب پر بھی کوئی مسلمان فائز نہیں ہے۔ مسلمانوں کی کمزوری کی تیسری وجہ ان کا اسلحہ سے محروم ہونا ہے ماگھ ان کو سب سے پہلے جاپان نے مسلح کیا تھا، پھر ان کو کمیونسٹ ذرائع سے اسلحہ مل رہا ہے۔ مزید برآں خود برمی حکومت بھی نہی کے ہاتھ مضبوط رکھنے کے لئے اسلحہ فراہم کر رہی ہے۔ ادھر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس اگر کچھ اسلحہ تھا تو صرف انگریزوں کی دی ہوئی رائفلیں تھیں لیکن ان میں سے بھی ایک تعداد بیکار ہو گئی ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ اراکانی مسلمانوں نے دو ہزار رائفل کشمیر کے جہاد کے لئے بھی پیش کر دی تھی۔ نیا اسلحہ ملنے کا ان کے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں اراکانی مسلمانوں کی ایک یہ شکایت بھی ہمارے سامنے آئی ہے کہ قریباً تین سال ہوئے کہ ایک برمی گروہ سے لڑتے لڑتے پاکستان کی سرحد پر آ پہنچے اور انہوں نے پاکستانی فوج کی پناہ طلب کی یہاں ان سے ہتھیار رکھوا لئے گئے۔ قریباً ۸۰ رائفلیں چھوڑ کر چکنے کے بعد وہ مقابلے میں اتر آئے اور بالآخر واپس لوٹ گئے۔

ان ساری کمزوریوں کی وجہ سے وہ مظالم سہہ رہے ہیں اور آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں۔ انہی مظالم کے مقابلے میں عاجز آ کر اراکانی مسلمانوں کی ایک تعداد پناہ گزین بن کر مشرقی پاکستان میں داخل ہوئی ہے۔ مرکزی اسمبلی میں ان کی تعداد دو ہزار بتائی گئی تھی۔ مگر بعض متعلق کی معلومات یہ ہیں کہ اراکانی پناہ گزینوں کی تعداد ۴۰، ۵۰ ہزار ہے۔

اراکانی مسلمانوں کے مطالبات } ان مظالم کو سہتے ہوئے اراکانی مسلمان جن مطالبات کے لئے اپنی حکومت کے سامنے سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں ان میں سے نمایاں ترین مرکزی مطالبہ اُن کا وہی پرانا مطالبہ ہے کہ شمالی اراکان کو برمی حکومت کے تحت اسی طرح ایک خود مختار علاقائی یونٹ قرار دیا جائے جس طرح برما کے دوسرے نسلی علاقائی یونٹ موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم علیحدگی پسند نہیں ہیں۔ ہم برمی یونین کے وفادار رہتے ہوئے آزادی کی برکات سے مساویانہ استفادہ کے خواہشمند ہیں وہ یہ بھی پسند کرتے ہیں کہ پورے اراکان کو ان علاقوں سمیت ایک یونٹ کی حیثیت دے دی جائے۔ اس کے لئے وہ شرط یہ رکھتے ہیں کہ اراکان میں مجموعی طور پر فوج پولیس اور دوسری ملازمتوں میں ان کو ۵۰ فیصد نمائندگی دی جائے اور بندرگاہ اکیاب کو شمالی اراکان اور جنوبی اراکان کی مشترک بندرگاہ قرار دیا جائے اور شہر اور بندرگاہ کا نظم ونسق وفاقیت (Condominium) کے اصول پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مساویانہ نمائندگی کے ذریعہ چلایا جائے۔ پھر وہ یہ چاہتے ہیں کہ برما کی مرکزی حکومت میں ایک وزیر خاص طور پر مسلمانوں کے معاملات کے لئے مقرر کیا جائے۔ دستور میں شمالی اراکان کے مسلمانوں کو دوسرے علاقائی وحدتوں کے مساوی نمائندگی دی جائے۔ مقننہ کے ایوان بالا میں بھی شمالی اراکان کو دوسرے علاقوں کے برابر اور ایوان زیریں میں تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جائے۔ اسی طرح وہ ملازمتوں میں تناسب آبادی کے مطابق حصہ طلب کرتے ہیں۔ وہ مکمل مذہبی اور تہذیبی آزادی بھی چاہتے ہیں وہ ایک مفتی اعظم کے تحت قاضی کورٹس کے نام سے مذہبی عدالتیں بھی قائم کرنے کا مطالبہ رکھتے ہیں اور پھر وہ ایک مجلس اسلامیہ کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں جو جملہ مذہبی امور کی نگران اور منتظم ہو۔

ایک اہم خطرہ } کمیونسٹ مگر جس چیز کے لئے زور کر رہے ہیں اس کے لئے "عظیم اراکان" کا نعرہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ "عظیم اراکان" کا مطلب یہ ہے کہ پورے اراکان کو برما سے الگ کر کے ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے برپا کیا جائے اور دوسری طرف اس کی حدود کو مینی کے مقام تک وسیع کر لیا جائے یعنی مشرقی پاکستان کے ایک علاقے پر بھی نگاہ ہے مینی کے مقام کو نقشے میں دیکھنے ہی سے آپ کو صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ "عظیم اراکان" کے معنی کیا ہیں۔
اس خطرے کے راستے میں اراکان کے مسلمان روڑا بننے کی وجہ سے پس رہے ہیں، اور دنیا میں کسی کو خبر بھی نہیں کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔

اراکانی مسلمان اور پاکستان } ہمیں معلوم ہے کہ اراکانی مسلمان پاکستان سے بڑی شکایت رکھتے ہیں کہ اس نے حکومت برما کو تو امریکہ و برطانیہ کے منصوبے کے تحت اپنے خزانے سے ۵۰ لاکھ روپے بطور قرض دے دیئے، حالانکہ وہ حکومت اپنے زیرنگیں مسلمانوں کے حقوق برابر پامال کر رہی ہے۔ لیکن اراکان کے مظلوم مسلمانوں کو ہمدردی کے جذبے تک میں سے حصہ نہ مل سکا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان نے اُلٹا ان کی مخالف طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کئے ہیں۔
لیکن اگر بات صاف صاف کی جائے تو واقعہ یہی ہے کہ پاکستان گونا گوں وجوہ سے اراکانی مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بالکل کچھ نہیں کر سکتا! بہتر یہ ہے کہ ہم سے وہ وجوہ معلوم نہ کئے جائیں! اور یہ بھی صاف صاف کہہ دیا جائے کہ اگر اراکانی مسلمانوں نے پاکستان سے کچھ توقعات وابستہ کیں، یا کسی طرح کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے تو یہ چیز خود اراکانی مسلمانوں ہی کے مفاد کے سخت مضر بیٹھے گی۔ پاکستان بحیثیت حکومت جن بین الاقوامی پیچیدگیوں میں مبتلا ہے ان سے نکلنے کے لئے اسے ایک نیا دستور اور ایک

نئی قیادت چاہئے ــــــ البتہ پاکستان کے شہریوں کا اراکانی مسلمانوں سے اسلام کا بھی رشتہ ہے اور ہمسائیگی کا بھی رشتہ اور یہ دونوں رشتے تقاضا کرتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے دکھوں کو سمجھیں اور ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوں اور دونوں پورے ایشیا بلکہ ساری دنیا کو ایک خدا پرستانہ تہذیب کے فیوض و برکات سے مالا مال کرنے کے لئے اپنی قوتیں ہم آہنگی سے صرف کرنے کے قابل ہو جائیں۔

ایک خلاء } اراکان کے مسلمانوں میں حرکت بھی، سرگرمی بھی، لیکن یہ حرکت نسلی و گروہی عصبیت کے بل پر چل رہی ہے ۔ بس ایک ذرا سا غیر شعوری جذبۂ اسلامیت اس بنا پر ان کی سرگرمیوں میں شامل ہو گیا ہے کہ مسلم تاریخ اور مسلم لٹریچر کا فطری تقاضا یہی ہے اور کوئی قوم بہرحال اپنی روایات کی محبت سے بالکل خالی تو ہو نہیں سکتی، لیکن خالص اسلامی تحریک کے کوئی آثار اراکان میں ابھی تک موجود نہیں ہیں ۔

یہی وہ چیز ہے کہ اس کا جہاں کہیں تعلق ہے وہاں مسلمان پہلے پستا اور کچلا جاتا ہے اور اس کے بغیر وہ سکڑنے اور سمٹنے کی کوئی اسکیم بناتا ہے ــــــ حالانکہ اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا کی جدید ہمہ گیر تحریکیں حدیں توڑتی ہوئی کہیں کی کہیں پہنچ رہی ہیں ۔ اس کا ذہن تو گویا اب یہ بات سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا کہ وہ بھی پھیل سکتا ہے اور چھا سکتا ہے ــــــ کسی کے سہارے کے بغیر پھیل سکتا ہے ۔ اور کسی سے مخلوق کی بھیک مانگے بغیر چھا سکتا ہے ۔

اراکان کے مسلمانوں سے ہم اپیل کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے اصولوں پر ایک ہمہ گیر تعمیری تحریک کو لے کر اٹھنے والی نوجوان طاقت کا مطالعہ کریں ۔ جو پاکستان سے اٹھ رہی ہے، جو مصر سے اٹھ رہی ہے ۔ جو شام اور عراق سے اٹھ رہی ہے اور جو انڈونیشیا سے اٹھ رہی ہے ــــــ اور جس کی لہریں ایک دن ہر طرف سے آ آ کر ایک سنگم پر جب مل جائیں گی تو تاریخ عالم کا نقشہ بدل جائے گا کیوں نہ اراکان کے مسلمان بھی اسلام کے اصولوں کو ایک تحریک بنا کر اٹھیں ۔ اور اس یقین کے ساتھ اٹھیں کہ ان کے اصولوں کی برتری اور ان کے اخلاق کا سچ ماگھوں کے دلوں کو فتح کرتا ہوا اور پورے برما کو حل تصل کرتا ہوا جب ٹھاٹھیں مارتا جغرافیہ کی چند بودی لکیروں کو عبور کرے گا تو ساری دنیا اس کے زیر نگیں ہوگی ۔

اگر یہ ہو تو برما بھی تمہارا ہے اور پاکستان بھی تمہارا ہے، اور اگر یہ نہیں تو اراکان تمہارا ہے اور نہ پاکستان اور نہ دنیا کا کوئی اور گوشہ تمہارے لئے پناہ گاہ بن سکتا ہے ۔

بہرحال تم ہمارے بھائی ہو، ہم تمہاری بھلائی چاہنے والے ہیں اور تمہارے لئے فوز و فلاح کی دعا کرتے ہیں ۔

ڈھمک ڈھم

نعیم صدیقی

گاؤں بھر میں ڈھنڈورا پٹ رہا ہے ——

ڈھمک ڈھم —— ڈھمک ڈھم —— ڈھمک ——

کل لوکائی سن لو! پلاکے دار (علاقہ دار) صاحب بہادر کے حکم دتا ہے سارا پنڈ
مجبرات تے دیاڑے آزادی دا جشن مناؤ، اپن تلکے آ گیاں۔ ساویاں جھنڈیاں لاؤ
جلوس کڈھو، ڈھول ڈھمکے دا انتجام کرو، نالے راتیں کوٹھیاں اُتے دیوے بالو۔
کوئی چیں میں نہیں سنی جاوے گی۔

—— ڈھمک ڈھم —— ڈھمک ڈھم —— ڈھمک —— کل لوکائی سن لو ——

اور کل لوکائی سن رہی ہے۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا ہو گیا، باتیں کرتے ہوئے لوگ چپ ہو گئے۔ گاؤں میں ایک نیا چرچا شروع ہو گیا۔ وہ دیکھئے ایک بڈھا اور ایک جلاہے سے پوچھ رہا ہے "آزادی کیا ہوتی ہے"؟ جلاہا اسے بتا رہا ہے کہ وہ جو ایک دفعہ ووٹ (ووٹ) پڑے تھے نال، وہ جھگڑے میں —— اسی کو آزادی کہتے ہیں۔ پاس سے جمعدار دین محمد بول پڑا۔ "چاچا فتو! انگریز چلے گئے ہیں۔ اور ہمیں آزادی دے گئے ہیں۔" فتو بابا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ہیں! انگریز چلے گئے؟" —— اور پھر اس کی سانس رکی سی گئی

"ہاں چاچا چلے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک جبھی تو آنا نہیں تھا۔ جمعداروں اور محلوں میں ایسا جھگڑا پڑا ہے کہ دشمن میں بھی نہ ہوگا، اور رشوت کا زور ہو گیا ہے"
فتو نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ جمعدار کی تیوری پر بل پڑ گیا۔

"چاچا تو تو نرا بے عقل ہے۔ یہ تو ہماری اپنی جہالتیں ہیں"

"نہیں جمعدار جی" —— فتو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جیسا راجہ ہوتا ہے ویسا ہی پرجا کا حال ہو جاتا ہے۔ انگریز نے ڈنڈے کے زور سے امن سلامتی کا خوب انتظام کر رکھا تھا۔ اب یہ جو دن رات کی گڑبڑ ہے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ آج پتہ چلا کہ اصل گرو چلا گیا اب اس کے چیلے گدی پر بیٹھے ہیں۔"

"مگر جمعدار جی" تا جولاہا پوچھنے لگا: "انگریز ہمارے ملک کو چھوڑ کر کہاں گیا؟ کیونکہ سارے کا سارا دفتری انگریزی ہے۔ میرے لڑکے کے جتنے خط آتے ہیں ان پر انگریزی ہی میں مہریں لگی ہوتی ہیں۔ پھر ایک مقدمے میں گواہی دینے کے لئے میں شہر گیا تو سب لوگ ٹوپ پتلون پہنے دیکھے۔ کچہری میں انگریزی تختیاں لگی تھیں۔ وکیل ترتر انگریزی بول رہے تھے۔ سڑک کی دکانوں پر انگریزی چلنے کی طرح گندے گانے ہو رہے تھے۔ کوئی فرق نہیں جمعدار جی۔ رتی جتنا بھی نہیں!"

"ہو ہو! دینو بھائیا!" مکھیار جی لمبی آواز میں کہنے لگے "ہولے ہولے سب ٹھیک ہو جائے گا، دنیا بدلتے بدلتے بدلتی ہے۔"
مگر دینو نہیں مانا۔ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ مکھیار کو دھوکا ہوا ہے کیونکہ وہ اخبار پڑھتا ہے اور اخبار پڑھنے والے دینو کی نگاہ میں دھوکے میں رہتے ہیں۔ اس کو پکا یقین تھا کہ انگریز یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہے یہ کوئی گہری چال ہے۔

ڈھمک ڈھم —— ڈھمک ڈھم — ڈھمک —— گل لوکائی سن لو!

فاتاں ودنی نے بھی سنا اور اپنی نند سے کہنے لگی۔ "پتہ ہے یہ جشن کیا بلا ہوتی ہے" نند نے نفی میں جواب دیا۔ فاتاں نے اسے بتایا کہ "آزادی ایک پری ہے۔ سچ پرمل والی! اس کی شادی ہمارے ملک کے بادشاہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ اب ریت ہر سال اس شادی کا دن مناتی ہے۔ تمہیں کہانی یاد ہے جو میں تمہیں جاڑوں میں سنایا کرتی تھی۔ سو یہ وہی کہانی ہمارے دیس میں سچ بن گئی ہے ہمارا جو بادشاہ اب تخت پر بیٹھا ہے، بڑا مسلین ہے۔ اس نے انگریزوں سے کہا کہ میں سچ پری کو بیاہ کے لاؤں گا۔ انگریز نے بیچ میں ٹانگ اڑانی چاہی۔ مگر ہمارے بادشاہ نے آنکھیں دکھائیں۔ بات چیت بہت بگڑ گئی تو ہمارے بادشاہ نے کل مسلین کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنا شروع کر دیا۔ مسلم لیگ کا نام تو تم نے سنا ہے ناں، یہ اسلامی مجاہدوں کی فوج تھی۔ ہمارا بادشاہ جب اسلامی فوج لے کے ملی جلا تو انگریز کے چیلوں نے بھی بڑے لاؤ لشکر آگے کھڑے کئے۔ مگر میرے چچا کے لڑکے کا چھوٹا سالا بتاتا ہے —— وہ بھی غازی بن کے گیا تھا ناں —— کہ اسلامی فوج جب ایک بار نعرۂ تکبیر لگاتی تھی تو ایک لاکھ دشمن کے ہتھیار بے کار ہو جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر انگریز بھاگ گیا۔ پھر جب انگریز بھاگ گیا تو مسلین فوج دوسرے کافروں پر ٹوٹ پڑی۔ کھتری، سکھ جو کوئی بڈھا بچہ تھا دور پار چلا گیا۔ اب کوئی بھی ایسا نہیں رہا جو محمدؐ کا کلمہ نہ پڑھتا ہو۔ اب سارا راج محمدی ہو گیا۔ تو ہمارے بادشاہ نے —— سنو! پاکستان! ہمارے بادشاہ کا نام ہے، نرا پاک جو ہوا —— کبوتر کے پروں میں رقعہ باندھ کر سچ پری کو کوہ قاف پر بھیجا، وہ لونڈی، غلام اور مال دولت لے کے جھٹ آ پہنچی۔ کراچی شہر میں جو یہاں سے ایک مہینے کی راہ پر ہے۔ پاکستان اور آزادی کی شادی ہوئی۔ شادی کو پانچواں سال ہو گیا ہے۔ ہر سال اس کا جشن منانا ہر مسلین پر فرض ہے۔ اب دیکھو، ان دنوں میں لوگ سبز جھنڈیاں بنوانے کے لئے ٹوٹ پڑیں گے۔ بڑا کام سر پہ ہے۔

"ڈھمک ڈھم —— ڈھمک ڈھم —— ڈھمک —— گل لوکائی سن لو! ——"

گاؤں جشن منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ کمہار دیئے بنا رہے ہیں، بنیا ٹیانے اور کاغذی جھنڈیاں لے آیا ہے بڑے بڑے چوہدریوں کے مکان پہ لگنے کے لئے۔ فاتاں ودنی سبز کپڑے کے جھنڈے سی رہی ہے۔

جگو منحنی سا آدمی ہے ورثے میں اسے آدھ ایکڑ بنجری زنیلی زمین ملی تھی، یہ غریب اس زمین پر اس طرح جان چھڑکتا ہے۔ جیسے وہ اس کی جورو ہو، اس کی محبوبہ ہو، وہ سارا دن اپنی کھیتی کے ساتھ گزارتا ہے، اس کی مٹی کے ہر ذرے سے، اس کی ہر کنکری سے، اس کے اندر اگی ہوئی جڑی بوٹیوں سے، اس کی مینڈوں سے اسے بڑا پیار ہے۔ رات کو گھر آتا ہے تو فراق کی ایک ایک گھڑی اس کے لئے بھاری ہو جاتی ہے۔ پو نہیں پھٹتی کہ وہ اپنی سلطنت میں جا پہنچتا ہے۔ کبھی کسّی سے کر کھود رہا ہے۔ کبھی کراہ لگا رہا ہے۔ کبھی ہل چلا رہا ہے۔ کبھی بنے درست کر رہا ہے، کبھی جڑی بوٹیاں اکھاڑ رہا ہے۔ سمجھ دار اتنا ہے کہ رفع حاجت بھی وہیں جا کر کرتا ہے تاکہ مٹی زرخیز ہو جائے۔ اسکی محنت نہ جانے کیا کچھ کرتی لیکن بدقسمتی سے زمین ہی ناقص واقع ہوئی ہے۔ اس وقت گندم کی فصل کھڑی ہے۔ بس فٹ فٹ بھر کے فاصلے پر ایک ایک پودا ہے اور ہر پودے پر ذری ذری سی خوشیاں پڑی ہیں۔ یہی جگو کی ساری دنیا ہے۔ اس کی خوراک، اس کا لباس، اس کی دوا دارو، اس کی بیوی کی تمنائیں۔ اس کے بچوں کی امیدیں! وہ کسی جانور تک کو اس پر منہ مارنے نہیں دیتا۔ وہ ہر روز جا کر ایک ایک خوشہ کو دیکھتا ہے۔

اور ایک ایک پودے کو جیسے لگتا ہے جیسے یہ اسکی اولاد ہو جیسے نوشیوں میں پلتے ہوئے دانے اس کے بچے ہوں۔ مگر آج پٹواری کے ہاں افسر آگئے ہیں۔ پانچ گھوڑیوں کے لئے چارہ چاہئے۔ باس آج جگو کی ہتک کی گئی ہے۔ وہ جگو کہ جس نے اپنے جان سے پیارے بیلوں کو کبھی ایک پتہ نہ توڑنے دیا تھا۔ درانتی لے کے مینڈھ پر کھڑا ہے۔ جیسے وہ آج خودکشی کرنے آیا ہو جیسے وہ اپنی اولاد کو ذبح کر کے اس کا گوشت کچھ جیلوں کو کھلانے والا ہو۔ بہت ٹھنکا بہت سوچا، کلیجہ سینے میں پک دھک کرنے لگا۔ لیکن آہ پٹواری! پٹواری سے خدا دشمن کو بھی پالا نہ ڈالے۔ درانتی چلنے لگی، خود جگو کے ہاتھ سے چلنے لگی جیسے آج جگو اپنی محبوبہ کی زلفیں مونڈ رہا تھا اور ادھر گاؤں میں آزادی کا جشن منایا جانے والا تھا۔

ڈھک ڈم ــــ ڈھک ڈم ــــ ڈھک ــــ کل لوکائی رُن ہوا

اس میں کیا شک کہ صاحبان بڑی حسن تاب عورت تھی ــ ماں تو اس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی، باپ ہی اس کا باپ بھی تھا اور ماں بھی۔ چار سال ہوئے اس کا نکاح پندرہ کوس دور کے ایک گاؤں میں ہوا تھا۔ نکاح ہونے کے ڈیڑھ مہینے بعد باپ بھی رخصت ہو گیا اور صاحبان کا مائیکہ ختم ہو گیا صرف ایک ڈھاری رہ گئی اور ایک بیکان کا درخت! اب اس کا جو کچھ بھی تھا سسرال تھا۔ لیکن بدنصیبی نے اپنا آخری علاج بھی کر دیا اس کا گھروالا ایک بلوے میں زخمی ہوا اور ہسپتال جا کر مر گیا۔ اب صاحبان کا اگر کوئی سہارا تھا تو صرف گود کا بچہ۔ ساس سسر نے بھی چندہی روز کے بعد صاحبان کے بیاڑ جیسے بوجھ کو اتار پھینکا۔ لیکن اس کی منت سماجت پر بچہ اس کے ساتھ ہی رہنے دیا ــ صاحبان اپنے باپ کی ڈھاری میں آرہی۔ گاؤں کے لوگوں کی مدد سے اس نے چھپر ٹھیک ٹھاک کئے۔ لوگوں نے کچھ غلہ چندہ کر کے جمع کر دیا اور صاحبان کی جوانی بیوگی کا خارزار طے کرنے لگی۔ بچہ ایک بے کس بیوہ کی چھاتیوں سے پوری غذا نہ ملنے کی وجہ سے کمزور تو تھا ہی پچھلے جاڑوں میں اس پر نمونیے کا حملہ ہوا۔ دم درود سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو صاحبان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی صورت نہ رہی کہ بچے کو قصبے کے حکیم نابینا صاحب کے ہاں لے جائے۔ اس مہم کے لئے وہ پانچ روپے کی محتاج تھی ــــ لیکن کس سے لیتی، کون دینے والا تھا وہ بچے کو گود میں لئے کئی گھروں میں پھری۔ لیکن کہیں سے امید بر نہ آئی۔ جاتے جاتے چوہدری شہامت سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ شہامت نے رسمی طور پر حال احوال پوچھا اور کہا کہ "جب کوئی ضرورت ہو تو ہمیں بتانا کوئی یہ نہ کہے کہ گاؤں میں ایک بیوہ تھی اور اس کی خبرگیری کرنے والا کوئی نہ تھا۔" صاحبان کی اضطراب یہ سن کر جیسے پھوٹ بہی "چوہدری جی بچہ تو کوئی دم کا مہمان نظر آتا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ خود حیدر کر دیکھوں آگے تقدیر خدا کے ہاتھ ہے۔ حکیم نابینا جی کو بھی دکھالوں، مگر میرے پاس ایک دمڑی بھی نہیں، کہیں سے پانچ روپے مل جائے تو ــــ"

شہامت ایک مشہور شکاری آدمی تھا، اس کی تو باچھیں کھل گئیں کہ شکار تو خود ہی کھچا چلا آرہا ہے، نہ محنت کی ضرورت نہ لاگت کی۔ چوہدری نے صاحبان کو میلی نگاہ سے دیکھتے ہوئے تہمد کا ڈب کھولا اور کھن کھن بجتے ہوئے پانچ روپے صاحبان کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"بس صاحبان! یا کچھ اور بھی چاہتی ہو ــــ؟"

"چوہدری جی! خدا آپ کو سلامت رکھے! آپ کے بچے جئیں ہم مسکینوں کا اب کون ہے۔"

چوہدری جی کی آنکھوں کی پتلیاں اب بالکل شیطان بن گئی تھیں، اور صاحبان نے ان دو کالے کالے شیطانوں کو پہچان لیا وہ سمجھ گئی تھی کہ ان پانچ روپوں کی قیمت کیا ہوگی۔ ــــ لیکن وہ بچے کی جان بچانے کے لئے سب کچھ کرنے پر آمادہ تھی۔

صاحبان قصبے کو چلی گئی اس نے دو روپے حکیم جی کو نذر کئے۔ دو روپے کی دوائیاں لیں اور ایک روپیہ بچا رکھا کہ نجانے کب ضرورت پڑے۔ واپسی پر وہ راستے کے بیچ میں تھی کہ بچے نے دم توڑ دیا۔ دنیا اس کی نگاہوں میں آج پھر ایک بار گھوم گئی جیسے آج اس کا باپ

از سر نو مرا ہو، جیسے اس کے شوہر کی موت آج دوبارہ واقع ہوئی ہو۔ جیسے وہ خود مر گئی ہو۔ وہ لاش ہتھیلیوں پر لئے روتی بلکتی گاؤں میں پہنچی۔ اس کے بین سن کر عورتیں مرد بچے جمع ہونے لگے۔ آدمی بھیج کر اس کے سسرال والوں کو جنازے کے لئے بلوایا گیا۔ کفن دفن کا سامان ذمہ چوہدری شہامت نے لیا اور آدھی رات کو صاحبان کی بچی کھچی پونجی مٹی کے حوالے کر دی گئی ——— لوگ چوہدری شہامت کو دعائیں دے رہے تھے اور بڑے بوڑھے اسے آفرین کہہ رہے تھے!

صاحباں جانتی تھی کہ شہامت نے کس کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لئے صبح شام اس کے ہاں آنے لگا۔ صاحباں اس کے پانچ روپیوں اور اپنے بچے کے کفن دفن کے انتظامات کا حساب آخر کار بے چکاتی۔ صاحباں کے پاس اگر کچھ تھا تو صرف صاحباں ہی تھی۔ چنانچہ چوہدری شہامت کی آنکھوں کے دو ننھے ننھے کالے شیطانوں نے ایک روز صاحباں کی پاکیزہ روح سے اس کا جسم لوٹ لیا۔

اور گاؤں میں آہستہ آہستہ صاحباں کے بارے میں سرگوشیاں ہونے لگیں، سرگوشیاں چرچے بن گئیں اور چرچے ایک ہنگامہ ہو گئے اور ہنگامہ آخر کار ہو ہوا کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ چوہدری شہامت اپنی خدمات کی قیمت چکا لینے کے بعد صاحباں کو چھوڑ کر نئے شکار کی تلاش میں نکل گیا، اور اسکی جگہ اب کئی اور شہامت صاحباں کے دروازے پر دستک دینے لگے۔ گناہ کا راستہ جب کوئی شیطان ایک مرتبہ کھول دیتا ہے تو پھر اس کے نقوش پا پر کارواں کے کارواں آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ اب صاحباں علاقے بھر کے بدمعاشوں کا کھلونا اور دل بہلاوا تھی ہوتے ہوتے گاؤں کی فضا اسے برداشت کرنے سے جواب دینے لگی۔ یہاں تک کہ کل رات کو چوہدری شہامت نے اپنے مکان پر گاؤں کے سرپنچوں کو بلوا کر سب کے مشورے سے صاحباں کو گاؤں سے نکال دینے کا فیصلہ کر لیا۔ صبح سویرے ہی شہامت کا آدمی صاحباں کو پیغام دینے اس کے گھر پر پہنچا تو گھر کو قبرستان کی طرح خالی اور ڈراؤنا پایا۔ آدمی واپس نکلا تو پڑوسیوں سے معلوم ہوا کہ صاحباں تو کسی کے ساتھ نکل گئی ہے۔ ہماری بڑھیا نے منہ اندھیرے اسے ایک مرد کے ساتھ بقچی سر پہ لئے جاتے دیکھا ہے۔ آج گاؤں میں گھر گھر صاحبان کے کرتوتوں کا چرچا تھا ادھر صاحبان دفان ہوئی ادھر لوم آزادی آپہنچا۔

ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ——— کل لوکائی سن لو!

پچھلے ہفتے بڑی موسلادھار بارش ہوئی تھی۔ یہ بارش بڑی موقع کی بارش تھی، اس سے گندم کا ایک ایک دانہ منٹوں میں موٹا ہو گیا۔ مگر سیم پور والوں پر قیامت بیت گئی۔ نیلم پور ایک برساتی نالے کے کنارے پر واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ آج سے بیس سال پہلے نالے میں اور گاؤں میں ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا، مگر اب مکان بالکل نالے کے کنارے پر ہیں۔ ہر دفعہ جب اس میں طغیانی آتی ہے تو دس پانچ مکان بہ جاتے ہیں۔ اس بارش سے تو ایسی غیر معمولی طغیانی آئی ہے کہ کئی گھر بالکل صاف ہو گئے ہیں اور استادہ گھروں کا کچھ حصہ پانی کی نذر ہو گیا ہے۔ اس گاؤں کے لوگ کئی سال سے سرکار میں عرضیاں دے رہے ہیں کہ ان کے بچاؤ کا کوئی انتظام کیا جائے اور گاؤں کی طرف پختہ بند بنا کر پانی کے بہاؤ کا رخ بدلا جائے۔ مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ آخر اس مرتبہ جب انتخابات ہوئے تو نیلم پور کے لوگوں نے متحدہ طور پر فیصلہ کیا کہ ووٹ اسے دیں گے جو ہمیں بند بندھوا کے دے۔ شیخ محمد اکرم صاحب صدر ضلع مسلم لیگ نے ان سے مسجد میں بیٹھ کر پیمان باندھا کہ ممبر بننے کے تین مہینے کے اندر اندر بند بندھوا دوں گا۔ چنانچہ نیلم پور کا ایک ایک ووٹ شیخ محمد اکرم کو ملا بلکہ اس گاؤں نے کئی کئی پولنگ اسٹیشنوں پر جا کر شیخ صاحب کی کامیابی کے لئے جعلی ووٹ بھی بھگتائے۔ مگر اب انتخاب ہوئے دس ماہ ہوتے ہیں لیکن نیلم پور والوں کو اس عرصے میں شیخ صاحب کی زیارت تک کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ اب جبکہ گاؤں کا ایک حصہ برساتی نالہ بہا کے لے گیا ہے تو نیلم پور کے مظلوم اپنے تازہ زخم لئے شیخ صاحب کی تلاش میں بھی

اس گاؤں کبھی اس گاؤں مارے مارے پھرتے ہیں۔ جس کا پتا مٹا ہے اُدھر ایک ٹولی چل کھڑی ہوتی ہے۔ نیلم لوہاروں کو حبیب سے یہ اطلاع ملی ہے کہ جشنِ آزادی علاقے میں منایا جاتا ہے اور شیخ صاحب جشن کو کامیاب کرانے کے لئے علاقے میں نکل پڑے ہیں تو وہ چراغ ہاتھ میں لئے ان کی تلاش میں ہیں۔ یہ دیکھئے سامنے ایک ٹولی کمر باندھے کمال آباد کی طرف جا رہی ہے۔ ان میں سے ایک کا نوجوان بیٹا، طغیانی کی لہروں کی نذر ہو گیا ہے دوسرے کا مکان ایسا اَنّا فانّا بہ گیا کہ گھر کے اثاثے میں سے بھی کچھ نہ بچایا جا سکا۔ دو چار گھروں کے ڈھور ڈنگر ضائع ہو گئے ہیں۔ بے چارے کیا کرتے طغیانی رات کو اچانک آئی۔ ان کو کون بتلائے کہ شیخ محمد اکرم کمال کے جیب سے کی طغیانی بہا لے گئی ہے۔ اور اب وہ مشکل ہی سے ہاتھ آئیں گے۔ تم سیدھے سیدھے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور جشن مناؤ۔

ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ——— کل لوکائی سن لو!

گاؤں میں دو چار گھر مہاجروں کے بھی ہیں آزادی آنے کے بعد سب سے بڑی تبدیلی جو نمایاں ہے وہ یہی ہے۔ ایک کنبہ کرنال سے آیا ہوا ہے، دوسرا جالندھر سے، تیسرا ٹھیالے سے، چوتھا ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں سے۔ بولیاں الگ، کھانے پینے کے مزاج الگ، چلیے الگ، لباس الگ، اور گاؤں کی پوری فضا بالکل مختلف! مگر بہر حال مسلمان دوسرے مسلمان سے چاہے وہ کہاں کہاں کے ہوں جوڑ میل کھا ہی جاتا ہے ان کی بیویاں گاؤں کی بولی کے غرارے پر چڑھ گئی ہیں ان کے لباسوں میں ادل بدل ہونے لگ گئے ہیں۔ ان کی عادات اوران کے ذوق تنگ بدل رہے ہیں دو ایک نسلوں میں کانِ نمک ان نمک ان سنگ، زیدوں کو بھی نمک بنا لے گی۔ چند روز سے ایک کنبہ نیا آوارد ہوا ہے۔ یہ سندھ سے آ رہا ہے۔ عارضی مستقل آبادکاری کی اسکیم کے تحت کرنالیوں کو حکم ملا ہے کہ وہ بوریا بستر باندھ لیں۔ ان کو منتقل جانا ہوگا۔ کرنالیوں کا مکان اور زمین اس نئے کنبے کو الاٹ ہو گئے ہیں۔ کرنالیوں نے مکان کو درست کیا۔ اس کی لپائی ابھی ابھی کی ہے۔ صحن میں بوٹے لگائے ہیں۔ کھیت میں ان کی فصل تیار کھڑی ہے، لوگوں سے دو تین سال رہ کر انھوں نے تعلقات استوار کئے ہیں۔ وہ آخر دامن جھاڑ کر یہاں سے کیسے "ہجرتِ ثانیہ" کر جاتے۔ چنانچہ انھوں نے نئے الاٹیوں کو ٹکا سا جواب دیا۔ نئے الاٹی چوپال میں ڈیرہ ڈالے چند روز پڑے رہے۔ پرسوں تنگ آ کے وہ لوگ پولیس کو بلا لائے۔ پولیس نے مکان خالی کرنے اور زمین کا قبضہ نئے الاٹیوں کو فوراً دینے کا مطالبہ کیا۔ کرنالیوں نے پھر بھی انکار کر دیا۔ اب پولیس کے سپاہی پورے کنبے پر ٹوٹ پڑے۔ مردوں کو ڈنڈوں سے پیٹا گیا۔ عورتوں کو بالوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر نکالا گیا۔ سامان اُچھال اُچھال کر باہر پھینکا گیا۔ گاؤں میں گویا ایک قیامت آ گئی۔ اب نئے الاٹی مکان اور زمین پر قابض ہوتے ہیں اور کرنالی چوپال میں پڑے ہیں۔ ان کو منتقل جانا چاہئے یا مرجانا چاہئے! بہر حال یہ عارضی مستقل آبادکاری ہے ——— :- اور اس پہ مزے یہ کہ آزادی کا جشن آ رہا ہے۔

ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ——— کل لوکائی سن لو!

کرم بخش چرواہا اپنا گلہ لئے گاؤں کی طرف چلا آ رہا ہے، گرد کا ایک دھیما دھیما طوفان گلے کے جلو میں ہے۔ بکریاں بھیڑیں اپنے بچوں سے ملنے کے لئے "میں میں، بیے بیے" کرتی تیزی سے لپک رہی ہیں، کرم بخش ایک خاص حیوانی بولی میں ہدایات دیتا چلا آ رہا ہے۔ گاؤں کا یہ واحد چرواہا ایک بکری کے لئے آٹھ آنے اور ایک بھیڑ کے لئے چار آنے ماہانہ مزدوری لیتا ہے۔ کبھی جوان تھا اور بنسری کی تانیں اڑایا کرتا تھا، مگر اب بوڑھا ہو گیا ہے اسے اونچا سنائی دیتا ہے۔ آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا تھا۔ اب ایک آنکھ بن گئی ہے اور موٹے شیشے کی عینک لگا رکھی ہے، کہتا ہے کہ اس عینک نے مجھے پھر دنیا دکھا دی۔ بکری اگر سو پھر بھی ہو تو ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں۔ بے چارے کی کھپا چپاں سی ٹانگیں اب لڑکھڑا جاتی ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کا بیٹا الٰہ دا اس کی جگہ لے لیتا۔ مگر الٰہ دتا تین مہینے سے بستر پر ہے۔ اسے تپِ دق ہو گئی ہے۔ حکیموں نے لاعلاج کر دیا ہے۔

باقی پر صفحہ ۴۲

استفسارات

نقدِ حدیث

فتنۂ انکارِ حدیث ایسا فتنہ نہیں ہے کہ کسی اصولی بحث سے اس کا ازالہ کیا جائے۔ بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ایک حدیث پر غلاظت اور کوڑا لا لا کر ڈالا جاتا ہے اور نبی صلعم کے غلام بارگاہ کو ایک ایک حدیث کے [illegible] اقدس کو اپنے دامنوں سے صاف کرنا پڑتا ہے۔ ذیل کے سوالنامے میں بھی کئی احادیث ایسی پیش کی گئی ہیں کہ جن پر منکرینِ حدیث نے فتنہ کی غلاظت ڈال دی ہے۔ اور حدیث کے ایک قدر شناس نے یہ ساری غلاظت بڑی محنت سے ہٹائی ہے۔ یہاں تک کہ فرموداتِ نبوی کے جواہر نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔

کیا حدیث میں مزید ریسرچ کی ضرورت ہے؟ یا جتنی احادیث ہم تک پہنچی ہیں، سب درست ہیں۔ آج کل کے دَور میں ہم عقیدہ کو لے کر کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی کوئی اصولی (Ideology) پیش کر سکتے ہیں جو دوسرے نظام ہائے زندگی کو شکست دے سکے۔ احادیث بہت سی ایسی ملتی ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، قرآن سے ٹکراتی ہیں اور رسول اکرم صلعم کی شخصیت سے ٹکراتی ہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے بعض بزرگوں سے سوالات کئے وہ میرے سوالات کا تشفی بخش جواب تو نہ دے سکے البتہ یہ کہا کہ حدیث میں تشکک کرنا کفر کے مترادف ہے۔ ہمارے ان بزرگوں کی یہ انتہا پسندی مغرب زدہ طبقہ کو حدیث بلکہ مذہب سے بہت دور لے جا رہی ہے۔ ڈر ہے کہ یہ انتہا پسندی اس طبقہ کو قطعی طور پر مذہب سے انکار پر مجبور کر دے۔ (حدیث کے انکار کی واضح مثال فتنۂ انکارِ حدیث کی روز افزوں ترقی ہے اور غالباً مغرب زدہ طبقہ اس کا سب سے بڑا شکار ہے) اس لئے حدیث کو سائنٹفک طریق پر پیش کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ کیونکہ اس طبقہ کو صرف عقیدہ پیش کر کے خاموش نہیں کر سکتے۔ ایسی احادیث بہت تھوڑی تعداد میں ہیں جن سے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ میں چند مثالیں دینے کی کوشش کروں گا۔[1]

• • •

[1] سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بات صرف "آج کل" ہی کے لئے کیوں مخصوص کی گئی، کہیں ایسا تو نہیں کہ تاریخ کے گزشتہ ادوار میں فلسفے جو انقلاب برپا کئے ہیں ان کے بارے میں سائل کو یہ سوئے ظن ہو کہ وہ محض اندھے عقیدوں کے زور سے نمودار ہو گئے تھے۔ یونانی عقل پہلے بھی تشکیک پھیلاتی تھی اور اندھے عقیدے آج بھی پائے جاتے ہیں۔ آج کے اندھے عقیدے خدا، نبوت اور آخرت کے بارے میں نہیں تو "آزادی" "مساوات" اور "جمہوریت" کے مفروضات کے بارے میں ہیں۔ بہر حال ہم ان اصلی نعروں کی عملی حقیقت کو سمجھے بغیر لوگ ان سے بہکتے ہیں۔ سائل "آج کل" کی عقلیت پسندی پر ضرورت سے زیادہ عقیدہ رکھتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام روزہ رکھ کر اپنی ازواج کے بوسے لیتے اور ان سے مباشرت فرمایا کرتے تھے (بخاری)

(۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم روزہ رکھ کر مجھے چومتے اور میری زبان چوستے (ابوداؤد)
حالانکہ قرآن نے روزہ کی حالت میں ان حرکات سے سخت منع کیا ہے! پھر کیا زبان چوسنے سے روزہ نوٹ نہیں جاتا؟

(۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حیض کی حالت میں رسول اللہ صلعم مجھے تہ پوشی پہننے کا حکم دیتے اور اس کے بعد مجھ سے مباشرت کرتے (بخاری)

اس معاملہ میں قرآن یہ کہتا ہے کہ لوگ آپ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہدیجئے کہ حیض ایک قسم کی غلاظت ہے اس لئے ان دنوں میں بیویوں سے دُور رہیے!

اب فرمائیے کہ حدیث پر عمل کیا جائے یا قرآن پر؟

احادیث کے مزید تضاد ذیل کی مثالوں سے سامنے آتے ہیں:—

(۱) ابوہریرہؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ عورت، گدھا اور کتا سامنے آجائیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ (مسلم)
لیکن دوسری طرف حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ میں نماز میں حضورؐ کے سامنے پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتی تھی جب وہ سجدہ کرنے تو مجھے انگوٹھے سے اشارہ کرتے چنانچہ میں پاؤں سمیٹ لیتی اور جب وہ اٹھتے تو پھر پھیلا دیتی اور گھر میں چراغ موجود نہ تھا! (بخاری)

پہلی حدیث میں عورت کے سامنے آجانے سے نماز کا ٹوٹنا بتایا گیا ہے اور دوسری میں حضرت عائشہؓ سامنے لیٹ کر کبھی پاؤں پھیلا دیتی ہیں اور کبھی سمیٹ لیتی ہیں لیکن حضورؐ منع نہیں فرماتے!

(۲) آنحضرتؐ نے فرمایا۔ جنت تمہاری ماں کے پاؤں تلے ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ میں نے جہنم کو دیکھا تو اس میں اکثریت عورتوں کی تھی (بخاری) گویا قرآن نے عورت کو اتنا اونچا درجہ دینے کے بعد خود ہی گرا دیا۔

پھر احادیث میں ایسی باتیں ملتی ہیں جنہیں عقل انسانی قبول نہیں کر سکتی، مثلاً:—

(۱) ابن عمرؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو، اس لئے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے (بخاری)

کیا کوئی یورپین اس حدیث کو پڑھنے کے بعد قبول اسلام پر آمادہ ہو سکتا ہے؟

(۲) ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ غروب آفتاب کے بعد رسول اکرمؐ نے مجھ سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ غروب کے بعد آفتاب کہاں چلا جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سورج بعد از غروب خدائی تخت کے نیچے سجدہ میں گر جاتا ہے رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے چنانچہ اسے مشرق سے نکلنے کی دوبارہ اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اسے اجازت نہیں ملے گی اور حکم ہوگا کہ لوٹ جاؤ جس طرف سے آئے ہو۔ چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے نکلنا شروع کر دے گا (بخاری)

(٣) حضرت عمرؓ ابن الخطاب فرماتے ہیں کہ اللہ نے محمدؐ کو رسول بنا کر بھیجا اور اس پر ایک کتاب نازل کی جس میں آیتِ رجم موجود تھی (بخاری)

ایسی احادیث کو پیشِ نظر رکھ کر، کیا علما حضرات حق بجانب ہیں کہ کوئی ذرا سا بھی شک کا اظہار کرے، یا یہ کہے کہ تحقیق ضروری ہے تو کفر کا فتویٰ صادر کر دیں

نیز اس چیز کی بھی تشریح کیجیے کہ اگر حدیث میں تحقیق کی جاوے تو کس معیار کو سامنے رکھا جائے گا؟ صحیح یا غلط حدیث کو آپ کس کسوٹی پر پرکھیں گے؟ کیا صرف راوی کی سند پر ہی اکتفا کیا جائے گا یا اور کوئی کسوٹی بھی پیشِ نظر ہوگی؟

آپ نے حدیث کو سائنٹیفک طور پر پیش کرنے کی جس ضرورت کا اظہار فرمایا ہے اس کی اہمیت سے کوئی عقلمند مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ یہ کرنے کا ہے کام اور اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ صحیح اسلامی انقلاب پیدا کرنے کے لئے اس کام کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم اس کی اہمیت کو ابھی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وسائل کے محدود ہونے کے باوجود اس کے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ــــــ اگرچہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ مشکلات کے اندر یہ کام کب تک ہو سکے گا؟

مجھے اس امرِ واقعہ کا پوری طرح احساس ہے کہ بعض لوگ حدیث کے معاملہ میں ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں وہ اس پر کسی کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوتے، ہر حدیث جو حدیث کی کسی کتاب میں داخل ہوگئی ہے ان کے نزدیک ہم پایۂ وحی بن گئی ہے۔ لیکن یہ آپ دیکھیں یہ حال صرف اُن لوگوں کا ہے جو حدیث کے لئے اپنے اندر تعصب تو رکھتے ہیں لیکن حدیث کا علم نہیں رکھتے۔ حدیث کا علم رکھنے والے ہمیشہ جرح و تنقید کے عادی رہے ہیں، بلکہ یہ کہنا ذرا مبالغہ نہیں ہے کہ حدیثوں کو جانچنے پرکھنے کے لئے جو اہتمام انہوں نے کیا ہے، تمام کسی اور چیز کے لئے کسی گروہ نے بھی نہیں کیا تاہم احادیث کی مزید جانچ پرکھ کی ضرورت ہوتی ہے اس ضرورت سے ہرگز انکار نہیں کیا جاتا۔

لیکن جہاں مجھے اس ضرورت کا اعتراف ہے وہاں میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آج جو لوگ حدیثوں پر مخالفانہ تنقید کرتے ہیں۔ ان میں بلا استثنا ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس فن کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو۔ یا جس کے اندر اس کے سمجھنے کی معمولی صلاحیت ہی ہو۔ کچھ غیر ذمہ دار قسم کے لوگ جن کو نہ حدیث کی خبر ہے، نہ قرآن کی، محض چند سنی سنائی باتوں کو لے کر آج حدیث پر تنقید کرنے بیٹھے اور گمراہ کر رہے ہیں اُن بے چاروں کو جو اپنے علم و مطالعہ کی کمی کی وجہ سے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ بھی اسی طرح کے فتنہ پھیلانے والوں سے متاثر ہو کر حدیث کے خلاف بدگمانیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ اگر آپ خود ان پر غور کرتے تو بڑی آسانی سے ان کا صحیح پہلو متعین کر لیتے مجھے اندیشہ ہے کہ آپ جتنا شوق ان پر اعتراض کرنے کا رکھتے ہیں، اتنا ان کے سمجھنے کا نہیں رکھتے،

آپ نے جن حدیثوں کو قرآن کے خلاف ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے وہ ہرگز قرآن کے خلاف نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی موجود

• • •

٭ مولانا نے بظاہر تو بڑے سادہ سے طریق سے ایک حقیقت معلوم پیش کی ہے لیکن منکرینِ حدیث کے دورِ مناظرہ میں جا کر جب اس کے ساتھ صغریٰ و کبریٰ لگے گا تو نتیجہ یہ بر آمد کر لیا جائے گا کہ دیکھیو! یہ شخص کہتا ہے کہ میں ہوں مزاج دانِ نبوت!

نہیں ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ روزہ رکھ کر میاں بیوی ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے' یا ایک بستر میں لیٹ نہیں سکتے یا ایک دوسرے کا بوسہ نہیں لے سکتے۔ یا دونوں ہم آغوش نہیں ہو سکتے۔ ممانعت جس چیز کی ہے وہ وطی کی ہے۔ باقی چیزیں شوہر کے لئے مباح ہیں۔ بشرطیکہ وہ اتنا کمزور آدمی نہ ہو کہ ذرا سی تحریک سے آپے سے باہر ہو جانے والا ہو اور اندیشہ ہو کہ اس کے قدم حرام کے حدود میں جا پڑیں گے۔ اگر کوئی شخص اپنے اندر یہ کمزوری محسوس کرتا ہے تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ روزے کی حالت میں بیوی سے دور ہی دور رہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے ایک روایت میں اس کی تشریح فرما دی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے تو اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ روزہ رکھ کر اپنی بیوی کو پیار کرے۔ قرآن نے بیوی کو کہیں بھی نواقض روزہ میں سے نہیں شمار کیا ہے۔ مذکورہ حدیثوں میں "مباشرت" کا جو لفظ آیا ہے اس سے آپ کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ مباشرت سے مراد یہاں جماع نہیں ہے۔ بلکہ محض پاس سونا بیٹھنا اور ظاہری افعالِ محبت ہیں۔

اسی طرح قرآن میں کہیں بھی یہ بات نہیں لکھی ہے کہ حیض کے ایام میں عورت کو اچھوت بنا کے رکھ دیا جائے کہ نہ میاں کو اس کو ہاتھ لگانے کی اجازت ہو اور نہ وہ میاں کو ہاتھ لگا سکے۔ یہودیوں کے ہاں بلاشبہ ایامِ حیض میں میاں بیوی کے لئے اس طرح کی پابندیاں تھیں' لیکن یہ ان کے اصل مذہب سے زیادہ ان کے فقہ کی پیدا کردہ تھیں۔ اسلام نے جو ایک دینِ فطرت ہے اس طرح کی تمام خلافِ فطرت پابندیوں کو ختم کر دیا ہے ـــــ صرف اتنی پابندی رکھی ہے کہ مرد ایامِ حیض میں عورت کے ساتھ جماع نہیں کر سکتا۔ آپ نے حیض کے زمانہ میں عورت سے دور رہنے کی بابت جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس میں دور رہنے سے مراد مجامعت سے پرہیز کرنے کے ہیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اس زمانے میں عورت نجاست کا ایک ڈھیر بن جاتی ہے جس کو گھر سے نکال باہر پھینک دینا چاہئے۔ آپ حضرات پر یہ تعجب ہوتا ہے کہ انکارِ حدیث کے جوش میں آپ لوگوں کو اپنی اس روشن خیالی پر بھی رحم نہیں آتا جس کا اظہار آپ جیسے لوگ عورت کے بارہ میں اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ یا تو قرآن و حدیث سب کا انکار کر کے عورت کی وہ شان بڑھاتے ہیں کہ مرد بھی اس کے آگے گرد ہو کر رہ جاتا ہے' یا پھر ایک حدیث کے انکار کے شوق میں اس کو اس درجہ گرا دیتے ہیں کہ مرد اس کے پاس سے بھی گزر جائے تو آپ لوگوں کے نزدیک گندا اور نجس ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کی جن روایتوں کو آپ نے تضاد کی مثال پر پیش کیا ہے' اس تضاد کو آپ بڑی آسانی کے ساتھ رفع کر سکتے تھے بشرطیکہ آپ اس فن سے کچھ واقف ہوتے۔ ان دونوں روایتوں میں آپ ترجیح کا اصول استعمال کر کے ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوح بھی قرار دے سکتے ہیں اور اگر ذرا سے تامل سے کام لیں تو بڑی آسانی سے ان میں جمع و تطبیق کا قاعدہ بھی چل سکتا ہے۔

ترجیح کا پہلو یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہیں اور وہ خود اپنا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیان کرتی ہیں اور محض ایک دوسرے کا کوئی اتفاقی واقعہ پیش کرتی ہیں' بلکہ اپنا ایک ایسا تجربہ بیان کرتی ہیں جو ان کو بار بار پیش آیا ہے اور جس میں بظاہر کسی غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔ دوسری طرف حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے جس میں متعدد پہلو اس امکان کے موجود ہیں کہ ان کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔ اس وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت اس معاملہ میں ترجیح کے لائق ہے۔

دوسرا پہلو جمع و توفیق کا ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ آپ حضرت ابو ہریرہؓ والی روایت کو اس حالت کے ساتھ مخصوص کر دیں جب کہ کوئی اجنبی غیر محرم عورت بے حجابانہ نمازی کے سامنے آ جائے۔ ایک اجنبی عورت کے بے حجابانہ سامنے آ جانے سے اس یکسوئی طبیعت اور توجہ الی اللہ کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے جو نماز میں مطلوب ہے۔ اس حدیث کو اس حالت کے ساتھ مخصوص کر دینے کے بعد دونوں حدیثوں کے الگ الگ محل متعین ہو جاتے ہیں اور وہ تضاد رفع ہو جاتا ہے جس سے پریشان ہو کر آپ پورے ذخیرہ حدیث کو دریا برد کر دینا چاہتے ہیں۔

جنت کے ماں کے پاؤں نیچے ہونے اور پھر دوزخ میں عورتوں کی کثرت سے متعلق آپ نے جو روایات نقل کی ہیں ان میں تضاد

کا پہلو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلی حدیث میں اولاد کے لئے ماں کی خدمت اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی تشویق و ترغیب ہے اور اس کا اجر جنت بیان کیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک مسلم بیٹے کے لئے ماں کی خدمت کا یہی صلہ ہے۔ عام اس سے کہ ماں کافرہ ہو یا مومنہ ۔۔۔ اور دوسری حدیث میں عورتوں کی بعض عام بیماریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو مردوں کے بالمقابل عورتوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں اور جن کے سبب سے دوزخ میں ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔ ان دونوں حدیثوں میں دو بالکل الگ الگ حقیقتیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں تضاد کا کیا سوال ہے؟ کہیں آپ نے جنت کو ماں کے پاؤں کے نیچے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں سمجھا ہے کہ جنت عورت کی تحویل میں دیدی گئی ہے وہ جس کو چاہے جنت میں داخل کرے اور جس کو چاہے جنت سے محروم کر دے۔ اور یہ مطلب لے کر آپ اس میں اور دوسری حدیث میں تضاد پیدا کر رہے ہوں؟ اگر یہ بات ہے تو اس میں حدیث کا کوئی قصور نہیں ہے۔ سارا قصور آپ کے فہم کا ہے۔

جن حدیثوں کو آپ نے خلاف عقل قرار دیا ہے ان میں بھی کوئی بات خلاف عقل نہیں ہے۔ ہر بات بالکل عقل کے مطابق ہے۔ بشرطیکہ ایک شخص کے پاس خود اپنی گرہ کی عقل ہو اور وہ اس کی تعبیرات حقائق کے سمجھنے کے لئے استعمال کرنے کا ذوق اور سلیقہ رکھتا ہو۔ میں پورا اطمینان رکھتا ہوں کہ اگر کوئی عقلمند یورپین اس حدیث کو پڑھے گا تو ان کا کوئی نہ کوئی صحیح محمل وہ ضرور نکال لے گا؛ البتہ ہمارے اندر کے جو یورپ زدہ ہیں وہ بے سمجھے بوجھے اس طرح کی باتوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

میں بعینہ ان حدیثوں پر بحث کرنے کے بجائے یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے چند اصولی باتیں رکھوں جن سے آپ اگر چاہیں گے تو اس طرح کی حدیثوں کو سمجھنے میں مدد لے سکتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ان میں بعض اہم حقائق کی تعبیر کی گئی ہے۔ اس وجہ سے ان کو ظاہر پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے

دوسری یہ کہ جس طرح قرآن میں بعض باتیں از قبیل متشابہات ہیں۔ اسی طرح حدیث میں بھی بعض باتیں از قبیل متشابہات ہیں اور ان کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہونا آدمی کے لئے فتنہ سے خالی نہیں۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت پر اطمینان ہے تو محض اس وجہ سے ان کا انکار کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ آپ کے علم و ادراک سے مافوق ہیں۔

تیسری یہ کہ ہمارا علم محدود ہے، اس وجہ سے ایک شے کے ایک پہلو کو دیکھ کر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس اس کا یہی ایک پہلو ہے حالانکہ اس کے بے شمار پہلو ہو سکتے ہیں جس سے ہم بے خبر ہو سکتے ہیں اور تنہا وہی ان کا احاطہ کر سکتا ہے جس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

ان باتوں کو سامنے رکھ کر اب حضرت ابوذر والی روایت پر غور فرمائیے کہ ان میں سے کون سی بات ہے جس کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ غروب کے بعد سورج خدا کے تخت جلال کے آگے سجدہ میں گر جاتا ہے؟ کیا قرآن میں یہ حقیقت نہیں بیان ہوئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے۔ اور یہ کہ رات میں ہر چیز کا سایہ خدا کے آگے سربسجود رہتا ہے اور آفتاب کے طلوع کے ساتھ ہی اٹھنا شروع ہوتا ہے اور پھر اس کے رکوع و سجود کے ساتھ ہر چیز رکوع و سجود کی حالت میں ہو جاتی ہے؟ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا سورج کو مشرق سے طلوع ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دے گا اور سورج کو اس حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی؟ آخر آپ کو ان حقائق سے کن وجوہ کی بنا پر انکار ہے؟ کیا محض اس بنا پر کہ آپ ظاہر میں ایسا نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو یہ تو محض ایک منفی پہلو ہے، اثباتی طور پر آپ نے اس سلسلہ میں کیا تحقیقات فرمائی ہیں؟

حضرت عمرؓ بن خطاب کی جس روایت کا آپ نے حوالہ دیا ہے اس پر کچھ اضطراب ہے اور اس کو ماہرین فن نے خود محسوس کیا ہے لیکن یہ اضطراب پورے ذخیرہ حدیث کی بے اعتباری کا ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ احادیث کو نقد و نظر کے ساتھ قبول کرنا چاہئے۔

احادیث کے نقد و نظر میں اہلِ فن نے صرف سند ہی کو معیار نہیں قرار دیا ہے بلکہ متعدد دوسری چیزوں کو بھی قرار دیا ہے۔ لیکن میں ان چیزوں کا بیان کرنا یہاں غیر ضروری سمجھتا ہوں، اس لئے کہ ان چیزوں کا علم ان لوگوں کے لئے مفید ہے جو باقاعدہ فنِ حدیث سے واقف ہوں جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ فنِ حدیث تو درکنار سرے سے عربی زبان ہی سے ناواقف ہیں محض سنی سنائی باتوں کی بنا پر حدیث پر تنقید کرنے بیٹھ گئے ہیں ان کو تنقیدِ حدیث کے معیارات معلوم ہونے سے پہلے عربی زبان، قرآن مجید اور حدیث کی واقفیت ضروری ہے اور میں آپ کو یہ مشورہ دونگا کہ آپ پہلے یہ واقفیت بہم پہنچائیں۔

از قلم جناب مولانا امین احسن اصلاحی

بھونرے کتّے

آپ کی نظم بھونرے کتّے پڑھ کر میں نے اپنے دل میں ایک خلش محسوس کی جس کی بنا پر میں آپ کو یہ خط لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں آپ نے مئی ۱۹۵۲ کے پرچہ میں بھی "میں نہیں چاہتا، مگر ــــ" کے عنوان کے تحت ایک اسی قسم کی چیز لکھ دی تھی۔ ایسی چیزیں تحریر کرنا اسلامی اخلاق اور آپ کے وقار کے منافی ہیں (یہاں چند اقتباسات نقل کئے گئے ہیں)۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو سچی بات یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کا نہایت بُرا نمونہ ہے جسے ہم دوسروں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

میں نے یہ خط محض جذبہ ہمدردی و اصلاح کے تحت تحریر کیا ہے۔

ہمارے ادبی ارتقا میں جو رکاوٹیں ہیں اُن میں سے ایک رکاوٹ ایسی ہے کہ جس کی طرف یہ خط خواہ مخواہ متوجہ کرتا ہے وہ یہ کہ ہمارے اندر سے کسی نہ کسی طرح زور کر کے ادیب و شعرا تو ابھر سکتے ہیں مگر اُن غریبوں کو اہلِ ذوق کا حلقہ کون پیدا کر کے دے اور کہاں سے دے۔ ہمارے بعض لکھنے والوں کی تخلیقی حِس محض اسی وجہ سے مرجھا کے رہ گئی ہے کہ ان کو روز "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" کی حالت سے سابقہ پیش آتا ہے۔ خود میرا حال یہ رہا ہے کہ میں نے جب کبھی بھی کوئی اہم چیز لکھی کہ جس میں کسی پہلو سے گہرائی تھی تو بس اس جذبے سے لکھی کہ "نیکی کر دریا میں ڈال"! میں برابر دنیائے ادب میں نیکی کرتا ہوں اور دریا میں ڈال دیتا ہوں۔ کبھی یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اپنی ہر نظم اور اپنے ہر افسانے کے ساتھ خود ہی ایک تشریح بھی لکھ کر چھپوایا کروں، یا کسی رفیقِ ادب کی خدمات اس مقصد کے لئے مستعار لوں کہ میں جو کچھ لکھوں وہ اس پر حواشی لگا دیا کریں ورنہ جانے میں کیا لکھوں لوگ اس سے کیا سمجھا جائے ـــــ در آنحالیکہ یہاں تنقید اور خصوصاً خیر خواہانہ تنقید کا بے حد و نہایت حق ہر شخص کو ہر دائرے میں حاصل ہے۔ اُس دائرے میں بھی جس میں اُس نے کبھی کاوش نہ کی ہو!

اب اسی نظم کو لیجئے۔ اس کے عنوان پر میں نے کم از کم دس بارہ گھنٹے غور کیا ہے اور بہت سوچ سمجھ کر اسے تجویز کیا ہے۔ پھر لکھنے کے فوراً بعد اشاعت کے لئے نہیں دی گئی بلکہ کئی روز تک زیرِ غور رہی ہے حلقہ ادب اسلامی لاہور میں پڑھی گئی ہے بعض احباب کو سنائی گئی ہے ان سارے مراحل سے گزرنے کے بعد جب یہ کتابت کو گئی ہے تو میں پوری طرح مطمئن تھا کہ اس میں فنی پہلو سے سقم ہوں تو ہوں، اور کوئی پہلو قابلِ گرفت نہیں ہے لیکن ہمارے بعض رفقا ہیں کہ ان کے لئے "بھونرے کتّے" کا عنوان ناقابلِ برداشت ہوا۔ اب بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ یہ عنوان کس بنا پر اختیار کیا گیا۔ میرے سامنے جو کردار تھا میں نے گھنٹوں غور کیا کہ اسے کس نام سے موسوم کیا

کہ اس کی ٹھیک ٹھیک تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اور وہ جس نفرت کا مستحق ہے وہ اس نام کے ذریعہ ذہنوں میں فوراً ابھرے اور معاشرے میں اس کا ایسا تصور پھیلا دیا جائے کہ آئندہ اس طرح کے کردار کے لئے فضا ناسازگار ہو جائے چنانچہ پورے غور و فکر کے بعد اس کردار کو میں نے "بھوسے کتے" کا نام دیا۔ جہاں تک اسلامی اخلاق کا تعلق ہے میں نے پورا غور کر لیا تھا کہ اس طرح کے حالات میں قرآن نے بھی انسانی کرداروں کے بعض ایسے ہی نام تجویز کئے ہیں۔ اس نے بعض سیرتوں کی تصویر سامنے لانے کے لئے "زبان لٹکائے بھونکے کتے" کا نقشہ پیش کیا ہے اور بعض کے لئے کتابیں لدے گدھے کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس سے فی نفسہ کسی گھناؤنے کردار کے لئے گھناؤنا تشبیہی نام تجویز کر دینا کوئی خلافِ اسلام حرکت نہیں ہے۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ اسلامی اخلاق کا تقاضا ہر جگہ نرمی اور انکساری کا نہیں ہوتا، بلکہ حسبِ موقع شدت و غلظت اور نفرت و حقارت بھی اسلامی اخلاق کا تقاضا ہوتے ہیں۔ وہ اخلاق کہ جس میں شدت و نفرت کی جگہ بھی نرمی و انکسار کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ جوگ اور تصوف کا اخلاق ہو گا' اسلام کا نہیں!

لیکن یہ بات شاید یوں سمجھ میں نہ آئے' اس لئے میں سیدھا سا ایک سوال کرتا ہوں کہ اگر کسی رات کو جو آپ کے پڑوسی کے گھر پڑیں یا کوئی شخص کسی راہ چلتی باعصمت خاتون کی نقاب پر ہاتھ ڈال دے تو آپ کا اسلامی اخلاق وہاں کیا کرے گا؟ اگر تنے پر بھی بات واضح نہ ہوں تو پھر میں سوال یہ کروں گا کہ بھوسے کتے جس واقعہ سے تاثر کا نتیجہ ہے وہ اگر خدانخواستہ خود آپ پر گزر جاتا تو آپ کا اسلامی اخلاق کیا کرتا! ——— اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے اس واقعہ کو بالکل اسی طرح محسوس کیا ہے کہ جیسے (خدانخواستہ) خود مجھی پر گزرا ہے اور کم ہی نظمیں ہیں جن کے پیچھے ایسی تمھی ہوں گی جن کے پیچھے اتنا اضطراب کام کر رہا ہو جتنا اس نظم کے پیچھے کام کر رہا تھا۔ محتمل ایک تاثر کی آگ میں جلنے کے بعد میری روح نے ایک فریاد کی ہے جسے آپ نے بھوسے کتے کے عنوان سے ملاحظہ فرمایا ہے۔

للہ! اسے پھر پڑھ کر دیکھئے! یہ نری شاعری نہیں۔ یہ کچھ اور بھی ہے اُس کچھ اور کو آپ نے محسوس نہیں کیا!

میرا خیال ہے کہ آپ اپنی رائے پر نظرِ ثانی فرمائیں گے۔ یوں مجھے آپ کے حسنِ نیت اور جذبۂ خیر خواہی پر کبھی بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی جزا بہرحال آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گی۔ (نعیم صدیقی)

فضول مضامین

چراغ راہ ستمبر ۱۹۵۲ء میں چارلس ڈبلیو ٹلیس کا کیس شائع ہوا ہے۔ اس کا فائدہ میں نہیں سمجھ سکا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اسلامی جرائد میں فضول مضامین چھپنے نہ شروع ہو جائیں۔

در اصل مضامین کی نوعیت اور ان کے معیار اور ان کے مقاصد میں جس طرح بڑا فرق ہوتا ہے اسی طرح پڑھنے والوں میں بھی بڑا ذہنی اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات ایک چیز جو اکثر لوگوں کو بڑی قابل قدر معلوم ہوتی ہے بعض کی نگاہوں میں بالکل خرافات ہوتی ہے۔ [illegible] برعکس۔ مذکورہ بالا کرداری خاکے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نفسیاتِ انسانی کا داخلی تناؤ کس طرح آدمی کی پوری سوشل اور اخلاقی [illegible] کو تباہ کر دیتا ہے بخصوصیت سے وہ لوگ جو اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے دنیا کے خزانۂ مسرت میں سے اپنا فطری حصہ خود حاصل [illegible] کرسکتے کس طرح ان کا ذہن دنیا بھر کے مقابلے میں حسد کے غیر شعوری جذبے سے بھر جاتا ہے یہاں تک کہ ان کی صلاحیتوں کا قافلہ انسانیت کی تباہی کی اسکیموں کی وادیوں میں کھو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ان کی روح کے دروازے پر بھلائی

کی کچھ قوتیں دستک دیتی رہتی ہیں لیکن وہ کبھی ان کے لئے کواڑ نہیں کھولتے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دستک اس کو کبھی چین نہیں لینے دیتی ۔

اس طرح کے خاکوں میں تجزیۂ نفس جو کچھ بھی کیا جاتا ہے وہ انسانی فطرت کی پیچیدگیوں کی وضاحت کے لئے کیا جاتا ہے اس کی افادیت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسے علم تشریح وظائف اعضا کی !

مذکورہ بالا خاکے میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ فرائڈ کے نظریۂ تجزیۂ نفس کی ڈگر سے ہٹ کر سوچا گیا ہے۔ بلکہ اسکی صاف صاف تردید کی گئی ہے۔ اس وجہ سے یہ خاکہ ہمارے طلبائے نفسیات کے لئے فرائڈ کی ذہنی غلامی کے خلاف زور کرنے میں مدد دینے والا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ فرائڈ کی فکر دور حاضر کا ایک تراشیدہ بت ہے۔

پھر اس کی اشاعت سے ہمارا مدعا یہ بھی تھا کہ اپنے ملک کے سامنے غیر ملکی ادب کا ایسا نمونہ لائیں کہ جو ان کو بتائے کہ ادب میں بے شمار نئے راستے نکالے جا سکتے ہیں ایسے راستے کہ جو گندگی سے پاک ہیں۔ جیلانی صاحب نے ترجمہ میں اصل کا پورا زور منتقل کر کے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے مگر وہ نام اور ماحول بھی بدل دیتے تو بالکل مقامی رنگ چھا جاتا۔

امید ہے کہ آپ دوبارہ اسے پڑھیں گے تو آپ ذہانت اور معقولیت سے لبریز پائیں گے۔

نعیم صدیقی

بقیہ ڈھمک ڈھم

اب امام مسجد صاحب تعویذ گنڈے اور دم درود سے اسکی جان بچانے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ الوزی کی حالت آج پہلے سے خراب ہے۔ کمزوری کا دورہ بہت جان لیوا ہو گیا ہے۔ بخار تیز تر ہے، سر مارتا ہے، کروٹیں بدلتا ہے، اور امام صاحب برابر دو گھنٹے سے دم پڑھ رہے ہیں۔ آج ایک مصیبت اور بھی تو کرم بخش نے بھگتی ہے۔ بے چارے کی کچھ بکریاں ایک دشمن نے کانجی ہاؤس پہنچا دی تھیں۔ دشمنی یہ تھی کہ کرم بخش نے اپنی برادری کے امیدوار کو ووٹ دیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ناکام ہو گیا۔ اور مخالف برادری کا امیدوار بازی لے گیا۔ اب اس کے آدمی بدلہ لینے کے لئے ایک ایک کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کرم بخش نے بکریاں چھڑانے کے لئے دس روپے کی رشوت بھی ادھار دے کر دی ہے اس لئے آج وہ زیادہ تھکا ہوا آ رہا ہے ——— بعد میں الوزی کی حالت غیر ہو رہی ہے:

ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ——— کل لوکائی سن لو!

ڈھولی ڈھول پر چوبیں مارنے کے ساتھ ساتھ سر ہلاتا ہے۔ پھر چیختا ہے، اور بچوں کی فوج اس کے جلو میں گلیاں ناپ رہی ہے۔

ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ——— کل لوکائی سن لو! ———

اللہ کے دار ساب بندہ بھیج کے حکم ڈالے ۔ سارا پنڈ تعمیرات آئے دہاڑے آزادی دا جشن مناؤ چین نال
آیاں ساریاں جھنڈیاں لاؤ جلوس کڈھو ڈھول ڈھمکے دا انتظام کرو نالے راتیں کوٹھیاں اتے دیوے بالو
——— کوئی چیں میں نہیں سنی جاوے گی ———
ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ڈھم ——— ڈھمک ——— کل لوکائی سن لو!

اقبال کا تضاد

فروغ احمد

(۱)

یہ کوئی نیا عنوان نہیں ہے۔ اس عنوان پر اقبال کی زندگی ہی میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کے بعد تو کثرتِ تعبیر یا "اقبالیات" کا مترادف سی بن کر رہ گیا۔ سوال یہ ہے کہ اقبال کا تضاد فی نفسہٖ تضاد ہے۔ یا اس کی حقیقت محض ناظرینِ اقبال کی انفرادی حیثیت ہے میں فی الحال دوسری صورت کو آئندہ کسی موقعہ کے لئے ملتوی رکھتا ہوں اور اقبال کے فی نفسہٖ تضاد کی حدود اربعہ متعین کرتا ہوں۔

اس سلسلہ میں یہ بات ناظرین کرام پر واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ وہ خالص علمی مباحث جو مجرد علمی ہونے کے باوجود ملت کے عمرانی اور حیاتی عوامل سے متعلق ہوں۔ جذباتیت کے متحمل قطعاً نہیں ہوتے۔ ناقدین کو جذبات اور جذباتیت میں وہی فرق سمجھنا چاہئے۔ جو خود عقل اور عقلیت میں ہے۔ ہمیں جذبانیت اور عقلیت دونوں سے یکساں احتراز کرتے ہوئے جذبات و عقل کا صحیح امتزاج پیش کرنا چاہئے عمرانی اور حیاتی مسائل پر قلم اٹھاتے وقت ہم اپنے جذبات کو (rationalise) کرتے ہوئے سائنٹیفک استدلال (جلکہ ہو سکے تو اعداد و شمار اور حیاتی اعتراف) سے کام لے سکتے ہیں۔ یہ بات اتنی شدت سے میں اس لئے لکھ رہا ہوں۔ کہ انتہا پسندی اور افراط و تفریط ہمارے ناقدین کے یہاں عام ہوتی جا رہی ہے۔ ہفت روزہ کوثر کے پچھلے شماروں میں اقبال پر جو مقالے آئے ہیں ان میں کوثر نیازی اور عاصی ضیائی کے مقالے اس اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کوثر کی اقبال شکنی ادا لائقِ احترام ہے لیکن ایک محتاط ناقد کو چاہئے کہ قلم اٹھانے سے پہلے احتسابِ نفس کر لے۔ اسے اپنے نفس کا تجزیہ کر کے یہ اطمینان کر لینا چاہئے کہ کہیں کسی غیر معمولی بیرونی محرک نے کوئی شدید تاثر یا انتہائی جذباتی ردِ عمل تو پیدا نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو بہت ممکن ہے کہ میانہ روی اور حزم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ اور خوب و ناخوب سبھی محاسبہ کی زد میں آ کر باہم گڈمڈ ہو جائیں ——— کوثر نیازی کو میں ہرگز مولویت کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ لیکن یہ کہے بغیر نہ رہونگا کہ آپریشن کرتے وقت انہوں نے بعض غیر ماؤف غدود کو بھی نکال پھینکا ہے۔ اور یہ بات ایک دردمند اور جارحیت جرات کے شایانِ شان ہیں۔ عاصی ضیائی کے مقالے کو شروع کرتے وقت مجھے بڑی تقویت ہوئی کہ "اقبال کے نئے نکتہ چینوں" کو وہ کوئی واضح لائحہ عمل دے سکیں گے لیکن بڑی مایوسی ہوئی یہ دیکھ کر کہ تمہید اور مدعا میں بین تضاد ہے۔ عاصی کو میں جتنا اقبال شکن سمجھا تھا اس سے زیادہ میں نے اسے آخرکار تاویلات کا دعی پایا اور حد یہ ہے کہ انہوں نے ان اشعار کی بھی فقیہانہ تاویل کر ڈالی جن کے متعلق اقبال پرست حضرات بھی جھینپتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہاں اس موقعہ پر اقبال کافی شوخ ہو گئے ہیں"۔

اقبال کے تضاد کو نمایاں کرتے وقت ضروری ہے کہ اس ضمن میں پہلے ہی اپنے نقطۂ نظر کو آپ پر واضح کر دوں۔ نئی سطور لکھنے کی بجائے میں اپنے ایک سابقہ مقالے کے آخری پیراگراف کو نقل کر دیتا ہوں ؎ —

"اقبال معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ خلوص اور متانت کے ساتھ ہم اس کی غلطیوں کی نشان دہی کریں۔ اب

• • •

؎ مطبوعہ چراغ راہ بابت جنوری ۱۹۵۲ء

اس بحث کو ختم ہونا چاہیئے۔ کہ اقبال کے یہ اشعار میرزا غالب کے ان اشعار کے مقابلے میں ایسے ہیں اور ویسے ہیں۔ یا اقبال فلاں فلاں مغربی مفکر سے متاثر ہے۔ اور اس کے فلاں فلاں تصورات نطشے، نشتے وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ کیونکہ معاملہ اب اقبال کی حد تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس کا پیام اور اس کے افکار ایک پوری ملت پر اثر انداز ہو چکے ہیں۔ اس لئے اب نئے ناقدین پر بالکل نئی ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں۔ اب وہ اقبال کی شخصیت یا اس کی ذاتی خصوصیات سے بحث کر کے فنی حاشیوں میں مبتلا نہیں رہ سکتے۔ اب تو انہیں اقبال کے پیام اور کلام کو انہی عمرانی قدروں کے معیار پر جانچنا اور پرکھنا ہے جن کا وہ خود علمبردار تھا۔ اور قدریں اس کی ذاتی ملکیت نہیں۔ بلکہ اپنا تاریخی اور عمرانی مقام رکھتی ہیں۔ انہی ابدی قدروں کی بدولت اس کا پیغام ایشیا کی ایک کثیر آبادی کے بخت خفتہ کو بیدار کر رہا ہے۔ وہیں اب ایک ایک مقام پر انگلی رکھ کر یہ بتانا ہے کہ اسلامی معیار قدر کے اعتبار سے یہاں یہ نقص ہے۔ اور یہاں یہ خامی ہے یہاں اقبال کا تصور نہایت واضح اور روشن ہے۔ اور یہاں اس کا فکر مبہم اور دھندلا ہے۔ تضاد اور تناقض اس مقام پر ہے۔ اور توافق و سلامتی اس جگہ۔ بے شعوری میں الحاد و زندگی کے چند جراثیم یہاں گھس آئے اور یہاں اس کی اسلامی بصیرت کے سفید دانوں نے ان مہلک دانوں کو ہضم کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان میں ملحدانہ اور فاسقانہ تحریکیں اقبالیات ہی کے بعض مبہم نقوش سے اپنے سانچے تیار کر رہی ہیں۔ اور دوسری طرف اسلامی نظام کی تحریک کو بھی اقبالیات ہی کے واضح افکار سے تقویت حاصل ہو رہی ہے کیا یہ ضروری نہیں کہ ان مبہم نقوش اور واضح افکار کی انتشار پرور دورنگی کا خاتمہ کیا جائے؟ ۔ ۔ ۔"

چنانچہ آج اسی مقصد کے پیش نظر اقبال کے تضاد کا مختصر سا ابتدائی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے میں اقبال کے فنی نقص تضاد کو دو ابواب میں تقسیم کرتا ہوں:۔

(۱) مواد کا تضاد

(۲) زندگی اور ادب کا تضاد

(۱) مواد کا تضاد

اقبال کے مواد کا تضاد اس کے چند اقتباسات یا ایک آدھ تصنیف کو پڑھ لینے سے متحقق نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اقبال کی نظم و نثر کا بیشتر حصہ ہماری نظر کے سامنے ہو۔ ناظر کی عینی (Subjective) حیثیت سے قطع نظر ایک (normal) قسم کے شاہد کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اقبال کا فکر غالب مقدار اور شدت دونوں اعتبار سے واضح اور نمایاں ہے۔ اس کے کم تر نقوش ایسے ہیں۔ جن پر شاعرانہ ابہام کی دھندلاہٹ چھائی ہوئی ہے اور ظاہر بات ہے کہ من حیث الکل اقبال کی حیثیت اس کے فکر غالب کی بنا پر متعین ہوئی۔ نہ کہ چند دھندلے نقوش کی بنا پر (اِنَّ الحَسَنَاتِ یُذھِبْنَ السَّیِّئَات) انعام الرحمن کے مضمون "اقبال کیا تھا؟" (مطبوعہ معیار میرٹھ بابت دسمبر ۱۹۵۳ء) کے مرکزی خیال سے مجھے اتفاق ہے لیکن اقبال کے تضاد کی گتھی کو سلجھانے کے لئے اقبال کے "ذہنی ارتقاء" یا اس کے "گوناگوں حادثات کے امتزاج" والا نظریہ حرف آخر معلوم نہیں ہوتا۔ پیام اقبال کے مواد کا تضاد صرف منظوم مواد کے تضاد کا مترادف نہیں۔ اس کی تعلیں اس کے مقالے، خطبے، مکاتیب کے خطوط — اس کا سرمایہ ہمارے احتساب کی زد میں ہونا چاہیئے۔ خط میں شخصیت کا پورا اظہار ہوتا ہے نظم میں وجدان و مقاصد یا شعور اجاگر ہوتا ہے۔ ہم ایک کی خاطر دوسرے کو ترک نہیں کر سکتے۔ شخصیت، وجدان اور شعور تینوں ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ ۔ ۔

اقبال کے سلسلے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کہیں بھی شخصیت، وجدان اور شعور کی باہمی آمیزش سے عاری ہوا ہے۔ میں نے اس حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے حسب ذیل فارمولا اختیار کیا ہے:-

اقبالیت = اسلام {شاعری + فلسفہ + تفریح} ٭

اقبالیات کے مجموعی مواد کو بھی اور اس کی ایک ایک صنف کو الگ الگ بھی اسی فارمولے پر جانچا جا سکتا ہے کہیں اقبال خالص فلسفی نہیں ہے، نہ خالص شاعر ہے نہ خالص مسلمان، نہ مقالوں میں، نہ نظموں میں، نہ خطوط میں اور جہاں جہاں ہم اس کے عنصر فلسفہ کو چھانٹ کر علیحدہ کرتے ہیں۔ وہ نرا فلسفہ نہیں ہوتا۔ بلکہ تفریح کا ایک آدھ سالمہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ بیشتر وہ اسلام کی قدر غالب اور عناصر شعر و فلسفہ کے نازک امتزاج کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ لیکن اگر شعر و فلسفہ کی ترکیب کا غلبہ زیادہ ہو جاتا ہے تو اسلام کی قدر دب جاتی ہے اگر صرف عنصر شعر کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ تو اسلام کی قدر کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ اور اگر فلسفہ کا عنصر حاوی ہوتا ہے۔ تو شعریت پھیکی پڑ جاتی ہے اور اسلام بھی "فقط اک مسئلہ علم کلام" بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ کمی بیشی اور یہ نیرنگی و گوناگونی کم و بیش اور گوناگون تضاد کے اسباب ہیں۔ اگر ناقد کے ذہن میں مذکورہ بالا فارمولا موجود ہو تو وہ ایسے کسی تضاد پر سراسیمہ یا متحیر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ اسی فارمولا کی مدد سے اس تضاد کی معقول توجیہہ کر سکتا ہے۔ اور اس کی ماہیت کی تشریح کر سکتا ہے۔

یہ بات کہ اقبالیات کے بنیادی عناصر ترکیبی کی نیرنگی کے کیا بنیادی اسباب ہیں یقیناً غور طلب ہے۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ اس سلسلہ میں خارجی اور داخلی دونوں ہی اسباب کارفرما رہے ہیں۔ بیرونی قومی محرکات و ہیجانات اور داخلی عدم توازن اور خطاء و نسیان نے جا بجا اقبال کو اس کے پیامبرانہ اور مصلحانہ خط اعتدال سے منحرف کر کے کبھی رندانہ و ملحدانہ بھول بھلیوں میں اور کبھی متکلمانہ اور خطیبانہ بیچاک میں گم کیا ہے۔ اس کا خط اعتدال وہی ہے جو اس کی دینی بصیرت، فکری صوابدید اور شعری وجدان کے ساتھ ساتھ خارجی ہیجانات کے مقابلے میں داخلی سلامت روی سے بنتا ہے۔ ہمیں سوائے اس کے کچھ نہیں کرنا ہے۔ کہ پوری شرح و بسط کے ساتھ ہم اس کے خطوط اعتدال اور خطوط انحراف کا جائزہ لیں۔ یہ بات قابل اطمینان ہے کہ اقبال کے تمام خطوط اعتدال نہایت واضح ہیں۔ اور پورے کینوس پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اس کے خطوط انحراف چند دھندلی دھندلی سی لکیریں ہیں۔ جو بسا اوقات آسانی سے دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ ارباب ذوق اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان پر اپنا اپنا موقلم چلا کر انہیں نکھار لیتے ہیں۔ اگر اقبال کے واضح خطوط اعتدال سے بننے والے واضح نقوش کو الگ مرتب کر لیں۔ اور اس کے مبہم خطوط انحراف سے بننے والے مبہم نقوش کو الگ یکجا کر لیں۔ تو کثرت تعبیر ہا" کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائے۔ میں تمام مخلص ناقدین سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ اس مہم میں ہمارا پورا پورا تعاون کریں تاکہ اقبال پر وہ فیصلہ کن تنقید مرتب ہو سکے۔ جو پچھلے تمام سرمایۂ تنقید پر خط تنسیخ کھینچ کر رکھ دے۔ (باقی)

٭ یہ مساوات بالکل غیر ریاضیاتی ہے۔ کوئی صاحب خیال نہ فرمائیں کہ میں ادب کو ریاضیاتی قدر کی اکائیوں میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں ادب کو صرف نفسیاتی قدر کی اکائیوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جدید ماہرین نفسیات نے اپنے مضمون کا ڈانڈا ریاضیات سے جا ملایا ہے۔ اور ریاضیاتی مسائل (problems) میں بُری طرح اُلجھ چکے ہیں۔ جدید علم النفس سائنس کے زمرہ میں اس طرح داخل ہو رہا ہے جیسے کوئی خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہوتا ہو (ف)

مرا غمِ زمانہ

مسعود جاوید

انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ مگر اس کی مختاری کا دائرہ ایک غیر فطری نظام میں اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ وہ چلا اٹھتا ہے

"یوں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا"

فضا کا حسن، بہار کی تازگی، شباب کی رعنائی اور ہر وہ منظر جس میں مسرت کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو اُسے افسردہ کر دیتی ہے اُس کے احساسات پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ اُس کی یہ غم پسندی اُسے تنہائی کا خوگر بنا دیتی ہے۔ لیکن جب وہ تنہائی سے بھی سکون حاصل کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو مرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ مگر جس طرح جینا اُس کے بس کا نہیں، مرنا بھی اس کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ روتے سسکتے موہوم اُمیدوں کے سہارے، مرنے کی آرزو لئے زندہ رہتا ہے۔ اور جب موت آتی ہے۔ تو بستر مرگ پر ہزاروں خواہشوں کو دل میں لئے بے دوا، بے علاج، تیمارداری کے بغیر تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔ اور جان دے کر زندہ رہنے والوں کے احساس بے چارگی اور جذبہ باشکستگی کو اور زیادہ شدید کر جاتا ہے۔

مسکراتا، مہکتا، کھیلتا ارشد، بے چارگی کی تاب نہ لا سکا۔ پانچ خزاؤں کے بعد ہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ آج سے چار سال قبل جب میں والدین، بھائیوں اور بہنوں کو گریہ کناں چھوڑ کر ان سے بادلِ ناخواستہ جُدا ہو رہا تھا۔ تو وہ امی کی گود میں تصویر حیرت بنا ہوا تھا۔ اُس کی چمکتی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ میں اُس کے تر و تازہ گالوں کو تھپ تھپا کر تیزی کے ساتھ دہلنے سے باہر نکل پڑا تھا۔ اس عزم کے ساتھ کہ پاکستان پہنچنے کے بعد ہر قسم کی مصیبت برداشت کروں گا۔ زمین کھود دوں گا۔ انبار بچوں کا نشہ پا تھ پر سو جاؤں گا۔ اور کسی طرح اپنے عزیزوں کو بے بسی اور بے کسی کے پنجہ سے نجات دلاؤں گا۔

بھارت کے وسیع قید خانہ سے جواب دلوں تک پھیل چکا تھا۔ ماں باپ، بہنوں اور بھائیوں کو نکال کر پاکستان لے آؤں گا ــــ وہ پاکستان جسے میں پھولوں کی سیج، بہاروں کا نغمہ، جنت کا ٹکڑا، اور نہ جانے کیا کیا سمجھ رہا تھا ــــ میرے دل میں آرزوؤں کا ہجوم تھا۔ اور یہ آرزوئیں ارشد کی موت سے پہلے تک زندہ و تابندہ تھیں۔ یہی کہ یہاں ایک خوشنما مکان بنواؤں گا۔ جس کے سامنے پھلواڑی ہوگی۔ عقب میں چیڑ کے اونچے اونچے درخت ہوں گے۔ مکان کے آراستہ کمرے برقی قمقموں کی ہلکی نیلی روشنی سے جگمگا رہے ہوں گے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں پردوں سے اٹھکیلیاں کر رہی ہوں گی۔ بھائیوں اور بہنوں کے پھول سے چہروں سے مکان گلستاں بنا ہوا ہوگا۔ ہر بام و در سے مسکراہٹوں کے پھول جھڑ رہے ہوں گے۔ ارشد ــــ کبھی تو اسکول جانے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ کبھی دوسرے بھائیوں کے ساتھ سبق یاد کر رہا ہوگا ــــ اور پھر ایک دن آئے گا جب ہنستے کھیلتے کالج کی تعلیم ختم کریگا جس میں متانت اور سنجیدگی آ جائے گی۔ وہ مجھ سے ادب اور سیاست پر سردیوں کی راتوں میں آتش دان کے قریب بیٹھا گھنٹوں بحث کیا کرے گا ــــ مگر وہ دن کبھی نہ آیا، یہ سب باتیں اب مجھے دیوانہ کا خواب معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی امید بھی پوری نہیں ہوئی

دن گذرتے گئے ۔ میں ایک تابناک مستقبل کی تمنا میں در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ جب خودداری کو بار بار فروخت کرنے پر بھی کراچی کی عریض و طویل سڑکیں اور شاندار عمارتیں میرے درد کا درماں نہ بن سکیں ۔ تو میں سندھ کے قلب میں چلا آیا۔ مگر یہاں بھی مجھے سکون نصیب نہ ہو سکا، سندھ کے میدانوں کو چھوڑ کر میں میانوالی کے ریگزاروں میں خاک چھانتا رہا۔ مگر یہ صحرا نوردی بھی مجھے آسودگی نہ دے سکی ـــــ اس دوران میں والدین کے دعاؤں سے معمور خط آتے رہے۔ بہنوں اور بھائیوں کی معصوم تمنائیں کاغذی لباس پہن پہن کر میرے دل کو برماتی رہیں ـــــ بھائی میاں ہمیں بھی اپنے ہاں بلا لیجئے ۔ بھائی میاں، ہمارے لئے تعلیم جاری رکھنا مشکل ہو گیا ہے ۔ بھائی میاں آپ کو ہم سے جُدا ہوئے ایک سال ہو گیا۔ دو سال بیت گئے، تین سال گذر گئے ۔ اگر آپ ہمیں نہیں بلا سکتے ۔ تو کم سے کم ایک مرتبہ یہاں آکر مل ہی جائیے ۔ امّی آپ کو یاد کر کر کے روتی ہیں ۔ اعظم پاشا ضد کرتا ہے کہ مجھے منجھلے بھائی میاں کے ہاں لے چلو ۔ بھائی میاں اب ارشد باتیں کرنے لگا ہے ۔ بہت شریر ہے ۔ اُسے آپ کا خیال تو نہیں لیکن وہ بھی پوچھتا ہے ۔ کہ منجھلے بھائی میاں کب آئیں گے ۔

میری آنکھیں خط پڑھ پڑھ کر روتی رہیں۔ دل ناسور میں تبدیل ہوتا گیا۔ نہ میں جا سکتا تھا اور نہ وہ یہاں آسکتے تھے ۔ کیونکہ ہندوستان کی تقسیم اسی لئے تو عمل میں آئی تھی ۔ کہ ماں باپ کو اولاد سے بھائیوں کو بہنوں سے جدا کر دیا جائے ۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان جو زہریلی خاردار باڑ کھینچ دی گئی ہے اُسے پار کرنا نہ میرے بس میں تھا اور نہ اُن کے اختیار میں ۔

کچھ دن بعد بڑے بھائی بھی خاندان کو چھوڑ کر پاکستان آ گئے ۔ اور پھر کچھ دن بعد اور دو بھائی بھی چلے آئے ۔ ماں باپ کی ہمت ٹوٹ گئی معصوم بھائیوں اور بہنوں کے چہرے کملا گئے ۔ چاروں بھائی جن سے خاندان کی امیدیں وابستہ تھیں ۔ تلاشِ روزگار میں پاکستان چلے آئے ۔ مگر چاروں مل کر چار سال میں بھی اتنا نہ کر سکے کہ جان سے زیادہ عزیز رشتہ داروں کو مفلسی، بے بسی اور بے کسی سے نجات دلا سکتے !

دفورِ یاس سے گو دل رہینِ برف و شبنم ہے
کبھی چھپکے پھر آتش فشانی اب بھی ہوتی ہے

تاریک راتوں کی تنہائی میں میں سوچتا ہوں ۔، ارشد تو مر گیا ۔ میں بھی ایک دن گھُل گھُل کر مر جاؤں گا ۔ مگر کیا حالات یونہی رہیں گے ۔ کیا اسی طرح بے بس ماؤں کی گود میں ننھے دم توڑتے رہیں گے ! کیا اسی طرح بھائی بھائی کے فراق میں گھُل گھُل کر موت کے قریب ہوتے جائیں گے ۔ کیا اسی طرح بہنوں کے پھول سے چہرے، خزاں دیدہ پتوں کی طرح زرد پڑتے جائیں گے ۔ کیا ماں باپ اپنے جگر پاروں کے غم میں رو رو کر اسی طرح بینائی کھوتے رہیں گے ۔ - - - - - - - - - - - - - - - - -
کیا انسان یکایک اسی بیچارگی کے پنجے میں اس طرح مقید ہے جس دبے حرکت پھنسا رہے گا ۔ کیا اُسے خدا کی دی ہوئی آزادی واپس نہیں مل سکے گی ۔ یہ غیر فطری، غیر منصفانہ نظام زندگی ختم نہیں ہوگا ؟ ؟

ممکن ہے لاکھوں ارشد اس جابرانہ نظام کا شکار ہو جائیں ۔ ممکن ہے میں اس غیر منصفانہ نظام کی تباہی کا منظر نہ دیکھ سکوں مگر میرے دل کی گہرائی میں ایک مدھم آواز ہے ۔ جو مجھے یقین دلا رہی ہے ۔ کہ ارشد کی موت رائیگاں نہیں جائے گی ۔ کیونکہ یہ درد درد تنہا نہیں ۔ بلکہ غم زمانہ ہے ـــــ اور پھر بے بسی کا شعور ہی تو آزادی کی تمہید ہوا کرتا ہے !!

تعمیر نو

مترجم : ابو ندیم

مسائل ہر قوم کو پیش آیا کرتے ہیں ۔ اور ہر قوم اپنی بصیرت کے مطابق ان کا حل تلاش کیا کرتی ہے ۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ جو پاکستان کے لئے پانچ سال سے درد سر بنا ہوا ہے ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے دوسری قومیں بھی دوچار ہوئی ہیں ۔ زیر نظر مضمون میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مغربی جرمنی کے ایک شہر میں یہ مسئلہ کس طرح حل ہو رہا ہے ۔ اس مضمون میں بہت سی چیزیں ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں ۔ اس مضمون کو پڑھ کر بلا مبالغہ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ کاش اس مضمون سے ہمارے عوام اور حکمران کچھ سبق حاصل کر لیں ۔

مترجم

خوش نصیب شہری

ایلف فلاف کے شہری اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتے تھے ۔ کیونکہ ان کا چھوٹا سا شہر جو جنوب مغربی جرمنی میں درختوں سے ڈھنپی ہوئی ایک پہاڑی کے اوپر واقع تھا ۔ جنگ کی ہولناک تباہی سے صاف بچ گیا تھا ۔ اگرچہ اس کے بہت سے فرزند میدان جنگ میں یا اس روس کے جبری محنت کے مرکزوں میں کام آئے تھے ۔ لیکن جب توپ کی آخری گرج سناٹے میں ڈوب گئی ۔ تو ۶۰۰ سال یہ پرانا شہر ابھی اپنی اسی حالت پر قائم تھا ۔ وہی سلیٹ کی سیدھی ڈھلوان چھتیں اور وہی پتھر اور کڑی کی عمودی دیواریں ۔

پناہ گزیں

تاہم امن کے جلو میں پریشانیاں بھی آ گئیں ۔ روسی دہشت سے خوف زدہ پناہ گزینوں کا ایک سیلاب امڈ آیا ۔ اور ایلف وارف میں آ کر رک گیا ۔ یہ جرمن نسل کے وہ لوگ تھے جو پولستان ۔ ہنگری ، چیکوسلاویکیا اور رومانیہ وغیرہ میں آباد ہو گئے تھے ۔ ان کے پاس کوئی روپیہ پیسہ ، کوئی مویشی ، کوئی خوراک یا کوئی سر و سامان نہیں تھا ۔ رات بھر میں قصبہ کی آبادی ۲،۲۳۰ سے ۵،۵۰۰ ہو گئی ۔

پریشانی

ایلف وارف کے شہری خود بے حد غریب تھے ۔ وہ پہاڑی کے دامن میں گندم ، آلو ، جئی وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی اونچی نیچی کھیتیوں میں صبح شام تک سخت محنت کرتے تو پھر کہیں جا کر انہیں پیٹ بھر کر کھانا میسر ہوتا ۔ ان کے پاس نہ کوئی فالتو بستر تھا ۔ نہ کوئی خالی مکان اور نہ ہی روٹی کا کوئی فالتو ٹکڑا جسے وہ نو واردوں کو پیش کر سکیں ۔

لیکن یہ تو پریشانیوں کا ایک جزو تھا ۔ پشت ہا پشت سے ایلف وراف کے پارسا لوگ لوتھر کے پیروکار تھے اور نو واردوں میں سے مٹھی بھر لوگوں کے سوا تمام کیتھولک فرقہ سے تھے کہ وہ اپنا پادری بھی ساتھ لے کر آئے تھے ۔ فوراً ہی نا ہمواری کے جذبات بھڑک اٹھے ۔ بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کی خبریں جلد ہی ایلف فلاف کے صدر بہتا دو سالہ رئیس نہس نام ہولشر کے کانوں میں بھی جا پہنچیں ۔

رئیس شہر

یہ رئیس ایک نرم دل انسان تھا ۔ اس کا خاندان دس پشتوں سے قریب و جوار کے اکثر جنگلوں اور کھیتوں کا مالک تھا ۔ شہر کے کمانے والے افراد کی نصف تعداد اس کے ہاں ملازم تھی ۔ اہل قصبہ کے ساتھ اس کا برتاؤ فیاضانہ

تھا۔ اور سب لوگ اس کی دانش مندی کی وجہ سے اس کا ادب کرتے تھے۔

ایثار

"ہم اپنے کھانے میں بھوکوں کو اور اپنے گھروں میں بے گھروں کو شریک کریں گے۔" اس نے ایلف والاف کے شہریوں کو اکٹھا کرکے اعلان کیا۔ "جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے ہم ان لوگوں کی مدد کریں گے۔" اور ایک مثال قائم کرنے کے لئے وہ خود پناہ گزینوں کے ۷ خاندان اپنے ساتھ قلعہ میں لے گیا۔ اہل قصبہ نے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے گھر، بستر اور خوراک کے ذخیرے اجنبیوں کے ساتھ بانٹ لئے۔

مذہبی رواداری

رئیس نے ایلف والاف کے نوجوان پادری سے مشورہ کیا اور پھر دونوں نئے پادری کے پاس پہنچے اور اس سے کہا "فرمایئے۔ لوتھر کے پیروکار کیتھولک لوگوں کی کیا مدد کرسکتے ہیں۔ کیا تو وار دپسند کریں گے کہ وہ قصبہ کے قدیم گرجا میں ہی نماز ادا کر لیا کریں۔" نئے پادری نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور پورے دو سال تک مذہبی تہواروں پر کیتھولک پادری نے لوتھری گرجا میں صبح کے وقت نماز پڑھائی اور لوتھر کے پیروکاروں نے اپنی نماز کو پچھے پہر پر ملتوی کر دیا۔ رئیس نے کیتھولک لوگوں سے وعدہ کیا کہ جب موقع ملا انہیں اپنا گرجا بنانے میں مدد دی جائے گی۔

مسائل

کئی اور حل طلب مسئلے تھے مدرسے میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ اس میں نو واردوں کے بچے بھی سماسکیں۔ آب رسانی کے انتظام پر بے حد بوجھ پڑ رہا تھا۔ پناہ گزین بے کار تھے۔ کیونکہ کرنے کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ چنانچہ صدر نے اپنے قدیم اور جدید شہریوں کو قصبے کے چوک میں جمع کیا اور انہیں بتایا کہ اب صدارت کے فرائض مجھ جیسے بوڑھے کی ہمت سے زیادہ ہیں۔ اور یہ کہ نوجوانوں میں سے کئی ایسے ہوں گے۔ جنہیں اس قسم کی ذمہ داری اٹھانے کی تربیت حاصل ہے اور تجویز پیش کی کہ قریب کے شہر ہائیگر لاخ میں افسران بلدیہ کے لئے ایک تربیتی مرکز قائم ہے کیوں نہ اس مرکز کو لکھیں کہ ایلف والاف کے بلدیہ کے لئے ایک صدر کی ضرورت ہے۔

صدر بلدیہ کی تلاش

فوراً ہی شورائے بلدیہ کی طرف سے اس مطلب کا اعلان جاری کر دیا گیا۔ پانچ امیدواروں کی درخواستیں موصول ہوئیں۔ اور ان پانچوں کو قصبہ کے چوک میں لوگوں سے خطاب کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ نوجوان امیدواروں نے باری باری اس مسئلہ کے متعلق کہ ایلف والاف کی تعمیر نو کس طرح ہونی چاہیے۔ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تمام لوگوں نے نہایت غور سے سنا۔

انتخاب صدر اور صدر بلدیہ کے عزائم

ایک مقرر نے لوگوں کو خاص طور سے متاثر کیا۔ یہ ایک دبلا پتلا سیاہ چشم نوجوان تھا جس کی باتوں میں شہریوں کی سی خود نمائی تھی۔ اس نے اخراج آب، آب رسانی مکانات، کام، بستر اور خوراک وغیرہ کے مسائل کے متعلق اپنی تجاویز پیش کیں۔ اور بتایا کہ کس طرح باہمی مفاد کی خاطر لوگ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ تقریروں کے تھوڑی ہی دیر بعد لوگوں نے اس سیاہ چشم نوجوان کو صدر بلدیہ منتخب کر لیا۔ یہ نوجوان ولہلیم شابر ایک سابق فوجی تھا۔ جو ایک سال تک روس کے جنگی کیمپ میں رہ چکا تھا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں ہی اسے کئی چھوٹے چھوٹے بلدیوں کا تجربہ حاصل تھا اور اب اس کے سپرد ایلف والاف کی تعمیر نو تھی۔ صدر بلدیہ شابر کی منصوبہ بندی میں مکانات کا مسئلہ سرفہرست تھا۔ حکومت کے ارباب اختیار سے مدد مانگنے کی بجائے اس نے لوگوں پر زور دیا کہ وہ مکانات کی تعمیر کے لئے ایک نجی نفع آور شرکت کی بنیاد ڈالیں۔ شہر کے بہت سے لوگ اس کے حصہ دار بن گئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی ہمت کے مطابق سرمایہ (یعنی مسالہ یا اوقات محنت کی شکل میں ہو سکتی تھی) کئی کئی حصے خرید لئے۔

تعمیر مکانات جب پہلے ۶ مکانوں پر چھتیں ڈالی جا چکیں۔ تو شرکت کو مزید روپیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ان مکانوں کو گروی رکھ دیا گیا اور بنک اور بلدیہ سے روپیہ قرض لیا گیا۔ اور اب جوں جوں کرایہ وصول ہو رہا ہے۔ یہ قرضہ ادا کیا جا رہا ہے۔ ۹۰ خاندان جن کے اپنے دور افتادہ گھر اشتراکیوں کے ہاتھوں چھن گئے۔ آج کل بالکل نئے مکانوں میں آباد ہیں۔

مسئلہ بیکاری کا حل پناہ گزین اپنے ساتھ کئی قسم کے ہنر لے کر آئے تھے۔ ان میں پارچہ باف، شیشہ گر، اور گلکار بھی تھے۔ ادھر ریلیف دارف کا شہر کئی نسلوں سے محض کسانوں کی ایک منڈی تھی۔ جس میں چند چھوٹی چھوٹی دکانیں، چند سرائیں، دو حماموں کی دکانیں اور کوزہ گروں کی چند مختصر دکانیں تھیں جو سستی طشتریاں بنانے کے لئے آس پاس کے کھیتوں کی مٹی استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ مکانات کی تعمیر کے بعد شاتبر نے روزگار کا مسئلہ لیا۔ اور اس سلسلے میں وہ شہر کے ۱۲۰۰ بالغ باشندوں سے ملنے اور معاملہ طے کرنے کے لئے کئی دن تک اپنی سائیکل پر سوار شہر کی پر پیچ گلیوں میں اوپر نیچے چکر لگاتا رہا۔ اس نے ایک نقشہ مرتب کیا جس میں ہر بالغ مرد اور عورت کا نام مع پیشہ، تعلیم اور تجربہ درج تھا۔ اور پھر اسے اپنے قریب ترین بڑے شہر سٹٹ گارٹ میں لے جا کر مختلف بنکاروں اور صنعت کاروں کو دکھایا۔ اور ان سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ ہم کام کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اور آپ کو ہمارے ہنر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ زنانہ کمربند بنانے والے ایک صنعت کار نے سوال کیا:۔

کمربند "کیا تمہارے پاس چالیس سلائی مشینیں رکھنے کے لئے عمارت اور انہیں چلانے کے لئے ہنرمند عورتیں موجود ہیں؟"
شاتبر نے جواب دیا۔ "جہاں تک عورتوں کا سوال ہے وہ ہمہ تن منتظر ہیں۔ اور جہاں تک عمارت کا تعلق ہے آپ ہمیں بتائیں کہ آپ کو کس قسم کی عمارت درکار ہے اور ہم مہیا کر دیں گے۔"

اور آج سلائی مشینوں کی گھرر . . . گھرر . . . . کی آوازوں سے معمور ایک بالکل نیا کارخانہ کام کر رہا ہے جس میں ۴۰ سے لے کر ۸۰ عورتوں تک کام کرتی ہیں اور جس کا انحصار ہفتہ وار فرمائشوں پر ہے۔

کوزہ گری ہابلیٹ دارف کی مٹی سے آج کوزہ گری کے چار کارخانے چل رہے ہیں جن میں تمام کے تمام پناہ گزین کام کر رہے ہیں۔ اور ان کی مصنوعات مرتبان، قرابے اور چمکدار گلدان مغربی جرمنی کے طول و عرض میں مقبول ہیں۔ اور قصبے کی شہرت میں چار چاند لگا رہے ہیں۔

مرصع سازی نئے شہریوں میں بہت سے لوگ جو چیکوسلاواکیا اور جرمنی کے درمیانی علاقے کے باشندے تھے مرصع ملبوسات تیار کرنے میں ماہر تھے چنانچہ شہر کی مذکورہ شرکت نے ایک اناج گھر کرایہ پر لے کر اس کی اصلاح و مرمت کی اور مشینیں کرایہ پر لینے نیز خریدنے کے لئے لوگوں کو پیشگی دی۔ اور آج ۳۰ مرد اور عورتیں اس تبدیل شدہ عمارت کے اندر مرصع سازی میں مشغول ہیں۔ اور ایک لاری گلوبندوں، انگوٹھیوں، بروچوں اور پنوں وغیرہ جیسے زیورات کا انبار ہفتہ میں تین بار کوئی دس میل دور ریلوے سٹیشن پر لے جایا کرتی ہے۔ شاتبر اکثر اس بات کا افسوس کیا کرتا ہے کہ بدقسمتی سے ابھی ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں کہ ہم ان زیورات پر سونے اور چاندی کی ملمع کاری کر سکیں اور اس لئے مجبوراً ہمیں یہ تمام زیورات تاب کاری کے لئے قریب کے شہر شویبش گمنڈ بھیجنے پڑتے ہیں۔

دوسری صنعتیں ۔ ایک اور دکان میں شیشہ گر لاکھوں رنگین منکے اور نقلی موتی بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ نہایت

عمدہ فرنیچر کی ایک چھوٹی سی دکان بھی قائم ہو گئی ہے اور ایک اور نئی کان میں پولستان کے پارچہ باف سوتی کپڑا بنا کرتے ہیں

نیا گرجا اس اثنا میں کیتھولک فرقہ نے ایک نیا گرجا تعمیر کر لیا ہے۔ اس گرجا کی زمین لوتھری فرقہ کے رئیس نام ہولٹنز کی تھی اور اس کا تمام عمارتی سامان ہر دو عقیدے کے لوگوں کا عطیہ تھا۔ چونکہ مرد روزی کمانے میں مشغول رہتے تھے اس لئے بنیادیں کھودنے، بجری ملانے، پتھر گاڑی دھکیلنے کا کام خانہ کے لئے آنے والی عورتوں نے سرانجام دیا۔ پراٹسٹنٹ فرقہ کے معماروں اور ترکھانوں نے نصف اجرت پر کام کیا اور جب شہتیر رکھنے کا وقت آیا تو قصبہ کے تمام لوگوں نے مل جل کر ایک اتوار کی صبح کو نماز کے بعد یہ کام ختم کر دیا ۔

مدرسے مدرسے میں کئی کمروں کا اضافہ ہو گیا ہے اور کنڈر گارٹن مدرسہ اب ایک نئی دو منزلہ عمارت میں واقع ہے۔ اس عمارت کا ایک بڑا کمرہ قصبے کی تمام تنظیموں کا دارالاجتماع بن گیا ہے۔ رئیس کی سرگرم بیوی کیتھولک اور پراٹسٹنٹ فرقے کی خواتین کی انجمن کی صدر ہے۔ ان عورتوں نے کیک بیچکر اور کروشئیے کا کام کر کے اس عمارت کے لئے پردے اور دیگر سامان آرائش مہیا کیا تھا ۔

رفاہِ عامہ ایلف والف کے قریب بلدیہ کے جنگل میں لکڑہارے عمارتی لکڑی کے درخت کاٹتے اور نئے پودے لگاتے رہتے ہیں۔ چونکہ لکڑی قیمتی ہے اس لئے تمام نئی عمارتیں سیمنٹ کے قالبوں کی بنی ہوئی ہیں۔ لکڑی نقد قیمت پر فروخت کی جاتی ہے۔ اور اس طرح جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ اخراج آب، آب رسانی اور گلیوں کی اصلاح و مرمت پر صرف ہوتی ہے

حصولِ امن آج ریلف والف کے قصبہ میں کوئی شخص بھوکا نہیں۔ مارشل امداد کے لئے درخواست کئے یا اس میں سے ایک پیسہ بھی قبول کئے بغیر سارے قصبے میں ہماہمی ہے۔ اب ہر نئے یا پرانے خاندان کے پاس سر چھپانے کے لئے جگہ ہے۔ ہر ایک برسر کار ہے۔ اب کوئی بیرونی نہیں ہے۔ بلدیہ کے ۱۷ ارکان میں سے ۲ نئے شہری ہیں۔ بوڑھے رئیس، نوجوان صدر، مبلغ اور پادری کی رہنمائی میں لوگوں نے ہمسایہ پروری، دور اندیشی اور محنت کی بدولت کامیابی کو حاصل کر لیا ہے۔ ویل ہیم شا برا اکثر سنجیدگی سے کہا کرتا ہے۔ کہ ہم حصول امن میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

(ریڈرز ڈائی جسٹ ماہ اگست ۵۲ء)

اگلے شمارے کی ایک جھلک

- ایک روسی ادیب اور فلسفی ! (از جیلانی بی اے) ——— افسوس ہے کہ اس اہم مقالے کیلئے اکتوبر کے شمارے میں جگہ نہ نکالی جا سکی!
- کیا حلقہ ادب اسلامی بھی جمود کا شکار ہے ؟ مختلف حضرات ——— اس بحث کو بھی نومبر ۵۲ء کے لیے موخر کرنا پڑا۔
- رشوت کے سدِباب کا طریقہ (سوچ بچار) ———
ملک کا اہم ترین مسئلہ جس پر ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے اور اس کا ایک ایسا جامع اور نتیجہ خیز حل پیش کیا گیا ہے جسے اب تک کوئی نہیں سوچ سکا !
- ہمارا موجودہ اقتصادی بحران (ایک اہم جائزہ) ———

علاوہ ازیں تنقیدی بحث، خطوط، تعارفِ کتب، ادبی اور دیگرہ * اغلباً ایک افسانہ بھی شریکِ اشاعت ہوگا۔

بھوکے ہیں!

نعیم صدیقی

یہ لڑکھڑاتے قدم، سست چال! بھوکے ہیں
کملانے لگتے ہیں، پچکے ہیں گال! بھوکے ہیں
بغیر لفظوں کے کہتے ہیں حال! بھوکے ہیں
جوان و پیر ہوں یا نونہال! بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال! بھوکے ہیں

زمینِ پاک جو غنچے کھلانے والی ہے!
زمینِ پاک جو گندم اُگلنے والی ہے!
زمینِ پاک جو سونا لٹانے والی ہے!
اُسی کے بیٹوں پہ ایسا وبال! بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال! بھوکے ہیں

ہوائیں چلتی ہیں کالی گھٹائیں لاتی ہیں
گھٹائیں آتی ہیں موتی یہاں لٹاتی ہیں
یہ کھیتیاں ہیں جو ہر سال لہلہاتی ہیں
جو بوتے جوتے ہیں سارا سال بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں۔

یہ چور منڈی ہے! سودے اُدھار سٹے ہوتے ہیں
زباں میں رہتی ہیں چُپ چُپ اشارے ہوتے ہیں
ہزاروں لاکھوں کے نت وارے نیارے ہوتے ہیں
انوکھا آکے پڑا ہے کال! بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال! بھوکے ہیں

یہ قصرِ شاہی کے کھانے کہاں سے آتے ہیں؟
پلاؤ، قورمے جانے کہاں سے آتے ہیں؟
ذخیرے اور خزانے کہاں سے آتے ہیں؟
ہیں زرد چہرے ہمہ تن سوال! بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال! بھوکے ہیں

کباب اُڑتے ہیں، جی ہاں! شراب لٹتی ہے
فضا میں جنتِ چنگ و رباب لٹتی ہے
حسین چہروں کی عصمت کی تاب لٹتی ہے
یہ مائی باپ ہیں! اور ان کے بال بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں

سه ملفتہ تصرّف ہے!

ہمارے "چوہوں" کے ہر بل میں اک ذخیرہ ہے
ہماری جونکوں کا خون چوسنا وطیرہ ہے
خواص کا تو الگ عیش کا جزیرہ ہے
فقط عوام ہیں آشفتہ حال، بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال، بھوکے ہیں

گرہ کٹوں کی ہے چاندی، مزے اڑاتے ہیں
جو جیب پوس ہیں یاں، قسمتیں بناتے ہیں
کمینہ کیش کماتے ہیں اور کھاتے ہیں
عجب ہے دیس کہ اہلِ کمال بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں

امیرِ قوم! ترے پاک راج کا صدقہ!
ترے محل، ترے جھنڈے کا تاج کا صدقہ!
ترے خزانے کا، باج اور خراج کا صدقہ!
کہانیاں نہ سنا! یوں نڈھال بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں!

یہاں "بھوک کے دکھ کا کوئی علاج نہیں
عوامِ قوم کو جلسوں کی احتیاج نہیں
یہ لوگ چیخ رہے ہیں کہیں اناج نہیں
نصیب میں رہی روٹی نہ دال، بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں

یہ ریڈیو کے مزامیر کوئی حل تو نہیں
رٹی ہوئی یہ تقاریر کوئی حل تو نہیں
یہ چھپنے والی تصاویر کوئی حل تو نہیں
ہے یاں تو سیدھا سا بس اک سوال، بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں

کسے پھڑکنے کی اب ہے مجال! اے صیاد!
یہ بال و پر تو ہوئے اک وبال! اے صیاد!
سر آنکھ پر ترا ریشم کا جال! اے صیاد!
پر اس کے حلقوں میں دانہ تو ڈال! بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں

یہ تیری قوم کے فرزند صبر کیش سہی۔
تو اِن کا اپنا سہی! یہ بھی تیرے خویش سہی
یہ تیری خدمت و طاعت میں پیش پیش سہی
مگر دلا نہ انھیں اشتعال! بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں

چمن کے حال پہ بلبل تو روز کوکے ہیں
یہ سوچیے کبھی آخر کہاں سے چوکے ہیں
نہیں ہیں پیٹ ہی بھوکے دماغ بھوکے ہیں
دماغ بھوکے ہیں! فکر و خیال بھوکے ہیں
زمینِ پاک کے معصوم لال بھوکے ہیں

انقلابِ مصر

ضیاء محمد ضیاء

انقلابِ مصر نے توڑا شہنشاہی کا جال
زندہ باد اے حریت کے جذبۂ فرخندہ فال
آگیا آخر نظامِ شہریاری کو زوال
آج پتلا ہے جہاں بھر میں ملوکیت کا حال
بار ہے دھرتی کے سینے پر سلاطیں کا وجود
اب بکھرتا جا رہا ہے سلطنت کا تار و پود

گر پڑے ایوانِ شاہی کے در و دیوار و بام
ٹوٹتی جاتی ہیں محکومی کی زنجیریں تمام
مل رہا ہے خاک میں صدیوں کا فرسودہ نظام
نیل کی موجیں سناتی ہیں مسرت کا پیام
تیرگی اب نور کے سانچے میں ڈھل جانے کو ہے
کاروانِ زندگی کا رُخ بدل جانے کو ہے

طوق ٹکڑے ہو گئے اور بیڑیاں گلنے لگیں
ڈوبتی جاتی تھیں جو نبضیں وہ پھر چلنے لگیں
آرزو کی خشک شاخیں پھولنے پھلنے لگیں
غم کی ظلمت میں خوشی کی مشعلیں جلنے لگیں
مصر کی تاریک دنیا میں اجالا ہو گیا
پھر زمیں پر حریت کا بول بالا ہو گیا

یہ ر وِ استبدادِ ے اُٹھتا ہے شاہی کا خمیر
اس کے سائے میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
منتظر عالم تو میں ہے یہ دنیائے پیر
مٹتا جاتا ہے جہاں سے نقشِ سلطان و امیر

ختم ہے جھوٹے خداؤں کی خداوندی کا دور
کس قدر بدلے ہوئے ہیں مادرِ گیتی کے طور

مضمحل ہوتی چلی جاتی ہے روحِ قیصری
اب نہ ہوگی آدمی پر آدمی کی سروری
جیسے جیسے ختم ہوگی غیرِ حق کی آمری
ٹوٹتے جائیں گے سب کہنہ بتانِ آذری

لشکرِ فرعون بھی ہے نیل کا طوفاں بھی ہے
کیا کسی کے پاس جذبِ موسیٰ عمراں بھی ہے

آرزو مدت سے جس کی سینۂ انساں میں ہے
اس خوشی کا راز پنہاں حکمتِ قرآں میں ہے
فتح کے ہاتھوں میں ہے نئے دور کے اعمال میں ہے
مصر کی تقدیر دستِ ہمتِ اخوان میں ہے

مرکزیت میں سکونِ قلب کا ساماں نہیں
قومیت بھی زندگی کے درد کا درماں نہیں

مغربیت کی جہاں میں فتنہ سامانی نہ ہو
قالبِ جمہوریت میں روحِ سلطانی نہ ہو
آدمیت لیستۂ فتراکِ شیطانی نہ ہو
کوئی انساں تختۂ مشقِ ستم رانی نہ ہو

اس زمیں پر اک جہاں ایسا بنانا چاہیے
آدمی کو پنجۂ غم سے چھڑانا چاہیے

آج پھر توحید کا پرچم اٹھانا ہے تمہیں
امتیازِ بندہ و آقا مٹانا ہے تمہیں
وحدتِ انسانیت کا گیت گانا ہے تمہیں
امن کا پیغام دنیا کو سنانا ہے تمہیں

آدمی جس روز حق کا پاسباں ہو جائے گا
آسماں والا زمیں[1] پر مہرباں ہو جائے گا

آدمی جب تک رہے گا آدمی پر حکمراں
ٹھیک رہ سکتا نہیں اک روز بھی نظمِ جہاں
مٹ نہیں سکتا کبھی ظلم و تشدد کا نشاں
چیرہ دستی سے کسی کو مل نہیں سکتی اماں

مسندِ شاہی سے بندوں کو اٹھانا چاہیے
آج پھر انسان کو انساں بنانا چاہیے

آدمی جس روز بھی سن لے گا فطرت کی پکار
زندگی ہو گی اساسِ دینِ حق پر استوار
دستِ اخوان میں جب آئے گی زمامِ اختیار
مصر کے اجڑے گلستاں میں پھر آئیگی بہار

نوجوانو! قومیت سے اک قدم آگے بڑھاؤ
اقتدارِ ماسویٰ سے گردنیں اپنی چھڑاؤ

[1] زمین سے مراد 'اہلِ زمین' ہیں

تعارفِ کتب و جرائد

مصباح القرآن

• مولفہ شیخ محمد نصیب صاحب بیرسٹرایٹ لا، گوردا سپوری • شائع کردہ: دارالبلاغ محمد نگر اقبال روڈ لاہور • قیمت مجلد [illegible]

یہ قرآن مجید کے مطالب کا ایک انڈکس ہے جس میں مختلف موضوعات پر باب باندھ کر پھر ان کے اندر چھوٹے موضوعات کی فصلیں قائم کی گئی ہیں پھر ہر فصل کے تحت مطالب کا خلاصہ درج کر کے قرآن کے متن کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

ہماری رائے میں یہ انڈکس بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے اور قرآن میں استفادہ کرنے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔

ریاضی کا ایک نیا اسلامی نصاب

• از جناب شوکت علی صاحب بی اے، ایل ٹی مرکزی درسگاہ جماعت اسلامی ہند۔
• شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور، یوپی۔

نظام تعلیم کو اسلامی آئیڈیالوجی پر استوار کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کی جماعتِ اسلامی جو تجربہ کر رہی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ اس معاملے میں نصابی کتب کا کتب کا مسئلہ بڑا پیچیدہ رہا ہے لیکن جماعت اسلامی ہند کی مرکزی درسگاہ نے پہلے زبان دانی کا نصاب مرتب کر کے نئی راہیں کھول دکھائی تھیں، اور اب ریاضی کی نصابی کتب پیش کر کے بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ ریاضی کا معاملہ زبان دانی کے نصاب سے زیادہ مشکل تھا لیکن شوکت علی صاحب کی محنت قابلِ داد ہے کہ بچوں کو حساب کی تعلیم دینے کے لئے ایک تو جدید مغربی تجربات سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ دوسرے اس کے اندر اسلامی آئیڈیالوجی کو بڑی خوبی سے حل کر دیا ہے اس نصابی سلسلہ کا پہلا جزو "بچوں کا حساب" ہے۔ اس حساب میں تصاویر اور خاکوں کے ذریعہ "بی وگو" کے اصول پر عدد اور گنتی کا تصور دلایا گیا ہے۔ پھر اسی طریق پر جمع تفریق اور ضرب و تقسیم کا عمل واضح کیا گیا ہے۔ اکائی، دہائی اور سینکڑوں کے دوسرے مراتب کے تصور بچوں کے ذہن میں آتا ہے کے لئے بہترین انداز اختیار کیا گیا ہے اور ساتھ کے ساتھ پہاڑے رٹائی کے طریقے سے ہٹ کر ذہن نشین کرانے کے جدید طریقے سے پیش کئے گئے ہیں۔ آسان ریاضی حصہ اوّل و دوم میں حساب کے بنیادی قواعد کی تعلیم تصاویر، مشاغل اور کھیل کے ذریعے دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ سوالات مرتب کرنے میں جہاں زندگی کے دوسرے عملی پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا ہے وہاں ایسے سوالات بھی شاملِ نصاب ہیں جن سے خود بخود اسلامی زندگی کی طرف طلبا کا ذہن متوجہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً چند سوالات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) ظہر کی نماز میں ۴ سنتیں، ۴ فرض، پھر ۲ سنتیں اور ۲ نفل رکعتیں پڑھی جاتی ہیں بتاؤ کل کتنی رکعتیں ہوئیں؟

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۵ سال کی عمر میں شادی کی اور اس کے پندرہ سال بعد نبی ہوئے۔ بتاؤ آپ کتنی عمر میں نبی ہوئے؟

(۳) احمد نے اٹھارہ روزے رکھے تھے کہ بیمار ہو گیا۔ بتاؤ اس نے کتنے روزوں کی قضا کرنی ہے؟

(۴) ۶ آدمیوں نے مل کر ۳۰ روپے زکوٰۃ اور ۲۴ روپے فطرہ ادا کیا۔ بتاؤ ہر ایک نے کتنے روپے دیئے؟

(۵) ۸ آدمیوں نے مل کر بیت المال میں برابر برابر جمع کیا اگر کل رقم ۹۶ روپیہ تھی تو بتاؤ ہر ایک نے کتنا جمع کیا؟

اس طرح کے سوالات ایک معقول تناسب کے ساتھ دوسرے سوالات میں مل جلے ہیں بہر حال زندگی کے دوسرے پہلو نظر انداز نہیں کئے گئے۔ بلکہ روزمرہ کے حسابی معاملات زندہ تعداد میں لئے گئے ہیں۔ دوسری خاص قسم ایسے سوالات کی ہے جو معلومات افزا ہیں۔ مثلاً ایک سوال دیاسلائی کے متعلق پوچھا گیا ہے کہ وہ ۱۸۲۷ء میں تیار ہوئی تھی۔ بتاؤ ۱۹۵۲ء میں اسے بنے ہوئے کتنے سال ہوگئے۔ اسی طرح دیاسلائی کے بارے میں ہے کہ ۱۸۲۹ء میں ایجاد ہوئی تھی بتاؤ اب اس ایجاد کو کتنے سال ہوگئے ہیں۔ ایک سوال آواز کی رفتار کے متعلق ہے۔ کہ وہ ۱۱۲۵ فٹ فی سکنڈ ہے تو بتاؤ کہ ایک بندوق کی آواز ۹۳۷۵ گز کے فاصلے سے کتنی دیر میں سنائی دے گی؟ وغیرہ

اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس نصابی سلسلے کے تحت جن بچوں کو تعلیم دی جائے گی۔ وہ ایک طرف عام معلومات اور ذہنی بیداری کے لحاظ سے پیش پیش ہوں گے اور دوسری طرف اسلامیات کی تعلیم ان کو خود بخود ملتی جائے گی۔ اسلامیات کی تعلیم کا صحیح طریقہ یہی ہے جس کی طرف ہم اپنے کارپردازان تعلیم کو برابر توجہ دلا رہے ہیں کہ وہ اس تعلیم کو تمام مضامین میں حل کر دیں۔ مگر افسوس کہ یہ بات ان کے ذہن میں جگہ حاصل نہ کر سکی اب اس نصابی سلسلے کے بارے میں ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اسے بغور ملاحظہ فرمائیں اور اس کی روشنی میں نصابیات کا نیا منصوبہ سوچیں۔

ان کتابوں کے اندر اساتذہ کے لئے ضروری ہدایات موجود ہیں مگر افسوس کہ ایک بالکل ہی نئے طریق تعلیم کو رائج کرنے کے لئے یہ ناکافی ہیں۔ ضرورت ہے کہ زبان دانی اور ریاضی دونوں کے نصابی سلسلے کے ساتھ اساتذہ کے لئے گائڈ شائع ہوں یہ بھی مناسب ہوگا کہ وقتاً فوقتاً جرائد میں (خصوصاً الحسنات میں) سبق پڑھانے کی عملی رودادیں بھی درج ہوتی رہیں اور اساتذہ کی ڈائریوں کے اقتباسات بھی پیش کئے جائیں۔ نیز جرائد میں زبان دانی ریاضی اور دوسرے مضامین کے نئے نئے اسباق مختلف لوگ مرتب کر کے پیش کرتے رہیں۔ کاش کہ اس مقصد کے لئے درسگاہ جماعت اسلامی ہند کا اپنا ایک تعلیمی ماہنامہ وجود میں آجائے۔

● قیمت بچوں کا حساب ۵/ آسان ریاضی حصہ اول ۸/ آسان ریاضی حصہ دوم ۱۰/ قیمت کے لحاظ سے یہ کتابیں بہت سستی ہیں۔

● بہ ادارت خورشید احمد و ظفر الحق انصاری ● مقام اشاعت ۴۲ بندر روڈ کراچی

STUDENTS VOICE

● چندہ سالانہ ۸/ فی پرچہ ۱/

یہ پندرہ روزہ انگریزی جریدہ نوجوان طلبا کی مشہور اور ترقی پذیر تنظیم اسلامی جمعیت طلبا کا ترجمان ہے۔ اس کے چند شمارے ہماری نگاہ سے گزر چکے ہیں۔ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ یہ جریدہ طلباء کے حلقے میں خصوصاً لیکن طلبا کے علاوہ عام اہل ذوق کے نزدیک بھی قبولیت حاصل کرنے کے نمایاں وجوہ رکھتا ہے۔ اس کے مندرجات نہ صرف ادبی قدر رکھتے ہیں بلکہ ان میں اسلام کی سپرٹ کارفرما معلوم ہوتی ہے دنیا کے کسی نظام فکر اور دنیا کی کسی سلطنت اور کسی بلاک سے مرعوبیت کا کوئی شائبہ اس کے اندر محسوس نہیں ہوتا بخلاف اس کے موجودہ تہذیب الحاد اور اس کے پیدا کردہ نظام سرمایہ داری اور نظام اشتراکیت اور دونوں پر ایسے ناقدانہ مضامین برابر شائع ہوتے ہیں جن کی بنیاد سائنٹیفک اسلامی طرز فکر اور حالات کے صحیح مطالعہ پر ہوتی ہے۔ طلبا کے ہاتھوں سے اس معیار کے ایک انگریزی جریدے کا مرتب ہونا ہمارے لئے موجب مسرت ہے۔

اسٹوڈنٹس وائس کی ہر اشاعت کالموں کی فضا پر "ONLOOKER" کے قلم سے ایک تبصرہ بڑے دلچسپ انداز میں درج ہوتا ہے سوالات اور ان کے جوابات کا کالم اور اس کے ساتھ ساتھ The Last Page بھی ایک نرالا انداز رکھتے ہیں نوٹ اور مقالات بھی اہم موضوعات پر ہوتے ہیں۔

طلبا، پروفیسر صاحبان، کالج کی مختلف تنظیموں اور عام اہل ذوق کی خدمت میں ہم اپنا یہی مشورہ پیش کریں گے کہ نوجوان مسلم طلبا کی اس سعی کی

اپنی طاقت کی حفاظت کریں
جب آپ کی صحت کمزور ہو اور جسم میں خون کم ہو تو
مشہور عالم
مفرّح فولادی
استعمال کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ معتبر اور مقوی
دوا آپ کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کھوئی ہوئی
توانائی واپس لاتی ہے۔
قیمت فی شیشی ـــــــــ دو روپے آٹھ آنے
HAZME
STOMACH POWDER
FOR
Indigestion and all other troubles
caused by
STOMACH DISORDERS
الٰہی زمین معدہ من مرجان ۔ دگر ہر چہ رنجیدہ رنجیدہ باشد
معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے
کہیں . . . .
معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کر دیں
ھَضمی
ایک بہترین سفوف معدہ ہے جو فعل ہضم کو قدرتی طور پر کام
کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور معدہ کو ہر خرابی سے محفوظ رکھتا ہے
حفظ ما تقدم علاج سے بہتر ہے۔ اس لئے ہضمی کا استعمال کیجئے۔ تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے۔ مرد
اور عورت دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ قیمت فی شیشی ـــــــــ ایک روپیہ چار آنے
تیار کردہ:- حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

دار المصنفین اعظم گڑھ

کی مندرجۂ ذیل چند مشہور و بلند پایہ مطبوعات کا نایاب ذخیرہ

ارباب علم و اصحاب ذوق کے لئے خاص طور پر انتظام کیا ہے، بعض کتب کم تعداد میں رہ گئی ہیں۔ شائقین جلد تر منگا لیں۔ ریلوے کے ذریعہ منگانے کے لئے چوتھائی قیمت لازماً پیشگی ارسال فرمائیں۔

سیرۃ النبی (تقطیع خورد)	فی سٹ	۵۰/-/-
اسوۂ صحابہ اول	فی عدد	۴/۸/-
" دوم	"	۴/۸/-
خلفائے راشدین	"	۵/۸/-
سیر انصار اول	"	۶/-/-
" دوم	"	۳/-/-
سیر الصحابہ ہفتم	"	۳/۱۲/-
سیر الصحابیات	"	۲/۸/-
اسوۂ صحابیات	"	۱/۴/-
خطبات مدراس	"	۳/-/-

مکتبہ چراغِ راہ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی ۱

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم اصحاب کے واسطے آبِ حیات کا کام دیتی ہیں۔ اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنی ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک	۱۰ یوم	۲۰ یوم	۴۰ یوم
پیکنگ	۲۰ گولی	چالیس گولی	۸۰ گولی
قیمت	۲/-۱۰	۳/۱۲/-	۷/-/-

مقوّیاتِ سترّاج سلورین پلز

مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ جنرل ٹانک ہے۔ جو بھوک کو بڑھاتا ہے اور جسم میں تازہ اور سرخ خون پیدا کرتا ہے۔ قوت اور طاقت پیدا کرتا ہے۔

سلورین پلز

پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ قیمت ۴۰ گولی چار روپے بارہ آنے۔ ۸۰ گولی ۹ روپے

تیار کردہ:- حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

غلام محمد ... نے ... پریس سے طبع کرا کر شائع کیا۔

چراغِ راہ

(کراچی)

نومبر ۱۹۵۲

مرتب

نعیم صدیقی

مکتبۂ چراغِ راہ (پاکستان)

چراغِ راہ

اسلامی ادب، علم و حکمت کا علمبردار

نومبر ۱۹۵۲ء

قیمت ۸؍

جلد ۵ — شمارہ ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان	بھارت
۶ روپے	۸؍

مندرجات

سوچ بچار

رشوت کے سدباب کا طریقہ

حال ہی میں اخبارات کے ذریعہ یہ سوال سامنے لایا گیا ہے کہ رشوت دور کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ بلکہ پارلیمنٹ میں نذر احمد صاحب اس سلسلے میں ایک بل بھی پیش کرنے والے ہیں۔ یہ سوال ایسا نہیں کہ اخبارات کے ذریعے ہی سامنے لایا جائے تب اس کی اہمیت محسوس ہو، یا پارلیمنٹ میں اس پر بحث کی جائے تو عوام اس پر متوجہ ہوں، بلکہ یہ ہماری زندگی کا ایک ہی پیش پا افتادہ سوال ہے۔ زندگی کا کوئی میدان نہیں کہ جہاں رشوت اور خیانت سے ایک ایک شہری کو سابقہ پیش نہ آتا ہو۔ اس ملک میں کوئی سر مونڈے بغیر نہیں چھوڑتا اور اس قینچی کی زد سے کوئی جیب بچی نہیں۔ لگتی تک کامیابی کا کوئی بھی قفل کھلتا ہے تو رشوت کی کنجی ہی سے کھلتا ہے۔ موجودہ دور میں انسانی کام "حق" وزن کرنے کی مشین کی طرح ہے کہ اس میں مقررہ سکہ ڈالئے تو ساری مشین متحرک ہو جاتی ہے، ورنہ آپ اسے توڑ سکتے ہیں لیکن اس سے کوئی کام نہیں لے سکتے۔ مقدمات، دفتری کارروائیوں، عہدوں کی ترقیوں، مختلف قسم کی بھرتیوں، انٹرویو کے مختلف مواقع، مہتمات، تجارت کے درآمدی برآمدی لائسنسوں، محصولوں اور چونگیوں اور ٹیکسوں وغیرہ میں سے جس میدان میں بھی آپ کا گزر ہو، خیانت کی وبا کو آپ پوری طرح فروغ یافتہ پائیں گے۔ ہمارے کثیر التعداد خیانت کاروں کے ہاتھوں قوم اور مملکت کا حال اس بیل کا سا ہے کہ جس کے اندر کیڑے پیدا ہو جائیں اور جس گودے سے ان کی تخلیق ہوئی ہو اسی کو چاٹنے جا رہے ہوں، بغیر اس کا فکر کئے کہ یہ نہ رہا تو ہم کہاں رہیں گے۔ ہمارے ہاں کے اصل غدار اور تخریب پسند اور دشمن کے ایجنٹ یہ لوگ ہیں۔ ان میں بڑے بڑے عہدے دار، خوش پوش، خوش ذوق، زندہ دل، بیدار مغز، لٹریچر کے دلدادہ، آرٹ کے قدردان، مذہب کے شیدائی اور مملکت کے خدام شمار کئے جانے والے لوگ شامل ہیں۔ ہمارا پورا طبقۂ اشراف ہے کہ جس کے افراد اس حمام میں یکساں ننگے ہیں!

یہ حالت اگر قائم رہے تو اسلامی نظام کے قیام کی امیدیں تو در کنار، ملک کا محض بہ حیثیت ایک آزاد ملک کے باقی رہنا ممکن نہیں۔ جو لوگ کہ ملک کے مفاد کو غارت کر کے کنبہ پروری کر رہے ہوں اور جو لوگ کہ اس کے مفاد کو سرحدوں سے ناجائز برآمد کر کر کے اغیار کے ہاتھ خرید لکھوں کے لئے بیچتے ہوں، ان کی سیرت پر کیا اتنا اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ وہ کل کسی نازک لمحے اس ملک کا کوئی اہم سے اہم راز نہ بیچ ڈالیں گے اور کسی دشمن کو اس قلعے میں گھس آنے کے لئے کسی مالی منفعت کی خاطر پھاٹک نہ کھول دیں گے۔ یہ رشوت و خیانت کی بلا ایک دیمک ہے جو اندر ہی اندر وہ کام کر رہی ہے جو کسی دشمن کے ٹینک اور توپیں نہیں کر سکتیں۔

بدیں حال یہ سوال ہر لمحے ہمارے سامنے ہے۔ کوئی شہری پاکستان میں ایسا نہ ملے گا جو اس سوال سے ناواقف ہو۔ پھر یہ سوال نیا نیا سوال بھی نہیں۔ ... سے ... ہے کہ تقسیم سے پہلے خیانت کی وبا اتنی نہ پھیلی تھی جتنی کہ اب یکایک پھیل گئی ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ پہلے ملک کے نظم و نسق کا ذمہ دار انگریز تھا اور معاملات کا رجوع اسی کی طرف ہوتا تھا لیکن اب ذمہ دار ہم خود ہیں اور معاملات کا انحصار خود ہمارے اوپر ہے۔

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب یہی سوال چھڑ جاتا ہے تو ہر مرتبہ وہی چند فرسودہ تدابیر جو تمام تر سطحی اثرات رکھتی ہیں سامنے آتی ہیں۔ ... میں

بیک ڈور کو اختیار کیا جاتا ہے ۔ پھر جب وہ ناکام رہتی ہے تو سوال دوبارہ ابھر آتا ہے اور اپنا جواب مانگتا ہے ۔ کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں لیکن وہ خود رشوت خوروں اور رشوت خوانوں پر مشتمل ہوتی ہیں ۔ خاص محکمے اور محتسب مقرر کر دیئے جاتے ہیں اور وہ خود رشوت کے نظام کے سرپرست بن جاتے ہیں ۔ قانون بنائے جاتے ہیں اور وہ کتاب آئین کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں ۔ ہم ان طریقوں کا لمبا تجربہ رکھتے ہیں تو آخر ان طریقوں پر اب کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے ۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ علاج کے غیر مؤثر ہونے کا سبب کہیں یہ تو نہیں کہ تشخیص ہی غلط ہو ۔ اور واقعہ یہی ہے کہ تشخیص غلط ہے ۔ رشوت کو اپنے معاشرے اور مجموعی نظام زندگی سے کوئی باہر کی چیز سمجھا ہے کہ جو ادھر سے آکر اس پر چپک گئی ہے اس لئے اس کا علاج بھی ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ اس بلا کو اوپر سے نوچ کر الگ کر دیا جائے ۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ رشوت کے سرطان کے ریشے معاشرہ کے سارے بدن میں قدم قدم تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ اور محض بیرونی آپریشن اس کا علاج نہیں ہے ۔ اس کا اصل علاج معاشرے کے سارے نظام کی تجدید ہے ۔ رشوت کی بنیاد آپ کے نظام تعلیم و تربیت پر بھی ہے اور آپ کے نظام معیشت پر بھی ہے ۔ اور آپ کے ہاں فروغ پانے والے غلط نظریۂ حیات اور ادنیٰ مقاصدِ زندگی پر بھی ہے ۔ اور پھر جب آپ اس کے سدِّباب کے لئے اوپری تدبیریں اختیار کرتے ہیں تو یہ بھی اس کے سے حربے بن جاتی ہیں ۔ مانع نہیں ہو سکتیں ۔ جب تک آپ ہر جہتی اصلاح کرنے کا عزم نہ کریں اور رشوت کے سرطان کے ریشے نہ اکھیڑ نکالیں اور ان کو غذا بہم پہنچانے والے اسباب کا ازالہ نہ کر دیں ، ہزار سال میں بھی یہ بلا سر سے نہیں ٹل سکتی ۔

ہم یہاں اختصار سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ رشوت سے ملک کو پاک کرنے کے لئے کیا تدابیر ضروری ہیں ۔ تاکہ اگر ہمارے موجودہ حکمران چاہیں تو ان کو اختیار کریں ورنہ کم سے کم ان کے بعد آنے والی کسی بہتر قوت کے لئے ذہنی رہنمائی ہو سکے ۔

رشوت و خیانت کے سدِّباب کے لئے ناگزیر ہے کہ تین پہلوؤں سے کام لیا جائے ۔ ایک تعلیم و تربیت کا پہلو ، دوسرے اقتصادی پہلو تیسرے احتسابی پہلو ۔

اب ہم ہر پہلو کے متعلق مختصراً واضح کرتے ہیں کہ کرنے کا کام کیا ہے ؛

تعلیم و تربیت ۔ آدمی کے معاملات کی نوعیت کا دار و مدار ان نظریات (عقائد) پر ہوتا ہے جو اس کے نفس میں رچ بس جائیں کسی نظریے کا ذہن میں رچ بس جانا ہی اسلام کی اصطلاح میں ایمان کہلاتا ہے ۔ آدمی اگر اپنے آپ کو کسی خدا کا بندہ سمجھتا ہو اور اس کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ اور اس کی طرف سے اپنے آپ کو اخلاقی حدود کا پابند تسلیم کرتا ہو تو اس کا رویّہ ایک طرح کا ہوتا ہے ، اور ایسا نہ ہو تو اس کا رویّہ دوسرا ہوتا ہے ۔ یہ دنیا کی جانی پہچانی حقیقت ہے کہ خدا پرستی اور آخرت کے احتساب کا احساس اور کسی مذہبی ضابطۂ اخلاق کے احترام نے ہمیشہ انسانی اخلاق میں بلندی پیدا کی ہے ۔ خاص طور پر اسلام کی تاریخ اس بارے میں ایک مکمل ترین تجربہ ہمارے سامنے لاتی ہے کہ اس کے عقائد نے دو چار افراد کو نہیں بلکہ ایک معاشرے کے معاشرے کو صالح بنا دیا ۔

لیکن ہمارے ہاں صدیوں سے معاشرہ جس تاریخی عمل سے گزر رہا ہے وہ ذہنوں کو اسلامی عقائد سے اکھیڑ کر مادہ پرستانہ نظریات پر استوار کر رہا ہے ۔ یہ وہ بنیادی فساد ہے کہ جس کی وجہ سے اخلاقی اصولوں کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہو رہی ہے اور لوگ تیزی سے مفاد پرست اور خواہش پرست بن رہے ہیں ۔

دوسری بڑی چیز جو سیرتوں کو بناتی ہے وہ زندگیوں کا مقصد ہوتا ہے ، افراد کی زندگیوں کا مقصد ، اور قوم کی زندگی کا مقصد ! اگر کسی قوم اور اس کے افراد کے سامنے کوئی بلند انسانیت گیر مقصد ہوتا ہے تو اخلاق کا معیار خود بخود بلند ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر کوئی ایسا مقصد کارفرما نہیں ہوتا تو پھر خواہشات ہی سب سے بڑا مقصد بن جاتی ہیں ، اور جہاں خواہشات ہی سب سے بڑا مقصد ہوں وہاں تمام رشوت اور خیانت کے لئے میدان ہموار ہی ہوتا ہے ۔

آپ کسی بڑے سے بڑے ذمہ دار پاکستانی اور کسی عامی سے عامی شہری سے یہ پوچھ کر دیکھئے کہ تمہارا مقصدِ زندگی کیا ہے؟ فوقل تو وہ سوچتا رہ جائے گا۔ اعلیٰ الذبیہ کوئی جواب دے سکے گا۔ اور اگر وہ کوئی جواب دے گا تو بالعموم اپنے سیاسی گیٹ والوں کے دائرے جیسے کسی مقبولِ عام فقرے کو دہرا دیگا؛ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اس فقرے کا کوئی اثر اس کے ذہن پر موجود ہے یا نہیں!

واقعہ یہ ہے کہ خواہشات سے ہٹ کر کوئی مقصد نہ کسی بڑے میاں کے سامنے ہے، نہ کسی چھوٹے میاں کے سامنے!

عقاید، نظریات اور اخلاق اور مقصد کے پہلو سے یہ حالت جو پوری طرح چھا چکی ہے اس میں دوسرے بہت سے عوامل کے ساتھ ہمارے نظامِ تعلیم و تربیت کا نہایت ہی اہم اور موثر ترین حصہ ہے۔ ہمارا نظامِ تعلیم اپنے سانچے میں جو انسان ڈھال کر دیتا چلا آ رہا ہے اس کا نظریۂ زندگی خالص حیوانی اور مادہ پرستانہ ہے۔ اس کے سامنے اگر کوئی نظریہ اخلاق ہے تو وہ افادیت کا ہے۔ اس کا اگر کوئی مقصدِ زندگی ہے تو بس کوئی عہدہ، روپیہ، کوٹھی، کار، سیر و تفریح، ریڈیو سیٹ، صوفہ سٹ وغیرہ ہے۔ بس خواہشات کے ان کھلونوں پر ساری زندگی لگا دی جاتی ہے۔ قدرتی طور پر اس نظامِ تعلیم سے نفس پرست اور خیانت کار کارکن اور شہری حاصل ہوتے ہیں۔

اب اگر اس وقت خیانت کا سدِ باب ہمیں مطلوب ہو تو ہمیں پورے نظامِ تعلیم کو ایسے نقشے پر استوار کرنا ہوگا کہ اس کا ہر معلم ہر درجے میں اپنے زیرِ اثر طلبا کے اندر یہ ذہنیت اُبھارنے والا ہو کہ تم ایک خدا کے بندے ہو۔ تم اس کے حدود کے پابند ہو۔ تم اس کے دین کے علمبردار بنا کر اٹھائے گئے ہو۔ تم اس کے سامنے جواب دہ ہو۔ پھر ہمارے نظامِ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلبا کو نہ صرف اسلامی اخلاق کی تعلیم، بلکہ عملی تربیت دے کر نکالے۔ پھر ہمارے نظامِ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہماری نئی نسلوں کو وہ اونچا مقصدِ زندگی دے جس کے لئے قرآن نازل ہوا۔ وہ ان میں یہ شعور اُبھارے کہ تم ساری دنیا کے لئے اخلاق معلم بنائے گئے ہو۔ تم انسانیت کے ضابطۂ فلاح کے مشعل بردار ہو اور تم بدی کے خلاف لڑنے والے نیکی کے سپاہی ہو! تم کو اقوامِ عالم کا امام بنایا گیا ہے۔ تمہاری قوم معروف کی دعوت دینے اور منکر کا استیصال کرنے پر مامور کی گئی ہے۔ اور تمہاری مملکت کرۂ ارضی کا ایک ایسا حصّہ ہے جو غیر الٰہی اقتدار سے نجات دلانے اور الٰہی اقتدار کی برکات سے بہرہ ور کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ تم کو قوم اپنی خواہشات کی عبادت میں زندگی گزارنے کے لئے تیار نہیں کر رہی۔ بلکہ تم سے پوری انسانیت کی فلاح کا کام لینے کے لئے تیار کر رہی ہے۔ جوں جوں یہ شعور نئی پود میں اُبھرے گا، بندگیٔ نفس کے محرکات کمزور ہوتے جائیں گے اور فتنۂ رشوت کی جڑیں بھی ساتھ ساتھ اکھڑتی جائیں گی۔

تعلیم سے گزرنے کے بعد جن طلبا کو حکومت کی ملازمت کرنا ہو ان کو ایسی تربیت گاہوں سے گزارنا چاہئے جہاں پوری طرح اسلامی ماحول چھایا ہوا ہو اور اس پاکیزہ ماحول میں ان کے اندر یہ حس بیدار کی جائے کہ تم ایک اسلامی مملکت کے پرزے بننے والے ہو۔ یہ مملکت دنیا کا ایک مقدس ادارہ ہے اور اس ادارے کا جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک واجب الاحترام امانت ہے جس کا ایک حصّہ تمہاری تحویل میں رہے گا۔ تم محض پیٹ بھرنے کے لئے اس خدمت کے لئے تیار نہیں کئے جا رہے بلکہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی عبادت کے جذبے سے کیا جانے والا ہے۔ تم صرف اپنے افسروں کے سامنے ہی جواب دہ نہیں ہو گے بلکہ براہِ راست اپنے رب کے سامنے بھی جواب دہ ہو جس کی سی آئی ڈی ہمہ وقت تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے وقت اور قومی اور سرکاری املاک کو جس جس طرح تم استعمال کرو گے اس کا ریکارڈ رکھ رہی ہے۔

اسی طرح جن افسروں کو کسی خاص ٹریننگ کورس سے گزارا جائے ان میں بھی مسلمان کا سا احساسِ ذمہ داری بیدار کیا جائے کہ تم عنقریب اس مملکت کے کسی شعبے کے انچارج بننے والے ہو۔ تم پبلک کے مفاد کے نگہبان قرار پانے والے ہو۔ اور تمہارے سپرد بڑی بڑی امانتیں ہونے والی ہیں جن کے بارے میں قوم کے سامنے بھی جواب دہ ہو اور اپنے اللہ کے سامنے بھی! اس لئے یہ نہ سمجھو کہ یہ کوئی پھولوں کی سیج ہے۔ یہ کانٹوں کا بستر ہے جس میں ریاست اور دین اور پبلک کے مفاد کے لئے اپنے مفاد اور آرام اور خواہشات کو قربان کرنا ہوگا۔ تب تم اپنے فرض عین پورے

اختر دو گے۔

ملازمین اور جدید امیدواروں کی تربیت کے دوران میں وہ تمام آیات و احادیث ان کے سامنے آجانی چاہئیں جو ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں کوئی پہلو واضح کرتی ہیں اور ان کی کوتاہیوں کے بارے میں کوئی وعید سناتی ہیں۔ نیز انبیا کی سیرت اور خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام اور مسلم سیاسی اکابرین کے وہ کارنامے ان کی نگاہ سے گزار دیئے جائیں جو ان کے لئے قابل تقلید مثال بن سکیں۔

ملازمتوں خصوصاً عہدوں کے لئے انٹرویو لیتے وقت امیدواروں کے عقائد و نظریات، ان کے محبوب مقاصد اور ان کے اخلاقی رجحانات اور اسلام سے ان کی وابستگی کا جائزہ پوری طرح لیا جائے۔ اور جو امیدوار ان پہلوؤں میں کمزور نظر آئیں ان کو مزید تیاری کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ پھر تربیت سے گزرنے کے بعد بھی جن لوگوں کی ذہنیت و سیرت کو اسلامی پہلو سے نمایاں طور پر ناقص پایا جائے ان کی خدمات قبول نہ کی جائیں۔ اس طرح سوسائٹی کا بہترین عنصر چھنٹ کر ابھرے گا اور غیر مطلوب عنصر خود بخود دبنے اور ختم ہونے لگے گا۔

تعلیم و تربیت کے دائرے کو اور وسیع کر کے پھیلا جائے تو مناسب ہوگا کہ موجودہ کارکنوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے لئے حسب ذیل ذرائع سے بھی کام لیا جائے:-

—— دفاتر میں آیات، احادیث اور آثار کے جلی کتبے آویزاں کئے جائیں جو ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہیں۔

—— ہفتہ میں ایک مرتبہ ہر دفتر کے افسروں اور کارکنوں کا ایسا اجتماع ہونا چاہئے جس میں اسلامی فکر اور اسلامی اخلاق اور خلافت راشدہ کے عملی نمونوں کو پیش کیا جائے۔ کام کو ترقی دینے اور دفتری نظام کی اصلاح کے لئے مشورے ہوں اور باہم محاسبہ ہوسکے۔

—— ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلسل ٹریکٹ چھوٹے چھوٹے پمفلٹ شائع ہو کر دفاتر میں پھیلائے جائیں جن سے افسروں اور ملازمین میں اسلامی حسیات بیدار ہوں۔

—— ریڈیو سے جہاں عام شہریوں کو پیش نظر رکھ کر اسلامی خطوط پر ان کی تعلیم و تربیت کے لئے پروگرام نشر کئے جائیں، وہاں کارکنان حکومت کے لئے خصوصی پروگرام نشر ہوں۔ ان پروگراموں کے ایک جزو میں ایسے کارکنان کو نمونتاً متعارف کرایا جائے جنہوں نے اسلامی ذہنیت و سیرت کا بہترین مظاہرہ کیا ہو اور ایسے کارکنان کا انجام بھی بطور عبرت بتایا جائے جنہوں نے خیانت کاری کی کوئی مثال پیش کی ہو۔

—— وقتاً فوقتاً مختلف محکموں کے زیر انتظام ان کے کارکنوں کے ملتے وار ریفریشر کورس رکھے جائیں اور ان کو بار بار تربیت گاہوں میں جمع کیا جاتا رہے۔

تعلیم و تربیت کو پوری طرح نتیجہ خیز بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ضابطۂ ملازمت کو بالکل بدل ڈالا جائے۔ موجودہ ضابطہ ایک سیکولر نظام —— اور وہ بھی غلامی کا نظام —— چلانے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اب جب کہ ایک اسلامی ریاست کو چلانا ہے تو یہ ضابطہ بے کار ہی نہیں حد درجہ مضرت رساں ہے۔ نئے ضابطے کی رو سے پاکستان کی اسلامی ریاست کے ملازمین اور خصوصاً افسروں کے لئے ذہنی حیثیت سے مسلمان ہونا اور پابند عبادات ہونا اور اپنے زیر کفالت افراد کو بھی اسلامی اخلاق پر اٹھانا لازم ہونا چاہئے اور وہ اگر کسی غیر اسلامی طرز فکر کا اظہار کریں یا کسی فسق و فجور سے دلچسپی لیں یا کسی غیر اسلامی ادارے اور نظام جماعت یا کسی فاسقانہ کلب سے تعلق رکھیں تو اسی طرح ضابطۂ ملازمت کے خلاف ہو جس طرح کہ حکومت سے عدم وفاداری کا اظہار کرنا، یا مخالفین حکومت سے وابستگی رکھنا یا کسی سیاسی ہنگامہ میں حصہ لینا خلاف ضابطہ شمار ہوتا ہے۔ ان خصوصیات کو بھرتی کرتے وقت دیکھا جانا چاہئے اور ترقی دیتے وقت بھی دیکھا جانا چاہئے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ معیارات خدمت بالکل بدل جائیں۔

تعلیم و تربیت کا ایک موثر ترین وسیلہ کسی مملکت کے اکابر کا عملی نمونہ ہے ۔ اگر بدقسمتی سے کسی سلطنت کی زمام کار خیانت کار لوگوں کے ہاتھ میں ہو تو پھر کوئی پولیس اور کوئی وعظ جو دیانت پیدا کرنے کے لئے کیا جائے یا کوئی تعلیم جو اخلاق کو بلند کرنے کے لئے دی جائے بالکل بے کار رہتی ہے ۔ جس تناسب سے جو جو صفت اکابر ملک میں موجود ہوتی ہے اسی تناسب سے وہ صفت نیچے تک پھیلتی جاتی ہے اس اصول کی روشنی میں جب ہم اپنے ہاں رشوت و خیانت کو تیزی سے فروغ پاتے دیکھتے ہیں تو ہمارے لئے اپنے اکابر کی پاک دامانی کا تصور کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے بالخصوص تقسیم کے بعد رشوت و خیانت میں جو اضافہ ہوا ہے وہ بدیہی ثبوت ہے اس بات کا کہ ہمارے بڑے لوگ خود اپنے اندر ایسی کمزوریاں رکھتے ہیں کہ جن کمزوریوں سے سارے رشوت و خیانت کی بیلیں پروان چڑھ رہی ہیں ۔ واقعہ در حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جو پہلے سلطنت کے اصل کار پرداز نہیں تھے ۔ بلکہ انگریز کے زیر اقتدار ملازمتیں اور عہدیداریاں کیا کرتے تھے اور جن کے حسن کارکردگی کا دارومدار انگریز کی لاٹھی پر تھا ۔ وہ اس لاٹھی کے ہٹتے ہی یکایک خود کار پرداز بن گئے تو کار پردازیوں کی ذمہ داریوں کا احساس جو انگریز جیسا پیدا نہیں ہوا البتہ اپنی کمزوریوں کو بروئے عمل لانے کی آزادی جو حاصل ہوئی تو یہ پوری اہمیت کے ساتھ محسوس ہوئی ۔ اور ان کے ماتحتوں کو بھی اسی بنا پر کھل کھیلنے کا موقعہ ملا کہ ان کی کمزوریوں سے براہ راست واقف تھے اور ان کے ساتھ بے تکلفی سے مختلف معاملات میں تعاون کر سکتے تھے اس طرح خیانت کا طوفان انگریز کے ہٹتے ہی بالکل ابل پڑا ۔

ہمارے گردوپیش یہ واقعات بالکل عام اور جانے پہچانے ہوئے ہیں کہ مقدمات میں دخل اندازیاں ہوتی ہیں، پولیس پر موقع بے موقع دباؤ ڈالا جاتا ہے، سنگین سے سنگین مجرم ہوتے ہیں کہ ان کو قانونی شکنجے سے نکال لیا جاتا ہے بڑے بڑے لوگوں کے بیٹے اور ان کے رشتہ داروں کے بیٹے سفارشوں کے ذریعہ امتحانات پاس کرتے ہیں اور ایسے انتظامی اور فنی عہدوں کے حقدار بن جاتے ہیں باوجود اپنی نالائقی کے قابل تر نوجوانوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ۔ پھر اکابر ملک سے مراتب رکھنے والے لوگوں کے تجارت کے درآمدی و برآمدی لائسنسوں پر اجارہ قائم ہے اور کراچی میں مدت تک ان لائسنسوں کا چور بازار کھلا رہا ہے اس طرح مکانوں اور کارخانوں اور دکانوں اور زمینوں کی الاٹمنٹ ہے کہ وہ ایک خاص طبقہ کے لوگوں کے لئے مخصوص ہے ۔ یہاں تک کہ کراچی کے اونچے عہدہ داروں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے کہ جس نے ایک طرف سرکاری فنڈ سے قرض لے کر اپنے مکانات بنوائے ہیں اور وہ کرائے پر چڑھا رکھے ہیں اور دوسری طرف اپنے لئے الگ مکانات الاٹ کرا رکھے ہیں اور سستے کرایہ پر ان میں بس رہے ہیں ۔ اسی طرح یہ بات بھی ناقابل یقین نہیں ہے کہ جب ہمارے عالم بالا میں کسی ٹیکس کے لگانے یا ہٹانے یا کسی درآمدی یا برآمدی تجارتی معاہدہ کا فیصلہ ہوتا ہے تو قبل از وقت ان سے قریبی تعلقات رکھنے والے تاجروں اور صنعت کاروں کو معلومات مل جاتی ہیں اور آناً فاناً لاکھوں کی کمائیاں ہو جاتی ہیں ۔ علیٰ ہذا القیاس بڑے بڑے ٹھیکوں کے ٹنڈروں کی منظوری مشروط اس چیز پر ہوتی ہے کہ اس میں ہمارا حصہ بھی ڈالو اس طرح کی چیزیں عدالتوں میں ثابت کی جا سکیں یا نہ کی جا سکیں ، ہمارے معاشرے کے اندر رونما ہوئی ہیں اور اس معاشرے میں رہنے والا کوئی ہوشمند آدمی ان سے بے خبر نہیں رہ سکتا ۔

پس اگر اصلاح مطلوب ہے اور واقعی مطلوب ہے تو اس کی طرف موثر ترین قدم یہی ہے کہ وہ اکابر جو تقاریر کے ذریعہ عوام سے رشوت کے سد باب کے لئے ۔ لمبی اپیلیں کرتے ہیں وہ خود اپنی روش کو بدلیں اور اپنے دامن کو پاک کریں ۔ پھر ان کے دامن کے نیچے کوئی خیانت کار پھل پھول نہ سکے گا ۔ ورنہ اگر بڑے لوگوں میں خود کمزوریاں موجود رہیں تو وہ چھوٹوں پر گرفت کرنے کی طاقت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے ۔

اس موقعہ پر توجہ طلب ایک چیز یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ یہ جو سرکاری ملازمین خصوصاً پولیس کو انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے یہ رشوت ستانی سے بڑی خیانت ہے اور اس خیانت کے اثرات بڑے ہی خطرناک ہیں ہمارے وزراء اور ایم ایل ایز حضرات جن کارکنان حکومت کی اعانت خاص سے برسر اقتدار آئے ہوں گے ۔ آخر ان کی خیانت کاریوں پر وہ گرفت کیسے کر سکیں گے ۔ چنانچہ خیانت کے

غیر معمولی فروغ کی ایک بڑی وجہ یہی ہے ! ڈپٹی کمشنروں، تحصیلداروں، پٹواریوں اور پولیس کے سب انسپکٹروں کے بنائے ہوئے وزراء اور ایوان رشوت ستانی کو روک نہیں سکتے ۔ اس کام کے لئے عوام کے ووٹوں کے بل پر کامیاب ہونے والوں کی ضرورت ہے ۔

اقتصادی پہلو ۔ ملک کی عام اقتصادی حالت پوری کی پوری قابل اصلاح ہے ہی، مگر یہاں ہمارے پیش نظر تنخواہوں کا وہ غیر منصفانہ نظام ہے جو چھوٹے ملازمین کے لئے رشوت خوری کا ایک عذر بنتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ضمیر اتنا مرجاتا ہے کہ عذر کی حاجت ہی نہیں رہتی ۔ تنخواہوں کا نیا اسکیل "اصولِ کفالت" پر بننا چاہئے یعنی ادنیٰ ترین ملازم کو اتنی تنخواہ ضرور ملنی چاہئے کہ وہ اپنے کنبے کی بنیادی ضروریات پوری کرسکے ۔ نیز معمولی ملازمین اور اونچے عہدہ داروں کے معاوضوں میں تفاوت قابلِ برداشت ہونا چاہئے ۔ نہ کہ غیر فطری حد تک !

لیکن ہمارا نظام معاوضہ بندی ایسا ہے کہ چھوٹے ملازمین کی کثیر تعداد اپنی تنخواہوں پر گذر اوقات نہیں کرسکتی ، اور چونکہ ان کے اندر ایسے عقائد ، ایسے اخلاق اور ایسے مقاصد کارفرما نہیں ہیں ۔ جو معاشی بدحالی کے وباؤ کا مقابلہ کرنے میں کچھ دیر بھی موثر ثابت ہوں اس لئے وہ خیانت کا چور دروازہ کھولنے پر اپنے آپ کو مجبور قرار دیتے ہیں ۔ سوچنا یہ ہے کہ جب ان کی تنخواہوں کی کمی بھی قوم ہی کی دولت سے ہیٹی ہوئی رشوت سے پوری ہوتی ہے تو کیوں نہ اس دولت سے ان کی تنخواہوں میں اضافہ کرنے کا انتظام کردیا جائے آپ اگر یہ تبدیلی نہیں کرتے تو پھر محض رشوت کے خلاف وعظ کہنے یا قانون کی لاٹھی استعمال کرنے کا آپ کو اخلاقاً حق نہیں پہنچتا ۔

اقتصادی پہلو سے دوسری خرابی جو رشوت ستانی کی محرک بن گئی ہے وہ ملک کی دولت کی رفتارِ افزائش سے زیادہ تیز رفتار سے معیارِ زندگی کا ارتقاء ہے سادگی کے بجائے انتہائی تیزی سے تکلفات زندگی پر چھا رہے ہیں، تعیش کے اسباب روز افزوں ہیں، فاسقانہ تفریحات کے ادارے برابر بڑھ رہے ہیں، زندگی کی تقاریب اور ان پر ٹھاٹھ باٹھ کے مظاہرے گراں تر ہوتے جا رہے ہیں ۔ بجائے اس کے کہ ہمارے بڑے لوگ معیارِ زندگی کی اس مصنوعی اٹھان میں کوئی روک پیدا کریں ۔ وہ خود اس کی سربراہ کاری کر رہے ہیں ۔ ہمارا طبقۂ امراء جس میں اکابرِ ملت اور بڑے بڑے لیڈر اور تمام سرکاری عہدہ دار شامل ہیں زندگی کا ایک ایسا مہنگا، نمائشی اور پُر تکلف معیار قائم کئے ہوتے ہیں اور اسی کو عزت کا معیار بنائے ہوئے ہیں کہ سب دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں ۔ پھر ہر طرف فروغ پاتے ہوئے سینما ہیں، رقص گاہیں ہیں، مینا بازار ہیں، دعوتیں اور ضیافتیں ہیں ۔ پیدائش اور موت کی تقریبیں ہیں، عید اور یوم آزادی کے مظاہرے ہیں، ہوٹلوں میں پارٹیاں ہیں، بیگمات کے آرائشی لباس اور گاگر سنے اور غازے ہیں ۔ پھر کوٹھیاں ہیں کاریں ہیں، ریفریجریٹر ہیں، صوفہ سٹ ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہے یہ ساری چیزیں طبقۂ بالا کی طرف سے عوام کے لئے گویا قابلِ تقلید مثال بن گئی ہیں ۔ غریب طبقہ تو بس اس طوفانِ نمائش پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر رہ جاتا ہے ۔ لیکن درمیانہ طبقے کی شامت آگئی ہے درمیانہ طبقہ جو سوسائٹی کو ہر مقصد کے لئے کارکن مہیا کرتا ہے ۔ اور جس کا حصہ زراعت، صنعت، تجارت کی طرح ملازمتوں میں بھی زیادہ ہوتا ہے، وہ چونکہ احساسِ عزت رکھتا ہے اس لئے وہ سوسائٹی کے مروجہ معیارِ عزت پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے، اس کوشش میں آمدنی اس کا ساتھ نہیں دیتی ! مجبور ہو کر وہ خیانت کے راستے تلاش کرتا ہے ۔

اس طبقے کو اگر سادگی پر رکھا جاسکتا ہے تو صرف اس طرح کہ معیارِ زندگی کو مجموعی حیثیت سے سنبھالا جائے اور اوپر کے لوگ —— خصوصاً اکابرِ ملت اور سیاسی لیڈر اور سرکاری عہدہ دار اپنے معیار کو سادگی پر قائم کردیں ۔ نیز عملاً معیارِ عزت کو بدل دیں ۔

اس تبدیلی کے لئے حسب ذیل اقدام ضروری ہیں ۔

—— اکابرِ ملت رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو سادگی پر کاربند کریں اور عام لوگوں کی طرح سیدھی سادی زندگی گزاریں

—— سرکاری عہدہ داروں کو تربیت سے بھی اور بروئے ضابطہ بھی اس امر کا پابند کیا جائے کہ وہ تکلفات تعیش اور کبر کے مظاہرات سے اجتناب کریں ، نیز اپنی نجی تقاریب کو بالکل سادگی سے سرانجام دیں ۔

——— ملک میں سامانِ تعیش کی درآمد کو روکنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

——— چونکہ عورتوں کے پردہ سے باہر آنے اور مردوں سے مخلوط ملاقات رکھنے کی صورت میں ان کا ذوقِ آرائش فطری حد اعتدال سے بہت بڑھ جاتا ہے اور پھر یہ آگ ایک گھر سے دوسرے گھر تک بے پردگی کی صورت میں زیادہ تیزی سے پھیلتی ہے، اس لئے بے پردگی پھیلانے کی مساعی کو روک دیا جائے اور عورتوں کا مردوں کی مجالس میں آنا اور مردوں اور عورتوں کے لئے تعلیم گاہوں اور سیرگاہوں کا مخلوط ہونا بالکل گوارا نہ کیا جائے۔ ورنہ معیارِ زندگی کی مصنوعی اٹھان کو روکا نہیں جا سکیگا۔

——— قومی تقاریب پر نہ تو بے جا اسراف کیا جائے، نہ وزرا اور پریسیڈنٹ اور ان کی بیگمات قوم کے سامنے ٹھاٹھ باٹھ کا مظاہرہ کریں۔

——— فاسقانہ تفریح گاہوں کے فروغ کو روکا جائے۔

——— سرکاری دفاتر اور تعلیم گاہوں کے اندر سادہ لباس اور ضرورت کی دوسری سادہ اشیاء استعمال کرنے کی پابندی عائد کی جائے۔

——— ان تدابیر کے ساتھ عوام کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جائے اور معیارِ زندگی کی رفتارِ ارتقاء کو دولت کی رفتارِ افزائش سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔

اقتصادی پہلو سے یہ تبدیلیاں رشوت ستانی کی روک تھام کے لئے ضروری ہیں۔

احتسابی پہلو ۔ کوئی بھی اصلاح بغیر اس کے پوری طرح موثر نہیں ہو سکتی کہ اس کے ساتھ احتساب کا کڑا نظام کام کرے۔ فقط اپیلیں اور وعظ اور پبلسٹی کسی بھی برائی کا سدِ باب نہیں کر سکتے۔ ان مساعی کے ساتھ ساتھ قانون اور نظامِ احتساب کا تعاون بڑا ضروری ہے۔ پاکستان میں جس پیمانے پر خیانت فروغ پا چکی ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے ناگزیر ہے کہ نظامِ احتساب سخت کڑا ہو۔ تا آنکہ حالات نارمل ہو جائیں اس مقصد کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہے:

(۱) سی آئی ڈی کے قابلِ اعتماد کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کو اس مقصد کے لئے مخصوص کر دیا جائے کہ وہ مختلف دفاتر (خصوصاً ایسے محکمے پیشِ نظر رہیں جن میں رشوت ستانی غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی ہے) میں گھس کر ایسے افسروں اور کارکنوں پر کڑی نگاہ رکھیں جن کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ عادی راشی ہیں۔ اس مقصد کے لئے سی آئی ڈی کے کارکنوں کو ہر جگہ بھرتی کرا دیا جا سکتا ہے۔

(۲) سرکاری ملازمین، خصوصاً افسران کو بھرتی کرتے وقت ان کی جائدادوں اور املاک کا پورا حساب مرتب کر لیا جائے۔ اور ان کے ذرائع آمدنی کا جائزہ لے لیا جائے ——— نیز اسی وقت ان کے بیوی، بچوں اور بھائی بہنوں اور والدین کے املاک کی فہرست بھی لے لی جائے۔ پھر یہ محاسبہ ہر سال ہوتے رہنا چاہئے۔ نیز ان کے رہن سہن کے عام معیار کا جائزہ بھی لیا جاتا رہے۔ یہ محاسبہ اور جائزہ خود بتا دیگا کہ رشوت خواری ہو رہی ہے یا نہیں۔

اسی سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ وزراء، پارلیمنٹری سکریٹریوں، ایم ایل اے حضرات اور اونچے انتظامی اور فوجی عہدیداروں کے معاملے میں اس امر پر نگاہ رکھی جائے کہ کون کون لوگ ان کے قریبی اعزہ میں سے ہیں:

و۔ کون کون بڑے عہدوں کے چناؤ کے ٹسٹ اور انٹرویو میں کامیاب ہوئے۔

ب۔ کس کس کے نام کس چیز کی الاٹ منٹ ہوئی۔

ج۔ کس کس کو غیر ملکی تجارت کے لائسنس ملے

د۔ کس کس نے خاص خاص موقعوں پر بڑے بڑے تجارتی لین دین کئے

ہ۔ کس کس کے ٹینڈر ٹھیکوں میں منظور ہوئے۔

و۔ کس کس کے نام کے حصے مختلف کاروباری فرموں میں شامل کئے گئے۔

اس جائزہ میں جہاں شبہ پڑے، فوراً پوری انکوائری کرکے دیکھ لیا جائے کہ کوئی خیانت تو نہیں کی گئی۔

(۳) خیانت اور رشوت کی سزا بہت کڑی رکھی جائے اور صرف کڑی ہی نہ ہو، عبرتناک بھی ہو۔ مثلاً بڑے عہدہ داروں کے معاملہ میں تو لازماً ایسا ہونا چاہیے کہ ایک تو ان کو برسر عام تازیانہ کی سزا دی جائے اور دوسرے ان کی پوری جائداد ضبط کر لی جائے۔ چھوٹے ملازمین کو تازیانے کی سزا تو دی ہی جائے لیکن رشوت سے حاصل کردہ رقم کے دس گنا جرمانہ عاید کیا جائے، اور ملازمت سے ہمیشہ کے لئے برطرف کر دیا جائے۔

(۴) رشوت اور خیانت کے معاملات پر گرفت کرنے کے لئے کچھ مدت کے لئے ایک مستقل محکمہ برسر عمل آ جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ جیسے کہ حسابات کے لئے آڈٹ کا محکمہ ہوتا ہے۔ اس محکمہ کے دفاتر میں پبلک کے ہر آدمی کو شکایات اور اطلاعات پہنچانے کی پوری آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ نیز یہ محکمہ پریس میں شائع ہونے والی تمام ایسی شکایات اور ایسے مراسلات پر نظر رکھے اور مختلف جماعتوں اور انجمنوں کی پیش کردہ ایسی تجاویز پر پوری توجہ دے جو نظام حکومت میں کسی طرح کی خیانت کاری کا انکشاف کرنے والے ہوں۔ پھر یہ محکمہ ہر قابل لحاظ معاملے میں متعلقہ محکموں کو متوجہ کرے۔ جہاں ضرورت سمجھے انکوائری کے احکام دے سکے۔ اور جن معاملات کو عدالت کے سپرد کرنا ضروری ہو ان کو عدالت کے حوالے کرے۔

جھوٹی شکایات

اس نظام احتساب میں یہ خطرہ بھی ہے کہ سرکاری ملازمین اور عہدہ داروں کے خلاف لوگ جھوٹی شکایات لانے لگیں درآنحالیکہ اس معاملہ میں سزا بڑی کڑی اور عبرتناک رکھی جا رہی ہے جھوٹی شکایات کی روک تھام ضروری ہے۔ مگر کسی شکایت کے جھوٹا ہونے کا ثبوت یہ نہیں ہونا چاہئے کہ الزام ثابت نہ کیا جا سکا کیونکہ ہمارے معاشرے میں حالات ایسے ہیں کہ سرکاری ملازمین خصوصاً پولیس اور مال کے کارکنوں اور اُن سے بھی آگے بڑھ کر اونچے عہدہ داروں کے خلاف کسی الزام کو ثابت کر دینا آسان نہیں ہے۔ پس جھوٹی شکایت کی تعریف یہ ہونی چاہئے کہ اس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ کچھ لوگوں نے عداوت کی بنا پر باقاعدہ سازش کے طور پر ایک طومار باندھا ہے اگر یہ ثبوت مل جائے تو پھر شکایت کنندگان کو بھی کڑی سزا دی جانی چاہیے۔

رشوت خورانی

ایک قابل غور مسئلہ یہ بھی ہے کہ رشوت دینے والے کو بھی برابر کا مجرم گردانا جائے یا نہیں؟ اس کے جواب میں ہماری رائے یہ ہے کہ رشوت دینے والوں کی دو پوزیشنیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شہری کسی دوسرے کا حق مارنے یا اپنے لئے حق سے زائد کچھ وصول کرنے اور کچھ ناجائز منافع سمیٹنے کے لئے رشوت دے، دوسرے یہ کہ اسے اپنے کسی جائز حق کو حاصل کرنے اور کسی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے رشوت دینی پڑے۔ ان دونوں میں سے صرف پہلی صورت ہی رشوت خورانی کی تعریف میں داخل ہے۔ اور یہی صورت قابل سزا جرم ہو سکتی ہے۔ دوسری صورت میں شہری بے بس ہوتا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ پہلی صورت میں تو شہری اور ملازم دونوں کی ایسی سازباز ہوتی ہے کہ معاملہ اس وقت تک گرفت میں آ ہی نہیں سکتا جب تک کہ کوئی تیسرا اس سازباز سے واقف ہو کر اسے بے نقاب کرنے کی جرأت نہ کرے۔ لیکن دوسری صورت میں شہری چونکہ مظلوم یا فریق ہوتا ہے

بنا دو از خود شکایت کنندہ یا مدعی بن کر معاملہ کو سامنے لا سکتا ہے ۔ اب اگر آپ شہری کو دوسری صورت میں بھی رشوت خوری کا مجرم قرار دے کر سزا دینے کا فیصلہ کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شہری اور ملازم دونوں کا مفاد ایک ہو جائے گا ۔ اور اس طرح کے معاملات کبھی تیسری پارٹی کے بغیر نظام احتساب کے سامنے نہیں آسکیں گے ۔ لہذا ضروری ہے کہ جائز حق کے حصول کے لئے مجبورانہ رشوت دینے والوں کو مستثنیٰ رکھا جائے ۔

ہماری نگاہ میں یہ دو کم سے کم مزید تدابیر ہیں کہ جن کو اختیار کرنے سے ہم رشوت و خیانت کا سدباب کر سکتے ہیں لیکن یہ تدابیر جن تبدیلیوں کا تقاضا کرتی ہیں وہ اتنی ہمہ گیر ہیں کہ موجودہ دستور اور نظام کے ڈھانچے کو جوں کا توں قائم رکھتے ہوئے اُن کو پوری طرح روبہ عمل لانا مشکل ہے اگر ریاست کے مقاصد اور اس کے بنیادی اصول اسلامی ہوں اور پوری قوم کے سامنے اسلام کا عالمگیر نصب العین رکھا گیا ہو ۔ اور پھر نظام تعلیم اور ضابطۂ ملازمت اور قانون کا مزاج ان اصول و مقاصد کے سانچے میں ڈھلے تب ہی مطلوبہ تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں معاشرے کو اوور ہال کرنا ناگزیر ہے ۔

اگر ریاست بحیثیت ریاست اس نہج پر چل پڑی ہو تو پھر ملک کی صحافت اور ادب اور سیاسی جماعتیں اور مذہبی اور تہذیبی ادارات سب کے سب اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونے لگیں گے ، اور آج جو معاشرہ خیانت کا شکار ہے ۔ اس کے افراد تیزی سے امانت و دیانت کا درس دینے والے بن جائیں گے ۔

جیلانی بی اے

ٹالسٹائی

ٹالسٹائی کو سمجھنے کے لئے انیسویں صدی کے یورپ کے حالات و خیالات کو اپنے سامنے رکھ لیجئے۔ ایک مصنف کے قول کے مطابق انیسویں صدی کی مادیت نے یورپ والوں کو وہ کچھ دے دیا جو اس سے پہلے وہ کبھی نہ پا سکے تھے۔ یعنی ایک نظریہ کائنات سترھویں صدی میں گلیلیو نے پیسا کے خمیدہ مینار سے ایک بھاری پتھر پھینک کر اور اٹھارھویں صدی میں نیوٹن نے ایک سیب کو گرتے دیکھ کر جن اصولوں کو دریافت کیا تھا۔ انہوں نے گویا یورپ کے لئے ایک نئی راہ فکر نکال دی۔ ان اصولوں نے مادہ کے اس عمل کو منکشف کر دیا جس کے سبب مادہ اپنی صورت پذیری کرتا ہے۔ یہ اصول اس لئے عہد گر ثابت ہوئے کہ بعد میں انھیں کی بنا پر علم مشین (میکانکس) کی تعمیر ہوئی اور مشین کی ایجاد گویا فطرت کی تسخیر تھی جب مشین کے کرشمے سامنے آگئے تو کون تھا جو ان اصولوں پر والہانہ ایمان نہ لے آتا کہ جن کے طفیل یہ نعمت عظمیٰ میسر آئی تھی۔ اس علم کی مدد سے وہ مادہ کی حرکت کا اندازہ پوری صحت کے ساتھ کر سکتے تھے اور جوں جوں وہ ان اصولوں کی نگاہ سے مادہ کو دیکھتے گئے ان کا یقین پختہ تر ہو گیا کہ مادہ کی حرکت میں یکسانی اور نظم ہے۔ یہ کائنات ایک بہت بڑی مشین ہے جو ایک نظم باقاعدگی اور یکسانیت کے ساتھ چل رہی ہے۔ یہاں جو کچھ ہے وہ مادہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ اور کوئی شے یہاں ایسی نہیں جو غیر مادی یا روحانی ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہاں کوئی غیر مادی عنصر نہیں انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ عقل بھی ایک غذے کی پیداوار ہے۔ اس کو نکال دو انسان بے عقل رہ جائے گا اور فواد کے متعلق تو انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لیا کہ یہ سوائے دھکو پھکو کے کچھ نہیں۔ اگر کچھ ہے بھی تو مادے کی ترقی یافتہ صورت ہے جسے اگر "مادے کا شعور" کہہ لیا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

مادہ پر عقیدہ رکھنے سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ یورپ نئی نئی اختراعات اور علمی دریافتوں سے مالا مال ہونے لگا وہاں ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ انسان درجہ اشرف سے گر کر پستی میں آگیا۔ نہ تو خدا کی تخلیق خاص باقی رہا اور نہ صرف اشرف المخلوقات کے لقب کا مستحق۔ وہ کائنات کے مادی ارتقا کی ایک کڑی تھا۔ اور بس۔ اول تو خدا ہی باقی نہ رہا۔ اور اگر اس کے وجود کا کچھ حصہ باقی ہے بھی تو وہ بھی قوانین مادہ کے سامنے اس طرح بے بس ہے جس طرح مٹی یا پتھر پھر انسان کیوں کر ان قوانین سے بالاتر ہو سکتا ہے؟ چند کیمیاوی اجزاء کا پلندہ کس طرح پتھر کے سے فائق ہو سکتا ہے؟ اس خیال کی تصدیق علم الاعضاء سے بھی ہو گئی۔ جس طرح کہ کوئی عام جسم اجزاء لایتجزیٰ سے مرکب ہے اسی طرح انسانی بدن بھی چند خلیوں سے مرکب ہے۔

اس مادی عقیدے کو سب سے زیادہ منظم تقویت تین علوم سے پہنچی۔ حیاتیات، نفسیات اور طبعیات۔ علم الحیات میں سب سے زیادہ مدد نظریہ ڈارون سے ملی ہے۔ اور حیرت یہ ہے کہ اس کے بعد آج تک اس کی تحقیقات میں بہت کم اضافہ و ترمیم ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق سے یہ معلوم کیا کہ آغاز حیات سے آج تک جتنا بھی سلسلۂ تخلیق ہماری زمین پر موجود چلا آ رہا ہے وہ اپنی نوعیت میں اتفاقی ہے

اہم تغیر سے نہیں ہوا۔ بلکہ نہایت معمولی اور انحراف VARIATION سے ہوتا ہے اگر سلسلہ تخلیق میں یہ انحرافات نہ ہوتے اور ہر بچہ اپنے والدین کے عین بعین ہوتا تو اس دنیا میں سوائے امیبا اور جیلی مچھلی کے اور کچھ نہ ہوتا۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اور ہم دیکھتے ہیں ایک والدین کی اولاد باہم غیر متشابہ ہونے کے علاوہ اپنے ماں باپ سے بھی مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے ہم سوچنے پر مجبور ہیں کہ یہ اختلافات خدوخال اور شکل رنگ وصورت ان انحرافات کا پیدا ہوتی ہے جو بچوں کے اندر خود پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ انحرافات دو قسم کے ہوتے ہیں مفید اور مضر۔ چونکہ اس دنیا میں رسد خوراک بالکل محدود ہے اس لئے حصول خوراک کے لئے سب جانداروں کو تگ ودو اور سعی وجہد کرنی پڑتی ہے اگر یہ انحرافات کسی جاندار کے لئے حصول خوراک میں ممد ہوئے تو یہ مفید اور مضر اور اس کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔ مفید انحرافات راسخ ہو کر جاندار کی نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح ایک الگ اور مختلف نوع ظہور میں آجاتی ہے ڈارون کی اس تحقیق سے کہ ہر نئی نوع کسی انحراف سے پیدا ہوتی ہے۔ دو مشہور قوانین اخذ کئے گئے (۱) انتخاب نظری (۲) بقاء الاصلح۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ انحراف کسی جاندار میں پیدا کیونکر ہوا؟ اس غیر اہم اور غیر معمولی انحراف کا سبب اصلی کیا ہے؟ بس اسی سوال کے جواب سے یورپ نے کائنات کے متعلق وہ نظریہ مرتب کیا ہے وہ اب اپنا عقیدہ اور ایمان سمجھتے ہیں۔

ڈارون اس کا جواب دیتا ہے "محض حادثہ" ڈارون کا خیال ہے کہ اگر ایسے انحرافات بہم پہنچ جائیں تو یہ سلسلہ ارتقائے حیات بغیر کسی خارجی مدد و مداخلت کے خود بخود جاری رہے گا۔ کیونکہ ارتقاء کی بنا انہی انحرافات پر ہے اور اس کی تحقیق کے مطابق یہ انحرافات بغیر کسی مقصد اور منصوبہ کے واقع ہوتے ہیں کم از کم اس کو ان کے اندر کسی حکیم کا ہاتھ نظر نہ آیا۔ وہ اپنے آپ کو قائل نہ کر سکا کہ یہ خدا کا کام ہے جب کوئی خارجی عامل بھی نظر نہ آئے اور تبدیلی کا داخلی سبب بھی معلوم نہ ہو تو اس کے سوا اور کیا استنباط کیا جائے کہ یہ سب کچھ محض اتفاق کا کرشمہ ہے۔

اس کی دوسری توجیہہ لیمارک (LAMARK) کے ہاں ملتی ہے۔ وہ بھی ایک بہت مشہور ماہر حیاتیات گزرا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جاندار کے اندر انحراف یا تبدیلی خارجی ماحول کی تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب خارجی ماحول میں کوئی تغیر واقع ہوا تو اس کے اندر بسنے والے جاندار بھی اس کے مطابق اپنے اندر تغیر پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے جنہوں نے اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھال لیا وہ بچ گئے ———— جو ناکام رہے وہ فنا ہو گئے۔

بہر حال دونوں جوابوں میں خدا کہیں نہیں۔ ماحول ہے اور اسی ماحول سے انسان کی روش زندگی متعین ہوتی ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے ہادی ومآل خدا نہیں ماحول ہے۔ لہذا ماحول کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ ہے علم الحیات کی زندگی کی مادی توجیہہ۔

حیاتیات کا دوسرا دعوی یہ ہے کہ ارتقاء غیر جاندار سے جاندار کی طرف بڑھتا ہے زندگی کی اصل موت ہے امیبا پانی کی لاش تھی۔ جس سے جیلی مچھلی بنی اسی سے ترقی کرتے کرتے ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں اور پرندوں کا درجہ آیا و علیٰ ہذالقیاس زندگی کی کلی کا زندگی کی شاخ سے پھوٹنا تو سب نے دیکھا ہے۔ یہ معاملہ سمجھ میں بھی آجاتا ہے لیکن مردہ جسم سے زندگی کے بچے کا پیدا ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر اسے بھی تسلیم کر لیں کہ غیر نامیہ سے نامی جسم بن گیا تو یہ کیسے ہو گیا کہ خالص مادی جسم سے بالکل غیر مادی فواد نکل آیا؟ فواد (MIND) یقیناً ایک غیر مادی چیز ہے اور مادی حوالی سے نہ صرف لاتعلق بلکہ اس سے بلند و بالا ہے اگر ماحول مجھ کو متاثر کرتا ہے تو کیا میں ماحول کو نہیں بدل سکتا؟ انسانوں نے دریاؤں کے رخ موڑ دیئے ہیں اور سمندروں میں پہاڑ چلا دیئے ہیں یہ کس کے مظہر ہیں؟ کیا ان کارناموں سے انسان کی قوت ارادی کے اختیار کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ صرف بندۂ ماحول نہیں صاحب ماحول بھی ہے؟

اس الجھن کو انیسویں صدی کی نفسیات نے گہرا کیا۔ اور اس طرح اس عقدہ کو ما کیا کہ مادیت کا سکہ اور بھی جم گیا۔ یہ صحیح ہے کہ فواد بدن پر اور بدن فواد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ آنکھ کا ڈھیلا دبانے سے آنکھوں کے سامنے نیلے سا سے رقصاں ہو جاتے ہیں۔ یرقان اصفر کے مریض کو ہر شئے بسنتی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ پس فواد بدن کے اثرات سے آزاد نہیں۔ دوسری طرف دل کو ذرا ٹھیس لگے تو بدن میں ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں۔ محبت میں ناکامی بدن سے انتقام لے کر بس کرتی ہے۔ ہنگام خوف آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی ہیں اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ شواہد ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ بدن بھی فواد کی زد سے باہر نہیں۔ لیکن یہ سوال پھر کھٹکنے لگتا ہے کہ بدن وزن اور کمیت رکھتا ہے۔ یہ طبعی قوانین کی زد میں آسکتا ہے۔ لیکن فواد نہ تو جسم رکھتا ہے نہ وزن اور نہ کمیت۔ یہ زمان کی کمند میں آتا ہے۔ نہ مکان کے جال میں۔ پھر ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ ؟ اور یہ کیونکر ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک پتھر سے بدن پر چوٹ لگائی جا سکتی ہے کیونکہ دونوں جسم اور کمیت رکھتے ہیں لیکن اس سے کسی خواہش یا طلب کو کیونکر مجروح کیا جا سکتا ہے ؟ انسان کا بدن توڑا جا سکتا ہے ؟ لیکن کسی کی عزت یا اس کا اعتبار کیونکر توڑا جائے ؟

چونکہ یورپ پہلے ہی مشین اور علم مشین سوار تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ بدن اور فواد بھی اسی ایک ہی مشین کے علم کے تابع تصور کئے جائیں۔ فرانسیسی فلاسفر ڈیکارٹ نے حل تجویز کیا تھا کہ ان دونوں یعنی بدن اور فواد کو دو مختلف گھڑیاں سمجھ لیا جائے جن کو خدا نے بیک وقت کوک دیا ہے۔ اور وہ دونوں ایک ساتھ ٹک ٹک کر رہی ہیں۔ معاملہ یہ نہیں کہ ایک کی ٹک ٹک دوسری گھڑی کی ٹک ٹک کا سبب ہے بلکہ دونوں متوازی چل رہی ہیں۔ ڈیکارٹ کے بعد زمانے نے بہت ترقی کر لی۔ اس کے بعد جو مفکر آئے انھیں اس معاملے میں خدا کی مداخلت کچھ ناگوار سی گزری۔ انہوں نے اس نکتے کو سرے سے ترک کر دیا۔ اور فیصلہ کیا کہ فواد مادے ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یہ مادے کا شعور ہے جسے ہم فواد کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہمارے اندر جتنے خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ سب ہی ہمارے دماغی پٹھوں یا غدود کے وظائف کا نتیجہ ہیں۔ بدنی حرکت کے بغیر خیالات پیدا ہو ہی نہیں سکتے پس فواد کی غیر مادی اڑان بدن کی حرکات کے تابع ہے۔ اور بدن بجائے خود خارجی ماحول کے تغیرات کے تابع ہے۔

اس عقیدے کی توثیق علم طبعیات سے بھی ہو گئی ہے۔ علم طبعیات کی تحقیق تھی کہ مادہ اجزائے لاتیجزی سے مرکب ہے اور یہ اجزاء غیر فانی اور متجانس (HOMOGENEOUS) ہوتے ہیں۔ لہذا ہر حقیقت مادی ہے۔ پس جو مادی ہے وہ حقیقی ہے۔

ان تحقیقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا جہان کی ہر چیز مادہ میں ملبوس نظر آنے لگی۔ اور ہر وہ بات جو پہلے غیر مادی یا مادی قوانین سے بالاتر تصور کی جاتی تھی اب اس کے تحت آگئی۔ انسان بجائے خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو گیا۔ وہ محض ارتقائی اٹکل کا نتیجہ تھا۔ اور جس طرح وہ ایک دن محض اتفاق سے عالم ہست میں آگیا ہے اسی طرح وہ ایک دن اچانک نیست بھی ہو جائے گا۔ کوپرنیکس نے کائنات کے اندر زمین کی مرکزی حیثیت ختم کر دی۔ ڈارون نے زمین کے اندر انسان کی مرکزی حیثیت ختم کر دی اور مادی نفسیات نے بدن کے اندر فواد کی مرکزیت کو ختم کر دیا۔

اور انجام اس نئی بصیرت کا جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے صفحات میں صاف نظر آ جاتا ہے۔ نہ مذہب رہا نہ اخلاق رہا نہ نیکی رہی نہ مروت۔ حیاتیاتی ارتقاء کے اصول کے لحاظ سے مذہب کوئی قطعی امر نہ رہا وہ مختلف تغیرات کا ایک سلسلہ تھا۔ چنانچہ اس کی بھی ارتقائی کڑیاں تلاش کی گئیں۔ اور اس کی پچھلی کڑیاں کو افریقہ کے دور دراز وحشی جنگلوں میں اور زمانۂ قدیم کے رسومات سحر سے جوڑ توڑ کر مستنبط کر لیا گیا۔ مذہب خوف اور تخیل کی پیداوار تھا۔ ابتدائی انسان آسمان کے نیچے بے سہارا رہتا تھا۔ وہ بجلی کی کڑک سے ڈرا تو اس کو خدا تسلیم کر لیا۔ سانپ کی پھنکار سنی تو اس کے سامنے سر بسجود ہو گیا۔ جب ذرا مہذب ہوا تو باقاعدہ بت پرستی شروع کر دی۔ تہذیب اور بڑھی تو شرک چھوڑ موحد بن گیا۔ اب وحدت پرستی کا زمانہ بھی گزر رہا ہے۔ اور انسان سائنس کی روشنی میں حقیقت کو پا کر اس وہم کے خدا سے بھی گلو خلاصی کر لے گا۔ اس تحقیق عالیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں حضرت عیسےٰ تک کے وجود پر شک ہونے لگا۔ وہ اس مخمصے میں مبتلا ہو گئے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کبھی عرصۂ وجود میں آئے تھے یا یہ بھی تخیل انسانی

کے ڈھکوسلے ہیں۔ جب مذہب جو اخلاق کی بنیاد تھا توہم اور فریب سمجھا گیا تو اخلاق کیا باقی رہتا۔ علم کے زور سے اس کی اصلیت بھی معلوم کر لی گئی۔ اخلاق تو ماحول کے ساتھ توافق پیدا کرنے کے ڈھب کا نام ہے۔ یہ ڈھب اس وقت بدل جاتا ہے جب ماحول بدلتا ہے یہ قائم بالذات نہیں۔ مذہب اور اخلاق کے جاتے ہی نیکی اور مروت بھی گئی۔ چونکہ کائنات محض اتفاق اور اسباب کا کرشمہ تھی۔ اس لئے زندگی عبث اور لایعنی بن گئی۔ علم الحساب نے فریضہ ثابت کیا کہ اس دنیا میں رزق کی مقدار بالکل محدود ہے۔ پس جنگ وجدل کے بغیر چارہ نہیں۔ علم معاشیات کو اس سے شہ ملی اور اس نے معیشت کی اس کمی کے سائنٹفک طریقوں کی چھان بین شروع کر دی۔ اس بنا پر ایسے فلسفے معرض وجود میں عام آ گئے جو انسان کو معاشی جانور ثابت کرنے کے لئے بے قرار تھے۔ انسان کی زندگی اور اس کے نشیب و فراز کی اصل معاشی چھینا جھپٹی ہے۔ لہٰذا جو اس سے محروم ہیں وہ اپنے پنجے جھاڑ کر ان پر ٹوٹ پڑیں۔ جو دوسروں کا رزق لے اڑتے ہیں۔ ایسے فلسفوں کی روح طبقاتی کشمکش تھی۔ سیاست میں حصول قوت نصب العین ٹھیرا۔ قوت حاصل کی جائے خواہ کسی طریقے سے ہو منزل اپنے لئے خود بخود کوئی نہ کوئی وسیلہ پیدا کر لیتی ہے۔ یہ تھا اس عہد کا نعرہ اور یہاں ان حالات کو دہرانے کی ضرورت نہیں جو تاریخ کے صفحات میں مل سکتے ہیں۔ نپولین۔ بسمارک اور ہٹلر اسی مسلک زندگی کے مثالی شاہکار تھے۔ خونچکانی دغا اور دجل کے ایک نہیں ہزاروں واقعات نظر آ جائیں گے۔ یہ سب کچھ ظاہر کر رہے ہیں کہ یورپ مادی ترقی کے باوجود کس منزل میں تھا۔

ایسے وقت میں جب کہ فکر و عمل سب کچھ شیطان کے حوالے ہو چکا ہو اگر انہی میں سے ایک آواز اپنے بھائیوں کی خدا کی طرف بلانے لگے تو کچھ تعجب کی بات ہے جب کہ مذہب و اخلاق لٹے پٹے قافلے کی طرح سرگشتہ و حیران ہوں ایک شخص ان کی حمایت میں مخالفتوں کے علی الرغم کھڑا ہو جائے تو تعجب کی بات ہے جب کہ نازی ازم۔ سوشلزم اور کمیونزم ایسی طبقاتی جنگجویانہ۔ متشددانہ، قاطع مذہب اور روحانیت پسند تحریکیں قبول عام پا رہی ہوں ایک دعوت محبت و عدم تشدد سے تو حیرانگی کیوں نہ ہو؟

یورپ کے اس شیطانی دور میں ٹالسٹائی سا خدا دوست اور نیک انسان کیونکر پیدا ہو گیا؟ ڈارون کے خیالات کے مطابق ٹالسٹائی کو ماحول کی تخلیق ہونا چاہئے تھا۔ یا اگر وہ اس سے انحراف بھی کرتا تو زیادہ سے زیادہ معمولی سا انحراف کرتا۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ وہ بندۂ ماحول کی بجائے صاحب ماحول اور قاعدے کے مطابق تھوڑا سا منحرف ہونے کی بجائے اپنے زمانے کے بالکل متضاد ہو گیا۔ حالانکہ اس کی تعلیم فرانس اور جرمنی میں ہوئی اس نے وہی حاصل کئے جن کو پڑھ کر دوسرے مذہب اور خدا سے برگشتہ ہو گئے تھے لیکن وہ تھا کہ ان کو حاصل کر کے خدا کا اور بھی مومن ہو گیا۔ جب پر حق منکشف ہوا تو وہ صرف اپنے ملک و ماحول ہی کے ساتھ نہیں اپنے بیوی بچوں اور اعزا و اقربا کے ساتھ بھی لڑا اور صرف حق کی خاطر ان کو چھوڑا حق کے معاملے میں اسی غیر مصالحانہ روش کی بنا پر اس نے اپنا گھر بار تج دیا اور ایک سنسان ریلوے اسٹیشن پر جان دی۔ آخر اس کی کیا توجیہ کی جائے؟

ٹالسٹائی فلسفی نہ تھا داعی تھا اس کے پاس سچائیاں تھیں جن کو فروغ دینے کے لئے اس کے اندر اک تڑپ تھی۔ جبکہ فلسفہ نام آرام کرسی پر بیٹھ کر سوچ بچار کرنے کا، داعی سراپا شعلہ و اضطراب ہوتا ہے جبکہ فلسفی سراپا سکون اور گیان فلسفی عمل کی دنیا سے دور رہتا ہے وہ تماشائی کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھنا چاہتا لیکن داعی جو کچھ کہتا ہے اس پر شہادت دینے کے لئے اپنی جان و مال تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ ٹالسٹائی کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں لیکن وہ جس سچائی پر ایک بار ایمان لے آیا تھا اس سے ایک قدم نہیں ہٹا۔ اس کی کوئی سنسر کی چھلنی سے گزرے بغیر روس میں نہ چھپ سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی بات کہنے سے نہ ٹلا۔ حکومت وقت نے ہر حربے تحریص سے اس کو اپنے مشن سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کو جتنا دبایا گیا وہ اتنا ہی ابھرا۔ وہ نواب تھا۔ اور اس کو ہزاروں ایکڑ زمین ورثہ میں ملی تھی۔ اس نے اپنی سب جائداد اپنے اعزا و مزارعین میں تقسیم کر دی۔ کیونکہ وہ کہتا تھا کہ شخصی ملکیت نا انصافی اور ظلم کی محرک ہے وہ اپنی تصانیف کی رائلٹی بھی نہ لیتا تھا۔ کہ وہ حق کو فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ اس نے جلب منفعت کی نیت سے کتا

…ں کو وہ حق سمجھتا تھا اور جس میں اسے انسانوں کی فلاح نظر آتی تھی اس کی تبلیغ اس کا فرض اولین تھا۔

جس حق کو اس نے پا لیا تھا وہ یہ تھا کہ دنیا کی فلاح حضرت عیسیٰ کی سچی پیروی میں ہے۔ اگر دنیا کے سب لوگ سچے عیسائی بن جائیں۔ تو دنیا کا سارا فساد اور خرابی یک لخت ختم ہو جائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس حق کو پیش کرتے ہیں اس پر دنیا کے سب دانشمندوں اور حکیموں نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ متقدمین میں کرشن، بدھ، لوتسی، کنفیوشس، سقراط اور افلاطون اور متاخرین میں روسو پاسکل کانٹ اور ایمرسن وغیرہ جس حقیقت کی تبلیغ کرتے رہے ہیں وہ بدرجہ اتم نکھری ہوئی صورت میں حضرت عیسیٰ کی تعلیم میں نظر آتی ہے۔ ان دانایان انسانیت کی تعلیم وہی تھی جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ نے انجیل میں فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں خدا کی رضا پوری کرنا اور اپنے ہمسایہ سے محبت کرنا۔ یہ دونوں مسلمات ایک لفظ میں سمٹ کر آ سکتے ہیں اور وہ ہے لفظ محبت۔ یہ کہ تم دوسروں سے وہی سلوک کرو جیسا کہ تم دوسروں سے اپنے لئے توقع کرتے ہو جب آدمی اس بات کو تسلیم کر لیتا ہے تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے لئے وہی رویہ پسند کرے جس کا نمونہ حضرت عیسیٰ نے صلیب پر چڑھ کر پیش کیا تھا۔ یہ کہ برائی کا جواب بھلائی سے دیا جائے سیئہ کے معاوضہ میں حسنہ اور شر کے بدلے خیر۔ عیسائیت سے پہلے کا طرز عمل یعنی برائی کے بدلے برائی ایک جاہلی طرز عمل تھا۔ توریت میں اس کو ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت کے قانون میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے انجیل میں صاف فرمایا ہے کہ میرا طریقہ نہیں ہے اگر تیرے داہنے گال پر تھپڑ ملے تو تو اپنا بایاں گال آگے بڑھا دے۔ کوئی تیرا قمیص لے اڑے تو تو اسے اپنا فرغل بھی پیش کر دے۔ یہ تھی اصل عیسائیت اور یہ تھا مسیحی زندگی کا مرکزی نقطہ جس کو آج کی عیسائی دنیا چھوڑ کر جاہلی طریقے اختیار کئے ہوئے ہے۔

ٹالسٹائی ([illegible]) میرے اعتقادات میں کہتا ہے میں کلیسا کے مواعظ سنتا تھا۔ لیکن کسی طرح دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ جب زندگی پر الم کی گھٹا چھائی تھی تو یہ مواعظ اس کا مداوا ثابت نہیں ہوتے تھے۔ پھر میں نے خود مطالعہ شروع کیا تو مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ کلیسا حصول حق میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ اس کے بالکل الٹ ہے جس کی تلقین حضرت عیسیٰ نے فرمائی ہے۔ یہ لوگ مسیح کا خون اور ہڈیاں بیچتے ہیں توحید کے بجائے شرک سکھلاتے ہیں۔ اور خدا کے حضور عبادات کی بجائے پتھروں اور بتوں کی عبادت کرتے ہیں انھوں نے عیسیٰ کے دین پر جھوٹ کا پردہ ڈال کر اس کو بالکل چھپا دیا ہے۔ اور اصل دین جو کہ زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ بتاتا ہے اس کی بجائے یہ لوگ اسے محض چند خرافات ٹونے ٹوٹکے اور منتروں کے مجموعے کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ کتمان حق ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ عیسائیت کی صاف ستھری اور واضح تعلیم کو گدلا کرنے والے یہی جبت کے ٹھیکیدار ہیں۔ غرضیکہ ان کا پورا وجود حضرت عیسیٰ کی تعلیم کی نفی ہے۔ جبکہ عیسائیت پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ تم شر کے بدلے خیر دو تو یہ اس وقت محکمۂ احتساب کے تہ خانوں میں اہل حق کو کوڑے مارتے ۔۔۔۔۔ اور ان کو آگ میں جھونک رہے تھے۔

جب تک آدمی کلیسا کے اس پردے کو پھاڑ کر نہ جھانکے گا اس وقت تک وہ حق کی تجلی کبھی نہیں پا سکتا۔ اس چھوٹی سی کتاب میں اس نے یہ وضاحت اور یہ دلائل عدم تشدد کے اصول کی تشریح کی جب یہ کتاب چھپی تو ٹالسٹائی کے شہرہ آفاق نام کی کتاب یورپ اور امریکہ کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی صرف نام ہی نے کام نہ کیا اس میں جو کچھ جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا گیا تھا وہ انداز میں بالکل انوکھا اور الگ تھا۔ اس کتاب نے گویا دلوں کو موہ لیا اور اس حقیقت کے چرچے پھر شروع ہو گئے۔ جس کو مدت ہوئی کہ دنیا بھول چکی تھی۔ یہ خبریں کلیسا تک بھی پہنچیں اور چونکہ اس کے ساتھ حکومت کو بھی غیر مسیحی ادارہ قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔ اس کے بعد موت تک ٹالسٹائی کی ہر تحریر جس میں مذہبی موضوع کسی نوع بھی چھیڑا گیا تھا۔ روس میں نہ چھپ سکی البتہ لوگ اشتیاق سے اس کی دستی نقلیں تیار کر کے ہاتھوں ہاتھ ایک دوسرے تک پہنچا دیتے اور اس طرح اس کی ہر اشاعت

روس کے کونے کونے تک پہنچ جاتی۔

اس کتاب میں اس نے انجیل سے ثابت کیا کہ ریاست کا ادارہ عیسائیت کے منافی ہے۔ اس لئے کہ جو تشدد و اذیت شخص انفرادی طور پر ہوتا ہے وہ حکومت کی شکل میں منتقل ہو کر وسیع پیمانے پر جاری رہتا ہے۔ جو شر فرد کے ہاتھ میں بالکل حقیر تھا وہ یہاں آ کر اژدہا بن گیا۔ کیا حکومت کا تشدد روا اور جائز ہے؟ اگر ایک شخص کسی کا خون کرتا ہے تو وہ گردن زدنی ہے۔ لیکن وہی خون اگر حکومت کرے تو عین روا اور اس قتل میں اس کی امداد عین ثواب ہے۔ یہ حکومتیں جو اپنے تئیں مسیحی حکومتیں کہتی ہیں قاتلوں کا ایک منظم جتھا تیار کرتی ہیں۔ اس کو فوج کا نام دیا جاتا ہے اور اپنے بچوں کو اس میں داخل کرانا اشراف کے لئے قابل صد فخر ہے۔ یہ فوج اس لئے بنائی جاتی ہے اور اس پر بجٹ کا معتد بہ حصہ اس لئے صرف کیا جاتا ہے کہ چند آدمی برسر اقتدار ہیں اور ہر ابھرنے والے فرد یا گروہ کا وسیع پیمانے پر خون بہایا جا سکے۔ جب فرانس اور جرمنی لڑتے ہیں تو دونوں اپنے آپ کو "محافظ مسیحیت" کہتے ہیں حالانکہ مسیح نے تو انجیل میں صاف کہا ہے کہ تم اپنے ہمسایہ سے محبت کر۔

اس کتاب پر یورپ و امریکہ میں گویا آگ سی لگ گئی۔ علماء، مذہبی اور غیر مذہبی سائنس دان اور سیاست والے بھی تڑپ اٹھے کہ یہ شخص ان کی مسیحیت کو مشکوک قرار دے رہا ہے۔ وہ ہمیشہ سے یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن کسی نے کبھی آنکھ تک اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا تھا۔ وہ خدا کے وجود پر بھی شک کر سکتے تھے۔ تو ان کی مسیحیت مسلم رہتی تھی۔ لیکن یہ کون تھا ان کی حیثیت پر غور کرنے والا! کلیسا نے سخت مخالفت کی اور ٹالسٹائی کی مذہبی تفسیروں اور اعتقادات کے بارے میں ایک سوال نامہ کل مذہبی مجلسوں (SYNODS) کو بھیجا گیا۔ اور اس سلسلے میں سخت ہو کر لڑنے کی اپیل کی گئی۔ کسی نے تنقید کی، کوئی جھنجلا اٹھا۔ اور کسی نے صرف چپ رہنا ہی بہتر سمجھا۔ لیکن اس میں جو کچھ پیش کیا گیا تھا۔ وہ کچھ اس قوت اور آہنی دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا تھا کہ کوئی اس سے انکار نہ کر سکا۔ ٹالسٹائی نے ان سب مخالف خیالات اور تنقیدوں کو اکٹھا کر کے ان کا جواب اپنی کتاب "ملکوت الٰہیہ تمہارے اندر ہے" میں دیا۔ یہ کتاب حسب معمول روس سے باہر چھپی اور اس کی دستی کاپیاں بدستور سابق روس کے عوام اور خواص میں گھومیں۔ یہ کتاب جس زور قلم اور دلائل کے ساتھ لکھی گئی ایسے زور کے ساتھ یورپ کی پوری فکری تاریخ میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب نے معاندین کے عناد میں ضرور اضافہ کر دیا۔ لیکن لبوں پر مہر لگا کر۔ ٹالسٹائی نے فی الواقع حجت تمام کر دی۔ مخالفین اس کو گالیاں دیتے دھمکیاں سناتے جو ان سے ذرا کم جوش تھے تیوری چڑھا کر اور کندھے سکوڑ کر رہ گئے۔ لیکن جواب کسی سے بھی نہ بن آیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ اور امریکہ میں کئی اہم مقامات پر ٹالسٹائی کے خیالات جڑ پکڑ گئے۔ متعدد لوگوں نے اپنی پرانی (جاہلی) روش زندگی ترک کر دی۔ اور فقیرانہ لباس پہن لیا۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے مہاتما گاندھی جیسے عظیم الشان آدمی کو عدم تشدد کا قائل کیا تھا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالعے نے ان کے سامنے فکر و نظر کی ایک پوری دنیائے معرفت لا بسائی۔ اس کتاب میں ٹالسٹائی اپنی دعوت کے ایک ایک پہلو کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔

وہ کہتا ہے جس حقیقت کا میں نے اظہار کیا ہے وہ تاریخ مسیحیت میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ابتدائے عیسائیت سے اب تک ایسے فرقے اور حق گو افراد موجود رہے ہیں جنھوں نے عدم تشدد کی زندگی ہی میں سچی عیسائیت کو پایا ہے۔ وہ اپنے عقیدے پر جمے رہے اور جب انھیں کسی پر تشدد کرنے پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے دوسروں پر تشدد کرنے کے بجائے اپنی ذات پر تشدد سہنا قبول کیا۔ انھوں نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے حکومت کا کوئی عہدہ منظور نہ کیا۔ انھوں نے کبھی پولس سے استمداد نہ کی۔ جب مقننہ کے لئے انتخابات ہوئے تو انہوں نے انتخابات میں حصہ لینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ کہ قانون سازی میں شریک

ہونے کا مطلب خود اس نظام میں حصہ لینے کے مترادف ہے جس کی بنیاد تشدد اور ظلم پر قائم ہے۔ ایسے حق گو ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ اگرچہ بالکل اقلیت میں۔ ان کی ہر پکار پر مجرمانہ تغافل کے ساتھ بہرا کان آگے بڑھا دیا گیا۔ وہ اس لئے کہ اگر وہ ان کی بات مان لیتے ہیں تو انھیں وہ سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ جو انھوں نے ظلم اور تشدد سے اپنی اغراض کے لئے سمیٹ رکھا ہے۔ انھیں وحشت و بربریت کی زندگی چھوڑ کر آدمیت اور اخلاق کی زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ٹالسٹائی کہتا ہے جو اطلاعات اس بارے میں مجھ تک پہنچی ہیں ان سے مجھے بخوبی معلوم ہوگیا ہے کہ برسراقتدار طبقہ بھی عیسائیت کو کبھی بھی نہیں چاہ سکتا وہ اس کے فروغ کی دیدہ دانستہ مخالفت کر رہا ہے اور نہیں چاہتا کہ سچائی کسی نوع بھی فروغ پائے۔"

آگے چل کر وہ کہتا ہے "میری کتاب پر تنقید کرنے والے روسی اور غیر روسی دو طبقات میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو مذہبی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور میری دعوت پر ایک مومن مسیحی کی حیثیت سے تنقید کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مذہب سے لاتعلق ہیں اور میری بات کو فلسفیانہ انداز سے پرکھتے ہیں اور پوری آزاد خیالی سے اس کی بین میخ نکالتے ہیں۔ میں پہلے مذہبی طبقے کے اعتراضات کا جواب دونگا"

اور انہی اعتراضات کے جوابوں میں وہ اپنی دعوت کے مختلف پہلو کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ پہلا اعتراض اس سوال پر کیا گیا تھا کہ جو ٹالسٹائی نے اپنی کتاب "میرے اعتقادات" میں اٹھایا تھا کہ کیا حضرت مسیح نے پہاڑی کا وعظ محض سنانے کیلئے کیا تھا یا اس پر عمل کرنے کے لئے جب یہ تسلیم ہے کہ یہ وعظ عمل کرنے کے لئے ہے تو پھر اس فوجی جبری بھرتی کی کیا توجیہ کی جائے جو ان کی جانب سے ہو رہی ہے۔ جو اپنے... آپ کو مسیح کے پیرو اور پہاڑی کے وعظ کو حرز جان سمجھتے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں مسیحی علماء کے ایک گروہ نے سرے سے انکار کر دیا کہ عدم تشدد مسیحیت کا لازمی جزو ہے۔ اس مکتب خیال کے متعلق ٹالسٹائی کہتا ہے ایسے لوگوں کو سمجھانا عبث ہے وہ مسیحیت اور حضرت عیسےٰ کو انجیل کے صفحات میں نہیں اپنی خواہشات اور اہوائے نفس میں ڈھونڈتے ہیں۔

دوسری دلیل عدم تشدد کے خلاف یہ دی گئی کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حضرت عیسےٰ نے بایاں گال آگے بڑھا دینے اور قمیض کے ساتھ کوٹ پیش کر دینے کی تلقین کی ہے۔ لیکن سوسائٹی میں ایسے شریر لوگ بھی تو ہوتے ہیں کہ جنھیں جب تک بزور نہ دبایا جائے۔ وہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ ٹالسٹائی اس کا جواب دیتا ہے کہ چند لوگوں کو شریر کہہ کر گویا ہم اس آیت کی نفی کر رہے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ تم سب بھائی بھائی اور ایک باپ کے بیٹے ہو۔ دوسرے یہ کہ خیر و شر کا ہمارے پاس کونسا معیار ہے جس سے ہم قطعی طور پر معلوم کر سکتے ہیں کہ فلاں شریر ہے اور فلاں نیک۔ دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی کے نزدیک نیک یا بد ہوتا ہے۔ اس رخنے کو کھول کر گویا ہم تشدد کے لئے ایک چور دروازہ کھول رہے ہیں۔

تیسری قسم کی دلیل اور بھی پرفریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شر کا مقابلہ کرنے کی تلقین صرف اپنی ذات کے معاملے تک محدود ہے لیکن جب شر اپنے ہمسایہ پر حملہ ہو تو اس وقت عدم تشدد نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ تشدد کے ساتھ اس شر کا قلع قمع کرنا عین مستحسن ہے۔ ٹالسٹائی جواب دیتا ہے اول تو یہ تاویل نص کے قطعی خلاف ہے اگر اسے تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر استفسار طلب معاملہ ہوگا کہ وہ کونسا خیر یا خطرہ ہے جس پر تشدد استعمال کیا جائے۔ اگر صرف ذاتی رائے ہی اس معاملے میں حکم مان لی جائے۔ تو تشدد کا کوئی ایسا قضیہ باقی نہ رہے گا۔ جو خطرہ قرار نہ دیا جا سکتا ہو۔ اگر حضرت عیسےٰ کو اس استثنے کا علم ہوتا تو وہ اس کی طرف ضرور اشارہ فرماتے۔ مگر انھوں نے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جب کوئی تیرے دائیں گال پر چپت مارے تو تو اپنا بایاں گال بھی بڑھا دے

ہم محض خطرے کی بنا پر ایک شخص کو قید کر دیتے ہیں اس کے جرم کی سنگینی پر اسے تختہ دار پر لٹکا دیتے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مجرم ہمیشہ مجرم رہے گا۔ کون پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ اس میں اصلاح کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ کیا عجب جو ایک روز وہ تائب ہو کر راہ ہدایت اختیار کر لے۔ کیوں نہ اسے سدھرنے کا موقع دیا جائے؟

چوتھی دلیل میں کہا گیا ہے کہ اگر چہ یہ حکم صحیح ہے کہ شر کے بدلے میں خیر دیا جائے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ بس اسی کو معیار عیسائیت قرار دے دیا جائے گا۔ ٹالسٹائی کہتا ہے گویا اس حکم کے اقرار سے فرار کا ایک نہایت لطیف طریقہ ہے۔ ذرا مسیحی علمائے سے پوچھ دیکھئے تو وہ ہمیشہ زنا کو برا کہتے ہیں۔ اور زنا کے کسی معاملے میں انجیل کے زنا کے متعلق حکم کو غلط یا غیر ضروری نہیں بتلائیں گے پھر اس حکم کے بارے میں وہ کیوں پس و پیش کر رہے ہیں؟

پانچویں قسم کی دلیل اعلیٰ علمائے عیسائیت کی جانب سے لائی جاتی ہے انھیں خوب خوب معلوم ہے کہ ان کے وعظ و عمل کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج پیدا ہو چکی ہے۔ وہ اس حکم کی سچائی بھی مانتے ہیں۔ اور اپنی غلط روی پر بھی نگاہ رکھتے ہیں اس تفاوت کو چھپانے کے لئے وہ کہتے ہیں یہ تو خیر صحیح حکم ہے کچھ اور کہئے ٹالسٹائی کہتا ہے ایسے لوگوں کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ وہ احکام شریعت مسیحی کی صریحی خلاف ورزیاں دیکھتے ہیں۔ اور ان سے اس لئے منہ پھیر لیتے ہیں کہ وہ کہہ سکیں کہ ہم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں وہ بندگان مفاد ہیں وہ شریعت مسیح کو اپنے مفاد پر قربان کر دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

روسی نقادوں کے بارے میں وہ کہتا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تہذیب کی جس راہ پر اس وقت یورپ گامزن ہے بس وہی تہذیب و انسانیت کا واحد مسلک ہے۔ ایسے لوگوں کی فہم پر سوائے رنج و ماتم کے اور کیا کیا جائے"

اور جو لامذہب لوگ آزاد خیال تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسا مسلک زندگی اس دنیا میں قابل عمل نہیں ہے۔ اور یہ کہ ٹالسٹائی گزرے ہوئے اکہارٹ کے زمانہ کی سوئی کو صدہا برس پیچھے پھیر رہا ہے۔ ٹالسٹائی کہتا ہے وہ اس حقیقت پر اس لئے برستے ہیں کہ یہ حقیقت ان سے تبدیلی روش کا تقاضہ کرتی ہے حضرت یسوع کی تعلیمات اس لئے نامناسب اور غیر موزوں ہیں کہ اگر یہ عمل میں لائی گئیں تو زندگی ویسی نہ رہے گی جیسی کہ اب ہے بالفاظ دیگر اگر ہم حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کر دیں تو ہم اس شیطانی زندگی کو جاری نہ رکھ سکیں گے کہ جس پر ہم چل رہے ہیں اور جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

جہاں تک گزرے ہوئے اکہارٹ کا اعتراض ہے۔ معاملہ کو بہانے زمان کے دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو یہ الجھن بھی دور ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ اس کشمکش کو کیونکر ختم کیا جائے جو لوگوں کے درمیان اس لئے جاری ہے کہ جس کو چند لوگ خیر سمجھتے ہیں اس کو دوسرے شر کہتے ہیں۔ اور جس کو چند شر جانتے ہیں۔ وہ دوسروں کے نزدیک درجہ خیر رکھتا ہے۔ یہ کہنا کہ جس کو میں شر سمجھتا ہوں، وہی اصل شر ہے۔ اس مشکل کا حل نہیں۔ اس مشکل کے صرف دو ہی حل ہیں۔ یا تو ہمیں کوئی ایسا بے شک و شبہ اور قطعی معیار مل جائے کہ جس سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں شر ہے اور فلاں نہیں ہے۔ یا پھر ہم شر کا تشدد سے مقابلہ کرنا چھوڑ دیں۔ پہلا طریقہ آزما کر دیکھ لیا گیا ہے۔ ابتدائے تاریخ سے اب تک ہمیں کوئی قطعی معیار خیر و شر نہیں مل سکا دوسرا طریقہ جس کو ہم شر خیال کریں اس کا تشدد سے اس وقت تک مقابلہ نہ کرنا جب تک کہ کوئی قطعی عالمگیر معیار خیر و شر دستیاب نہیں ہو جاتا۔ یہ حل حضرت عیسیٰ کی جانب سے تجویز کیا گیا ہے۔ اگر ہم نے پہلے کو آزما کر دیکھ لیا ہے تو دوسرے کو بھی ضرور آزما لینا چاہئے۔

اس ساری کج فہمی اور گمراہی کی اصل وجہ ٹالسٹائی کو اس وقت معلوم ہوئی جب اس کی دعوت پر چاروں طرف سے غیظ و غضب کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ جو لوگ ٹالسٹائی کی تعریف کیا کرتے تھے وہ اس کی برائیاں کرنے لگے۔ جو اس کے مداح تھے وہ اس کے دشمن

بن گئے۔ ٹالسٹائی کہتا ہے۔ اس کور بینی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم عیسائیت کو صاف اور سیدھے معنوں میں نہیں سمجھتے اس نافہمی کے چند اسباب ہیں جن میں سے ایک تو یہ کہ عیسائی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عیسائیت کے متعلق ہم نے جو کچھ سمجھنا تھا وہ سمجھ لیا ہے۔ اور اس سے مزید ہم کو نہ تو سمجھنے کی ضرورت ہے نہ جاننے کی۔ وہ عیسائی جو ایمانًا عیسائی ہیں ان کا ایمان کلیسا کے تابع ہے وہ اس حجاب کو ہٹا کر دیکھنا نہیں چاہتے اور جو نسلاً عیسائی ہیں اور عیسائیت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کی سمجھ میں سائنس حائل ہے۔ وہ اس کے فریب سے نکلنا نہیں چاہتے ایک کی بصیرت کو کلیسا نے دھندلا کر رکھا ہے تو دوسرے کی بصیرت کو سائنس نے کلیسا کی زیست کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ کتمان حق کا فرض ادا ہو۔ اور اصحاب اقتدار کی ہر غیر مسیحی حرکت پر دست رحمت پھیر کر اسے مسیحی ثابت کر دیا جائے۔ اور سائنس اس زعم میں مبتلا ہے کہ میں کامل ہوں۔ حق صرف مجھ میں ہے۔ مجھ کو کیا ضرورت ہے اپنے سے باہر حق ڈھونڈھنے کی اس پر مزید اس کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ مسیحیت سوائے چند معجزوں کی داستان اور چند بیہودہ رسومات کے مجموعہ کے کچھ نہیں اور یہ کہ اس کی بنیادی تعلیم ناقابل عمل ہے۔ یہ دونوں طبقے جب تک فریب کے ان جالوں سے نہ نکلیں گے حق تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

لیکن ان دو وجوہ کے علاوہ سب سے بڑی وجہ عیسائیت کو غلط سمجھنے کی یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات آدمی اپنی زندگی کا رُخ بدلے بغیر بھی قبول کر سکتا ہے۔ ٹالسٹائی کہتا ہے (اور دیکھئے دین کا کیا واضح تصور اس کے سامنے تھا) حضرت عیسیٰ کی تعلیم محض چند ایسے قوانین کا مجموعہ نہیں جو انسان کی رہبری کیلئے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ یہ تو زندگی کے ایک نئے نظام کی تفسیر ہے یہ انسانی زندگی کے پورے دائرہ کار کی ایک بالکل نئی اور جداگانہ تعریف ہے۔ ایسی تعریف کہ اس سے پہلے جتنی بھی انسانی زندگی کی تعریفیں کی گئی ہیں ان سے بالکل مختلف اور انوکھی۔ یہ صرف اس عہد کیلئے نہ تھی کہ جس میں حضرت یسوع پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ آج کے پر آشوب دور زندگی کے لئے بھی ہے جس میں انسانیت اب داخل ہو رہی ہے۔

آگے چل کر وہ کہتا ہے " ایک عام آدمی اسی لئے مبہوت ہے کہ جس پر وہ ایمان رکھتا ہے وہ اس زندگی سے کتنا مختلف اور بعید ہے جو وہ بسر کر رہا ہے۔ کم از کم ایک حساس آدمی کے لئے ایسی زندگی بسر کرنا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کانٹوں کی سیج پر لیٹنا ہے۔ جدید دنیا کے سب لوگ ایک متضاد زندگی بسر کر رہے ہیں جو کچھ ان کے ضمیر میں ہے وہ ان کی عملی زندگی میں نہیں ہے یہ تضاد زندگی صرف ایک شعبے میں نہیں بلکہ ہر شعبے میں نمایاں ہے وہ معاشی ہو یا سیاسی۔ یہ تضاد جو ہمارے ضمیر اور عملی زندگی میں موجود ہے دو طریقوں سے رفع کیا جا سکتا ہے یا تو ہم اپنی زندگی کو بدل دیں یا اپنے ضمیر کو۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ آدمی عیسائیت پر ایمان بھی رکھے اور خون بھی بہائے۔ اور دھوکہ بازی بھی کرے ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم جاہلی طرز زندگی کو چھوڑ کر مسیحی طرز زندگی اختیار کر لیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم اس انجام کے لئے تیار ہو جائیں جو جاہلی زندگی کے لئے مقدر ہے۔

سلسلۂ کلام میں نوع کے وجود کا مقصد سمجھاتے ہوئے ٹالسٹائی بتاتا ہے کہ یہ انسان قوت و طاقت ہے اور اس سے منشا یہ ہے کہ چند آدمی مقتدر رہ کر اس کے ذریعہ لاکھوں خلق خدا کو دباتے رہیں اگر اس کا مقصد استعمال شر کہا جائے تو یہ غلط ہے ہر شخص جانتا ہے کہ تشدد اور طاقت سے شر کم نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ ماحول کو عاقلانہ جانے اور اخلاقی قوت کا اثر نہ ڈالا جائے عیسائیت کسی قانونی نظام کا نام نہیں کہ جس کو نافذ کر کے آدمیوں کی زندگیاں بدل دی جا سکتی ہیں عیسائیت ایک بلند اور نئے تصور زندگی کا نام ہے اور نیا تصور زندگی تھوپا نہیں جاتا قبول کیا جاتا ہے "

حقیقت مسلم اور شبہ سے بالاتر ہے۔ کہ موجودہ طرز زندگی غیر مسیحی اور جاہلی PAGAN ہے اور اس نظام میں عیسائیت کے اصولوں پر چلنا قریب قریب ہونے خیرہ سے کے مترادف ہے لیکن اس کا حل کیا ہے یہ کہ ہم جاہلی طرز زندگی کے اسباب زائل کر کے مسیحی طرز

زندگی پیدا کریں۔ کیا اس کے اسباب کہیں خارج میں ملیں گے۔ یا خود ہمارے اپنے اندر؟ ٹالسٹائی اس کا جواب دیتا ہے۔ خارجی ماحول کو بدلنے کا صرف ایک ہی مسیحی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو بدلا جائے۔ ایک عیسائی انسانی اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ اس لئے کہ وہ اقتدار کو صرف خدا کا حق سمجھتا ہے۔ وہ اسی خدا کے قوانین پر عمل پیرا ہوتا ہے کہ جن کا احساس اطاعت وہ اپنے اندر پاتا ہے اور انھیں ارادۃً اور برضاء ورغبت بجا لاتا ہے۔ بس ماحول کے بند صنوں سے چھٹکارا کشمکش اور جنگ سے نہیں حاصل کیا جا سکتا اور نہ موجودہ صورت زندگی کو جھک سے اڑا دینے سے ملتا ہے۔ اس سے چھٹکارا مل سکتا ہے تو صرف نہم دزندگی میں تبدیلی سے کوئی شخص کسی کو کسی غیر مسیحی فعل پر مجبور کرے تو وہ اس کی بجا آوری سے انکار کر دے اگر اس مثال کی تقلید سب کرنے لگیں تو یہ معاملہ بڑی آسانی اور خون خرابے کے بغیر بھی طے پا سکتا ہے جو دوسرے طریقوں سے ناممکن ہے"

"عیسائیت" ریاست" کو ختم کر دیتی ہے کیونکہ یہ منبع تشدد و طاقت ہے اور حضرت مسیح نے صلیب پر لٹک کر اس کی حقیقت واصلیت کو فاش کر دیا تھا۔ جو لوگ ادارہ حکومت کے لئے یہ وجہ جواز پیش کرتے ہیں کہ اگر اسے ختم کر دیا جائے تو شریر لوگ اشراف کا جینا اجیرن کر دیں گے ان سے ٹالسٹائی یہ پوچھتا ہے۔ اگر اس عہد میں جب کہ حکومت کلیت پسند (TOTALITARIAN) ہوتی جا رہی ہے نیکی مظلوم اور بدی ظالم نہیں ہے؟ کیا اس وقت نیک مجبور اور شریر مختار نہیں ہے؟ ریاست کے خاتمے کے بعد اگر چہ شر رہے گا تاہم وہ اتنا وسیع ومقتدر نہیں ہوگا۔ جتنا کہ اب ہے؟"

پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر صالح آدمی برسراقتدار آجائیں تو حکومت کا یہی ادارہ شر کی بجائے خیر کا ذریعہ بن جائیگا ٹالسٹائی کہتا ہے "اگر وہ بھی اصلاح کے لئے تشدد کا استعمال کریں گے تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہی کیفیت پھر پیدا ہو جائیگی جو غیر صالح قیادت کے ماتحت تھی۔ دوسرے یہ کہ حکومت اپنا مفہوم پاتی ہے دوسروں کو مطیع بنا کے۔ پس حکومت جس کسی کی ہوگی وہ دوسروں کو مطیع بنائے گی۔ یہ فعل استعباد بجائے خود شنیع اور غیر مسیحی ہے"

پس حق اور خیر حکومت کے اوامر کے ذریعہ سے نہیں آتے ہیں بلکہ اس طریقہ سے آئیں گے جس کی مثال خود حضرت مسیح نے اپنی زندگی سے دی ہے یعنی حق کی فہم پیدا کر کے آدمیوں کو اپنی اپنی جگہ پر آمادہ اصلاح کرنا اور اس کے لئے سب سے بڑا کرنے کا کام رائے عامہ کو حق کے لئے ہموار و تیار کرنا ہے۔

اکثر لوگوں کو یہ طریقہ اختیار کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اصلاح نفس اور عیسائیت کے شعوری طور پر قبول کرنے والے ان انیس صدیوں میں کتنے پیدا ہوئے ہیں؟ اگر یہ طریقہ اصلاح اختیار کیا گیا تو عوام کو راہ راست پر لانے کے لئے کئی صدیاں درکار ہوں گی۔

ٹالسٹائی جواب دیتا ہے "یہ اعتراض ان لوگوں کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے جو نیم قسم کے عیسائی ہوتے ہیں وہ بلاشک وشبہ عیسائیت کی راہ پر روڑا بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب رائے عامہ عیسائیت اور حق کے لئے تیار ہوگئی تو یہی لوگ عیسائیت کی طرف اس طرح لپکیں گے جس طرح آفتابہ پانی سے بھرنے کے لئے نہر میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ پہلے تھوڑا تھوڑا پانی اس میں داخل ہوتا ہے جوں ہی وہ پانی سے وزنی ہو جاتا ہے وہ غڑاپ سے نہر میں ڈوب جاتا ہے اور یکدم لبریز ہو جاتا ہے۔ پھر رائے عامہ کی تیاری و ہمواری کے لئے صدیاں درکار نہیں ہوتیں یہ ایک بار جڑ پکڑ لے تو خود بخود اپنے لئے میدان بناتی چلی جاتی ہے۔ جب قوموں کی قوموں نے نیا دین اختیار کیا اور وہ عیسائی یا مسلمان ہوگئے تو یہ تبدیلی ان کے اندر تشدد سے نہیں پیدا ہوئی تھی تشدد سے تو الٹا اثر پڑتا ہے۔ یہ تبدیلی اس لئے پیدا ہوئی کہ رائے عامہ ان کے حق میں ہموار ہو چکی تھی۔ اور اس سے کوئی جائے مفر نہ تھی۔

مسیحی دنیا اس وقت جس غیر اخلاقی حالت میں مبتلا ہے وہ کسی تشدد کا نتیجہ نہیں ہے اس کے قید خانے اور تختہ ہائے دار، اس کی فیکٹریاں اور سرمایہ کے جمع شدہ انبار۔ اس کے ٹیکس، گرجے، شراب خانے اور چکلے اور اس کی روز افزوں اسلحہ بندی اور اس کے لاکھوں اوف احساس آدمی جو زنجیر سے بندھے ہوئے کتے کی طرح اپنے مالک کے اشارے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے ہر وقت تیار بیٹھے ہیں اگر تشدد کا نتیجہ ہوتے تو یہ امر واقعی سخت اور وحشت ناک تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ سب کچھ رائے عامہ کا پیدا کردہ ہے۔ اور جس کو رائے عامہ قائم کر سکتی ہے۔ وہ اکھاڑ بھی سکتی ہے "۔

جب اس سے مسیحی نظام کے متعلق دریافت کیا گیا جس کی طرف وہ لوگوں کو بلا رہا تھا کہ وہ کیسا ہوگا؟ تو اس نے کہا۔ " ایسے مطالبوں کی نوعیت بالکل ایسی ہے جیسی کہ کوئی سیاح کے کسی اجنبی ملک میں داخل ہونے سے پہلے اس سرزمین کی تفصیلی نقشہ طلب کرنے کی ہے اگر ایک شخص کو اپنے ہر دور زندگی کے متعلق پہلے ہی سے پورا پورا علم ہو جاتا تو زندگی میں باقی کیا رہ جاتا؟ یہی معاملہ انسانیت کا ہے اس نئے دور زندگی اور اس نظام نو کے اسباب و شروط کا ہمیں علم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خود ہم ہی نے تو اسے برپا کرنا ہے زندگی کا راز اسی میں ہے کہ آدمی اور دائرے علم کی ٹوہ میں لگے رہیں۔ پھر جب کچھ ان کے علم میں آجائے اس کے مطابق اپنے اعمال کو ڈھال لیں "۔

اس کتاب کی تیاری میں اسے پورے دو برس لگے۔ روس اور یورپ کی معاشری زندگی کا کوئی گوشہ اس نے نہیں چھوڑا۔ جس کی مسیحیت کا پول اس نے کھول نہ دیا ہو۔ واعیانہ انداز سے معاشری تجزیہ جس کمال سے اس کتاب میں ملتا ہے۔ اس کی نظیر کہیں یورپ میں تو نہیں ملتی البتہ اس کا ایک جلوہ اسی روشنی کے ساتھ ہمارے یہاں کی ایک کتاب " مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش " میں ضرور مل جاتا ہے۔

یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے تلاش کر کے پڑھا جائے۔

اسی دعوت کو اس نے عقلی اور فلسفیانہ انداز سے اپنے ایک طویل مضمون (ON LIFE) میں پیش کیا۔ ایک عالم نقاد اس کے متعلق کہتا ہے " اس مضمون نے افلاطون کی یاد تازہ کر دی ہے ٹالسٹائی اس سے کسی صورت بھی کم نہیں "

اس مضمون میں وہ سب سے پہلے مذہبی اصطلاحات پر تنقید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے " اگر زندگی کے حقائق ہر انسان کے لئے ہیں وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ تو پھر ان کو اصطلاحات کے پردوں میں چھپا کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سائنس ان حقائق کو ظاہر کرنے سے ڈرتی ہے اور یہ ڈر اور خوف اس لئے ہے کہ خود اسے بھی یقین نہیں کہ جس چیز کی تحقیق وہ کر رہی ہے وہ غلط ہے یا صحیح۔ سائنس کا طریقہ تحقیق استنباطی ہے۔ وہ چند حصوں یا سمتوں یا اجزاء کا مشاہدہ کر کے اس سے کل کے متعلق استنباط کرتی ہے۔ لیکن کیا ایک چیز کے حصوں کا الگ الگ مشاہدہ آدمی کو کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچا سکتا ہے۔ ایک بھیڑی کے مختلف حصوں کا الگ الگ مشاہدہ کر کے کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ اور اس کا وظیفہ کیا ہے؟ سائنس اور اس کے ساتھ فلسفہ کی یہی بنیادی غلطی نہ صرف اس کو بلکہ کل انسانیت کو حق تک پہنچنے میں سنگ دست رکاوٹ بن رہی ہے۔

زندگی کا راز انسانی ضمیر ہی تلاش کر سکتا ہے سائنس نہیں کر سکتی۔ سائنس کا کام نقعا شاہدہ ہے۔ وہ بھی مشاہدہ کلی نہیں جزوی کسی چیز کے چند پہلوؤں کو دیکھ کر اس کے کل کے متعلق صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ایسی کوششوں سے وہ گویا حقیقت کو چھوڑ کر فریب کی طرف دوڑ رہی ہے۔ اور فریب سے کبھی حقیقت مستنبط نہیں کی جا سکتی وہ موزوں حصے کی اصل جگہ چھوڑ کر دوسری سمتوں میں بڑھ رہی ہے۔ اور اس طرح ایسی فاش غلطیوں میں مبتلا ہو رہی ہے کہ آئندہ اس کے سنبھلنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مثلاً حیاتیات زندگی کا راز تلاش کرنے نکلی اور اس چکر میں پھنس گئی کہ حیوانی زندگی کی کڑیاں کہاں کہاں ملی ہیں۔ مظاہر حیات کو عین حیات سمجھ لیا۔ پھر اس پر فلسفہ کی پوری عمارت کھڑی

کی ہی۔ زندگی کا سراغ خارج میں نہیں باطن انسانی میں ملے گا۔ اسی لئے حکما نے کہا ہے Know Thyself من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ۔

جب ہم باطن میں اپنی نگاہ ضمیر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد ذاتی راحت ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہی مقصد اپنی ضد آپ بن جاتا ہے۔ جب ہر فرد اسی کو اپنا مقصد زندگی بنالے جس امر میں میری خوشی ہے اس میں دوسرے کی نہیں اور یہیں سے ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں تضاد کا یہ بنیادی قانون موجود ہے۔ زندگی کو اسی تضاد کی الجھن سے بچانے کے لئے انسان نے سوچنا شروع کیا تھا "ٹالسٹائی کہتا ہے " آغاز تاریخ سے آج تک جو کچھ ہمیں اس بارے میں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی ساری تگ و دو اس بھلائی اور خیر کو دنیا سے زیادہ واضح اور غیر مبہم بنانے کے لئے ہے کہ جس کو باہمی کشمکش دکھ اور موت بھی نہ چھو سکیں " گویا انسانی زندگی جہد للبقا نہیں جہد للخیر ہے۔

زندگی کی ترجمانی کرنے والے اس وقت دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو ظاہری مذہبیت کا دو پٹہ حد سے بڑھے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو سائنس کے علم بردار ہیں۔ پہلا گروہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی زندگانی بے اصل اور حقیر ہے۔ اصل زندگی زندگی بعد موت ہے۔ لہذا سب معاملات یہاں کی بجائے آخرت پر اٹھا رکھنے چاہئیں۔ اور آخرت کی سرخروئی صرف ان رسومات کی بجا آوری ہی سے مل سکتی ہے جن کی تعلیم وہ دیتے ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے زندگی لایعنی ہے انسان کی اصل زندگی وہ حیوانی زندگی ہے جس کا مقصود بس اپنی ذات کی اغراض کی تکمیل ہے۔ انسان کو صرف حیوانی زندگی ہی کے قواعد کی پیروی کرنی چاہئے اور جس طرح بن پڑے اپنے نفس کی ہر خواہش پوری کرے۔

یہ کہہ کر سائنس والے حیوان اور انسان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتے حالانکہ انسانی اور حیوانی زندگی کو ممیز کرنے والا عقلی شعور ہے جو انسان کو حیوان سے اشرف بناتا ہے ٹالسٹائی کہتا ہے " انسانی زندگی عقلی شعور کے ظہور کے ساتھ شروع ہوتی ہے" حیوانی زندگی مادہ کے قوانین حرکت کے ماتحت ہے۔ لیکن انسانی زندگی عقلی شعور کے قوانین اور ان کی بجا آوری میں مضمر ہے عقلی شعور انسان کی حیوانی شخصیت سے اس طرح پھوٹتا ہے جس طرح پودے کا تنہ بیج سے پھوٹتا ہے۔ اس جہت سے ہماری زندگی کا اصل مقصد اپنی حیوانی شخصیت کا اتباع عقل کے تابع کر کے حصول خیر کے لئے جہد کرنا ہے۔ باطل علم ہماری حیوانی شخصیت (بدن) کے قوانین معلوم کر کے سمجھ لیتا ہے کہ بس ہماری زندگی یہی سب کچھ ہے۔ حالانکہ انسانی زندگی اور حیوانی زندگی کے درمیان وہی فرق ہے جو جسم اور سایہ کے درمیان ہے۔ اگر سایہ کی حرکات و سکنات سے جسم کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا تو قوانین بدن سے کیونکر انسانی زندگی کا راز معلوم ہو سکتا ہے؟ ہمارے مادی بدن کے قوانین ہمارے افعال کا سبب نہیں ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ان افعال کی راہ میں روڑا بن سکتے ہیں۔ فواد و بدن کی بحث کو پھر سامنے لائیے! اور دیکھئے کہ یہ شخص کس طرح اپنے عہد کے خلاف سوچ رہا ہے جبکہ انیسویں صدی کی نفسیات اپنی ساری قوت فواد کو مادی حرکات کا معلول قرار دینے میں صرف کر رہی تھی۔ تو یہ اللہ کا بندہ اس کے بدلے سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر انجیل سے حقائق ڈھونڈھ رہا تھا۔

کنفوشس، چینی پیغمبر کہتا ہے " سچا علم یہ ہے کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں اسے سمجھ لیں کہ ہم یہ کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ ہم نہیں جانتے اس کے متعلق تسلیم کر لیں کہ یہ کچھ ہم نہیں جانتے جھوٹا علم یہ ہے کہ ہم اس زعم میں مبتلا ہو جائیں کہ ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو فی الحقیقت ہم نہیں جانتے۔ اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اس کے متعلق تو اس کا فیصلہ ہے کہ یہ ہمارے احاطۂ علم سے باہر ہے اور جو کچھ فی الواقع ہمارے احاطۂ علم سے باہر ہے اس کے متعلق علم الیقین کا دعویٰ کرتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم کس مقصد کے لئے عالم وجود میں آئے ہیں اس علم کے باوجود سائنس کہتی ہے کہ ہماری زیست کا معنا ناقابل فہم ہے اور وہ اشیا جو ہماری نوع اور خود ہم سے دور ہیں ان کے متعلق

سمجھتی ہے کچھ قابل فہم ہیں گویا دور کی اشیاء تو اسے نظر آجاتی ہیں۔ لیکن قریب کی اشیاء اُسے نظر نہیں آتیں۔ یہ امیبا اور جیلی مچھلی کی حقیقتوں سے تو آگاہ ہے لیکن انسان کی حقیقت سے آگاہ نہیں اس لئے کہ تحقیق کرنے والا بدقسمتی سے خود انسان ہے۔ سائینس کی تحقیق کی سار ی ترتیب اسی طرز پر ہے دور کی اشیاء پہلے اور نزدیک کی اشیاء پیچھے۔ اس کی تفتیش غیر مرئی جراثیم اور انواع حیوانات سے شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ انسانی نفسیات کی طرف آرہی ہے گویا جب تک جراثیم اور جیلی مچھلی اور بندروں کی حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی تب تک انسان کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ حالانکہ انسان دوسروں کو سمجھتا ہے اپنے آپ کو سمجھ کر کہ ہم حیوانات میں احساس درد پاتے ہیں تو اپنے احساس درد سے قیاس کرکے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس دیگر علامات کی پہچان ان کے اندر کرتے ہیں تو اپنی علامات اعمال کے اسباب معلوم کرکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں علم اپنے شعور سے حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا شعور ہمارے احساسات وجذبات مکان وزمان کی قیود سے بلند ہیں۔ اس لئے جو شئے ہماری طرح مکان وزمان کی قیود سے بلند ہوگی اور اپنی نوعیت میں ہم سے مشابہ ہوگی۔ اس کو ہم سب سے پہلے پہچان لیتے ہیں۔ اس کے بعد ان اشیاء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ہم سے کم مشابہ یا ہم سے بالکل مختلف ہیں اس نظریہ سے ہم اپنے گرد وپیش سے انسانوں کو سب سے پہلے پہچانتے ہیں۔ پھر حیوانات اور اس کے بعد نباتات کو اس لئے کہ وہ ہم سے بالکل مختلف ہیں۔ گویا ہمارے علم کی اصل ترتیب نزدیک سے دور ہے نہ کہ دور سے نزدیک جب کہ سائینس کا خیال ہے کہ ہم قوانین مادہ معلوم کرکے ہی قوانین نامیہ معلوم کرسکتے ہیں۔ اور قوانین نامیہ کے ذریعہ اپنی عقلی ذات کی کنہ تک پہنچ سکیں گے۔ یقیناً اس کے بالکل اُلٹ ہے۔ ہم اپنے عقلی شعور سے قوانین نامیہ اور قوانین مادہ سمجھتے ہیں نہ کہ قوانین مادہ ونامیہ سے عقلی شعور کو۔

اس وقت ہمارے سامنے بظاہر تین مراتب خلقت ہیں۔ پہلا مادہ، دوسرا نامیہ organism تیسرا انسان۔ پہلی صنف تخلیق چند مشینی حرکات کے تابع ہے۔ دوسری صنف نامیہ جس میں حیوانات شامل ہیں۔ کے اندر مادہ سے بلند ایک اصول کام کررہا ہے جس نے مادے کی مشینی حرکات کو اپنے تابع کر رکھا ہے۔ اسی طرح اور اسی ترتیب کے ساتھ انسان، تیسری صنف تخلیق۔ ان دونوں سے بلند ہے۔ کیونکہ اس کے اندر ایک ایسا اصول کام کررہا ہے جو نامیہ کو اپنے تحت رکھ کر کام لے رہا ہے۔ انسان کی زندگی نہ زمان ومکان سے مقید اور نہ اس سے مشروط ہے۔ انسان کی زندگی مشروط ہے تو صرف اس وجہ سے کہ جس درجہ اس کی حیوانی شخصیت اس کی عقل کے تابع ہے۔ اس کی حیوانی شخصیت اس کی عقل سے جتنا مغلوب ہوگی اسی درجہ وہ بلند انسان ہوگا۔ پس انسان کی فلاح اس کی حیوانی شخصیت کی فلاح میں نہیں اس کی انسانی شخصیت کی فلاح میں ہے انجیل میں آیا ہے کہ "جو کوئی اپنی جان بچانے کی کوشش کرےگا وہ اسے کھودے گا جس نے اسے کھودیا اس نے گویا اپنی جان بچائی" ٹالسٹائی اس کی تفسیر یوں کرتا ہے۔ جب تک ہم اپنی حیوانی شخصیت (ہمارے ہاں صوفیانہ اصطلاح میں اسے نفس کہاجاتا ہے) کو اپنی انسانی شخصیت کے مقابلے میں نہ کھودیں گے۔ تب تک ہم انسانیت کے درجہ بلند تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور جس نے اپنی حیوانی شخصیت بچانے کی کوشش کی اس نے گویا انسانیت سے منہ موڑلیا درحقیقت حیوانی شخصیت انسان کے لئے ایک آلۂ کار ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ شخصیت بجائے خود بڑی محدود اور ایسے قوانین سے جکڑی ہوئی ہے جو ایک حد تک پہنچ کر اپنے تضاد آپ پیدا کردیتے ہیں۔ حیوانی شخصیت کی فلاح یوں سو وجوہ سے ناممکن ہے باہمی کشمکش یعنی جس چیز کو میں چاہتا ہوں اسی کو دوسرا چاہتا ہے ایک وقت میں ایک چیز پیدا کرکے

قابض ہو سکتے ہیں جب افراد کے ذاتی مفادات و اغراض باہم ٹکراتے ہیں تو یہی فلاح تباہی بن جاتی ہے۔ ۲۔ فریب لذت ایک حد تک انسان کو لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہی لذت الم بن جاتی ہے۔ آدمی ایک سیر دودھ آسانی پی جاتا ہے جب اس سے زیادہ پئے گا تو وہ بجائے سرور کے باعث تکلیف ہوگا۔ پس حیوانی لذتوں کے لئے ایک حد مقرر ہے جس سے پرے الم کی حد شروع ہو جاتی ہے ۳۔ موت۔ انسان کی حیوانی شخصیت جس کا مسکن بدن ہے رفتہ رفتہ مرجھاتا اور گھٹتا رہتا ہے۔ وہ چاہے جتنی مقویات استعمال کرے بدن کے انحطاط و اضمحلال کو کبھی نہیں روک سکتا۔ پس شخصی فلاح (جو حیوانی شخصیت کی فلاح کا دوسرا نام ہے) کے تقاضے پر فریب لہٰذا ناممکن ہیں۔ انسان کی فلاح شخصی فلاح میں نہیں اجتماعی فلاح میں ہے۔ اس کی بہتری حیوانی شخصیت کے تقاضوں میں نہیں عقلی شعور کے تقاضوں میں ہے۔ حیوانی شخصیت کا تقاضا یہ ہے کہ بس میرا ہی بھلا ہو۔ سب دنیا مجھے ہی پیار کرے۔ لیکن یہ بات اس لئے غیر ممکن ہے کہ سبھی لوگ ایسا چاہتے ہیں۔ اس کا علاج یہ نہیں کہ میں دوسروں کو صرف اپنی ہی ذات کے پیار پر مجبور کروں۔ پیار کبھی جبر سے نہیں آتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ میں اپنے سے زیادہ دوسروں کو پیار کرنے لگ جاؤں۔ اس کے معاوضہ میں مجھے وہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا جو کسی دوسرے طریقہ اور ذریعہ سے ممکن نہ تھا۔ یعنی یہ کہ دوسرے بھی مجھ سے پیار کرنے لگ جائیں گے۔

زندگی کا بنیادی قانون کشمکش نہیں تعاون ہے۔ نفرت نہیں محبت ہے۔ زندگی کیا ہے؟ یہ ذی حس افراد کے درمیان باہمی مبادلہ خدمت ہے۔ اور عقلی زندگی کا منشا شخصی فلاح کا خیال چھوڑ کے اجتماعی فلاح کی سعی کرنا ہے' ۔ السٹائی کی اس تعریف زندگی کے مقابل ڈارون کے نتائج تحقیق بھی رکھئے تو اس شخص کی عظمت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے اپنے زمانہ کے سیلاب افکار کے خلاف چلنا کتنا عزم امر ہے۔

اسباب زندگی لاتعداد ہیں انسان کو کھانے کے لئے صرف روٹی ہی نہیں رہنے کیلئے مکان اور پہننے کے لئے کپڑا بھی چاہئے جب یہ میسر آجائیں تو صرف کپڑے ہی نہیں نفیس ملبوسات اور سامان آرائش بھی چاہئے صرف گندم کی روٹی ہی نہیں کیک پیسٹری بھی چاہئے صرف مکان ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ پائیں باغ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ غیر ضروری سامان رفتہ رفتہ سبب زندگی بن جاتا ہے۔ پھر یہ غیر ضروری سامان معیشت نہیں کہلاتا احتیاج نام پاتا ہے۔ اور احتیاجات کا خاصہ ہے کہ جونہی ان کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے وہ بڑھنی اور پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ دیگر احتیاجات جن کی طرف بھی توجہ مبذول نہیں ہوتی ان کے نیچے پس کر رہ جاتی ہیں۔ احتیاجات ان کرویات خون [illegible] سے مشابہ ہیں۔ جو پھول کر دوسرے کرویات کو کچل دیتے ہیں۔ انسان کی زیست حیوانی شخصیت کے تقاضوں اور ضرورتوں سے پُر الم نہیں بنتی۔ یہ پُرالم اس وقت بنتی ہے جب یہ سمجھ لیا جائے کہ انسان کی خیر و فلاح بس حیوانی شخصیت ہی میں مضمر ہے۔ ضرورت اس شخصیت کی نفی کی نہیں ضبط کی ہے یعنی کہ حیوانی شخصیت عقلی شعور کے تحت رہے نہ کہ اس پر فائق۔ انسان نے اپنی ہزار ہا برس کی زیست کے تجربے سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا ہے کہ شخصی خوشی اور فلاح ناممکن ہیں۔ ٹالسٹائی کہتا ہے "یہ حقیقت ان ناخواندہ لوگوں کو بھی معلوم ہے جن کے اذہان ابھی علوم حاضرہ سے ملوث نہیں ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کا اگر کسی کو علم نہیں تو وہ یا تو یورپ کی مہذب متمدن سوسائٹی ہے یا افریقہ کے جنگلوں میں بسنے والے غیر مہذب وحشی۔"

ایسے فلسفی (مثلاً شوپن ہار اور ہارٹمان) جو زندگی کی نفی کرتے ہیں یا سلبیت قسم کے منکر ہیں۔ اگر وہ پوری ایمان داری اور اخلاص سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زندگی بے مفہوم اور لایعنی ہے تو وہ خودکشی کیوں نہیں کر لیتے؟ اصل بات یہ ہے کہ حیوانی شخصیت کے حبث مجبت ہو جانے کے بعد انہیں کوئی دوسری زندگی نظر نہیں آتی۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ دوسری زندگی عقل کی زندگی ہے اور اس کا ایک تقاضا یا ثمرہ عمل ہے اور وہ محبت ہے تو وہ کبھی اس قدر مایوس اور بددل نہ ہوتے۔ محبت کوئی جذبہ گریزپا یا احساس برق آسا نہیں کہ چند لمحات

کے لئے دل کو مسرور کرکے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بجھ جاتا ہے۔ محبت بجائے خود ایک فعلیت [illegible] ہے یہ ایک ضابطۂ حیات ہے جو دوسروں کی فلاح کیلئے اختیار کیا جاتا ہے اور نہ ہی یہ فعل مستقبل کے لئے ہے کہ آج تو میں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر لوں آئندہ جب کچھ بچے گا تو کسی بھوکے کو عطا کر دونگا۔ یہ فعل فعل حال ہے۔ یہ کہ جو کچھ کیا جائے ابھی کیا جائے اسی میں محبت کی روح مضمر ہے۔

وہ شخص جو زندگی کو حیوانی شخصیت تک محدود سمجھتا ہے موت سے ہر وقت لرزاں و خائف رہتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ موت سے نہیں اس خیال سے ڈرتا ہے کہ وہ ایک باطل زندگی بسر کر رہا ہے۔ جو شخص خودکشی کرتا ہے وہ اس لئے خودکشی کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کوئی دلیل یا منطق نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو اس لایعنی زندگی سے چھٹکارا دلانے کیلئے خودکشی کرتا ہے۔

زندگی کے دو نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک نقطۂ نظر وہ ہے جو زندگی کو بدن کی ظاہری صورت ہی میں پہچانتا ہے۔ یہ بدن جو زمان و مکان میں گھرا ہوا ہے اور پیدائش سے موت تک متحرک رہتا ہے۔ یہ بدن اجزائے لایتجزیٰ سے مرکب ہے۔ اور اس کے اندر جو شعور ہے وہ حواس کے فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

شعور کو زیادہ سے زیادہ ایک شعلہ کہا جا سکتا ہے۔ جو چند اسباب کے تحت مادہ میں بھڑک اٹھا۔ ورنہ اس کی اپنی کوئی اصلیت نہیں۔ دنیا محض اتفاق کا کھیل ہے۔ بالکل ایسے جیسے شعور مادے میں محض اتفاق سے نمودار ہو گیا۔ یہ نظریہ اتنا قدیم ہے جتنی کہ خود یہ دنیا۔ اس خیال کے معتقد قدیم یونان میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ بلکہ آج تو پوری دنیائے سائنس اس کے احقاق پر تلی ہوئی ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ زندگی وہ ہے جس کا مجھ کو شعور حاصل ہے۔ میں اپنی زندگی کا شعور کسی ماضی یا مستقبل میں نہیں پاتا حال ہی پاتا ہوں۔ جیسا کہ میں ہوں اور یہ شعور پابندی مکان و زمان سے آزاد ہے اگرچہ میری زندگی کا قالب مکان و زمان میں گھرا ہوا ہے تاہم خود یہ اس کے احاطہ سے باہر ہے۔ وہ زندگی جس کا مجھ کو شعور حاصل ہے ان حدود و قیود سے بلند اور ماورا ہے۔

دونوں نظریات بالمنطق و مدلل ہیں اور دونوں میں موت کے خوف کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ پہلے نظریئے کی بنیاد ہی موت پر ہے مردہ اجزا مل کر ایک جسم بناتے ہیں۔ جب تک وہ باہم مرکب ہیں جسم میں شعور بھی ہے اور احساس بھی۔ جوں ہی وہ بکھر جاتے ہیں یہ دیا بھی گل ہو جاتا ہے۔ اس لئے موت کا ڈر اس نظریئے میں بھی کہیں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ دوسرا نظریہ زندگی کو ماورائے مکان و زمان سمجھتا ہے اس لئے یہ لامنتہی ہے صرف اس کا مظہر یا قالب منتہی ہے جو مکان و زمان میں گھرا ہوا ہے۔ اور مظہر یا قالب کا اس زمنیت کے ساتھ منتہی ہونا عین فطری ہے۔ لیکن اس مظہر یا قالب کی موت کے ساتھ زندگی تو نہیں مر جاتی۔ پس موت کا خوف کیسا؟

حقیقت یہ ہے کہ آدمی موت سے نہیں ڈرتے زندگی سے ڈرتے ہیں۔ موت کا ڈر دراصل اس ناکامی کی تلخی ہے جو زندگی کی الجھنیں نہ کھول سکنے کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس بات کا رنج ہے کہ وہ بدن موت کے حوالے ہو رہا ہے جس کو ہم نے کس درد اور ہراس سے پالا تھا۔ یہ اس امر کا افسوس ہے کہ جس کو نہیں مرنا چاہئے تھا۔ وہ مر رہا ہے موت کا خوف زندگی کے غلط تعین کے سبب آتا ہے۔ جب آدمی یہ سمجھ لے کہ اصل زندگی بدن ہی کی زندگی ہے۔ حالانکہ یہ زندگی تو زندگی کا ایک جزو ہے نہ کہ کل۔ پھر عدم حیات سے عدم ذات کیسے ثابت ہوتی ہے؟ ایک شخص موت کے بعد ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو اس کا یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ وہ بس بالکل ہی فنا ہو گیا ہے؟ موت تو گویا انتقال مرکز ہے۔ زندگی کا مرکز ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھ گیا۔ پھر جس شخص نے حیوانی شخصیت کو تابع حق کر لیا وہ گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا۔ اس نے اپنے اسوۂ حسنہ سے ایک ایسا چشمہ کھودا ہے جس کا سوتا کبھی بھی بند نہیں ہو سکتا۔ ابدی زندگی کا یقین صرف اسی شخص کو آ سکتا ہے جس نے زندگی کی صحیح

راہ پالی ہو۔

جو شخص مظہر حیات کو عین حیات سمجھتا ہے وہ اپنی مظاہر کی بقا میں اپنی بقا دیکھتا ہے۔ جس شخص کی نظر بدن پر ہے وہ خیال کرتا ہے کہ بقائے نسل میں میری بقاء ہے۔ لیکن بقائے نسل سے اس کی اپنی ذات تو باقی نہیں رہتی وہ مادی نقطہ نظر سے اپنے آپ پر غور کرے تو اسے اپنا وجود ایک ایسا کمزور و نحیف شعلہ نظر آئے گا جو تیز جھونکے سے بھی بجھ سکتا ہے اور نسیم سحری سے بھی۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھ لے کہ زندگی ایک منقطع موج نہیں ایک ابدی مسلسل اور رواں دواں حرکت ہے۔ تو یاس کی ساری گھٹا چھٹ جائے۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ایک شخص سن کہولت تک جیتا ہے۔ اور دوسرا بن کھلے مرجھا جاتا ہے؟ کیوں ایک شخص رنگینیٔ حیات سے بھرپور جام پیتا ہے تو دوسرا دیدۂ عیش ملکتے بغیر گزر جاتا ہے؟

ٹالسٹائی جواب دیتا ہے "اگر آدمی اس وقت مر جاتا ہے جب موت اس کے فائدے کے لئے اشد ضروری ہوتی ہے۔ اگر یہی زندگی سے ہماری مراد ہے یہ نہیں تو علت معلول سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہماری یہ مرئی و مبصر زندگی ابدی زندگی سے پیدا ہوئی ہے اور کوئی گولی یا بارود یا مرض بھی اور ابدی زندگی کو مرئی وجود کے ساتھ ختم نہیں کر سکتا۔ شاخ کٹ جانے سے تنا یا جڑیں ختم نہیں ہو جایا کرتیں۔ یہی زندگی کا کام ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کیا ہوا جو مرئی زندگی بجلی کے کوندنے کی طرح چمکی اور بجھ گئی۔ وہ عناصر جن سے ملکر نئے ترکیب پائی تھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے موجود ہیں۔ جو لوگ ان سوالات کا جواب نہ پاکر جھنجھلا اٹھتے ہیں کہ ہم پیدائش سے پہلے کہاں تھے؟ کن اسباب کی بناء ہم یہاں پھینکے گئے؟ اور موت کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا؟ وہ اس پر کیوں نہیں جھنجھلاتے کہ ہم حد نظر سے پرے کیوں نہیں دیکھ سکتے اور حد سماعت کے ماورا کیوں نہیں سُن سکتے؟ ہمارے لئے حد نظر سے پرے دیکھنا ضروری نہیں۔ ہمارے لئے سب سے ضروری اور اہم گردوپیش سے آگہی ہے"؟

اس کے بعد وہ لذت و الم کے موضوع کی طرف رُخ کرتا ہے۔

وہ کہتا ہے "انسان کے ذہن میں سب سے بڑی اُلجھن مصائب کی پیچیدگی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دکھ کس لئے ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟ آدمی بہت اسی قسم کے سوالات پوچھتے ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں پوچھا لذت کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟"

دکھ وہ احساس درد ہے جو انسان کو ایسے لائحہ عمل پر مجبور کرتا ہے کہ جس سے یہ احساس درد مٹ جائے۔ اور خوشی کی حالت پیدا ہو جائے دکھ انسان کو آمادہ عمل کرتا ہے۔ لیکن خوشی ایسا نہیں کرتی۔ رفع درد میں حیوان انسان سے ملتا جلتا ہے فرق یہ ہے کہ جہاں حیوان رفع درد کر کے مطمئن ہو جاتا ہے وہاں انسان محض افاقہ درد سے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ان اسقام و اغلاط بعض اوقات سادہ اور ادبری ہوتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہ اس قدر پیچیدہ اور مختلف اسباب کے پردہ میں لپٹی ہوتی ہیں۔ کہ آدمی انہیں آسانی اور بخوبی دیکھ نہیں سکتا۔ ایسے وقت میں جب کہ دکھ یا مصیبت کا سبب آدمی کی دسترس سے باہر ہو تو وہ قدرتی طور پر سوال کرتا ہے "یہ دکھ کس لئے ہے؟ جن آدمیوں کی نگاہ بدنی زندگی (حیوانی شخصیت) سے پرے نہیں جاتی وہ اپنے آپ کو معلوم اور مظلوم تصور کر کے خدا پر الزام دینا شروع کر دیتے ہیں جب اس کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو باغی ہو جاتے ہیں۔ اور فیصلہ کر لیتے ہیں کہ زندگی عبث ہے۔ اس کا کوئی مفہوم نہیں۔ اس کا سب سے اہم اور بنیادی قانون "حادثہ" ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں۔ کہ ہماری زندگی عقل سے روشنی اور فہم حاصل کرتی ہے۔ وہ اپنے دکھوں اور مصیبتوں کو اپنی غلطیوں اور اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کی نشان دہی نہ کر سکتے ہوں۔ چونکہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ مصائب ہماری اپنی کوتاہیوں سے وارد ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ اپنی اصلاح و درستی میں

کوشاں رہتے ہیں۔

ہمیں درد اور دکھ کو کوسنا نہیں چاہئے۔ درد اور دکھ ہمیں دوسروں سے پیار کرنا سکھاتے ہیں ہمیں زندگی کا درس دیتے ہیں۔ جو لوگ زندگی کو سراسر راحت اور لذت دیکھنا چاہتے ہیں وہ اس کسان سے مشابہ ہیں جو اپنے کھیت جُتے دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کھیت جُتے ہوتے تو کسانوں کی کیا ضرورت تھی؟

زندگی دوسروں سے محبت کرنے اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کا نام ہے۔

دکھ کا علاج ٹالسٹائی کے نزدیک ایک ہے اور وہ دعا ہے۔ یہ کہ آدمی ہر وقت خدا کے حضور میں دست بدُعا رہے اس سے نیک توفیق چاہے۔ اس کو دنیوی مصروفیتوں سے جبھی فرصت ملے وہ خدا کے سامنے جُھک جائے۔ یہ اس کی تعلیمات کا اہم جزو ہے۔

اسی نقطۂ نظر کو ٹالسٹائی افسانوی صورت میں " ایوان ایلیچ کی موت " میں پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ اس کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے جس نے یہ دیکھنا ہو کہ کوئی فلسفۂ زندگی فنی صورت میں کیسے پیش کیا جاسکتا ہے وہ اسے ضرور پڑھے۔

جرمنی کی ایک مذہبی انجمن کی جانب سے ایک سوال نامہ مذہب و اخلاق کی حقیقت کے بارے میں ٹالسٹائی کو بھیجا گیا جس کے جواب میں اس نے بتایا کہ یورپ کا یہ زعم بالکل غلط ہے کہ فلسفہ پہلے اور مذہب بعد میں پیدا ہوا۔ مذہب نہ تو ماحول کے تقاضوں کا جواب ہے اور نہ کسی کے تخیل کی فسوں کاری۔ مذہب نام ہے کائنات اور خدا سے تعلق کا۔ اس تعلق کو مختلف مذاہب نے مختلف پہلوؤں سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ ورنہ سب مذاہب کی اصل ایک ہے اور وہ ہے انسان کی کائنات اور خدا سے رشتہ کی تعریف و توضیح اس رشتہ کو وضاحت سے سمجھنے کی انسان کے اندر فطری طلب تھی۔ وہ جبلی طور پر چاہتا تھا کہ اُسے معلوم ہو کہ وہ جس کائنات کے اندر بس رہا ہے اس سے اور اس کے بنانے والے سے اس کا کیا علاقہ ہے؟ اس میں کسی خارجی موثر کا دخل نہیں، اور نہ یہ فلسفہ کی اپج ہے فلسفہ تو کہیں اس وضاحت تعلق کے بعد آیا۔ جو سائنس داں حیاتیات کے ارتقائی کلیئے کے تحت مذہب کی مختلف کڑیاں تلاش کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ تخیل اور خوف کی پیداوار ہے۔ ٹالسٹائی کہتا ہے " ان سے ذرا یہ پوچھئے کہ اگر آدمی بجلی کی کڑک سے ڈرا تو اس ڈر سے اس نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا کہ اور بھی کئی خدا ہیں؟ محض خوف سے تخیل انسانی نے اتنی بڑی دیو مالا کیونکر بنالی؟ یا ایک خدا اور اس کی مختلف صفات اسے کیسے معلوم ہوگئیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جہاں جدید سائنس نے اور کئی نقشے کھڑے کئے ہیں وہاں اب ANTHROPOLOGY کا ایک نقشہ بھی منظم علم کی بنیادوں پر استوار کر رہی ہے۔ اس شعبۂ علم کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کے حیوانی کارناموں کی تہذیبی کڑیاں تلاش کی جائیں۔

اخلاق مذہب کا منطقی نتیجہ ہے یہ گویا مذہب کی عملی لُغت ہے۔ جو چیز عقیدہ کی شکل میں مذہب کہلاتی ہے۔ وہی جب معرض عمل میں آتی ہے تو اخلاق نام پاتی ہے۔ اخلاق اس وقت تک موجود رہے گا جب وقت تک کہ مذہب خود موجود ہے۔ اور مذہب اس وقت تک قائم رہے گا جس وقت تک کہ انسان کو اپنے رشتۂ کائنات و خدا کی توضیح کی چاہت ہے۔

اس کے نزدیک آرٹ کا مقصد بھی ان واردات قلب کی اشاعت ہے جو مذہبی احساس سے پیدا ہوتی ہیں انسان کے اندر بلند جذبات و احساسات صرف دینداری اور مذہبی احساس ہی سے پیدا ہوسکتے ہیں کیونکہ اسی کے ذریعہ آدمی زندگی کے مفہوم کو سمجھتا پاتا ہے۔ جنسی اور شہوانی لذات کی دنیا بہت محدود اور جلد فنا ہوجانے والی ہے۔ اس کے موضوع نہایت فرسودہ اور پامال ہیں۔ ایک فنکار کو تو نئے موضوع صرف روح و قلب کی دنیا میں مل سکتے ہیں۔ وہ جس بلندی کو مذہبی حس سے پاسکتا ہے

وہ کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں کیونکہ روح و قلب کی دنیا داخلی اور ناپید کنار ہے۔

لیکن آرٹ صرف صورت اور بناوٹ سے آرٹ نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے اندر پیش کردہ جذبات اور احساسات میں خلوص نہ ہو۔ آرٹ ایک جذبہ کی اشاعت ہے اور اس میں اس وقت تک اثر نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ احساسات و جذبات میں حقیقت اور سچائی نہ ہو۔ پیش کرنے والا جو کچھ پیش کرے پورے اخلاص سے پیش کرے کیونکہ یہ اخلاص ہی ہے جو پڑھنے یا دیکھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔ اور اخلاص اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ خود فن کار اپنی شخصیت کو پاکیزہ اور مخلص نہ بنائے۔ وہ شخص صحیح فن کار نہیں جو دل میں تو خدا پر ایمان نہیں رکھتا لیکن ایسی تخلیقات پیدا کرتا ہے جس میں خدا پر ایمان کی دعوت ہے۔ وہ تو منافق ہے اس کی تحریروں میں اثر نہیں پیدا ہو سکتا اور نقصان پیدا کر سکتا ہے۔

خود ٹالسٹائی نے اپنی شخصیت کو پاکیزہ بنانے میں جس جہد اور کوشش سے کام لیا وہ واقعی قابلِ صد داد ہے۔ اس کے پہلے کے معلم کی زبانی ایک واقعہ سنئے وہ لکھتا ہے:-

"ایک دن ٹالسٹائی میرے پاس بڑی گھبراہٹ کی حالت میں آیا اور مجھ سے مدد طلب کی میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں میں حیران تھا میں اس کی مدد کیا کر سکتا ہوں اس نے مضطربانہ کہا مجھ کو بچاؤ میں پھسل رہا ہوں" میں سمجھ گیا ضرور کوئی افتاد ہے۔ اس اچانک وحشت سے میں بھی ڈر گیا۔

"کیا بات ہے لیونکولوویچ ؟" میں نے پوچھا۔

"میں شہوانی جذبات سے مغلوب ہوا جا رہا ہوں۔ اور اس وقت بالکل بے بس ہوں۔ مجھ کو خوف ہے کہیں میں ان جذبات کے سامنے اپنی سپر نہ ڈال دوں۔ میری مدد کرو"

میں نے کہا "میں بھی ایک کمزور طبیعت آدمی ہوں میں تمہاری مدد کیوں کر کر سکتا ہوں ؟"

"تم میری مدد کر سکتے ہو۔ براہ کرم انکار مت کرو"

میں نے پھر پوچھا "کیسے ؟"

اس نے جواب دیا "ایسے کہ جب میں سیر کو جاؤں تو تم میرے ساتھ رہو تم میرے ساتھ رہوگے تو میری توجہ ادھر مبذول نہ ہوگی"

ہم دونوں سیر کرنے گئے تو اس نے مجھے بتایا کہ ایک دن دوران سیر اسے ایک لڑکی ملی جس کا نام ڈومنا تھا۔ اس کا خاوند فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ وہ انیس تئیس کے لگ بھگ تھی۔ اگرچہ وہ اتنی حسین نہ تھی تاہم اس کا رنگ ایسا تھا جیسے روس کے دہقان خون اور دودھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ سرو قد اور صحت مند اور جاذبِ نظر تھی۔ پہلے پہل چند روز تو وہ اس کو دور سے تکتا رہا اس سے اس کو ایک گونہ سرور ملا۔ پھر اس کا تعاقب کیا اور اسے سیٹی کے اشارے سے بلا لیا۔ اس کے بعد اس نے اس کے ساتھ سیر کرنا شروع کر دی۔ اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ٹالسٹائی نے اس کے ساتھ خفیہ جائے ملاقات اور وقت بھی مقرر کر لیا۔ (یہ خفیہ جائے ملاقات باغ کی ایک کنج تھی۔ اور وہاں تک پہنچنے کے لئے اس کمرے کی کھڑکیوں کے آگے سے گزرنا پڑتا تھا جس میں ہم بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے) جوں ہی ٹالسٹائی ملاقات کے لئے اس کمرے کی کھڑکیوں کے سامنے سے گزرا۔ اس کے دل میں جذبۂ ہوس اور ضمیر کی کشمکش شروع ہو گئی۔ عین اس وقت اس کے لڑکے ایلیا نے اس کو کھڑکی

۲ کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر پکارا اور اسے یونانی کا وہ سبق سننے کیلئے کہا جس کے سننے کا وعدہ ٹالسٹائی نے اس سے کیا تھا۔ وہ گویا فیصلہ کا آخری لمحہ تھا۔ ٹالسٹائی یک بہ یک جاگ اٹھا اور جائے ملاقات کی طرف جانے کی بجائے اندر آگیا۔ وہ خوش تھا کہ وہ اس ملاقات سے بچ گیا لیکن معاملہ یہیں ختم نہ ہوا۔ ہوس اس کو بدستور تنگ کرتی رہی وہ خدا کے حضور میں بڑے خضوع و خشوع سے دعا کرتا رہا لیکن اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ وہ اس قدر مغلوب ہوا جا رہا تھا کہ اس نے محسوس کر لیا کہ وہ اب پھسلا کہ اب پھسلا۔ بس اس نے آخری چارہ کار یہ اختیار کیا کہ کسی کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرے۔ اس کو اپنے جذبۂ ہوس کی پوری قوت خباثت سے آگاہ کر دے کہ جس کے ساتھ وہ لڑ رہا تھا اور اس کے سامنے اپنا اخلاقی افلاس بھی بیان کر دے جو اس آزمائش کے لمحہ میں اس کے سامنے آگیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میرے پاس آیا اور نفس کی سازش میرے سامنے بے نقاب کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی نگرانی پر خود اپنے آپ کو شرمسار کرے۔ اور اسی جذبۂ ہوس سے پناہ لینے کے لئے اس نے مجھ سے سیر میں مصاحبت کی استدعا کی۔ حالانکہ وہ تنہا سیر کا شائق تھا۔ اس کے بعد اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ ڈونا اس جگہ سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئی۔"

ٹالسٹائی کی ہمت کی پوری داد وہی شخص دے سکتا ہے جو یورپ کے ماحول اور اس کی ہمہ گیر خباثتوں سے پوری طرح سے آگاہ ہو۔ ٹالسٹائی نے کبھی اپنے آپ کو نیک اور پاکباز نہیں کہا۔ وہ اپنی کوتاہیوں سے پوری طرح سے واقف تھا۔ لیکن وہ اخلاق کے نچلے درجے پر کبھی مطمئن نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ اپنی اصلاح میں کوشاں رہا اور اس میں مبالغہ نہیں اگر یہ کہا جائے کہ تادم واپسیں وہ اپنے "اعترافات" میں لکھتا ہے "لوگ میری سیرت کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اور میرے معاصر مجھ کو اب بھی ایک بداخلاق سمجھتے ہیں۔" لیکن یہ تعریف و تمجید قبل دعوت تھی۔ جب دعوت پیش کرنے کے بعد اس نے موجودہ سوسائٹی کی غلط اور غیر مسیحی روش پر تنقید کی تو وہی لوگ جو اسے نیک اور بااخلاق سمجھتے تھے۔ اسے بداخلاق اور شریر کہنے لگے۔ وہ لوگوں کو اس کی کتابیں پڑھنے سے روکتے یہ کہہ کر کہ ایسے بداخلاق شخص کی تحریریں پڑھنے سے کیا فائدہ۔

مغرب کی پوری ادبی تاریخ میں یہ پہلا شخص تھا جس نے ادب میں اخلاق کو داخل کیا اور کمال فن کے ساتھ کیا۔ اور ادب کا معیار یہ ٹھہرایا کہ وہ حق کو روشن اور اخلاق کو بلند کرتا ہے۔

ٹالسٹائی کی دعوت کا مرکزی نقطۂ زندگی کا غیر متشددانہ عمل ہے۔ جو لوگ ٹالسٹائی کے اس مسلک پر ہنستے تھے وہ ان عوامل سے بے خبر تھے جن کی شرکت سے اس کا یہ نظریہ تعمیر ہوا تھا۔

۱۔ ایک تو خود انجیل کی تعلیم یہی تھی۔ جو لوگ اس پر ہنستے تھے وہ انہیں انجیل پر ہنسنے کیلئے کہتا تھا۔ مگر اعتراض کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ مذہبی طبقہ اس پر سیدھے وار کر سکتا تھا کیونکہ ان کے پاس ٹالسٹائی کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ کہ اگر عدم تشدد مسیحیت کا لازمی جزو نہیں ہے اور حضرت عیسیٰ نے اس کی تلقین نہیں کی ہے۔ تو ان کے صلیب پر بے چون و چرا چڑھ جانے کی کیا وجہ تھی۔ اور ان آیات انجیل کا کیا مفہوم ہے "تو نے یہ قول سنا ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تجھ سے کہتا ہوں تو شر کا مقابلہ مت کر۔ جو کوئی تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اپنا بایاں گال آگے بڑھا دے۔ اور جو شخص تیرے خلاف قانونی دعویٰ دائر کرتا ہے اور تیرا قمیض لے لیتا ہے تو تو اس کو اپنا چغہ بھی دیدے"۔ اب چونکہ وہ ان آیات کے واضح اور ظاہر معانی سے انکار نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ تاویلات کی فضا میں

منتقد کے تبصرہ سامنے اور مختلف اولیاء و فقہائے مسیحیت کے اقوال سے استدلال کرتے۔ مگر ٹالسٹائی ایک ہی بات سناتا "مسیحیت کا بانی مسیح ہے یا یہ اولیاء و فقہا ماہان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ انھیں انجیل کی روح سے بھی واقفیت نہ تھی"۔

دوسرے یہ کہ وہ خود اس دین سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا "اگر میں حضرت مسیح کی تعلیمات سے دلچسپی رکھتا ہوں تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں اسی دین کے ماننے والوں میں پلا ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھ کو مسیحیت کی سچی تعلیم کو ان آلائشوں سے صاف کرنے میں ایک روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جو کلیسا نے اس پر ڈال رکھی ہیں"۔

۲ ۔ دوسرا عامل روس اور یورپ کے داخلی حالات تھے۔ جس قدر تشدد اور جبر ان دنوں روس میں مروج تھا وہ ایک قلب حساس کو یہ سوچنے پر خواہ مخواہ مجبور کر دیتا کہ اس دنیا میں جو شر اور دکھ پھیلا ہوا ہے اس کا کیا مقصد ہے؟ اور اس کا استیصال کیونکر ممکن ہے؟ ٹالسٹائی کی زبانی ایک واقعہ سن لیجئے اور اس کے بعد اندازہ کیجئے کہ جب پڑھنے والے پر یہ حال طاری ہوتا ہے تو وہ جو ان حالات کے دھارے میں تھا اس کی کیا کیفیت ہو گی؟

ایک قصبے کا ایک بڑا زمیندار چند کسانوں کی کچھ زمین ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ اس زمین کے قریب اس کی پن چکی تھی۔ زمیندار نے پن چکی کے لئے نہر کے پانی کی سطح بلند کرانے کے لئے حکام سے ان کسانوں کی مرضی کے بغیر ہی اجازت حاصل کر لی۔ کسانوں نے اس نہر کے پانی کی سطح بلند کرنے سے روکنا چاہا۔ کیونکہ اگر پانی اونچا ہوتا تھا تو وہ کنارے توڑ کر ان کے کھیتوں کو برباد کرتا تھا۔ کسانوں نے اس کو روکنے کی کوشش یوں کی کہ خود جانے کی بجائے اپنی عورتوں کو بھیج دیا کہ وہ نہر میں بند لگانے والے مزدوروں کے کام میں رکاوٹ ڈالیں۔ عورتوں نے مزدوروں کے چھکڑے اُلٹ دیئے اور انھیں وہاں سے بھگا دیا۔ زمیندار نے حاکم ضلع سے استمداد کی۔ حاکم ضلع نے پولیس کو لکھا کہ وہ ہر کنبے کی ایک عورت پکڑ لے۔ جب پولیس آئی تو وہ حیران تھی کہ کنبے کی کس عورت کو پکڑے اور کس کو چھوڑے۔ چنانچہ وہ حکم بجا لائے بغیر ہی لوٹ گئی۔ زمیندار نے گورنر کے ہاں اس عدم تعمیل کی شکایت کی۔ گورنر نے حکم جاری کیا کہ اس حکم کی فوراً اور سختی سے تعمیل کی جائے۔ اب پولیس نے عورتوں کو پکڑنا شروع کر دیا۔ اس پر لوگ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے اپنی آستین چڑھا لیں۔ وہ پولیس کا باقاعدہ مقابلہ کرنے پر تل گئے۔ پولیس کا مقابلہ گویا دوسرا سنگین جرم تھا۔ چنانچہ گورنر بہادر بہ نفس نفیس ایک دستہ فوج کے ساتھ رائفلیں اور ڈنڈے لے کر ان کو سزا دینے کے لئے اپنی خاص ٹرین میں تشریف لائے گورنر کے ہمراہ ایک سرکاری ڈاکٹر بھی تھا جس کو بید زنی کی کارروائی کی نگرانی کرنا تھی۔

ٹالسٹائی کہتا ہے "جو ہال کے قریب سپاہی اور گھوڑ سوار فوج کا ایک دستہ کھڑا تھا۔ جن کے شانوں کے ساتھ پستول لٹک رہے تھے۔ ان کے قریب دیہات کے نمبردار چوکیدار وغیرہ اور مجرم کھڑے تھے۔ اور ان کے گرداگرد کم از کم ایک ہزار کا مجمع تھا۔ گورنر اپنی گاڑی سے اترا ایک افتتاحیہ تقریر کی اور مجرموں اور ایک بنچ کو منگوایا۔ بنچ منگوانے کا مطلب پہلے کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ ایک گھوڑ گاڑی پر جو گورنر کے پیچھے آگے ہر وقت رہتا تھا۔ اور جس کا کام تعزیہ کے انتظامات کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اس نے بتایا کہ بنچ بید زنی کے لئے ہے۔ بنچ آ گیا۔ کوڑے اور بید تیار کر لئے گئے۔ کوڑے مارنے والے بھی پہنچ گئے" (کوڑے مارنے کا کام نامی چوروں سے لیا گیا۔ کیوں کہ فوجیوں نے اس حکم کی بجا آوری سے انکار کر دیا تھا)

جب سب کچھ تیار ہو گیا۔ تو کمانڈر نے ان بارہ آدمیوں میں سے ایک کو چن لیا جن کے متعلق زمیندار نے بتلایا تھا کہ سارے فساد کی جڑ وہ ہیں۔ وہ شخص جس کو پہلے نکالا گیا۔ گاؤں کا سربرآوردہ اور معمر آدمی تھا۔ چونکہ وہ گاؤں کا پنچ تھا۔ اور کوئی بات اس کے مشورے بغیر نہیں کی جاتی تھی۔ اس لئے وہ گاؤں والوں کی نگاہ میں معزز تھا۔ وہ بنچ کے قریب لے جا کر عریاں کیا گیا۔ پھر اسے بنچ پر منہ کے بل لیٹ جانے کا حکم دیا گیا۔ اس شخص نے پہلے تو رحم کی درخواست کرنا چاہی لیکن جب اس نے دیکھ لیا کہ یہاں منت سماجت کام نہیں دے گی تو وہ

سینے پر صلیب کا نشان بنا کر مردانہ وار لیٹ گیا۔ معمولی سا ایک گنبد ڈاکٹر بھی قریب آ گیا۔ تاکہ بوقت ضرورت طبی امداد بہم پہنچا سکے۔ کوڑے مارنے والے چوبداروں نے ہاتھوں پر تھوکا اور پورے زور سے کوڑے برسانے شروع کر دیئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہنوز ایک تھا۔ اور مضروب سو پر بخوبی تڑپ نہ سکتا تھا اس پر گورنر بہادر نے ایک اور بنچ منگوایا اور دونوں کو ملا کر اس پر ایک چھوٹا سا تختہ سا رکھ دیا۔ گورنر کا حکم سنتے ہی ماتحتوں کے ہاتھ ڈبیوں کی طرف اٹھ جاتے۔ اور "بجا حضور عالی" کہتے ہوئے تعمیل حکم کیلئے دوڑ پڑتے۔ اسی اثنا میں مضروب نیم عریاں اور نیم جاں حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔ سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے اور اس کی ننگی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے تعزیر کی دوسری قسط کا انتظار کر رہا تھا۔ جب دوسرا بنچ آ گیا تو اس کی اس پر لٹا کر پھر تڑاتڑ کوڑے برسانے شروع کر دیئے۔ اس کی پشت اس کے جوتڑ۔ ران اور ماس کی لپیلیاں نیلی جھیوں اور سرخ زخموں سے بھر گئیں۔ ہر ضرب پر اس کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ کھسک جاتی۔ جس کو وہ اپنے سینے میں دبا نہ سکتا تھا۔ گرداگرد کھڑے ہوئے مجمع میں سے عورتوں، ماؤں، بہنوں اور مضروب کے لواحقین کی واویلا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ لیکن گورنر بہادر بڑے سکون سے انگلیوں پر کوڑوں کی گنتی فرماتے رہے وہ بار بار سگریٹ کے کش لگاتے اور جب کبھی ہز ایکسلنسی کا سگریٹ بجھ جاتا ماتحت افسر دوڑے دوڑے آتے اور دیا سلائی سے آپ کا سگریٹ جلا دیتے"

یہ واقعہ ٹالسٹائی کی سند سے آج بھی جرمنی اور روس کی قانون کی کتابوں میں راعی اور رعایا کے تعلقات کے عنوان کے ماتحت موجود ہے تعزیر کی ایسی ایسی اقسام روس میں جاری تھیں۔ کہ آج کا مہذب شہری ان کا تصور کر کے کانپ اٹھتا ہے[1]۔ روس کی کڑاکے کی سردی میں صبح کے وقت ننگے بدن کوڑے مارنا تو عام سزا تھی۔ چونکہ اس موقع پر گورنر بہادر بہ نفس نفیس موجود تھے۔ اس لئے ملزم کو کوڑوں سے پناہ لینے کیلئے موت کی آغوش میں بھی جانے کی اجازت نہیں تھی، ورنہ مضروب کا ایسی سزا کے دوران ہی میں جان بحق ہو جانا عام واردات تھیں۔ پھر سائبیریا میں جو ستم اور بربریت سیاسی اور اخلاقی مجرموں پر ڈھائی جاتی تھیں وہ تو آج بھی سدا اور جاری ہے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۵۰ء تک جس جبریت اور استبداد کی حکومت روس میں رہی ہے ویسی اس عہد میں کسی ملک میں بھی نہ تھی۔ اور یورپ والے بجا طور پر اسے اس وقت غیر مہذب سمجھتے تھے۔ فرد کی شخصیت تو بالکل معدوم ہو چکی تھی۔ آزادی تقریر تھی نہ آزادی تحریر یہاں ایک سیفٹی ایکٹ کا رونا رویا جاتا ہے وہاں ایسے سینکڑوں سیفٹی ایکٹ تھے۔ زار کی مرضی ملک کا قانون تھی۔ اور رحم و انصاف کی ہر درخواست پر جیسا جواب ملتا تھا وہ آج بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

غور کیجئے! جب حق طلبی اور ناانصافی کے احتجاج پر ایسی ایسی شدید سزائیں دی جاتی تھیں۔ تو واقعی جرائم پر کیا کچھ ہوتا ہوگا ایسے مظالم کا دور دورہ ایک قلب حساس کو کب چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔ ٹالسٹائی کے لئے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ سخت نسل کا منتقم باغی اور دہشت پسند بن جاتا جیسا کہ ہر ذہین نوجوان وہاں بن جایا کرتا تھا۔ یا پھر مصلح بن کر کوئی راہ نجات ڈھونڈ ٹالسٹائی نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور وہ فطرتاً مصلح تھا۔ انجیل سے اسے اس زندگی اور اس کے ضروریات کا حل مل گیا۔ اور

---

[1] یہ لکھتے ہوئے ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔ کہ تعزیر کی اس سے بھی بڑھ کر مثالیں پاکستان کی پانچ سالہ تاریخ میں مل جاتی ہیں۔ موضع ڈھیر دسکے کا واقعہ ابھی محو نہ ہونے پایا تھا کہ چک ۲۳۲ ضلع جھنگ کا شرمناک سانحہ پیش آ گیا۔ جس کی بدنما اس اسلامی ملک کی بیوروکریسی کے استبداد کی یاد ان واقعات سے ہمیشہ ہمیشہ منسلک رہے گی۔

وہ عدم تشدد کا ماننے والا تھا۔ بلکہ شر کے مقابلہ میں خیر و یا جائے۔

۳۔ لیکن وہ ہر قسم کے تشدد کے خلاف تھا۔ اگرچہ وہ حق کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ وہ تشدد کے معاملے میں کسی استثنا کا قائل نہ تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ یہ اصول کسی بھی واقعہ کے لئے اپنے آپ کو نہیں توڑتا۔ تشدد اور عدم تشدد دو مختلف نظام ہائے زندگی ہیں اور وہ اس طرح متضاد ہیں جس طرح کفر و ایمان۔ آدمی بیک وقت دو متضاد طریقے اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ یا تو عدم تشدد کی زندگی بسر کرے یا تشدد کی۔ درمیانی چال چل کر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے سامنے بعض ایسے نظائر بھی لائے گئے جن میں تشدد کسی صورت میں بھی ناجائز نہ تھا۔ لیکن وہ ان میں بھی تشدد کی اجازت اس لئے نہیں دیتا تھا کہ انسان کے پاس شر کا کوئی قطعی اور بے لچک معیار نہیں ہے۔ جو ایک کیلئے شر ہے وہ دوسرے کیلئے خیر ہے۔ خیر و شر کی یہ اضافی حیثیت بھیانک ہو جاتی ہے۔ کہ تشدد کیا جائے۔ وہ ایک جگہ خود لکھتا ہے کہ شر کو دبانے کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو ہمیں کوئی قطعی خارجی معیار خیر و شر مل جائے کہ جس سے ہم یہ معلوم کر سکیں کہ فلاں خیر ہے اور فلاں شر ہے یا پھر ہر قسم کے شر کا مقابلہ عدم تشدد سے کریں۔ جہاں تک کہ پہلے راستے کا تعلق ہے ہمیں آج تک کوئی خارجی اور قطعی معیار نہیں مل سکا۔ اب تک دنیا میں جتنے بھی معیار ہائے خیر و شر ہیں۔ وہ سب داخلی نوعیت کے ہیں۔ لہٰذا اضافی ہیں سب آدمی ان پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اس لئے دوسرا راستہ ہی بہتر اور صحیح ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب معیار داخلی اور اس طرح محدود ہو تو اس سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے لیکن محض اسی ایک معمولی سے مطمئن ہو جانا کہ بس ہم کوئی خارجی معیار نہیں پا سکتے بالکل غیر علمی سی بات ہے۔ جب سے آئن سٹائن نے نظریۂ اضافیت پیش کیا ہے تب سے یہ دلیل اور بھی زور و شور سے پیش کی جاتی ہے کہ بس دنیا میں ہر خیر و شر اضافی ہے۔ لیکن اس سے سوائے ذہنی انتشار اور فرار کے کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔ سائنس اور فلسفہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ کائنات میں دو قسم کے قوانین جاری و ساری ہیں۔ ایک وہ ہیں جو اپنی نوعیت میں غیر متبدل ہیں۔ مثلاً ثقل ارض مادے کی طبیعی حرکات، رات دن کا اپنے اپنے وقت پر آ جانا۔ پھر خود ہمارے جسم میں ان کے نمونے نظر آ جاتے ہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن سن نہیں سکتے۔ جو کام کانوں کا ہے وہ کسی دوسرے عضو سے ممکن نہیں۔ دوسرے وہ قوانین ہیں جو تغیر پذیر ہیں۔ مثلاً آنکھ دیکھے گی تو ضرور۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر آنکھ یکساں اور ہر وقت تیز ہو بلکہ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اور ماہرین چشم کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ دن میں سینکڑوں بار آنکھ کی بصارت میں فرق آ جاتا ہے کبھی وہ تیز اور کبھی مدھم پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح دن غروب آفتاب کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں آفتاب ٹھیک ایک ہی وقت پر غروب ہو۔ سردیوں میں جلدی اور گرمیوں میں دیر سے غروب ہوتا ہے۔ مادے کی حرکات ایک قانون کے تابع ہیں لیکن اپنے حدود میں وہ آزادی رکھتا ہے۔ چنانچہ سرجیمس جینز مشہور ماہر سائنس دان نے دھاتوں میں بھی زندگی اور موت کے آثار دکھا دیئے ہیں۔

انسانی معاملات قریب قریب اسی اسلوب پر مرتب کئے گئے ہیں۔ افراد باہم مختلف و متباین ہونے کے باوجود جب اپنی اجتماعی ہیئت تشکیل کرتے ہیں تو اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر کہ طبیعت میں تغیر پذیری کے ساتھ اس میں چند ایسے غیر متبدل قوانین بھی موجود ہیں۔ کہ جن پر سب متفق ہو سکتے ہیں۔ آدمی اپنی سوچ بچار میں اختلاف رکھ سکتے ہیں لیکن کھانے، لباس اور رہائش کی ضروریات میں مختلف نہیں ہو سکتے۔ یہی غیر متبدل حقائق و قوانین کے سانچے

میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ اگر ہماری بدنی اور جسمانی ضروریات کے معاملات چند غیر متبدل حقائق رکھ سکتے ہیں۔ تو کیا ہماری اخلاقی اور باطنی زندگی چند غیر متبدل قوانین نہ رکھتی ہوگی۔ آخر اس کا بھی تو ایک دائرہ کار ہے۔ اگر معاشی اور معاشرتی قوانین بنانے کے لئے غیر متبدل حقائق تلاش کئے جا سکتے ہیں تو اخلاقی اور باطنی زندگی کے معاملہ کو کیوں تغیر پذیر فروغ کا معاملہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ ٹالسٹائی ہی کے الفاظ میں کہنا پڑتا ہے کہ جو لوگ ایسا کہتے اور سمجھتے ہیں وہ درحقیقت زندگی کو نہیں سمجھتے۔ اضافیت کا قانون جائز ہے تو صرف تغیر پذیر فروع کے لئے نہ کہ غیر متبدل قوانین میں اضافیت اس میں تو ہے کہ ایک آدمی کے لئے دو روٹیاں کم ہیں اور دوسرے کے لئے زیادہ۔ ایک قورمہ پسند کرتا ہے تو دوسرا کباب۔ لیکن بھوک اور بدن کی غذائی ضروریات میں تو نہیں۔ قریب قریب یہی معاملہ ہمارے اخلاق اور روحانی زندگی کا ہے۔ کوئی شاعر کی طرف میلان رکھتا ہے تو کوئی پیدائشی انجینیئر ثابت ہوتا ہے۔ کوئی زاہد خشک طبیعت ہے تو کوئی نرم اور رطب اللسان۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کم بھیانک اور فواحش کے بارے میں بھی انسانوں میں اختلاف ہے۔ یورپ اور افریقہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹیوں میں بھی بنیادی انسانی اخلاقیات کی جھلک مل جاتی ہے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بنیادی اور غیر متبدل قوانین اخلاق کو کیونکر تلاش کیا جائے؟ کس ذریعہ اور طریقہ سے ہم اسے پا سکتے ہیں؟

یہاں ٹالسٹائی پھر بھٹک گیا ہے۔ وہ جہاں تک انجیل کے پیچھے پیچھے چلتا ہے وہ راہ راست پر رہتا ہے۔ لیکن جوں ہی راہ کا ناموس پا کر انجیل کو اپنے پیچھے چلانا چاہتا ہے۔ بھٹک جاتا ہے۔ تلاش حقیقت کا اس کے نزدیک ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے ضمیر انسانی۔ یہاں تک تو صحیح ہے۔ لیکن جب وہ اس کا جواب دیتا ہے کہ ضمیر کیا ہے تو گویا وہ انجیل کو چھوڑ کر والٹیئر کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ ٹالسٹائی کہتا ہے ضمیر عقلی شعور ہے۔ ہم ان قوانین کو اپنی عقل سے ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ کہ اسی عقل کے ذریعہ سے خود اس نے محبت کا بھید پا لیا تھا۔ اس مقام پر بہو بہو کر بات ایسی نہیں رہ جاتی کہ اس پر مزید تنقید و تبصرہ کیا جائے عقل کی بے بسی ٹالسٹائی کے عہد سے زیادہ اب واضح ہو رہی ہے کہ بر ٹرنڈ رسل سے مادہ پرست اور عقل ان تی [illegible] کے عبادت گزار جب جدید دنیا اس کی ہئیل بہتر زندگی اس سلسلے میں انسانی عقل کی امداد دیکھتے ہیں۔ تو سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔

جدید دور میں نفسیات[1] بھی اس کے طبل تہی کے بھرم کو پا چکی ہے۔ اور ٹرنگ سے ماہر نفسیات کی تحریریں پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ عقل انسانی کو ایک ناقص اور از کار رفتہ ہتھیار سمجھتا ہے۔ برگساں بھی اس کو در خود اعتناء نہیں سمجھتا۔ وہ تو ان کے اندر اس سے بدرجہا اعلیٰ ایک ایسی قوت کی جھلک پا چکا ہے جو مکان و زمان کے پردے چیرتی ہوئی حقیقت ابدی سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ اس صدی کے شروع میں امریکی فلسفی ولیم جیمز نے ان کیفیات نفسی کا تجزیہ شروع کر دیا تھا۔ جن میں آدمی خدا کا قرب محسوس کرتا ہے۔ یہ کیفیت عقلی نہیں اس کے الفاظ میں "مذہبی تجربہ[2]" ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر

ص۱۔ نفسیات کی تحقیق یہ ہے کہ عقلی فیصلے بڑی حد تک آدمی کے مزاج پر منحصر ہوتے ہیں آدمی چاہے کتنا ہی بے لاگ اور بے تعصب ہو وہ اپنے مزاج سے بلند نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہر آدمی کے دلائل اس کے اپنے مزاج کے دلائل ہوتے ہیں۔ اور جس طرح مزاج مختلف ہیں اسی طرح دلائل بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔

ص۲ دیکھئے ولیم جیمز کی مشہور کتاب The variation of religion experience.

اور تجربہ و مشاہدہ سے عقل کی حد بندیوں اور خام کاریوں کا احساس شدید تر ہو رہا ہے۔ ان نوا صیول[1] کو مبہم طور پر یہ ضرور محسوس ہو چکا ہے کہ انسان کی ہدایت کیلئے کوئی اور یقینی ذریعہ قدرت نے فراہم کر رکھا ہے
خود ٹالسٹائی حق و باطل کا فرق پا سکتا تھا۔ اگر وہ انجیل کی کشتی کے ساتھ عقل کا بادبان نہ لگاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں صرف ٹالسٹائی ہی نہیں یورپ کے دوسرے بہت سے مفکر بھی کبھی اتنی ٹھوکریں نہ کھاتے۔ اگر خدا کے قانون ہدایت کا انھیں علم ہو جاتا۔ عقل کا مقام اور اس کی حیثیت کا علم اس راز کے افشاء ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے ٹالسٹائی دوسرے مفکرین سے زیادہ بہتر اسے سمجھ سکتا تھا کہ وہ دین کی حقیقت کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ صرف ایک چیز اس کے ذہن میں کھٹکی کہ جس کا جواب نہ پا کر وہ کمال حق تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا۔ اور وہ وہ استعجاب ہے جس کو مخالفین قرآن بھی محسوس کرتے تھے۔ کیا آدمی خدا سے ہم کلام ہو سکتا ہے؟ کیا خدا خالق کے علاوہ ہادی بھی ہے؟

ٹالسٹائی پر جب کفر کا فتوی صادر کیا گیا تو اس کے جواب میں اس نے اپنے اعتقادات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ میں حضرت یسوع کو ایک آدمی کا بیٹا مانتا ہوں نہ کہ خدا کا اور میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ کسی مافوق الفطرت عمل سے حق ان کے پاس پہنچا تھا کسی اور مقام پر بھی اس نے کہا۔ کہ وحی بس یہ ہے کہ آدمی ان حقیقتوں کو پالے جن کو انسانیت کے بڑے دانا اور زیرک لوگوں نے اپنے تجربات و مشاہدات سے پایا ہے۔ وہ حقیقتیں ہمیشہ سے ایک اور غیر متبدل ہیں۔

اگر انجیل ہی کے توسل سے وحی کی حقیقت اس پر کھل جاتی تو پھر نہ تو کبھی وہ کسی خارجی اور قطعی معیار خیر و شر کے فقدان کی شکایت کرتا اور نہ خال جانوں کے اتلاف کو تشدد یا ظلم کہتا۔ وہ اس کو ایسا ہی عمل سمجھتا جیسا کہ وجود کائنات میں اس کی تعمیر کے لئے ذروں کی ٹوٹ پھوٹ ہے نظام کائنات میں جہاں ترکیب و تعمیر ہے۔ وہاں انتشار و تخریب بھی ہے۔ اور بغیر اس کے ترکیب و تعمیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس عمل کا نفوذ صرف آفاق ہی میں نہیں ہمارے انفس میں بھی ہے۔

بدن کی تعمیر میں ہر وقت کتنے ناقص اور ساز کار رفتہ کردیات و خلایا کو موت کے گھاٹ اترنا پڑتا ہے کہ سفید و کامل کردیات و خلایا ان کی جگہ لے سکیں۔ از کار رفتہ پتوں کو جھڑنے کے لئے خزاں کو ضرور آنا پڑتا ہے۔ کہ ان کی جگہ نئے پتے آئیں اور درخت کے مقصد وجود میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے سائنس بھی اس کو حقیقت اور فلسفہ بھی اس کو عمل الحق سمجھ کر قبول کر رہا ہے۔ اب جو عمل بالحق [illegible]ق میں ایک قانون کے ذریعہ بغیر ارادہ و مشیت کے انجام پاتا ہے وہی اگر انسانوں میں ارادہ و مشیت سے ہونے لگے تو کیا وہ تشدد ہوگا؟ وہ تو ایک فرض ہے۔ ایک عمل حق ہے جس کو بجا لانا ہی اصل خیر ہے اور جس سے اغماض و لاپرواہی ظلم عظیم ہے۔ جن کو اس معیار خیر و شر اور عمل بالحق کا علم نہ ہو ان کے لئے البتہ تشدد سے بدرجہا بہتر

حد۲ فلسفۂ مغرب کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر ایسے مفکر ملتے ہیں کہ جن تک اگر قانون ہدایت کا علم پہنچ جاتا تو وہ کبھی یوں نہ بھٹکتے یکم از کم اتمام حجت کیلئے ضروری ہے۔ کہ خدا کے قانون ہدایت کو سائنٹیفک طریقہ سے ان کے سامنے پیش کیا جائے مسلمانوں کے ذمہ یہ حق ابھی باقی ہے

حد۱ چند برسوں کی بات ہے امریکہ کے ایک مشہور ماہر نفسیات نے ایک کتاب شائع کی تھی Back To Religion اس میں اس نے ان مشاہدات کا ذکر کیا ہے جو اس کو اپنے معالجات کے دوران میں ملے۔ وہ کہتا ہے یورپ اور امریکہ کی جدید سوسائٹی جب تک اس زعم باطل میں گرفتار ہے کہ عقل ہی رہبر کامل ہے اس وقت تک وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتی۔ عقل تو ایک آلہ ہے تصدیق حق کیلئے یہ منزل نہیں وسیلہ ہے اور جب اس سے وہ کام لیا جاتا ہے جو اس کے اختیار سے باہر ہے تو آدمی نامراد و ناکام ہوتا ہے

مدد ثابت دے۔

۴۔ اپنی تحریروں میں متعدد مقامات پر ٹالسٹائی نے عہد نامہ عتیق (توریت) پر اظہار ناپسندیدگی کیا ہے۔ کچھ تو غالباً اس وجہ سے کہ یہودیوں نے اس کتاب میں اس قدر تحریف کی ہے کہ بعض مقامات بالکل لغو ہو گئے ہیں اور کوئی سمجھدار آدمی انہیں احساس شرم کے بغیر پڑھ نہیں سکتا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی پاک سیرت پر جہاں گندگی کے چھینٹے اڑائے گئے ہیں وہ اور چند اسی قسم کے اور مقامات ایسے داغ ہیں کہ جنھیں باقی حصۂ کتاب بھی نہیں چھپا سکتا۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ٹالسٹائی کے ذوق پر ضرور گراں گزری ہوں گی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انجیل میں ایک جگہ حضرت عیسےٰ نے فرمایا ہے کہ "میرا وہ طریقہ نہیں" جس سے اس نے اخذ کر لیا حضرت عیسیٰ توریت کے قوانین کو ناپسند کرتے ہیں۔ نیز توریت دین مسیحیت کی کتاب نہیں۔ توریت اور انجیل کے طریقہ کار میں بنیادی فرق ہے حشر کے بدلہ میں شر کی قائل ہے جبکہ انجیل شر کے بدلے میں خیر کی تلقین کرتی ہے۔

ٹالسٹائی بچارا یورپ کے علم کے سہارے جتنا کچھ پا سکا وہ غنیمت نہیں کمال ہے۔ کاش کہ اسلام نکھری ہوئی صورت میں اس تک پہنچ جاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ توریت کیا کہتی ہے۔ اور انجیل کا کیا مقصد ہے؟ ایسے مقامات جیسے دموسیٰ کا بھی علم ہو جاتا۔ تو اس پر قانون اور دعوت کی حقیقت بھی کھل جاتی۔ یہ کہ حضرت موسیٰ صاحب امر تھے اور حضرت عیسےٰ صاحب دعوت حضرت موسیٰ ایک سوسائٹی کے رہبر و ہادی اور حاکم و آمر تھے۔ اور ان کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ سوسائٹی کو ایک قانون عطا کرتے جس میں پورا مکافات عمل ہو۔ جو حق کا موئد اور باطل کا دشمن ہو۔ سوسائٹی تمام تر نیک اور صالح افراد پر مشتمل نہیں ہوتی اس میں نیک طینت بھی ہوتے ہیں اور بد طینت بھی۔ حق پسند بھی اور شر پسند بھی۔ اب جہاں تک ان کے خارجی معاشرتی معاملات کا تعلق ہے۔ ان کے تصفیے کے لئے لازماً ایسے ٹھوس اور عمومی قانون کی ضرورت ہے جن کی رو سے حق تلفی کرنے والے کو بزور روکا جائے اور مظلوم کا حق محض خوشامد اور موعظت سے نہیں قوت سے دلایا جائے۔ توریت میں انھی بنیادی قوانین کو احکام حشر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کا مطلب شر کا جواب شر نہیں ہے ان کا مطلب پوری پوری حق رسی اور پورا پورا مکافات عمل ہے

حضرت عیسےٰ اسی سوسائٹی کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ جس کی تشکیل حضرت موسیٰؑ نے کی تھی (اور جن کی وقتوں اور کوششوں سے یہ بے لگام قوم ایک سوسائٹی بنی تھی۔ اس کی تفصیل آج تک موجود ہے) چونکہ حضرت عیسےٰ اصلاح چاہتے تھے۔ اور اصلاح جبر سے نہیں ہوتی محبت سے ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت عیسےٰ نے قانونی راہ چھوڑ کر دعوت کی راہ اختیار کی۔ جس میں محبت اور درد بھری موعظت ہوتی ہے۔ جس میں مخالفین کے طعنے اور بد سلوکی سہکر اخلاق اور عفو کا نمونہ دکھانا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہودی قوم کی شدید ترین مخالفت اور شقاوت قلبی کے باوجود حضرت عیسےٰ نے ان پر شفقت کی اور کبھی وہ راہ اختیار نہ کی جس کی گنجائش کے لئے قانون بنا ہوتا ہے۔ اور یہی مطلب ہے۔ ان کے فرمان کا کہ میرا وہ طریقہ نہیں جو صاحب امر کا ہوتا ہے۔ میں مصلح ہوں معلم ہوں اور طبیب روحانی ہوں۔ میں تمہیں تمہارا ہی بھولا ہوا سبق پڑھانے آیا ہوں جو احکام عشر کے نگینے میں جھلک رہا ہے۔ میں جانتا ہوں تم ایک مہلک مرض میں گرفتار ہو اور مدت العمر کے مرض نے تمہاری طبیعت متغیر کر دی ہے تم جو چاہے کرو۔ لیکن ایک رازدان فطرت کی حیثیت سے مجھ پر واجب نہیں کہ میں غضب میں آجاؤں۔

اب جو شخص قانون کو چھوڑ کر ایک سوسائٹی کو صرف دعوتی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے وہ یقیناً ایک وقت ضرور مایوس ہو جاتا ہے۔ صرف دعوت سے کبھی نظم نہیں پیدا ہوتا، نظم صرف قانون سے پیدا ہوتا ہے۔ اور بغیر نظم کے سوسائٹی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ ٹالسٹائی کا دعوتی مزاج اس تعلیمی اسکیم سے بھی ٹپکتا ہے۔ جس کو ابتدائی دور میں اس نے عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی

کی۔ اس کے نزدیک تعلیمی نصاب اس اصول پر مبنی ہونا چاہئے کہ لڑکوں پر کوئی نظم نہ ٹھونسا جائے۔ جو ٹالسٹائی کے قول کے مطابق تعلیمی نصاب کا خلاصہ یہ ہے LET THE BOYS BE OUT OF BENCH۔ مہاتما گاندھی کی دعوت بھی اسی اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے کوئی باقاعدہ تحریک نہ چلائی جدید دور میں اس کے عظیم تبع مہاتما گاندھی کی ناکامی بھی جاننے کے لئے غور و فکر کا کافی مواد مہیا کرتی ہے جہاں تک تحریک آزادی کا تعلق تھا مہاتما گاندھی کی اہنسا منظم جماعت کے ساتھ ہی چلی۔ اس کے بغیر محض دعوت اہنسا کا کیا انجام ہوتا وہ گاندھی جی کی موت کے بعد واضح نظر آرہا ہے۔ جوں ہی ہندو معاشرے کو اپنی تقدیر آپ بنانے کی اجازت ملی۔ اس نے یکلخت اس شخص اور اس کی عمر بھر کی کمائی کو چند لمحوں میں ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے ہلاک ہوتے ہی اس کی ساری تعلیم دلوں سے سمٹ کر کاغذوں میں آگئی ہے بعینہ یہی حال ٹالسٹائی کا ہوا۔ اس کی تعلیم کا زور شور صرف اس کے دم تک تھا جوں ہی اس کی آنکھ بند ہوئی روس بالشویک کی آغوش میں آگرا۔

ایک سوسائٹی کی اصلاح صرف دعوت سے کرنی۔ تصویر کے صرف ایک رخ کو لینا ہے دعوت کو وہ شخص تو قبول کر لیتے ہیں جو کچھ ذہین اور گیانی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے سود مند نہیں جو اس کے مفہوم تک نہیں پا سکتے۔ ان کے لئے قانون کی ضرورت ہے۔ دعوت اور قانون جب تک دونوں نہ ہوں اصلاح مکمل نہ ہوگی۔ ایک وقت دعوت کی ضرورت ہے تو دوسرے وقت قانون کی بعینہ جیسے ایک وقت علاج دوا سے ہوتا ہے تو دوسرے وقت غذا سے صحت کامل دونوں کے باہم تعامل سے ہوتی ہے۔

یہ تھا ٹالسٹائی حق گوئی اور بے باکی دو صفات اس کی سیرت میں بلند میناروں کی طرح روشن ہیں۔ اس نے حکومت اور کلیسا کو وہ وہ باتیں کہیں جن کے کہنے کی کسی دوسرے میں جرأت نہ ہو سکتی تھی مخالفت کے باوجود اس کی عظمت کے سامنے سب کا سر نگوں تھا اس کے معاصر اس کی کتنی عزت اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس کا پتہ اس خط سے چلتا ہے جو ترگنیف TURGENEV. مشہور روسی ادیب نے اپنے فرانسیسی ناشروں کو لکھا تھا۔ اس میں اس نے ٹالسٹائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔ "میں تو اس کے جوتوں کے تسمے باندھنے کے بھی لائق نہیں ہوں" روس کے عوام اسے پیغمبر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ حکومت وقت اس کی دشمن ہونے کے باوجود اس پر ہاتھ ڈال سکتی تھی البتہ کلیسا نے ۱۹۰۱ء میں اپنے اپنے صبر کا جام چھلکا دیا۔ اور اس پر کفر کا فتوی صادر کر دیا۔ اس فتوے کے ساتھ اس کو کئی نامعلوم اشخاص کی جانب سے قتل کی دھمکیاں بھی موصول ہوئیں۔ مگر وہ تو بلند پہاڑ تھا جس کو چند حقیر چوہے اپنے پنجوں اور دانتوں سے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہی شخص تھا جس کی طفیل مسیحیت پر یورپ کا جاں بلب ایمان پھر جی اٹھا۔ پہلا شخص تھا جو کئی صدیوں کے بعد دین مسیحیت میں ایک مجدد کی حیثیت سے آیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے انیسویں صدی کے مادی زمانے کی دیجور رات میں مذہب کی شمع عقل و دلیل سے روشن کی۔ وہ پہلا مصلح تھا جس نے محض جزوی نہیں زندگی کی کل اصلاح کی دعوت دی اور اپنے عہد کے نوجوانوں کے اندر مذہب و اخلاق کا درد پیدا کیا دہریت کی اجتماعی روکا رخ خدا کی طرف موڑنے والا یہ واحد شخص تھا۔ جن کی نظر یورپ کے ادب و فکر پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے بعد پیدا ہونے والا یورپ کا کوئی ادیب و مفکر اس کے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ آج یورپ کے بڑے بڑے ادیبوں کے اندر جو یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ مسیحیت تمام دکھوں کا حل ہے تو یہ اسی کے طفیل ہے اس کے باوصف اس پر کفر و ارتداد اور غداری کے الزامات لگائے گئے اس کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔

اَے دوست

کوثر نیازی

ہر وہ لمحہ ہے مرا کفر میں شامل اے دوست!
دل تری یاد سے جس میں رہا غافل اَے دوست!

آدمی "ہمّتِ بیدار" اگر رکھتا ہو،
کوئی مشکل بھی نہیں دہر میں مشکل اے دوست!

بڑھ گئی اَور بھی مہجوریٔ قلبِ مضطر
غضب ہے تیری توجہ کا یہ حاصل اے دوست!

یہ کبھی جلوہ گہِ ناز ہوا کرتا تھا
دل کہ ہے آج اک اُجڑی ہوئی محفل اے دوست!

کارواں دُور، قدم سست، مراحل پُرپیچ
کیسے پہنچوں گا میں اب برسرِ منزل اے دوست!

یہ تری ذرہ نوازی ہے کہ برباد کیا
ورنہ کب تھا میں ترے لطف کے قابل اے دوست!

کیا غضب ہے کہ مسیحا بھی بنے پھرتے ہیں
جن سے بڑھ کر نہیں اِس دَور میں قاتل اے دوست!

عشق میں پار اُترنے کی امیدیں باطل
یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل اے دوست!

محسوسات

ابوالبیان حمادؔ

محبت کی روش ہی کچھ جدا معلوم ہوتی ہے
کہ اُن کی ہر جفا ہم کو وفا معلوم ہوتی ہے

ذرا سی آبلہ پائی سے تو گھبرا گیا اے دل
ابھی تو عاشقی کی ابتدا معلوم ہوتی ہے

محبت کی ابھی تک قدر پہچانی نہ تھی ہم نے
اسے یہ تو متاعِ بے بہا معلوم ہوتی ہے

جو ہوں اپنے ہی بیگانے تو پھر کیا غیر کا شکوہ
کہ ہم کو اپنی قسمت ہی خفا معلوم ہوتی ہے

کھنچے رہتے تھے جو ہم سے وہ خود ہی کھنچ کے آئے ہیں
یہ سب حمادؔ تاثیرِ دعا معلوم ہوتی ہے

حقائق

وارثؔ القادری

جبیں کے ساتھ پائے ناز پر دل بھی جھکا ہوگا
متاعِ روح بن جائے گا جو سجدہ ادا ہوگا ۔

قریبِ دل بقدرِ جذبۂ مہر و وفا ہوگا
وہ سیرت آشنا ہو کر ہی صورت آشنا ہوگا

مہ و انجم کی تابانی میں بھی تو یاد آتا ہے
کہاں تک دلفریب آخر جمالِ ماسوا ہوگا

یہاں آغاز ہوتا ہے ترے لطف و عنایت کا
وہیں ختم ان لرزتے آنسوؤں کا سلسلہ ہوگا

تم اپنے کو جو وارثؔ وارثِ اسلاف کہتے ہو
تو تم میں بھی وہی عشقِ خدا و مصطفےٰ ہوگا؟

ہمارے ادبی محاذ پر جمود

● اسد گیلانی
● کوثر نیازی
● مسعود جاوید

بہت سے گوشوں سے یہ سوال ابھر کر سامنے آ رہا ہے ۔ کہ ہمارے یہاں کچھ دنوں سے ادبی جمود اور تعطل سا پیدا ہو گیا ہے ۔ اس بات کو ایک رفیق نے بھی اپنے ایک حالیہ نیم تبصراتی مضمون میں چھیڑا ہے ۔ یہ سوال گذشتہ دو برس سے اشتراکی اور نیم اشتراکی ادیبوں کا بھی موضوع سخن بنا رہا ہے ۔ اور وہ اس پر بڑی جگر کاوی کرتے رہے ہیں ۔ اس کے مختلف گوشوں کی چھان پھٹک ہوتی رہی ہے اور بالآخر انہوں نے اپنا منشور بدل کر اور ایک نیا ادبی چولا بدل کر اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کے یہاں جمود کا سبب ان کا وہ غلط فیصلہ ہو سکتا ہے ۔ جب انہوں نے یہ سمجھ کر کہ اب اشتراکی انقلاب آنے میں دن ہی کتنے ہیں کھل کر اشتراکیت کے راگ الاپنے شروع کر دئے اور لینن کی "حمد" اور اسٹالن کی "نعت" سے اپنے جرائد کو بھر دیا ۔ یہ حرکت انہوں نے کچھ اس طرح اچانک شروع کی گویا سرخ سویرے کا طلوع وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن جب انہیں محسوس ہوا کہ ان کی آواز پر عوام میں کوئی ہلچل برپا نہیں ہو رہی ۔ کہیں سرخ پھریرے لہراتے نظر نہیں آ رہے ۔ اور ان کی اصل قوت کمیونسٹ پارٹی بالکل بے جان ہے تو انہوں نے محسوس کیا کہ چلتے چلتے یکایک ان کے سامنے ایک گہرا غار آ گیا تھا ۔ اس طرح ان کی سرگرمیوں میں اچانک ایک خلا پیدا ہو گیا ۔ انہیں اپنی بولی خود اجنبی سی معلوم ہونے لگی ۔ اور احساس کمزوری بلکہ نقاہت نے انہیں خاموشی پر مجبور کر دیا ۔ ساتھ ہی حکومت نے بھی ان کی خاموشی اور جمود میں کچھ مدد کی اور نتیجۃً ان کے یہاں یہ سوال ابھرا کہ ادب میں جمود ہو گیا ہے ۔ جمود تو واقعۃً پیدا ہو گیا تھا ۔ کیونکہ ایک طرف وہ اپنی راگنی کو لینن اور اسٹالین کی مدح اور سرخ سویرے کے طلوع کے افسانوں تک لے گئے تھے ۔ اور دوسری طرف انہیں اچانک یہ احساس ہوا کہ ان کی آواز اس فضا میں اجنبی اور یکہ و تنہا تھی ۔ اور ان کی پشت پناہ پارٹی بے قوت اور بے جان تھی ۔ بہرحال ان کے ہاں جب جمود کا یہ سوال ابھرا تو دراصل اس مقصد کے لئے تھا کہ اب ہم کس راہ سے اپنی بات کہیں کہ جس سے میں نیا روپ دھاریں ۔ اور کس انداز میں کوئی نئی حیثیت اختیار کریں کہ ہماری بات کا کھویا ہوا اثر واپس آ سکے ۔ چنانچہ ایک طویل اور پُر پیچ طریق کار کے بعد اور اپنی غلطیوں اور تقصیروں کے اعتراف کے ساتھ انہوں نے اپنا نیا منشور بنا لیا ۔ گویا راہ گم کردہ کچھوے کو احساس ہوا تھا کہ وہ اپنے تالاب کے قریب ہے اور اس نے اپنے خول میں سے گردن نکال کر اطمینان سے چلنا شروع کر دیا تھا اور جب چند شریر لڑکوں کے کنکر اس کے سر میں پڑے تو اسے محسوس ہوا کہ ابھی منزل دور ہے اور اس نے اپنی گردن پھر اپنے خول کے اندر سکیڑ لی ۔

ہمارے یہاں کا جمود ہمارے یہاں جمود کا مسئلہ ان معنوں میں موجود نہیں ہے ۔ اور نہ ہونے کا امکان ہے ۔ البتہ مجھے خطرہ ہے کہ جب یہ مسئلہ تصدیق یا تردید کے لئے چھڑ گیا تو پھر کہیں اسی پر تحریک کی قوتیں نہ صرف ہونے لگیں ۔ اور اس کی مثال یوں ذہن میں آئے کہ ایک محفل میں گفتگو ہوتے ہوتے ذرا سا وقفہ ہو اور پھر اس وقفہ کی خاموشی کو ایک شخص یہ کہہ کر توڑے کہ "بھائی ہم سب خاموش کیوں ہیں ؟" اور دوسرا کہے کہ "نہیں خاموش تو نہیں ہیں ؟" اور تیسرا کہے کہ "خاموشی کی وجوہات یہ ہیں ؟"

اور چوتھا کہے کہ خاموشی دراصل قوت تقریر کی کمی کا نتیجہ ہے "۔ اور پھر اس خاموشی کے موضوع پر دھواں دھار تقریریں ہوں کہ اس کے شور و غل سے ہمسائے بھی بلبلا اٹھیں اور پھر بھی یہ نہ طے ہو سکے ۔ کہ ہم خاموش کیوں ہیں اور اس کے اسباب کیا ہیں؟

بلاشبہ ہمارے یہاں ادب کی جو ہما ہمی پہلے تھی ۔ اس میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے لیکن یہ کمی ایسی نہیں ہے جو بڑے خطرناک عوامل کی حامل ہو اور اس کی پشت پر کوئی بڑے ہی بھیانک نتائج پوشیدہ ہوں ۔ اس لئے کہ ہمارے پاس اپنے کام کو ناپنے تولنے کی ایک ترازو موجود ہے اور اگر اس ترازو میں وزن ہماری طرف جھکتا نظر آتا ہے تو پھر خطرے کی گھنٹی بجانے کا کوئی موقعہ نہیں ہے اور وہ ترازو ہے ۔" ملک میں اسلامی اقدار اخلاق اور اسلامی نظام حیات کو برپا کرنے کی جدوجہد" اسی مقصد کے لئے یہاں ادب میں ایک اسلامی تحریک اٹھ رہی ہے ۔ اسی مقصد کے لئے یہاں مزدوروں میں اسلامی تنظیمیں وجود میں آ رہی ہیں ۔ اسی مقصد کے لئے یہاں معاشرے میں اسلامی پنچائتیں بن رہی ہیں ۔ اسی مقصد کے لئے یہاں خواتین کے اسلامی حلقے بن رہے ہیں ۔ اسی مقصد کے لئے یہاں طلباء میں ایک اسلامی جمعیت جدوجہد کر رہی ہے اور اس مقصد کے لئے یہاں ایک منظم جماعت سرگرم کار ہے

دیکھنا یہ ہے کہ یہ قافلہ مجموعی طور پر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے یا رک گیا ہے یا رجعت قہقری کر رہا ہے جو صورت اس سارے قافلے کی ہوگی ۔ وہی اس قافلہ کے ہر گروہ کی ہوگی ۔ میرے خیال میں اس میزان میں ہمارا پلڑا ہلکا نہیں ہے اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے ہمیں قلب کا یہ اطمینان دیا ہے کہ ہم راہ راست پر اقدام کر رہے ہیں ۔

اس اطمینان کے باوجود بھی ہمارا ادبی گروہ کہہ سکتا ہے کہ ہمارے محاذ پر پہلے کی نسبت گرماگرمی کم ہے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اس محاذ کی سردی کے اسباب کا کھوج لگائیں ۔ میں نے اس موضوع پر جب غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ بات بے حقیقت نہیں ہے ۔ ادبی محاذ پر پہلے کی نسبت واقعتہً شورا شوری کم ہے ۔ اس کے جو اسباب میری سمجھ میں آئے ہیں ان میں اہم ترین تین ہیں :۔

۱ ۔ ہماری ادبی تحریک کی تنظیم میں کوتاہی

۲ ۔ ہمارے ادبی جرائد کی بندش

۳ ۔ ہمارے ادبی کارکنوں کا سیاسی محاذ میں جذب ہو جانا ۔

ان تینوں اسباب نے ہمارے ادبی محاذ کو کچھ دنوں سے سرد کر دیا ہے ۔ اہمیت کے لحاظ سے بھی ان کی ترتیب وہی ہے ۔ جو اوپر دی گئی ہے

۱ ۔ تنظیم کی کوتاہی ایک بہت بڑا سبب ہے ۔

جب کسی جگہ ایک ادبی حلقہ منظم ہوتا ہے تو وہاں چند ادیب ہفت روزہ یا پندرہ روزہ یا ماہانہ نشستیں منعقد کرتے ہیں جن کا ایک متعین اور مقررہ پروگرام ہوتا ہے اور ہر نشست میں نئے نئے ادیب پروگرام میں حصہ لیتے رہتے ہیں اس کے دو فوری نتیجے برآمد ہوتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ جو پہلے سے کچھ کہہ رہے ہیں وہ پروگرام میں نام آنے اور ایک اخلاقی دباؤ محسوس کرنے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں ۔ اور ان کی ادبی صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگنے پاتا ۔ بلکہ ان کا ادبی چشمہ رواں دواں رہتا ہے دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس حلقے میں نئے نئے لکھنے والے شامل ہوتے رہتے ہیں . . . .

. . . . اور احباب کے مشوروں اور ہدایات سے ان میں یہ صلاحیتیں ابھرتی ہیں ۔ مشق بڑھتی ہے ۔ آہستہ آہستہ پختگی بھی آنے لگتی ہے ۔ پھر یہ ادبی حلقہ اپنے انعقاد کی تاریخوں کا اعلان بھی لازمی سمجھتا ہے ۔ تاکہ اس میں زیادہ لوگ شامل

ہوں۔ لہٰذا دور کے احباب کو ان کی سرگرمیوں کا علم ہو۔ اس طرح مل جل کر بیٹھنے سے وہ اپنے حلقے کی توسیع کی تدابیر بھی سوچتے ہیں۔ دوسرے ادیبوں کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ اخبارات میں اعلان بھیجتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ماہانہ یا سہ ماہی کھلے اجلاس کر کے ذرا بڑے پیمانے پر دوسرے ادب دوست حضرات کو بھی شرکت کی دعوت دینے لگتے ہیں۔ جب ایک حلقہ اس طرح منظم ہو اور اسی ڈھب کے کئی حلقے ملک کے مختلف شہروں میں انہیں خطوط پر کام کر رہے ہوں۔ تو چند ہی ماہ میں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ چاروں طرف سے نئے نئے مضامین نظم و نثر کا سیل امڈا چلا آ رہا ہے۔ لیکن جب ایک حلقے کا ناظم تساہل سے کام لے نشستیں باقاعدہ کی جگہ بے قاعدہ ہو جائیں۔ باقاعدگی کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے بعض احباب آنا چھوڑ دیں۔ پرانے لکھنے والوں سے کچھ لکھوایا نہ جائے اور نئے لکھنے والے پیدا نہ ہو سکیں۔ بے قاعدگی کی وجہ سے اخبارات میں اعلان دینا بھی عبث معلوم ہو اور اس منتشر پونجی پر کوئی بڑا اجلاس منعقد کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہو جائے مرکز میں رپورٹیں جانا بند ہو جائیں۔ اور مرکز ایسے حلقے کو مردہ سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہونا چھوڑ دے۔ اور جب ملک کے بڑے بڑے حلقے کا یہی حال ہو جائے تو حلقے اپنی جگہ منتشر ہو جاتے ہیں لہٰذا مرکز اپنی جگہ کرد رہ جاتا ہے نئی نئی تحریریں نا بلند ہو جاتی ہیں بالعموم یہ تاثر ہو جاتا ہے کہ بحیثیت ادبی محاذ پر کچھ ہو رہا ہے

ہمارے ادبی جرائد۔

۲۔ دوسرا عامل ہمارے ادبی جرائد ہیں۔ ان کا قافلہ بڑھے تو ادب آگے بڑھتا ہے یہ رک جائے تو ادب رک جاتا ہے پچھلے دنوں ہمارے خالص ادبی جرائد ایک ایک کر کے بند ہو گئے جیسے نقوش یثرب۔ راحیل سلسبیل وغیرہ۔ ان میں بعض سیفٹی ایکٹ کا شکار ہوئے اور بعض مالی مشکلات کا۔ اور سیفٹی ایکٹ کا نتیجہ بھی بالآخر مالی مشکلات ہی ہوتا ہے۔ یہ جرائد ایسے تھے جو مضامین نظم و نثر کا ایک بڑا ذخیرہ ہر ماہ پیش کرتے تھے اور پیش کرنے کے لئے فراہم کرتے تھے اور فراہم کرنے کے لئے ادیبوں کو اکساتے تھے بلکہ ادیب سازی کرتے تھے نو مشقوں کی ہمت افزائی ہوتی تھی۔ اور کہنہ مشقوں کو لکھنے پر مجبور بھی کیا جاتا تھا یہ بند ہوئے تو یہ کاروبار بند ہوا۔ باقی فاران۔ چراغ راہ اور مشیر رہ گئے ہیں اور کچھ نوع سے ہفت روزہ کوثر بھی اس زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ فاران اور چراغ راہ کا مزاج اس ادب کا نہیں جس ادب پر جمود طاری ہونے کی شکایت ہو رہی ہے اور وہ دونوں اپنے مخصوص مزاج پر ایک حد تک کافی سختی سے جمے رہنے کے قائل ہیں لیکن اس سختی کے باوجود انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نئے نئے لکھنے والوں کے پیدا ہونے میں ہی ایسے مخصوص مزاج کے جرائد کی بھی خیر ہے اس لئے کہ اگر نئے ادیب پیدا ہوں گے تو ان کے مزاج کے ادیب بھی ساتھ ہی پیدا ہوں گے اور جب یہ نہ ہوگا تو ان کے ہاں بھی پوری طرح ادبی قحط رہے گا۔ مشیر ایک ڈائجسٹ ہے اس لئے وہ ادب میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ البتہ جو ادب پیدا ہو چکا ہے اس کو سجا کر اس کی قدر بڑھانے اور اسے دور دور تک پہنچانے کا کام کر سکتا ہے۔ ہفت روزہ کوثر خالص ادبی پرچہ نہیں ہے بلکہ شذراتی ہے اور اس امر کا اہتمام رکھتا ہے۔ کہ ادب کی گرانی اسے دبا نہ لے۔ اس کا مزاج ہلکا پھلکا اور معلوماتی ہے۔ جو دیہات کے کم لکھے پڑھے لوگوں تک بھی اپنی آواز پہنچا سکے۔

چنانچہ ادیبوں کا وہ ایک لشکر جو جگہ جگہ تیار ہو رہا تھا۔ اس کی نشو و نما بھی جرائد کی کمی کی وجہ سے اچانک رک گئی ہے اور ادیبوں کی ایک نیم پخت کھیپ کی کھیپ ان جرائد کے نہ ہونے سے اپنی اپنی جگہ مرجھا کر رہ گئی ہے ایسا ادیب شاید ہی کوئی ہوگا جو مضامین لکھ لکھ کر ڈھیر لگاتا چلا جائے۔ اور اس بات سے قطعی بے نیاز ہو کر جو بات وہ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے وہ پہنچے یا نہ پہنچے اس کے لئے برابر ہے۔ وہ جب اپنی ایک بات نہیں پہنچا سکتا۔ تو دوسری بات کہتا ہی نہیں۔ اور اس طرح اس کے لبوں پر قفل لگ جاتا ہے۔ جو ادبی جمود کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا ادیب موجود بھی ہو۔

ہو طبیعت کے اس نفسیاتی تصور سے بے نیاز ہو ۔ تو بھی وہ جمود کے توڑنے میں وہ مددگار نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے کہ کسی کو کیا معلوم کہ کسی نے کیا کچھ لکھ کر اپنے بکس میں رکھا ہوا ہے ۔ جب تک وہ سامنے نہ آئے اس طرح گویا جمود کی کمی ادب کے سوتوں کو آہستہ آہستہ خشک کر دیتی ہے ۔

ادبی کارکنوں کی سیاسی مصروفیت ۔ ۳

اس تعطل کا تیسرا اہم عامل ادبی کارکنوں کا اسلامی نظام کے لئے جد و جہد کرنے والے سیاسی محاذ پر جذب ہو جاتا ہے ۔ اسلامی نظام کو برپا کرنے کا رلانے کے لئے ضرورت ہے کہ اس کے ہر محاذ پر جنگ کی جائے ۔ چنانچہ اس وقت دستوری محاذ پر جو جد و جہد ہو رہی ہے اس میں اسلامی ادیب بھی سرگرم کار ہیں اور وہ بھی گلی گلی محضر ناموں پر دستخط کراتے نظر آتے ہیں ۔ اور اس مہم میں جس قدر شدت پیدا ہوتی جاتی ہے اور کارکنوں کی جتنی ضرورت بڑھتی جاتی ہے اسی نسبت سے ادب کا موسم بھی سرد پڑتا چلا جاتا ہے ۔ ادیب کو ایک تخلیق لانے کے لئے اپنے اندر اترنا پڑتا ہے اور اندر اترنے کے لئے سکون ، فرصت اور مطالعہ کی ضرورت ہے لیکن جب ایک خارجی مہم اسے اتنا مصروف رکھے کہ وہ قلب کے اندر سیڑھی لگا کر اتر ہی نہ سکے تو مہینوں گذر جاسکتے ہیں کہ اس کا ادیب اس کے اندر پڑا سویا ہے اور اسے جگانے کی نوبت تک نہ آئے ۔ بیسیوں مضامین اس کے احساس کا دروازہ کھٹکھٹا کر گذر جائیں ۔ اور اس کی عدیم الفرصتی سے دروازہ کھولنے تک کی نوبت نہ آنے دے ۔ یہی حالات ہوتے ہیں جب ادب میں تعطل کی سرگوشیاں سننے میں آتی ہیں ۔

ان تینوں اسباب کو دور کرنے ہی سے ادبی چہل پہل رونما ہو سکتی ہے ۔ پہلی چیز تنظیم ہے تنظیم کے لئے جہاں ایک اچھے مرکز کی ضرورت ہوتی ہے وہیں اچھے ادبی حلقوں اور اچھے کارکنوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ اگر حلقے ہر وقت پیشے کا سہارا ہی ڈھونڈتے ہوں اور مرکز خود اپنی جگہ پر بے بس ہو کر رہ جائے گا اور اگر مرکز کی طرف سے ہدایات اور مشوروں کی کمی ہو تو بالعموم حلقے بھی منتشر اور بالآخر سرد پڑ جاتے ہیں ۔ دونوں میں یک جہتی ، ہم آہنگی اور خلوص قلب سے رفاقت کار کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس میں جس طرف سے کمی ہو گی ۔ اور جس قدر کمی ہو گی اسی نسبت سے تنظیم کمزور پڑ جائے گی ۔ چونکہ ایک واضح مقصد ہمارے سامنے ہے ایک متعین طریق کار بھی معلوم ہے اس لئے یہ کچھ زیادہ ضروری نہیں ہے کہ مرکز کی طرف سے اکسا ہٹیں بار بار حلقوں کی طرف ارسال کی جاتی رہیں جب ہی وہ کام کریں ۔ مرکز تو صرف اس مقصد کی راہ میں ہونے والے کام کو مربوط کرنے والا ہے وہ خود جا کر کسی حلقے کی کارکردگی بڑھا نہیں سکتا اس لئے اس کی تمام تر ذمہ داری حلقوں پر ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظم کو باقاعدہ رکھیں اور اس باقاعدگی سے اپنے مقام پر اپنی ایک حیثیت مشخص کرا لیں ۔ جب تمام حلقے باقاعدگی سے نشستیں منعقد کر رہے ہوں ۔ اپنی نشر و اشاعت کا انتظام اور اپنے اجتماعات کی کاروائیاں اخبارات میں بھیجا رہے ہیں ۔ مقامی طور پر پرانے لکھنے والے لکھتے رہیں ۔ اور نئے لکھنے والوں کو اکساتے رہیں ۔ اور ناظم حلقہ تقسیم کار کے اصول پر ان سے کام لیتا ہے اور ان کی انفرادی صلاحیتوں کے مطابق انہیں مشورے دیتا ہے تو لازماً وہ حلقہ پھلے پھولے گا ۔ اور جب وہ اپنے کام کی ماہانہ یا سہ ماہی رپورٹ مرکز کو بھی بھیجکر اپنے مسائل میں اس سے مشورے لیتا ہے تو مرکز بھی اپنی جگہ پر اپنی ضرورت اور ضرورت کے ساتھ کچھ طاقت محسوس کرے گا اور جب یہ ہر ہر جگہ سے ہو رہا ہو تو ظاہر ہے ۔ کہ یہ طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی اور پورے ملک میں ایک منظم ادبی تحریک پھیلی ہوئی محسوس ہو گی ۔ اس چیز کا نام ادبی بیداری اور جمود کا فقدان ہے

دوسرا سبب جرائد کی کمی ہے اس کمی کو ایک منظم ادبی تحریک ہی دور کر سکتی ہے ۔ اگر ایک تحریک کے پاس ماہ بماہ بڑھنے والا بیت المال ہو ۔ تو اس کے بل بوتے پر اپنے نظریۂ ادب کے مطابق ایک جریدہ جاری کیا جا سکتا ہے جس میں اس نظریۂ ادب کا ادبی سرمایہ شائع ہوتا ہے اور نئے نئے لکھنے والوں کو لکھتے رہنے پر مجبور کیا جا سکے ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ جرائد جو ہمارے نزدیک

اس نظریۂ ادب کی اشاعت کرنے والے ہیں ان کے مدیران کرام کو متوجہ کیا جائے۔ کہ وہ اپنے جریدے کی ترتیب میں اپنے مخصوص ذوق کے لئے ایک بڑا حصہ مقرر کرکے کچھ حصہ ایسا بھی مقرر کریں۔ جو چاہے ان کے مخصوص ذوق سے مطابقت نہ رکھتا ہو لیکن مجموعی طور پر اس نظریۂ ادب کے مطابق اور معیاری ہو۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اب "مخصوص جرائد" اور "ہمارے جرائد" کی حدود کو پھاند کر ان تمام ادبی جرائد میں لکھنے کی ضرورت ہے اور مناسب ہے کہ اسلامی ادیب ان جرائد میں لکھیں جو اپنے آپ کو غیر جانبدار ثابت کرتے ہیں۔ اور کسی مہلک عصبیت میں مبتلا نہیں ہیں۔ ایسے جرائد میں ہمایوں، عالمگیر، نیرنگ خیال، الحمرا وغیرہ شامل ہیں علاوہ ازیں کئی نئے نئے نکلتے رہتے ہیں۔ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے تاکہ ہماری آواز ان حلقوں تک بھی پہنچے جو اگر اب تک ہمارے موافق نہیں ہیں تو مخالف بھی نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ چونکہ ان رسائل کے قارئین کو فحش پسندی کی لت نہیں ہے اس لئے وہ ہمارے ادب کے پاکیزہ رس اور پُروقار انداز بیان اور پُرقوت استدلال کو پسند کرسکیں گے اس طرح یہ تعطل کی کیفیت ختم ہوگی۔

تیسرا سبب ادبی کارکنوں کی سیاسی محاذ پر کھپت ہے یہ ایک مبارک کام ہے اس سے گریز ممکن نہیں لیکن یہ سبب اپنے پیچھے چند در چند نفسیاتی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ جن کی عقدہ کشائی صاحب تدبیر اور ذمہ دار لوگوں کا کام ہے اقامت دین کی جدوجہد میں مختلف محاذوں سے لوگ حصہ لے رہے ہیں۔ اس لئے کہ فوج صرف پیدل دستوں کا ہی نام نہیں ہے بلکہ ہوائی طیاروں کے بیڑے بھی اور ٹینک بھی اور گھوڑ سوار اور بحری بیڑے بھی اور متحرک کارخانہ کا مزدور بھی اور فوجی ہسپتال کا عملہ بھی۔ یہ سب ایک ہی نصب العین لے کر میدان میں آتے ہیں کہ "جنگ جیتیں" اور شاید ان کی ضرورت سے کسی کمانڈر انچیف کو بھی انکار نہ ہوگا۔ لیکن اگر کچھ دستے یہ کہنے لگیں کہ وہی صرف فوج ہیں اور باقی سب ناکارہ یا زائد از ضرورت بھرتی ہے۔ اور اس کو بالعموم مشتہر کیا جائے تو یہ دوسرے فوجیوں کے مورال (Morale) پر بہرحال ایک بُرا اثر ڈالنے والی صورت حال ہوگی۔ اقامت دین کی اس جدوجہد میں بھی مختلف محاذوں پر کام ہو رہا ہے۔ اگر بعض لوگوں کا یہ تاثر بالعموم کارکنوں میں پھیل جائے کہ کام صرف وہی کر رہے ہیں۔ اور جو لوگ ادبی محاذ پر کام کر رہے ہیں وہ تو ناکارہ ہیں اخلاقی معیار سے گرے ہوئے ہیں نکمے ہیں۔ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ کردار کے ناپختہ ہیں اور "ادیبوں" کا کیا ہے۔ یہ تو غیر ذمہ دار ہوتے ہیں اور شاعروں کا کیا ہے۔ یہ تو بوالفضول ہوتے ہی ہیں۔ تو یہ تاثر ایک محاذ کے کارکنوں کو بددل کرنے اور اپنے کام سے بے توجہ کرنے والا ہوتا ہے۔ حالانکہ اپنے رفقاء کی طرف سے حسن ظن کی اتنی قلت کا شکار حضرات سوچ سکتے ہیں کہ ادبی لحاظ پر بھی نئے نئے لوگ آتے ہیں متعرض ہو کر آتے ہیں۔ پھر متاثر ہوتے ہیں۔ پھر متفق بنتے ہیں۔ اور ایک تدریج سے اس نصب العین کی طرف آتے ہیں۔ اور دوسرے سلسلوں سے کٹ کر آنے والا جو اپنے ساتھ کمزوریاں لایا ہے وہ نہ ادیب کی طبعی کمزوریاں ہیں اور نہ ادب کی جس طرح مختلف سیاسی تحریکوں سے کٹ کر آنے والا کارکن جو اپنے ساتھ کمزوریاں لاتا ہے۔ وہ نہ آپ کی کمزوریاں شمار ہوتی ہیں اور نہ آپ کے نصب العین کی ضرورت ہے کہ اس غلط اور غیر ذمہ دارانہ روش کو ختم کیا جائے اس لئے کہ اس تاثر کی کثرت نے بھی بہت سے ادیبوں کو اپنا محاذ بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔

پھر یہ کہ ادیب کے کام کو کام سمجھا جائے۔ جب ادیب کسی جلسے میں کھونٹا نہیں گاڑتا۔ تو کارکن چیختا ہے کہ ادیب غیر کارکن ہے۔ لیکن ادیب کافی جلدکاری سے ایک مضمون کہہ کر لاتا ہے تو اس کی فراخدلی سے کبھی اجازت نہیں دیتی۔ کہ وہ کارکن صاحب سے کہے کہ "آپ چونکہ لکھ نہیں سکتے اس لئے غیر کارکن ہیں۔ حالانکہ حال یہ ہے کہ ادیب کھونٹا بھی گاڑتا ہے اور مضمون بھی لکھتا ہے۔ ادیب کو ایک کمزور درجے کا کارکن سمجھنے کے جذبے نے بھی ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ کو اپنے محاذ کی طرف سے بددل کر دیا ہے اور ان کی ادبی صلاحیتوں کو صدمہ پہنچایا ہے۔ بلاشبہ بالعموم دماغی کارکن ہونے کی وجہ سے قوت جسمانی محنت کے کاموں میں

ادیب دوسرے کارکنوں کے مقابلے میں فروتر ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ کچھ "فروتری" ان کی ایک پہلو سے اپنے دوسرے رفقا کار کے مقابلے میں "قطعی برتری" کا نتیجہ ہوتی ہے۔ البتہ بھی ادیبوں میں قابلِ لحاظ لغزشیاں پائی جائیں۔ انہیں اسی طرح محبت سے دور کرنے کی ضرورت ہے جس طرح دوسرے لوگوں کی اصلاح کرنے میں محبت کی جاتی ہے یہ ضروری ہے کہ دماغی کارکنوں کو بھی اسی نسبت سے اپنی نوع کا ایک اہم دستہ سمجھا جائے اور ان سے کام لیا جائے جس طرح دوسرے دستوں سے لیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ان کی حیثیت کو قابلِ لحاظ طور پر تسلیم کرنے اور ان کی انفرادیت کو ایک متعین حیثیت دینا بہت ضروری ہے تاکہ وہ اپنے کام کو کام سمجھ کر کریں نہ کہ ایک بیگار جس کا حاصل ان کے رفقاء کے نزدیک غیر ذمہ داری کے ایک لیبل کے سوا کچھ نہ ہو

ادبی لحاظ پر تعطل اور جمود کے ان اسباب کو سمجھے بغیر اور ان کا حل ان خطوط پر کئے بغیر خاطر خواہ نتائج کی توقع نتیجہ خیز نہ ہوگی ۔

(۲)

کچھ عرصے سے ہمارے ادبی محاذ کی سرگرمیوں پر اوس سی پڑ گئی ہے کئی پرانے لکھنے والے اول تو لکھنا ہی چھوڑ چکے ہیں۔ اور اگر لکھتے بھی ہیں تو نہ لکھنے کے برابر۔ نئے نئے موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے کی بجائے کچھ خاص میدان ہیں جنھیں "روندنے" کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے اور یہ نہیں دیکھا جا رہا کہ اس سے پہلے ان بحثوں کی کتنی بار فضا میں ہلائی جا چکی ہیں۔ مقالات اور ٹھوس قسم کی چیزیں تو خیر ہمارے ہاں اول روز ہی سے آٹے میں نمک کے برابر تھیں۔ اب افسانہ و شعر کو بھی یہ دق چمٹ چکی ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں اور شعرا کو دے کے قیادت کی ایک لکیر مل گئی ہے جسے پیٹتے پیٹتے مدتیں بیت گئیں۔ لیکن ان حضرات کا جی اس سے ابھی تک سیر نہیں ہو سکا۔

تحریک اسلامی کی دعوت اور باطل قیادت کا ابطال ہمارا فرض ہے یہ بجا لیکن سوال یہ ہے کہ اس موضوع کے تعاقب کی کوئی حد بھی ہے؟ یا اب شعر و ادب میں یہی ایک توجہ طلب عنوان باقی رہ گیا ہے؟ اس کئی بار اور مختلف اسلوبوں میں کہی جا چکنے والی بات کو کسی خاص اور جدید رنگ میں پیش کیا جاتا۔ تو بھی کوئی بات تھی لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ جو بھی اٹھتا ہے ابتدائے سخن اس سے کرتا ہے کہ "قیادت کو شاہد اور آزاد دو"

حد یہ ہے کہ اب ہماری بعض نگارشات پر چربے اور نقل کا گمان تو گزر سکتا ہے لیکن ایک مستقل ذہنی تخلیق کا نہیں۔ نعیم صدیقی کی نظم "نیا انسان" کے بعد۔ طالب حجازی کا "آدم نو" ساحر لدھیانوی کے نظم "طلوعِ اشتراکیت" کے بعد آباد شاہپوری کا "طلوعِ اسلام" اور اسی قبیل کی دوسری بے شمار چیزیں آخر کس طرح مختلف اذہان اور مختلف افراد کا نتیجۂ فکر کہی جا سکتی ہیں ؟

اس صورتِ حال سے کم از کم مجھے تو یہ ڈر لگ رہا ہے کہ کشتِ ادب میں ہماری یہ "پنیری" جو ابھی بالکل "بچپنے" میں ہے۔ عدم نگہداشت کی وجہ سے کہیں مرجھا کر ہی نہ رہ جائے بہر حال یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا اس وقت ہمارا سب سے بڑا ادبی فرض ہے ۔

میں اب تک مسلسل غور و فکر کے بعد جن نتائج تک پہنچ سکا ہوں۔ انھیں یہاں مختصر طور پر بیان کئے دیتا ہوں تاکہ ہمارے دوست حضرات بھی ان پر غور فرما سکیں ۔

مطالعہ کی کمی ۔ سب سے بڑی اور سب سے پہلی وجہ، جسے اس جمود کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے رفقا میں مطالعہ کی کمی ہے۔ میں ذاتی طور پر ایسے کتنے ہی ادیبوں کو جانتا ہوں۔ جنھوں نے جماعتی لٹریچر کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھا۔ انہیں نہ تو یہ معلوم ہے۔ کہ شعر و ادب میں قدما کی جو خدمات ہیں وہ کیا ہیں۔ اور نہ یہ کہ جدید ادبی رجحانات سے جو مواد

مطالعہ فراہم ہوجاتا ہے۔ اس میں کیا کچھ بھرا پڑا ہے؟ ظاہر ہے کہ جب نا در راہ اور راستے کی مشکلات و موانع تو جاننے کا یہ عالم ہو تو سفر کو کوئی کتنے دنوں تک جاری رکھ سکے گا بالکل ایسے ناواقف آدمی کو تو بہر حال کسی پیچیدہ منزل پر جا کر رکنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ منزل پہلے قدم پر پہنے کی بجائے دوسرے قدم پر واقع ہو۔

ہمارے پرانے لکھنے والوں کی تکان بھی اسی بات کا ثبوت ہے کہ لٹریچر پڑھنے کے بعد ذہنوں میں جو ابال اٹھا وہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو کر دیا گیا اور اس کے بعد فکری ہوا نہ پانے کی وجہ سے ادبی صلاحیت کے پیشتر شہید ہو گئے ؟

متعدد دلائل کی بنا پر میرا یہ یقین ہے کہ جب تک وسعتِ مطالعہ ادبی قوتوں کو مہمیز نہ کرے۔ ہزار درجہ پیدائشی صلاحیتیں رکھنے والے ادیب بھی اس وقت تک نئے نئے موضوعات پر نئی نئی باتیں سامنے نہیں لا سکتے۔ اس لئے اپنی ادبی تخلیقات زوردار بنانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم فکری اور ادبی اسلحہ سے پوری طرح لیس ہوں۔

تحریکِ اسلامی سے لگاؤ:۔ جمود کی دوسری بڑی وجہ۔ ہمارے ادب کا تحریکِ اسلامی سے غیر متعلق ہونا ہے۔ مجھے ان لوگوں کی رائے سے شدید اختلاف ہے۔ جو ادیب کو مرکز کی فہرست سے نکال کر کسی تحریک کے "سرپرستوں" میں شامل کر دیتے ہیں۔ بعضوں کے عواقب اڑا دینا اور کسی تحریک کا عملی کام نہ کرنا ممکن ہے کسی ادیب کو "ترقی پسندانہ ادب" تخلیق کرنے میں مدد دے۔ لیکن یہ میرا دعویٰ ہے کہ ایسا ادیب "تحریکی ادب" پیدا کرنے میں قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جس نے جاہلیت سے خود معرکے نہ لڑے ہوں۔ وہ ان معرکوں کی نقشہ کشی کیسے کر سکتا ہے؟ اور جس نے راہِ حق کے مصائب کا مزا خود نہ چکھا ہو وہ اس کی لذت اور مٹھاس کی طرف دوسروں کو ترغیب کیسے دے سکتا ہے؟ اسی نوع ادیب ہونے کا نتیجہ ہے کہ ہمارے کئی شعراء کی نظموں میں انقلاب انقلاب کے نعرے تو بڑے زور شور سے گونجتے ہیں۔ لیکن ان کا حاصل سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ قاری کے ذہن سے ٹکرا کر سوڈا واٹر کی طرح ان کا ابال خود ہی ختم ہو جائے۔

پس اگر ہمیں اپنے ادب میں گہرائی۔ فکر۔ توازن اثر اور "احساسِ زخم" پیدا کرنا ہے۔ تو اس کا واحد علاج یہ ہے کہ ہم پہلے اس تحریک کے عملی کارکن بنیں۔ جس کی طرف دعوت دینے میں ہمارے قلم بڑے تیز رفتار واقع ہوئے ہیں۔ ورنہ اضافہ کرے، نہ تو ہم دین ہی کے کام کے رہیں گے اور نہ صحیح ادبی خدمات سرانجام دینے کے قابل۔

●

اکثر "اسلام پسند" مصنفین کی نگارشات میں مقصدیت فن پر اس قدر زیادہ غالب رہتی ہے کہ وہ پارۂ ادب کی بجائے اشتہار معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم با مقصد ادیب ہیں اور ہمارے آگے ایک واضح منزل ہے لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم ادبی خصوصیات کو نظر انداز کر دیں۔ اگر ہمیں لازوال، قابلِ قبول اور دل موہ لینے والا ادب پیدا کرنا مقصود ہے تو ہمیں فن کی دلآویزی پر توجہ کرنا ہوگا۔ ادب اور تبلیغ میں فرق بھی ناگزیر ہے

اکثر نوخیز ادیب جو ہمارے ادبی مسلک سے کسی حد تک متفق ہوتے ہیں ہمارے تبلیغی انداز اور ہماری تحریروں میں ادبی حسن کی کمی فقدان کی حد تک پا کر ہماری ادبی محفلوں سے دلچسپی نہیں لیتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ادبی تحریک میں اب تک کوئی قابلِ لحاظ ترقی نہیں ہوئی۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ:۔

ا۔ ہمارے تنقید نگاروں کو کھل کر بغیر کسی لاگ لپیٹ کے تنقید کرنی چاہئے اور ہمارے ادیبوں کو اس خوش فہمی کو دور کرنا چاہئے۔ کہ بھونڈے طریقے پر مقصد کا پرچار، ادب نہیں کہلاتا۔ ایسے ادب ـــــ اگر یہ ادب ہے! ـــــ کی تخلیق

خطوط و نکات

علمائے عظ کہیں :- ایک غیر اسلامی دستور کو قوم کے سر منڈھنے کے لئے جلتے سرمایہ کاروں کی سرپرستی میں انتشار انگیزی کی جو دلچسپ اور بظاہر بڑی معصوم سی بحث اخبارات میں فرضی ناموں کی آڑ میں چل رہی ہیں ان کی تازہ کڑی ملاحظہ فضل احمد صاحب پانی پتی کا مراسلہ ہے جو آفاق مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۵۳ء میں " علمائے کرام کیا چاہتے ہیں " کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مراسلے میں جس " نظریۂ اصلاح " کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں تو ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے۔ کیونکہ اس کا مفصل جواب مولینا عبدالرشید وعبدانی کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے دیا جا چکا ہے۔ البتہ چند غلط فہمیاں جو اس کے اندر کام کر رہی ہیں اس قابل ہیں کہ ان کا ازالہ کر دیا جائے :-

۱ - علماء کو وعظ کہنے کی تلقین کرتے ہوئے بار بار جماعت اسلامی کا نام سامنے لے آیا جاتا ہے حالانکہ جماعت اسلامی؟ علماء کی کوئی انجمن نہیں ہے۔ علماء کی دو بڑی تنظیمیں یہاں جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان کے نام سے موجود ہیں اور ان کے علاوہ دوسری انجمنیں بھی متعدد ہیں۔

جماعت اسلامی ، اسلامی نظام زندگی کے مخلص آرزومندوں کی ایک عوامی تنظیم ہے جس میں اگر علماء شریک ہیں تو ساتھ ہی ساتھ پروفیسر، ڈاکٹر، اطباء، صحافی، شعراء، ادبا، کلرک، لوہار، بڑھئی، کسان، مزدور اور دوسرے تمام طبقوں کے لوگ شریک ہیں۔ علماء کی تعداد اس جماعت انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کے عوام جن میں ان پڑھ بھی ہیں۔ اپنے دین کا کم سے کم اتنا علم ضرور حاصل کرتے ہیں جتنا مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے *

۲ - جماعت اسلامی کے متعلق یہ بھی واضح رہے کہ وہ صرف ایجی ٹیشن کا کام نہیں کرتی - بلکہ اس ضروری کام کے ساتھ ساتھ وہ دعوت دین اور خدمات عامہ کے کام بھی کرتی ہے اور پھر وہ تعمیر اخلاق کی مہم میں بھی برابر مصروف ہے اس کے پلیٹ فارم کی کوئی تقریر اور اس کے لٹریچر کا کوئی جز ایسا نہیں جس کا مقصود اسلامی ذہن و سیرت کی تعمیر نہ ہو۔ وہ عوام کے عقائد و خیالات بناتی ہے۔ پھر ان کو عبادات پر قائم کرتی۔ پھر ان میں اسلامی اخلاق کی حِس پیدا کرتی ہے اور اس کے بعد جو افراد سنورتے جاتے ہیں۔ ان کی قوتوں کو اصلاح کے مزید کام کے لئے منظم کرتی جاتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی ساری جماعتی تنظیم کا دارومدار اسلامی عقائد و اخلاق پر ہے لیکن یہ اس کا سالوں کا تجربہ ہے کہ اصلاح کی یہ ساری سعی نظام حکومت کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے اپنے فطری نتائج کا بمشکل دسواں حصہ رد عمل لا کے رہ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ افراد کی اصلاح کی مہم ہی کو پوری طرح بار آور بنانے کے لئے اجتماعی نظام کی اصلاح کے لئے بھی سعی و جہد کو ضروری سمجھتی ہے۔

۳ - آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ پاکستان میں یہی ایک جماعت ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے تحت اسلامی اصولوں کو نئے نئے مسائل پر منطبق کر کے فقہ کی تدوین جدید کرنے کا وسیع زاویہ نگاہ رکھتی ہے لیکن وہ قائل اجتہاد کی ہے نہ کہ اسلام کو مسخ کرنے کی :

۴ - علماء پر فرقہ بندی کا الزام جانے کن شواہد کی بنا پر لگایا گیا ہے۔ ہمارے دین سے بچھڑے ہوئے لوگوں کی یہ ایک عادت ہو گئی ہے کہ جہاں علماء کا نام زبان پر آیا تو ساتھ ہی فرقہ بندی ، فرقہ بندی کی رٹ شروع ہو گئی۔ اگر حافظ صاحب نے یہ الزام قادیانیت کے خلاف اکثریت کے رجحانات کے ظہور پر لگایا ہے تو معاف فرمایا جائے۔ یہ وہ " فرقہ بندی " نہیں ہے جس کا نعرہ بلند کر کے آپ علماء کی تحقیر کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ کو خود یہ معلوم نہیں کہ فرقہ اور فرقہ بندی کسے کہتے ہیں۔ یہاں آپ نے فرقہ بندی کی اصطلاح استعمال کر کے وہی غلطی کی ہے جو کانگریسی مسلمانوں کی سیاسی کشمکش پر فرقہ واریت کی پھبتی کسا کرتی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں مسلمان اکثریت کے ہاتھوں ستائے جو

تھے اور یہاں ایک اقلیت کے ہاتھوں مصیبت میں ہیں۔ لیکن مارے مولانا دونوں جگہ ایک ہے کہ مسلمان قوم جن کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو ایک قوم نہیں سمجھتی۔ ان کے ساتھ ملا کر زبردستی ان کو ایک قوم شمار کیا جاتا ہے اور وہ اگر اس کے خلاف کوئی آواز اٹھاتے ہیں۔ تو الزام فرقہ بندی لگا دیا جاتا ہے۔ یاد رکھئے دو متضاد عناصر کو جوڑ رکھنے کی سعی ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔

۵۔ اس انکشاف کی حقیقت بھی ہمیں معلوم ہونی چاہئے کہ علماء نے اصلاح معاشرہ کے لئے سرے سے کام کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ ذرا بتلایئے تو کہ وہ کون سے علماء ہیں اور انہوں نے کب یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اصلاح کی مساعی میں شریک نہ ہوں گے۔

۶۔ اس مراسلہ میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ علماء کو جب بھی اصلاح معاشرہ کے لئے کہا گیا تو وہ غیظ و غضب میں مبتلا ہو گئے۔ آخر یہ کیا فقرہ ہے؟ اس کا مفہوم کیا ہے؟ کیا یہ فن مبالغہ کا استعمال ہے؟ یا آیا یہ پروپیگنڈا کی تکنیک ہے؟ کیا غیظ و غضب اس کا نام ہے کہ جب کچھ لوگ دانستہ غلط پیٹ پاٹ کے کہیں تو کوئی مانگے اسرار ان کا تجزیہ کر کے حقیقت کو کھول دے اور ہر صحافی چال کا صاف صاف جواب سامنے رکھ دے؟ اس کا براہ کرم ترجمہ فرما دیجئے کہ "علماء اور ان کے حامی غیظ و غضب میں جامہ سے باہر ہو گئے"! درحقیقت ان باتوں کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ علما کا ایک مضحکہ انگیز کارٹون بنا کے آپ لوگ اپنے مراسلات میں عوام کے سامنے رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

۷۔ علماء پر ـــ اور نہ جانے کن علماء پر ـــ ایک حملہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ "وہ غنڈوں سے استمداد کر کے جا بجا قانون و انتظام کو غارت کرتے پھریں گے"۔ غنڈوں سے استمداد کی سنت تو ہمارے اکابر اور ان کی داعیانہ جماعت کی سنت ہے، اس پر کیا اعتراض؟ پھر اگر واقعی کوئی علماء ایسے تھے کہ جنہوں نے اس سنت کو اختیار کیا ہو تو تحقیق فرما لیجئے وہ ایسے ہی علماء ہوں گے جو سیاست میں مسلم لیگ کی امامت مانتے ہیں۔

آخر میں یہ گذارش ہے کہ جس مقصد کے لئے یہ کمزور حربے استعمال کئے جا رہے ہیں وہ ان باتوں سے حاصل ہونے کا نہیں۔ آخر کیوں قوتیں اور وقت اور اخبارات کے کالم اور قوم کا روپیہ اس پر ضائع کئے جا رہے ہیں۔

(نفض الرحمٰن)

نقش فریادی:- آپ شاعر ہیں اور فرض کیجئے ایک نہایت اہم موضوع پر اپنے خیالات موزوں کرنے بیٹھے ہیں۔ اشہب قلم چلتے چلتے رک جاتا ہے ہوا یہ کہ ایک شعر کا مصرعہ اول تو موجود ہے لیکن مصرعہ ثانی کسی صورت برآمد نہیں ہوتا۔ یکایک ایک مصرعہ برجستہ معانی و بلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ذہن سے کود کر باہر آ جاتا ہے۔ آپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ جامے میں پھولے نہ سمائیں گے۔ جھٹ لکھ لیں گے۔ پھر بار بار جھوم جھوم کر پڑھیں گے۔ اپنی طبع رسا کی کامیابی پر ناز فرمائیں گے۔ اور اس الہام غیبی پر دل ہی دل میں علام الغیوب کا شکر بھی ادا کریں گے۔ حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کرسی پر بیٹھے سر کھجلا رہے تھے یا گردن جھکائے تکیے سے ٹیک لگائے بحر سخن کی تھاہ گہرائیوں میں گم تھے۔ مگر گوہر مقصود دامن میں نہ پڑتا تھا۔ یا ایک اضطراری حالت میں صحن میں ٹہل رہے تھے۔ لیکن رشتۂ معنی کچھ ایسا گم تھا کہ ہاتھ نہیں آتا تھا۔ بلاشبہ اچھے شعر کی تخلیق اور ایک کامیاب نظم کی ترتیب شاعر کے لئے بے پایاں مسرت کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک شاعر کی پریشانی اور دل گرانی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ جب اتنی محنت، بڑھی اور جگر کاوی سے تیار کی ہوئی اس کی نظم یا غزل کسی رسالے میں شائع ہو لیکن اشعار یا مصرعوں کی ترتیب وغیرہ بدل کر اس کی صورت اور ہیئت مسخ کر دی جائے۔ راقم الحروف بھی اس وقت کچھ اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہے۔ "چراغ راہ" کے اکتوبر کے شمارے میں "انقلاب مصر" کو دیکھئے یہ پوری نظم ایک نقش فریادی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو اپنے پیرہن کاغذی میں سراپا فغاں نظر آ رہی ہے۔ غضب خدا کا اچھی بھلی نظم جو روانی اور تاثر میں کامیاب، صاف اور سپاٹ چل جا رہی تھی۔ آخر میں ربط اور تسلسل سے محروم کر دی گئی۔ قاری جب "آج پھر توحید کا پرچم اٹھانا ہے تمہیں" پر پہنچتا ہے تو مخاطب کو ڈھونڈنے لگتا ہے اور مخاطب ہیں کہ نظم سے باہر آخری بند میں دھکیل دئے گئے ہیں۔ اس نظم کو دیکھتا ہوں اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ نہیں معلوم میری اس تخلیق عزیز کا خون کس کی گردن پر ہے اور مجھے کہیں جا کر کس عدالت میں اپنا استغاثہ لے جاؤں۔ بہرحال قارئین محترم سے درخواست ہے کہ صفحہ ۵۹ کے آخری اور صفحہ ۶۰ کے پہلے بند کو حسب ترتیب

زبان اور دستاں بند شمار کیا جائے۔

"نیا قانون دول" کا حال بھی عجیب ہے۔ جناب کاتب کے قلمی تصرفات نے ایک طرف شعر ثانی کے مصرعۂ اولیٰ کو عروض کی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے تو دوسری طرف آخری شعر میں تقاضا ساگر کو ساغر بنا کر کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اگر آں جناب کی مشق ناز کا یہی عالم رہا۔ تو ہماری نگارشات کی معصوم جانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔ ضیا محمد ضیا

●

میں پچھلے چند دنوں سے علیل چلا آرہا ہوں۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اکتوبر کے شمارے کی کاپیاں بھی اطمینان سے نہیں پڑھی جا سکیں۔ اب طبیعت سنبھل رہی ہے۔ لیکن ابھی تک میں کام کرنے کے قابل نہیں ہوا۔ چنانچہ نومبر کا شمارہ بھی میں خود ترتیب نہیں دے رہا۔ صرف اس میں میرے مشورے شامل ہیں۔ میں ضیا صاحب سے معذرت خواہ ہوں کہ اُن کی تخلیقات عزیز اس بُری طرح مجروح ہوئیں —— البتہ شعر ثانی کے مصرعۂ اولیٰ میں کچھ تصرف کرنا پڑا۔ لیکن اس میں بھی کاتب صاحب نے "ہے" اپنی طرف سے بڑھا دی۔ (ن۔ م)

بقیہ صفحہ ۴۵

سے ہم اپنے پڑھنے لکھنے والوں کے حلقے کو روز بروز تنگ کرتے چلے جائیں گے۔

۲۔ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ ہمارے کہنہ مشق ادیب ادبی محفلوں کی آراستگی میں خاص حکمت عملی کو اختیار کریں۔ انہیں کرنا یہ چاہیئے کہ ابھی کچھ عرصہ تک "حلقۂ ادب اسلامی" کے لیبل کے بغیر ادبی اجتماعات منعقد کر لیا۔ ان اجتماعات میں نوخیز اور اُن تمام ادیبوں کو لانے کی کوشش کریں جو ادب میں ابھی کسی خاص مکتبِ فکر سے وابستہ نہ ہوں اور ابھی جن کے فکر و قلم میں پختگی نہ آئی ہو ایسے ادیبوں کو اپنی نگارشات سنانے کا موقع دیں اور ان پر اپنے نقطۂ نظر سے پہلے ادبی حیثیت پر پھر مقصد پر تنقید کریں۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ انہیں اپنے مسلک سے متفق کر کے اپنی تحریک میں جذب کر لیں۔ میں نے اکثر ہمارے ادیبوں کو —— جو ادیب کم اور سیاسی کارکن زیادہ ہیں۔ دیکھا ہے کہ وہ ادبی پہلو پر غور نہیں کرتے بلکہ نوخیز ادیبوں کو مسلک کی بحث میں الجھا کر ادب اسلامی سے بدظن کر دیتے ہیں۔ میری رائے میں ابھی وہ دور نہیں آیا کہ ہم علی الاعلان "حلقۂ ادب اسلامی" یا اسی نوعیت کی کسی اور انجمن کے نام پر ادیبوں کو مجتمع کریں

۳۔ جیسا کہ میں اُوپر لکھ چکا ہوں —— ہمارے ادیب، ادیب کم اور سیاسی کارکن زیادہ ہیں۔ —— اس حقیقت کے پیشِ نظر ڈر ہے کہ ارباب اقتدار "حلقۂ ادب اسلامی" کو سیاسی ادارہ قرار دے دیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ یقیناً ہماری ادبی تحریک کے لئے جان لیوا ثابت ہوگا۔

۴۔ مجھے "اسلام پسند" کی اصطلاح سے بھی اختلاف ہے۔ اس اصطلاح سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے یہ اصطلاح "ترقی پسند" کی تقلید میں استعمال کی ہے جو ذہنی مرعوبیت کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں "ترقی پسند" سے رقیبانہ تعلق ہے جس سے ہماری تحریک کا مقصد اثباتی سے زیادہ سلبی قرار دیا ہے۔ اس کا ثبوت ہمارے ادیبوں کی نگارشات سے بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

بقیہ صفحہ ۳۶ جب نگاہ تاریخ پر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ داعیانِ خیر کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ خود ہمارے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک تاریخی حقیقت کے بیان کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ ایسے چشمہ ہائے خیر کبھی چند کنکروں اور خزف ریزوں سے بند نہیں ہوتے۔ ان کے سوتے سطح زمین کے اوپر نہیں پاتال میں ہوتے ہیں جہاں ان حقیر کنکروں کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔

تن درستی
اور
چہرے کا قدرتی حسن
عمدہ وصاف خون
کا آئینہ دار ہے
موسموں کی تبدیلی کے وقت بالخصوص موسم بہار
اور برسات میں خون کمزور اور ناصاف ہو جاتا ہے اور
انسان پھوڑے پھنسیوں، خارش، داد، اگزیما
اور دوسری خون کی بیماریوں اور کمزوری کا شکار
ہو جاتا ہے،
صافی نہ صرف خون کو صاف کرتی ہے
بلکہ اُسے طاقت ور بناتی ہے انسان کو چست اور
صحت مند رکھتی ہے صافی کو استعمال میں رکھنے
والے امراض سے محفوظ رہتے ہیں اور مریض جلد
مرض سے نجات پاتے ہیں
صافی بچے، بڑے اور عورت مرد سب استعمال
کر سکتے ہیں
صافی قبض نہیں رہنے دیتی ۔
صافی
ہمدرد دواخانہ، کراچی

چراغ راہ کے لئے

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:-

مکتبۂ نشأۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد دکن (ہند)
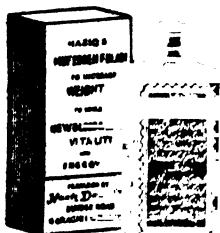
اپنی طاقت کی حفاظت کریں
جب آپ کی صحت کمزور ہو اور جسم میں خون کم ہو تو
مشہور عالم
مفرّح فولادی
استعمال کریں۔ آپ کو معلوم ہوجائے گا۔ کہ یہ مقوی اور
مقوی دوا آپ کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کھوئی
ہوئی توانائی واپس لاتی ہے۔
قیمت فی شیشی:۔۔۔۔۔۔۔ دو روپے آٹھ آنے
الٰہی زمین معدہ من سرنجان۔ دگر ہر چہ رنجیدہ رنجیدہ باشد
معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے
کہیں ....
معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کر دیں۔
HAZMEE
caused by
STOMACH DISORDERS
ہاضمی
ایک بہترین سفوف معدہ ہے جو فعل ہضم کو قدرتی طور پر کام
کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور معدہ کو ہر خرابی سے محفوظ رکھتا ہے حفظ ماتقدم
علاج سے بہتر ہے اس لئے ہاضمی کا استعمال کیجئے۔ تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے۔ مرد اور عورت دونوں کیلئے یکساں مفید ہے
قیمت فی شیشی:۔۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ چار آنے
تیار کردہ:- حاذق دواخانہ بندر روڈ۔ کراچی ۱

• ـــــــ قرآن بہت آسان ہے

• ـــــــ قرآن بہت مشکل ہے

دونوں ہی باتیں اپنی جگہ درست ہیں

ان میں کوئی تضاد نہیں ہے

اس حقیقت کو مولینا امین احسن اصلاحی نے اپنی گراں بہا تصنیف

"تدبّر قرآن"

میں علمی و تحقیقی انداز سے نمایاں کیا ہے

اور یہ بھی بتایا ہے کہ :-

قرآن مجید میں تدبر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ ـــــــ اس کام میں کن آداب و شرائط کا اہتمام ضروری ہے۔ تفسیر کی کتابوں میں سے کون سی کتابیں کس حد تک مفید ہیں؟ عربی ادب کی کس درجہ کی استعداد قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے؟ لغت کی کون سی کتاب مطالعۂ قرآن کے وقت پیش نظر رکھنی چاہئے۔ نحو، بلاغت، تاریخ اور حدیث سے قرآن مجید کو کس حد تک تعلق ہے۔؟

دوسرا ایڈیشن۔ ترمیم و اضافے کے ساتھ۔ قیمت ۴/۔/۳

مکتبۂ چراغِ راہ ۹۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

غلام محمد پرنٹر و پبلشر نے [illegible] پرنٹنگ پریس سے طبع کرا کر شائع کیا

چراغِ راہ کراچی

اسلامی ادب کا علمبردار

دسمبر ۱۹۵۲ء

جلد ۵ ——— شمارہ ۱۲

قیمت ۸/

سالانہ چندہ

پاکستان	بھارت
۵ روپے	۶/

مندرجات

دفتر چراغ راہ ۹ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

غلام محمد نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

سوچ بچار

خیر خواہانہ انتباہ

۱۴ اگست کی صبح کے ظہور کے ساتھ دستوری مطالبے کا خاص ہفتہ منانے کا پاکستان گیر پروگرام ختم ہوگیا۔

تعریف اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے جس نے حق کی آواز کو، جس آواز پر تحقیر کے ساتھ یہ پھبتیاں کسی جاتی تھیں کہ یہ چند ملاؤں کا اٹھایا ہوا فتنہ ہے، چند رجعت پسندوں کا ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔ پاکستان کے کچھ غداروں اور دشمن کے جاسوسوں کا بے جان ہلڑ ہے۔ اقتدار سے محروم رہ جانے والے مذہبی سرپھروں کا ایک حاسدانہ طوفان ہے۔ پاکستان کے کونے کونے سے بلند کرا دیا ہے۔ آج بنگالی یہی بولی بول رہا ہے آج سرحد یہی نغمہ الاپ رہا ہے۔ آج سندھ بھی نعرہ بلند کر رہا ہے۔ آج بلوچستان یہی بانگ لگا رہا ہے۔ اور آج پنجاب یہی اذان پکار رہا ہے۔ آج یہ جرس ہمارے پورے ملی کارواں کا جرس بن گیا ہے۔ آج کوئی شہر ایسا نہیں رہا۔ کوئی قصبہ ایسا نہیں چھوٹا۔ کوئی کوردہ ایسا باقی نہیں رہا جس نے ۹ نکاتی مطالبے کے پلڑے میں اپنا وزن نہ ڈال دیا ہو۔ آج اس ملک کی تمام دینی جماعتیں اور تمام مذہبی فرقے اپنے سارے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر تحریک نظامِ اسلامی کا نغمہ الاپنے کے لئے ایک ہی ساز کے تار بن گئے ہیں۔ اور ہر تار میں سے ایک ہی سُر بول رہا ہے آج قوم نے اپنے مطالبے کی پشت پر اپنے جوانوں کو اور اپنے بوڑھوں کو، اپنے مردوں کو اور اپنی خواتین کو، اپنے علماء کو اور اپنے عامیوں کو، اپنے تعلیم یافتہ افراد کو اور اپنے اَن پڑھ شہریوں کو اسی طرح جمع کر دکھایا ہے۔ جس طرح ایک مرتبہ اس نے مطالبہ پاکستان کی پشت پر جمع کر دکھایا تھا۔

گذشتہ چند ماہ میں اور خصوصاً اس دستوری ہفتے میں اسلامی دستور کی عوامی تمنا جتنے جلسوں، جتنے ریزولیوشنوں، جتنے محضر ناموں، جتنے تاروں اور کارڈوں اور جتنے اعلیٰ درجہ کے جلوسوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس نے یہ حقیقت کھول دی ہے کہ پاکستان کے باشندوں کی ننانوے فی صدی اکثریت شعور کے ساتھ بھی اور جذبات کے ساتھ بھی اپنے اوپر ایک اسلامی دستور کا نفاذ چاہتی ہے۔ اور کسی قیمت پر بھی اپنی زندگیوں کی باگ ڈور ایک غیر اسلامی دستور کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہے جمہور کی طرف سے ۹ نکاتی مطالبے کے حق میں جذبات کا جو اجتماعی اظہار اس دستوری ہفتے میں ہوا ہے۔ وہ ہمارے حکمرانوں اور دستور سازوں پر یہ حقیقت کھول دینے کے لئے کافی ہے کہ ۹ نکاتی مطالبے کے خلاف اگر کوئی دستور یہاں نافذ کیا جائے تو اس کے چاہنے والی صرف وہ ایک فی صدی کی حقیر اقلیت ہے۔ جو خود ان حضرات اور ان کے ساتھ مفادو اغراض کے رو پہلے کچے تاروں سے بندھے ہوئے بورژوا کلاس اور اپر مڈل کلاس کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس ایک فی صدی کی اقلیت کا حال یہ ہے۔ کہ اس نے اسلام کا سرے سے کبھی سنجیدہ مطالعہ کیا ہی نہیں۔ اس اقلیت کے اندر اگرچہ نام مسلمانوں ہی کے پائے جاتے ہیں۔ مگر افسوس کہ یہ اسلام پر ایمان رکھنے سے محروم ہو چکی ہے یہ اپنے قلوب کی گہرائیوں میں درحقیقت تبدیل دین کر چکی ہے۔ ہاں! یہ وہ اقلیت ہے جو عوام کے مطالبہ اسلامی کو اپنے سیاسی اور معاشی اقتدار کے تخت پر بیٹھ کر بڑی حقارت سے دیکھتی ہے۔ یہ اسلامی نظام کی ہر آواز پر پھبتیاں کستی ہے۔ اسے دلائل سے مطمئن کرنے کے لئے جو لٹریچر سامنے لایا جاتا ہے یہ اپنے مجنونانہ تعصب کی وجہ سے اس لٹریچر پر نگاہ تک ڈالنے کی روادار نہیں ہے۔ اس سے جب کبھی اسلام کے موضوع پر گفتگو چھیڑی جاتی ہے تو یہ مخاطب کو ملا اور رجعت پسند کے خطابات کے ہتھیاروں سے شکست دینے کی کوشش کرتی ہے یہ اقلیت ایسا پتھر بنتی جا رہی ہے جس کو کسی طرف سے جونک نہیں لگ سکتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ اقلیت ملک کی ننانوے فیصدی اکثریت کے خلاف آہستہ آہستہ ایک جنگ لڑنے کے

ثل رہی ہے ۔

اس اقلیت کو کامیاب دستوری ہفتے کے پاکستان گیر واقعہ کی طرف متوجہ کر کے ہم اس موقعہ پر تنبیہ کر دینا چاہتے ہیں کہ آپ عوام سے بیگانہ ہو ایک عالم بالا میں بس کر کبر و نخوت کے تخت پر سرمست پندار ہو کر علحدگی پسندی کے خول میں سمٹ کر اس اکثریت کی تمناؤں کا مذاق اڑا کر اور اس کے جذبات کو کچل روند کر اپنا مانا نظام ایک دن کے لئے بھی نہیں چلا سکتے ۔ آج اس دنیا میں انسان گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے جمہوریت کی منزل پر آ گیا ہے ۔ اور اس منزل میں کسی کا اقتدار بغیر اس کے نہیں چل سکتا کہ وہ یا تو رائے عام کو دلائل سے قائل کرے یا فریب سے رام کرے ، رائے عام سے لڑنے والوں کے آپ کے سامنے پرخچے اڑ رہے ہیں ۔ آپ ایران کے حالات سے سبق لیجئے ۔ جہاں رائے عام کو پامال کرنے والی وزارت کا سربراہ کار موت کی گھڑیاں گن رہا ہے ۔ آپ کو مصر سے سبق لینا چاہئے ۔ جہاں شہنشاہ اور جاہ و بادشاہت کی جڑیں فوج کے ہاتھوں کی ایک جنبش نے نوچ کے پرے رکھ دیں ۔ آپ کو انڈونیشیا سے سبق لینا چاہئے جہاں کے عوامی تقاضوں نے حکومت کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ آپ کو شرق اردن سے سبق لینا چاہئے جہاں کے مظاہرین پر جب پولیس کو گولی چلانے کے لئے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ ہم اپنے بھائیوں پر ہاتھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں ۔

آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ پاکستان ۱۹۴۱ء کا جرمنی نہیں ہے کہ یہاں ہٹلرازم چل سکے ۔ آپ کو جاننا چاہئے کہ زمانہ اس سے بہت آگے نکل چکا ہے کہ اس سرزمین کو اس طرح کا ترکی سمجھا جائے جس نے مصطفےٰ کمال کو پہنپنے دیا ۔ یہاں ترکی نہیں بن سکتا اور یہاں کسی کے لئے مصطفےٰ کمال بننے کا موقع نہیں ہے ۔

ہم اس ایک فی صدی اقلیت کو بتائے دیتے ہیں کہ تمہارا اقتدار حد درجہ کمزور ہو چکا ہے ۔ یہ بظاہر ایک اونچا سا مینار جو قطب صاحب کی لاٹ بنا کر کھڑا نظر آتا ہے اس کے نیچے بنیاد اتنی کھوکھلی ہو چکی ہے کہ کدالوں سے نہیں ، اگر سوئیوں اور پنوں کے ذریعے بھی کوئی اس کے نیچے سے ذرا سی مٹی کھرچ کر نکال لے تو قطب صاحب کی یہ لاٹھ زمین پر آ رہے گی ۔ بس مٹی اور ریت کے چند ذرے ہیں کہ جو یہ بوجھ اٹھائے کھڑے ہیں ذروں میں اگر ذرا سا تول بدل بھی ہو جائے اور توازن جو قسمت سے قائم ہے ۔ یہ ذرا بھی درہم برہم ہو جائے تو پھر خیر نہیں ۔ آپ کے عوام جو آج سے تین سال پہلے آپ سے اندھی عقیدت رکھتے تھے ۔ آج ان کے حلقوں میں آپ کے لئے ٹوٹا پھوٹا سا کوئی کلمہ خیر کہنے والا بھی باقی نہیں رہا ۔ ان پیچیدہ اور مشکل مسائل سے وہ پاکستان بننے کے بعد مسلسل دوچار رہے ہیں ۔ ان میں سے کسی مشکل گتھی آپ کے ناخن تدبیر سے سلجھ نہ سکی بلکہ مسئلے میں روز بروز نئی گرہیں ہیں ۔ کہ آپ کے ہاتھوں سے پڑتی جا رہی ہیں ۔ مہاجرین کا مسئلہ ہو یا کشمیر کا ۔ اقتصادی تعمیر کا معاملہ ہو یا غذائی قلت دور کرنے کا ۔ تعلیم کا جھمیلہ ہو یا قومی صحت کا ، تجارتی توازن کا سوال ہو یا صنعتی پالیسی کا ، نہری پانی کا جھگڑا ہو یا اموال متروکہ کی الاٹمنٹ کا مزارعین کا قضیہ ہو یا مزدوروں کا ۔۔۔ ان میں سے کوئی ایک گتھی نہیں کہ جسے آپ خوش اسلوبی سے سلجھا سکے ہوں ۔ پھر آخر قوم محض آپ کی تقریروں اور چھپی ہوئی تقریروں ، محض آپ کی تصویروں اور نت شائع ہونے والی تصویروں ، مینا بازاروں ، اور جا بجا لگنے والے مینا بازاروں ، جشنوں اور ان دھوم دھڑکے سے بھرے جشنوں کے بل پر کہاں تک اپنی عقیدتوں کو برقرار رکھ سکتی ہے ۔

اندریں حالات اب صرف ایک ہی چانس آپ کے لئے باقی ہے وہ دستور کے بارے میں آپ کے فیصلے کا چانس ہے ۔ دستور کے بارے میں بھی آپ کا رویہ یہ رہا ہے کہ آپ نے ٹال مٹول کی ۔ اور پانچ برس کی ۔ آپ نے قوم کو غچہ دینے کی کوششیں کیں ۔ اور بار بار کیں ۔ اور اس نے انتشار پھیلانے کی تدابیر اختیار کیں ۔ اور گوناگوں کیں ۔ تاہم ایک موقعہ اور باقی ہے ۔ قوم ایک مرتبہ آپ کی دستوری سفارشات رد کر چکی ہے اب دستوری سفارشات کی منتظر ہے ۔ آپ کی قسمت کا فیصلہ اب اسی پر منحصر ہے ۔ کہ یہ دستوری سفارشات آپ کس نوعیت کی لاتے ہیں ۔ قوم کی چھ سالہ اور ہزار سال کی بے چین تمناؤں کے مطابق لاتے ہیں ۔ یا ان کے خلاف لاتے ہیں ؟ اسلام لاتے ہیں یا کفر لاتے ہیں ؟ خلوص کے ساتھ

لاتے ہیں۔ یا فریب کا مادہ خوشکن الفاظ کے ساتھ لاتے ہیں۔ یا ایک بکھری ہوئی چیز لاسکتے ہیں۔ یا کوئی معجون مرکب بناکر لاسکتے ہیں۔ یقین جانئے کہ آج ایک ایک پاکستانی شہری کے ہاتھوں میں ۸ نکاتی مطالبے کی کسوٹی موجود ہے اور وہ ایوانِ دستور یہ پر نگاہیں جمائے منتظر ہے کہ کب کیا فیصلے سے باہر آتی ہے۔ جو چیز بھی آپ لائیں گے ۸ نکاتی مطالبے کی کسوٹی بتا دے گی کہ یہ خالص سونا ہے یا سونے میں پیتل کی ملاوٹ ہے، یا نرا پیتل ہے کہ جسے سونے کے نام سے پیش کر دیا گیا ہے ؛ قوم اب جاگ رہی ہے اور کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ دستور کے معمار اسے کس موڑ مڑتے ہیں۔ یہ موڑ اگر آپ اسلام کے رخ مڑے تو توقع ہے کہ قوم آپ کے سابق گناہوں اور سابق کوتاہیوں کو معاف کر کے آپ کو کچھ مدت کے لئے مزید مہلت کار دے دے۔ اور اگر یہ موڑ آپ کسی دوسری طرف مڑ گئے۔ تو قوم آپ کے پیچھے ہرگز ایک غلط موڑ مڑنے پر تیار نہ ہو گی۔ یہ قوم اب ایسی جگہ پہنچ چکی ہے کہ آپ کی امامت کو اسی صورت میں گوارا کر سکتی ہے کہ آپ اپنی پیشانی خدا کے حضور جھکانے کے لئے امامت کے مصلے پر کھڑے ہوں۔ لیکن اگر قد قامت الصلوٰۃ کہا گیا اور آپ نے اپنا سر نیاز کسی بت کے سامنے خم کر دیا۔ تو پھر ایسی نماز کے لئے آپ کو یہاں سے کوئی مقتدی نہ ملے گا۔ پیچھے جب پلٹ کے آپ دیکھیں گے تو سماں یہ ہو گا کہ صفیں خالی ہوں گی۔ ایک غیر اسلامی دستور کے تخت پر آپ بڑے لال بن کے چل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں آپ یوسف بے کارواں ہوں گے ؛

اس آخری چانس کو آپ نے اگر کھو دیا تو پھر آپ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو اپنی موجودہ حیثیت پر جمائے رکھنے کے لئے یہ کر سکتے ہیں کہ کھلم کھلا چنگیز بن جائیں۔ مگر کوئی چنگیز جبر کی تلوار کے زور سے کتنا ہی اونچا تخت قصرِ شاہی میں بچھا لے کسی دل کے اندر اس کا تخت نہیں بچھ سکتا۔ ایسی حالت میں آپ عوام کو جلسوں میں بلائیں گے اور کوئی نہ آئے گا۔ آپ خطاب کریں گے۔ اور سننے والے کان نہ ہوں گے۔ آپ پکاریں گے تو آپ کو دیواروں سے ٹکرا کر واپس آنے والی اپنی ہی آواز کے سوا لبیک کی کوئی صدا سنائی نہ دے گی۔ آپ کو کوئی سلامی دینے والا نہ ہو گا۔ آپ کے سامنے کوئی ایڈریس پڑھنے والا نہ ہو گا۔ آپ کے لئے کلمۂ خیر کہنے کے لئے کوئی زبان باقی نہ رہے گی۔ آپ کے لئے کسی دل میں عزت نہ رہے گی۔ آپ کی کسی اپیل میں کوئی اثر نہ رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں آپ اپنے اقتدار کے محل میں محصور اور تقریباً ہو کے رہ جائیں گے کیا ایسی حالت میں حکومت چلائی جا سکتی ہے۔ بلکہ کیا ایسی حالت میں جیا بھی جا سکتا ہے ؟

پس اس آخری چانس کی نزاکت کو محسوس فرمایئے اور اس خطرناک موڑ سے بچ نکلئے جس پر آپ کھڑے ہیں۔ یہ ایک انتہائی خیر اندیشانہ مشورہ ہے کیا معلوم کہ یہ خیر خواہی بھی امنِ عامہ میں خلل اندازی کی ہم معنی قرار پائے؛ ہے۔ اگر آپ اس کو قبول فرمالیں تو اس میں آپ کی، ملک و قوم اور خدا و رسول کے دین کی بھلائی ہے۔ اور اگر آپ اس کو رد کر کے کوئی اور تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجئے۔ آپ کو اپنی طاقتوں پر بڑا بھروسہ ہو گا۔ مگر ہم جس خدا کے دین کا علم بلند کر رہے ہیں، یقین جانئے کہ وہ خدا دنیا پر کسی آرامگاہ میں سویا نہیں پڑا ہے۔ بلکہ بیدار ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے اور ایک ایک چیز پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ وہ اپاہج خدا نہیں ہے بلکہ غیر محدود طاقتوں کا مالک ہے وہ بے بس اور عاجز نہیں ہے بلکہ مالک الملک ہے۔ وہ کفر و دین کی کشمکش میں غیر جانبدار تماشائی نہیں ہے بلکہ اس نے اعلان کیا ہے کہ " اللہ ولی الذین آمنوا "۔ اس خدا نے کسی سے کبھی شکست نہیں کھائی بلکہ اس کا دعوے یہ ہے کہ لاغلبن انا و رسلی۔ یعنی میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔ اور اس نے طے کر دیا ہے۔ کہ کلمۃ اللہ ھی العلیا : اللہ کا کلمہ سربلند ہو کے رہنے کے لئے ہے !

(۲۲ نومبر)

النواء

"دستوری سفارشات" کا دوسرا ایڈیشن ۲۲ نومبر کو دستور یہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے بڑے طنطنے سے جو اعلان ایک عرصے

ہوتا تھا - اس کے بجائے یہ ایڈیشن پیش کرنے سے بنیادی اصولوں کی کیفیت معذور رہ گئی ۔

اس سلسلے میں ظاہری رکھ رکھاؤ کے لئے جو بھی وجوہ بیان کئے گئے ہوں ہم ان کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھتے - تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ یہ ۲۲ نکاتی مطالبے کے محاذ کی ایک کامیابی ہے - چونکہ راستے اب دو ہی باقی تھے - ایک یہ کہ حکمراں طاقت کو جو من مانا دستور قوم پر مسلط کرنا تھا۔ لئے عوام کو کچل کر وہ اسے ملک پر مسلط کر دیتی - دوسرا یہ کہ وہ ہوا کے رخ کا لحاظ کرتے ہوئے اس مہلک اقدام سے باز رہ جاتی - الحمد للہ اس نے فیصلے کا قدم اٹھانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اچھی طرح سوچ لینا مناسب سمجھا ہے - یہ دستوریہ کی ایک مبارک پسپائی ہے اور ہم اس پر صدقِ دل سے مبارک باد کہتے ہیں۔ کتنے بڑے معاملات میں کسی اقدام سے پہلے ٹھنڈے دل سے بار بار سوچ لینا ہی موزوں ہے۔

مگر یہ ہم بالکل نہیں جانتے کہ قدم کس نیت سے پیچھے ہٹایا گیا ہے - آیا ایک مرتبہ پھر التوا کی مجرب پالیسی کو آزمانا پیش نظر ہے یا خدانخواستہ منصوبے یہ ہیں کہ اس ایک ماہ کے وقفے میں اسلامی دستور کے محاذ کو توڑنے کے لئے تیاریاں کر لی جائیں - نیز یہ کہ ادھر اُدھر کے ٹکڑوں پر ہاتھ ڈال کر دیکھا جائے کہ کون کس حد تک سہارا بننے کے لئے تیار ہے - بہت ہی خفیف امکان اس بات کا بھی ہے کہ اس کام کے گوشے گوشے سے اٹھتے ہوئے طوفان کو دیکھ کر یہ عقلمندانہ فیصلہ کیا گیا ہو - کہ دستوری سفارشات کو ۲۲ نکاتی مطالبے کے مطابق ڈھال دیا جائے ۔

یہ ساری صورتیں امکانی ہیں - لیکن حالات کی خارجی شہادت حوصلہ افزا نہیں ہے - واقعات کے حسب ذیل پہلو خصوصیت سے قابل غور ہیں:۔

(۱) تحریکِ اسلامی اور ۲۲ نکاتی مطالبے کے دو علمبردار جرائد یعنی ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور اور سہ روزہ کوثر لاہور سے اور جن پریسوں میں وہ چھپتے تھے ان کی سابق ضمانتیں ضبط کر کے نئی بھاری ضمانتیں طلب کی گئی ہیں - اور یہ منحوس قدم واپس بہرحال نہیں لیا گیا ہے ۔

(۲) کراچی میں جو اس وقت ۲۲ نکاتی مطالبے کی تحریک کا مرکزِ اعصاب بن گیا ہے دفعہ ۱۴۴ لگا کر جن عزائم کا ثبوت دیا گیا ہے وہ پسندیدہ نہیں ہیں ۔

(۳) "جماعت اسلامی پر ایک نظر" کے عنوان سے کرائے کے لکھنے والوں کے ہاتھوں جو انتشار انگیز کتاب میدان میں لائی گئی ہے وہ اچھی نیتوں کی ترجمان نہیں ہے ۔

(۴) لاہور کے اخبارات میں یکایک جو انتشار انگیز اداریے لکھوانے کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے - یہ بھی دل و دماغ کی اچھی تبدیلی کا ثبوت نہیں ہے ۔

اندریں حالات ہمارے سامنے ایک طرف التوا کی پالیسی کا خطرہ ہے - اور دوسری طرف انتشار کی مہم کا کہ جس کے لئے ایک مہینے کا استعمال کرنا پیش نظر رکھا ہے - ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام بھی اس ایک مہینے میں غافل نہ ہوں - اور سو نہ جائیں - بلکہ اپنے محاذ کو مضبوط رکھیں اور اپنی آواز کو کمزور نہ ہونے دیں - اور انتشار انگیزی کی مہم سے اثر پذیر نہ ہوں - نیز ان حضرات کو اپنے اندر سے کوئی ایسا تنکا فراہم نہ کر کے دیں - جو چند ڈوبنے والوں کیلئے بھی ان کے لئے سہارا بن سکے - اس طرح انشاء اللہ ۲۲ دسمبر تک غیر اسلامی دستوری سفارشات لانے کی رہی سہی جرات بھی ختم ہو جائے گی۔ حسبنا اللہ ونعم المولیٰ ونعم الوکیل (۲۳ نومبر)

کچھ اپنی باتیں

مرتب چراغ راہ کے ذمے کچھ ایسے گوناگوں فرائض کا بار ہے کہ وہ اپنا کوئی سے کا پورا وقت چراغ راہ کو کبھی نہیں دے سکا - تاہم دوسری ذمہ داریوں کو

دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس نے چراغِ راہ کی ترقی اور بہتری کے لئے اپنے قلم سے کام لینے اور دن رات سوچتے رہنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن ادھر بیماری کا ایک حملہ ایسا ہوا کہ ایک عرصہ تک چراغِ راہ کی خدمت کا حق ادا کرنا ممکن نہ رہا۔ اس دوران میں ایک طرف خط و کتابت کا سلسلہ تعطل میں پڑ گیا اور جواب طلب خطوط جمع ہوتے رہے۔ دوسری طرف ترتیب کا معیار گرا۔ تیسری طرف کتابت و طباعت پہلے سے ابتر ہو کے رہ گئی۔ کتابت شدہ کاپیاں دیکھنے کے جن رفقاء کو تکلیف دی گئی انہوں نے اپنی طرف سے بڑی محنت سے کام لیا ہوگا لیکن اغلاط کی کثرت نے پرچے کا دامن بہرحال داغ داغ کر دیا۔ اس سے قارئین ہی کو تکلیف نہ پہنچی بلکہ کتنے ہی قلمی معاونین کے جذبات مجروح ہوئے ——— ان میں ضیا محمد ضیا اور جیلانی بی اے کا حال تو بہت ہی قابلِ رحم ہو رہا۔ اب بہرحال مرتب یہ دعا کرتے ہوئے پھر اپنی ذمہ داریاں سنبھال رہا ہے کہ خدا حسن و خوبی کے ساتھ ادائے فرائض کی توفیق دے۔ اور چراغِ راہ کو تحریکِ اقامتِ دین کا ایک مجاہد بے باک بنائے اور اس کے ذریعہ اس ادبی شاہراہ فکر کو اجاگر کرے جو کاندھواں شعر و ادب کو اسلام کی قدروں کی طرف لے جانے والی ہے۔

●

اسی زمانے میں جیلانی بی اے کا ایک شاہکار چارلس ڈبلیو ڈکنس کا گیس ہمارے ہاں شائع ہوا ہے جس نے اپنے ایک نوٹ میں محض اندازے سے طبع زاد قرار دیا تھا کیوں کہ اس کا عنوان، اس کا خاکہ، اس کی زبان، اس کا نقشہ، مدعا اور اس کا مجموعی مزاج تھا ہی ایسا کہ بمشکل کوئی یہ تصور کر سکتا کہ اسے پنجاب کے ایک ادیب نے ضلع لائلپور کے ایک گاؤں چک ۔۔۔ میں بیٹھ کر ایک طبع زاد ادب پارے کی حیثیت سے لکھا ہوگا۔ اس ادب پارے میں جیلانی نے جس فنی چابک دستی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی توقع زیادہ تر مغربی زبانوں کے مصنفین ہی سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ خلافِ اندازہ یہ ادب پارہ جیلانی کی طبع زاد پیشکش ہے۔ اس علم کے ساتھ ایک طرف سے افسوس ہوا کہ ایک طبع زاد چیز کو ترجمہ قرار دے کر مصنف کو اس کے کریڈٹ سے محروم کرنے کی لغزش ہو گئی۔ مگر دوسری طرف خوشی بھی ہوئی کہ اس لغزش کے ذریعہ مصنف کی حقیقی ستائش بھی زبانِ قلم سے نشر ہو گئی۔ تاہم میں مصنف سے اس لغزش کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

●

ادھر میرا ایک افسانہ "ڈھکی ڈھم" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک نہایت درجہ کی فاش مگر معتبرانہ غلطی اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس غلطی پر مطلع ہو کر اپنے بارے میں اندازہ ہوا کہ کیفیت مثلِ "روزِ اول" ہی کی ہے۔ افسانے کا زمانہ اگست کا ہے مگر کہاں ہے افسانہ نگاری کا کہ کھیتوں میں گندم کی فصل کھڑی ہے۔ حیرت مجھے اس پر ہوئی کہ اپنے حلقہ کے اچھے اچھے لکھنے والوں بلکہ اہلِ نقد و نظر تک میں سے کوئی نہ ہوا جو اس پر گرفت کرتا۔ مجھے یہ احساس کیا تو ابنِ فرید نے کہ جس کی نگاہ کی دُور رسی اور ذہانت کا اعتراف مجھ میں پہلے سے بڑھ گیا ہے۔
مجھ پر الزام لگایا جا سکتا ہے واقعات کی دنیا سے الگ رہ کر خیالی افسانہ نگاری کا۔ مگر یہ الزام صحیح نہ ہوگا۔ میں نے اپنی عمر کے بیس بائیس سال اب تک گاؤں ہی میں گزارے ہیں کہ جہاں مکانوں سے لگے ہوئے کھیت موسم موسم کی فصلیں نگاہوں کے سامنے بار بار پیش کرتے رہے ہیں۔ مجھ سے اگر کوئی گندم کی کاشت اور برداشت کا زمانہ دریافت کرے۔ تو میں جواب میں کبھی نہ چوکونگا۔ لیکن کوتاہی دراصل عالمِ تخیل میں واقعات کی کڑیاں ملانے میں ہوئی اور اس وجہ سے ہوئی کہ جسے آنکھوں دیکھا ہیں تو شہر میں اور اس کا منظر سے کے دکھایا گاؤں میں۔
بہرحال یہ غلطی بڑی افسوسناک تھی اور مجھے خوشی ہے کہ کسی غیر کی گرفت سے قبل کسی اپنے ہی نے توجہ دلا دی۔

●

"پاکستان کے پانچ سال" کے عنوان سے جو اشاعتِ خاص پیش کرنے کے لئے ہم مہینوں سے مصروف سعی تھے آخر کار فیصلہ یہی کرنا پڑا کہ اس منصوبہ کا تمام تر لپیٹ دیا جائے۔ معاشیات نمبر کے منصوبے کے بعد یہ ہماری دوسری شاندار ناکامی ہے اور اس پر ہم ہر طرف سے مبارکباد کے متوقع ہیں۔

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

آسمانی ادب

دعوتِ کشمکش۔

ایمان والوں کے لئے کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے اور جو حق (کا پیغام) نازل ہوا ہے اس کے اثر سے لرز جائیں؟ —— اور چاہیئے کہ یہ ان لوگوں کا نمونہ نہ بن جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور پھر ان کے دل ایک زمانہ بیت جانے پر سخت ہو گئے، اور (آج یہ حال ہے کہ) ان میں فاسقوں کی کثرت ہے!

جان لو کہ، ——

اللہ زمین کو مر جانے کے بعد (از سر نو) زندگی عطا کرتا ہے!

ہم نے اپنے قوانین کو کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے! —— شاید کہ تم کو عقل آئے!

بالیقین جو بھی صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں ہیں اور جو بھی اللہ کو پاکیزہ جذبات کے ساتھ قرض دیتے ہیں ان کو (ان کا دیا ہوا) دوگنا کر کے لوٹایا جائے گا۔ اور ان کے لئے عزت مندانہ بدلہ ہے!

اور اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے تو بس وہی لوگ ہیں جو اپنے آقا کی نگاہوں میں سچے راست باز ہیں اور ہمہ تن (حق کے) گواہ ہیں! ان کے لئے ان کا محنتانہ ہے اور ان کا نور ہے!

اور وہ لوگ کہ جنہوں نے (دینِ حق سے) انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو وہ دوزخی ہیں:۔

جان لو کہ،

(یہ خدا فراموشانہ) دنیوی زندگی محض ایک کھیل تماشہ ہے، ایک آرائش ہے، آپس کا تفاخر ہے اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ایک دوڑ ہے!

اس کی مثال تو ویسی ہی ہے جیسے برکھا ہو اور اپنی فصل کو سرسبز ہوتے دیکھ کر دہقانوں کی باچھیں کھل جائیں۔ پھر وہ خوب زور پر آجائے اور اس کے بعد فصل پر زردی چھا جائے۔ یہاں تک کہ آخرکار روندن بن کر رہ جائے!

—— اور (اس کے مقابلے میں) آخرت ہے کہ جس میں (دنیوی زندگی کے کئے کرائے کے مطابق) ایک طرف شدید سزا ہوگی اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور خوشنودی ہوگی!

اور (خدا فراموشانہ) دنیوی زندگی ایک متاعِ فریب کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی

•

لپکو اللہ کی مغفرت کی طرف! اور اس جنت کی طرف جس کی وسعتیں آسمان و زمین جیسی ہیں، جو تیار کی گئی ہے اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لئے!

یہ (مرتبہ بلند) اللہ کا عطیہ ہے وہ جسے چاہے عنایت فرمائے اور اللہ بڑے عطیئے والا ہے!

(اس راستے پر لپکتے ہوئے) کوئی ایسی مصیبت نہیں جو زمین پر وارد ہو یا خود تمہارے دلوں پر اثر کرے کہ جو نوشتۂ تقدیر میں پیشتر اس کے موجود نہ ہو کہ ہم اس کو ظہور میں لائیں!

یہ (حوادث کا قبلِ وقوع ریکارڈ کر رکھنا) اللہ تعالیٰ کے لئے بالکل سہل ہے!

(اس حقیقت کو واضح کرنے کا) مدعا یہ ہے کہ جو کچھ بھی تم کو ملے اس پر اکڑ نہ جاؤ، جیسے کہ مخلوق میں جدید جدید کیسے ہوتے ہیں اتنے اچھے دنیا پرست اس کا غم نہ کرو اور جو کچھ اللہ تم کو عطا کرے اس پر اکڑ نہ جاؤ! ــــــ اور یاد رکھو کہ) اللہ تمام ایسے لاف زن شیخی خوروں کو ناپسند کرتا ہے جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ خود کنجوسی کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو کنجوسی ہی کا درس دیتے ہیں اور جو کوئی (اس تنبیہ کے باوجود) روگردانی کرے، تو اللہ تو ہے ہی بے نیاز، ستودہ صفات!!

ہم نے کھلی کھلی علامات کے ساتھ اپنے رسول اس لئے بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ "کتاب" اور "میزان" اسی لئے نازل کی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک عدل پر اپنے آپ کو استوار کریں ــــــ اور اسی مقصد سے ہم نے لوہا پیدا کیا ہے جو شدید جنگی قوت کا مظہر ہے اور جس میں لوگوں کے لئے بہت سے دوسرے فوائد بھی ہیں ــــــ

اور ہاں

یہ انبیاء کی بعثت اور خیر و شر کی کشمکش اس لئے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھے کہ کون پردۂ غیب کے ہوتے ہوئے اس کی اور اس کے رسول کی تائید میں اٹھتا ہے۔

بلاشبہ اللہ قوت رکھنے والا اور غلبہ رکھنے والا ہے!

بقیہ سوچ بچار

ناکامی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پاکستان کی اجتماعی زندگی کا جائزہ لینے کے لئے جن بنیادی موضوعات پر مقالات حاصل کئے بغیر ہم اس اشاعتِ خاص کو مکمل نہیں کر سکتے تھے ان میں سے بمشکل نصف موضوعات پر مقالات موصول ہوئے، اور وہ بھی اتنے اہتمام کے نتیجے میں کہ ہم نے ایک عرصہ قبل اہلِ قلم کو لکھنے کے لئے تحریک کی۔ پھر ان کو مضامین کے خاکے بنا کر روانہ کئے پھر اعداد و شمار فراہم کئے اور پھر پے در پے یاد دہانی کے خطوط لکھے (ان خطوط کے مصارف نے ہمارے بجٹ پر بھی ایک محسوس اثر ڈالا ہے) اتنا کچھ کرنے کے باوجود بعض اصحاب سے معذرت اور فرار کی درخواستوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے حلقہ کے لکھنے والے محض لکھنے والے نہیں ہیں اور پھر ان کو بلا معاوضہ رضاکارانہ طور پر لکھنا ہوتا ہے، ان کے سر پر ایک تحریک کے مختلف کاموں کی ذمہ داریاں ہیں۔ پھر ان کی گردن پر اپنی معاش کا بوجھ ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ وقت نکال کر کبھی کچھ لکھ پاتے ہیں لیکن ان ساری مشکلات کے باوجود ان کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل نہ ہونی چاہیے کہ کوئی بھی اصول محض سیاست کے میدان میں لڑ کر بازی نہیں جیت سکتا، بلکہ ناگزیر ہے کہ وہ اصول علم و ادب کے میدانوں میں بھی معرکے سر کرے۔ آپ خیالات کی جنگاہ کو دوسروں کی تحویل میں چھوڑ کر محض عملی سیاسی جد و جہد کے بل پر کوئی دیر پا انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ جن خیالات کو آپ شکست دیئے بغیر اسلام کا سماجی نظام نافذ کر دیں گے وہ خیالات بعد میں آپ کو چین نہ لینے دیں گے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں بھی ان کی پوری اہمیت محسوس کرتے ہوئے وقت نکالا جائے، اپنے جرائد کو مضبوط بنایا جائے اور خیالات کا ایک ایسا آہنی محاذ قائم کر دیا جائے کہ جس کے سامنے کسی دوسرے کا دعویٰ نہ چل سکے۔ ہمارے جرائد محض سامانِ تفریح نہیں ہیں۔ بلکہ درحقیقت یہ صحیح معنوں میں ہماری فکری تحریک کے مورچے یا دمدمے ہیں۔

بہرحال اپنے اہلِ قلم کے ناکافی تعاون کے پیشِ نظر کیا رائے یہ ہوئی کہ اب کسی خاص نمبر کا ارادہ کرنے کی قسم کھا لی جائے۔ تاکہ ہمارا حلقہ ایسے خون جلانے والے ستم کی ایک بڑی کھیپ نہ پیدا کرے جو دوسری سرگرمیوں کو جاری رکھ کر علمی و ادبی مورچوں پر بھی پیش پیش رہنے والے ہوں۔ مگر پھر یہ بھی سوچا گیا کہ جو حضرات نے وقت نکال کر اور محنت کر کے نہایت اعلیٰ درجے کے مقالات مرتب کئے ہیں ہمارے اس طرح کے فیصلے سے ان کو بڑا صدمہ ہوگا ...... پس طے کیا گیا کہ ان مقالات کے ساتھ مزید ادبی مقالات، افسانے اور نظمیں شامل کر کے جنوری ۱۹۵۸ء میں چراغِ راہ کی ایک اشاعتِ خاص بلا کسی خاص عنوان کے بطور سالنامے کے نکال دی جائے۔ مقالات موصولہ بہت معیاری ہیں اور توقع ہے کہ یہ اشاعتِ خاص ایک قابلِ قدر چیز ہوگی۔

مرض لاعلاج

فضل من اللہ

لائے عام چوہدری الٰہی بخش کے متعلق یہی تھی کہ وہ پیر فقیر کا قائل نہیں۔ ایک وجہ اس کی چوہدری کی وہ روشن خیالی تھی جس کی سرحدیں وہابیت سے
ملتی تھیں اور جس کا اظہار وہ دس بارہ برس قبل بڑے زور شور سے کیا کرتا تھا۔ لیکن اُس وقت چونکہ وہ صرف لاہیا تھا؛ کہ چوہدری الٰہی بخش۔
ں نے عام لوگ اُس کی باتوں کی قدر نہ کم ہی کرتے تھے۔ یار لوگ اُس کی بات اِس کان سنتے اُس کان نکال باہر کرتے۔ مگر جب وہ دولتمند ہوگیا
ں کی تیار کردہ پیٹنٹ دوائی خوب فروخت ہونے لگی۔ اُس کا کاروبار ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گیا اور مایا نے اُسے تبلیغ لام یعنی
ہدری الٰہی بخش عطا کیا تو اُس کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں کی تلاش ہونے لگی۔ پیری فقیری کے متعلق رائے عام متفق تھی کہ چوہدری اس کا قائل نہیں ایک
یہ وہی روشن خیالی تھی اور دوسری اور بڑی وجہ دولت۔

دولت پاکر تو انسان اللہ میاں تک کو بھول جاتا ہے۔ پیر فقیر کس کھیت کی مولی ہیں۔ ان تمام باتوں کے برعکس کل شام جب چوہدری الٰہی بخش کے
اتھ کار سے ایک ایسی ہستی برآمد ہوئی جسے پیر کہا جاسکتا تھا تو لوگ ہکا بکا رہ گئے اور پل بھر میں چوہدری کے گرد ایک بھیڑ سی لگ گئی
جو صاحب چوہدری کے ساتھ تھے اُن کے شانوں پر اگر لمبی زلفیں بکھری ہوئی نہ ہوتیں تو لوگ اُسے پیر کبھی نہ سمجھتے۔ بھلا فقیری کا یہ بھی کوئی ڈھب
ہے کہ نہ جبہ نہ قوالوں کا طائفہ، نہ ڈھب کا لباس۔ وہ سر پر ایک میلی پرانی پھٹی ہوئی جناح کیپ رکھے تھے۔ تن پر اس سخت گرمی کے موسم میں گلے
ے دو کرتے تھے کھاڈے ہی کا تہبند اور لوٹا جا جو تا بھی یہی کہہ رہا تھا کہ وہ پیر نہیں ہوسکتے۔ مگر اُن کی پریشان زلفیں اس بات کی شہادت دے
رہی تھیں کہ وہ پیر ہیں۔ حاضرین نہ جانے کب تک تصویرِ حیرت بنے اُنہیں تکتے رہتے کہ چوہدری نے سکوت کو توڑا۔
غلام الدین مستری کو مخاطب کرتے ہوئے اُس نے کہا۔
"بڑے خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ گریجویٹ ہیں گریجویٹ! ۔۔۔۔ اور پھر تارکِ دُنیا، اللہ کی دین ہے"
حاضرین نے عقیدت بھری نظروں سے حضرت صاحب کو دیکھا۔ چوہدری نے غلام دین کو بتایا کہ حضرت صاحب تھک گئے ہیں اب آرام کریں گے
بک مطلب پا گئے، بھیڑ چھٹ گئی اور پھر یہ بات ہوئے گل کی طرح پھیل گئی کہ چوہدری الٰہی بخش کے ہاں ایک ایسے خدا رسیدہ بزرگ تشریف لائے
ں جو بی۔اے ہیں۔ دکانوں سے یہ بات گھروں تک پہنچی، مردوں سے عورتوں نے یہ خبر سنی اور وہاں سے پھر پتہ نہیں کہاں تک جا پہنچی۔

حضرت صاحب کے ساتھ جس مکان میں چوہدری الٰہی بخش کو ٹھہرنا تھا وہ چوہدری نے گرمیوں کے لئے خاص طور پر بنوایا تھا۔ نوکر نے
ہدری کو آتے دیکھ کر فوراً بیٹھک کا دروازہ کھول دیا اور چوہدری کا اشارہ پاتے ہی پانی لینے چلا گیا۔ بلور کے چمکتے ہوئے گلاسوں میں شربت
شربت کو دیکھتے ہی پیاس کی جان پر بن گئی۔ حضرت صاحب صوفے پر تشریف فرما تھے اور چوہدری اُن کے قدموں میں ایک مونڈھے پر تھا
نے بکمالِ عقیدت اُن کے حضور پانی پیش کیا۔ حضرت صاحب نے گلاس لے لیا، تھوڑا سا پانی پیا بھی مگر اُن کے چہرے کے خدوخال اُن کے تکدر
کے واضح طور پر غماز تھے۔ چوہدری نے اُسے فوراً بھانپ لیا ——

"حضور کے دشمنوں کی طبیعت ناساز تو نہیں" اُس نے عاجزی سے دریافت کیا۔

"یہ کیا اندازِ بیان ہے الٰہی بخش، تیری ہر حرکت مجھے پریشان کر رہی ہے"

"میری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" بوکھلاہٹ کے عالم میں وہ اور کچھ نہ کہہ سکا، وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ اس کی نظریں زمین پر گڑ گئیں، مزید کچھ کہنے کے لئے وہ الفاظ تلاش کر ہی رہا تھا کہ حضرت صاحب نے فرمایا۔

"الٰہی بخش"

"جی"

"بھائی میں اس کمرے میں نہیں رہ سکوں گا"

چوہدری خاموش تھا وہ خاموش رہ کر وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کچھ کہتا اور حضرت صاحب ناراض ہو جاتے۔

"اُف! خون کی کتنی سخت بو آ رہی ہے" حضرت صاحب نے بیزار ہو کر کہا۔

"خون کی بو؟"

اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اُس کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے۔ ابتداً اُس نے نتھنے پھیلا دیئے تاکہ بو کو پا سکے۔ مگر جب اس میں ناکامی ہوئی تو دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر جھکنے لگا تاکہ بو کے ظاہری آثار مل سکیں۔ مگر باوجود سخت کوشش کے ناکامی کے سوا اُسے کچھ نہ مل سکا۔ مجبوراً حضرت صاحب کے لئے ایک دوسرا کمرہ خالی کرا دیا گیا۔ اُن کا مختصر سامان وہیں رکھ دیا گیا۔ سونے کا انتظام اوپر چھت پر ہو گیا۔ اور یوں اُس نے شکر کا سانس لیا۔

* * * * *

بستر پر لیٹے چوہدری الٰہی بخش کو ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک وہ بے قراری کے عالم میں پہلو بدل رہا تھا اُسے حضرت صاحب کے اس ارشاد کی کہ کمرے سے خون کی بو آ رہی ہے۔ ابھی تک سمجھ نہ آئی تھی اور وہ اس کا مطلب جاننے کے لئے بے چین تھا۔ اُس نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا ایک بار پھر الماریوں اور چھت تک پر نظر ڈال لی تھی۔ مگر بظاہر کوئی ایسی علامت ہاتھ نہ لگی تھی جو اُس کی پریشانی کو دور کر سکتی اور وہ ابھی تک مضطرب تھا۔ معاً اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ وارد ہوا

"کہیں اس میں کوئی رمز تو نہیں؟" اس نے سوچا۔ یہ انکشاف اُسے اس قدر حقیقی معلوم ہوا کہ اس کے شعور اور لاشعور کے تمام دریچے کھل گئے اور اُس نے بالآخر خود سے یہ کہا۔

"اللہ والے باطن کو دیکھتے ہیں، ظاہر سے اُنہیں کیا؟ کوئی رمز ضرور ہے؟"

اس انکشاف سے پہلے اس کی پریشانی مبہم اور بیگانہ تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کون شخص ہے جسے اُس نے قتل کیا ہے اور جس کے خون کی بو روحانیت کے اُس پیکر نے جو حضرت صاحب کی شکل میں اُس کے ہاں وارد ہوا تھا سونگھ لی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت صاحب کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا اور اُن کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگے "اُف! خون کی کتنی سخت بو آ رہی ہے۔"

چوہدری کو اپنی حرکت یاد آ گئی "لاحول ولاقوۃ" اور اپنی اس حرکت کو یاد کر کے وہ خود کو اپنی نظروں میں ذلیل محسوس کرنے لگا کہ اس رمز کو جان نہ سکا، اس کا فکر ذہن کی گہرائیوں تک پہنچا۔

"میں نے کسے قتل کیا ہے" اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ اُس کا ماضی اُس کی آنکھوں کے سامنے فلم کی ریل کی طرح پھرنے لگا۔ مختلف زمانے، مختلف مناظر! پندرہ برس قبل اس نے میٹرک پاس کیا۔ نوکری ڈھونڈی نہ ملی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تنگی کے دن، بے روزگاری! ۔ ۔ ۔

..... تانگے والے محنت و مشقت کرنے والے، وکٹ پینٹ کرنے والے کا نسخہ بتلاتے ہیں اور نصیحت کے انداز میں کہتے ہیں ۔
" بلکہ ہر کام محنت چاہتا ہے، محبت سے ہر قطرہ سرو ہو جاتا ہے، ہمت اور محنت سے کام لوگے تو سونے چاندی میں کھیلوگے "
وہ محنت کرتا ہے۔ محبت سے کام لیتا ہے۔ دوائیاں خریدتا ہے، پیستا ہے، سرکب تیار کرتا ہے، شیشیوں میں بھرتا ہے، لیبل چپکاتا ہے
ڈبیوں میں بند کرتا ہے، بازار لے جاتا ہے۔ بیچ دیتا ہے وہ بابو نوازی سے دو پیسے کی بیڑیاں خریدتا ہے، پیسوں کے لئے شام کا وعدہ کرتا ہے
مگر واحد دس سے بیڑیاں لے لیتا ہے، اُسے بے اختیار اور حقیر جانتا ہے ؛ . . . . . . اور پھر پیسے نقیب، جانتے ہیں اس کا کاروبار چمک
اٹھتا ہے، دولت کی مانگ بڑھ جاتی ہے . . . . اور پھر وہ لکھ پتی ہو جاتا ہے۔ جنگ اس کی خوب مدد کرتی ہے، ڈیڑھ درجن مزدور ملازم ہیں اور
دو کلرک حساب رکھ رہے ہیں . . . . . .   وہ مزدوروں کو پہلی تاریخ کو تنخواہ دے رہا ہے اُس کے ذہن میں حدیث کے اس حکم کی گونج ابھی تک ساقی
ہے ۔ " مزدور کی اُجرت اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو ! " وہ کتنا خلیق ہے، مزدوروں سے کس طرح خوش کلامی سے پیش آرہا ہے . . . ؟
ماضی اور حال کے یہ تمام واقعات اُس کے ذہن میں گھوم گئے ۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور وہ سوچنے لگا کہ اُس نے کس کو
قتل کیا ہے ؟

اگرچہ اس کے منہ پر داڑھی نہ تھی تاہم وہ نماز کا سختی سے پابند تھا ۔ یہی حال روزوں کا تھا ۔ سرکاری ٹیکس میں گڑبڑ تو خیر لابدی تھی مگر زکوٰۃ
میں وہ گڑبڑ نہ کرتا تھا علماء کی تقریریں وہ بڑے ذوق شوق سے سنتا تھا اور بڑے مولوی صاحب کے وعظ میں اُس نے کبھی ناغہ نہ کیا تھا ۔ وہ نہایت
سادہ زندگی بسر کرتا تھا ۔ مزدوروں سے اس کا سلوک اچھا ہوتا تھا ۔ ترقی دیتے وقت وہ ذرا سخت ہو جاتا تھا مگر اُس کے نزدیک یہ ناگزیر تھا ورنہ
مزدوروں کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا ۔ وہ اپنے اعمال کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کی پریشانی لحظہ بلحظہ بڑھتی جا رہی تھی ۔ خود کو قاتل تصور کرتے ہی اُس کے رونگٹے
کھڑے ہو جاتے اور وہ کانپ اٹھتا ۔ اُس نے یونہی بلا مقصد پہلو بدلا ۔ بستر کی سرسراہٹ اُسے یہ کہتے ہوئے سنائی دی ۔ " تم خونی ہو " یہ سوال پھیل گیا اور اس کے ذہن
میں اٹک کر رہ گیا ۔ دفعتاً اس کی نظر کھونٹی پر پڑی، اُس نے چھپی ہوئی نظروں سے دوبارہ دیکھا . . . . . . وہ خوفناک آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں ۔ اُس نے آنکھیں
بند کر لیں ۔ مگر اب وہ آنکھیں یہاں موجود تھیں، خوفناک اور گھورتی ہوئی آنکھیں ! بے تاب ہو کر اُس نے آنکھیں کھول دیں، اب سامنے صرف وہ آنکھیں
ہی نہ تھیں، ایک زرد چہرہ بھی تھا جس میں یہ آنکھیں گڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور اس پر گڑی ہوئی تھیں ! اُس نے آنکھیں ملیں ۔ کلمہ پڑھا خود کو خواب کے
فریب سے آزاد کرنا چاہا ۔ اگر خواب ہوتا تو اس کا طلسم ٹوٹ بھی چکا ہوتا ۔ وہ تو جاگ رہا تھا اور . . . . . . " یا اللہ ! " اب سامنے زرد چہرہ اور گھورتی ہوئی
آنکھیں ہی نہ تھیں ۔ ایک پورا ڈھانچہ موجود تھا ۔ میلے سے گاڑھے کے کفن میں لپٹا ہوا ۔ جیسے قبر سے ابھی اُٹھ کر آیا ہو اور کفن چھاتی سے سرک گیا تھا . . .
اور کتنا وحشت ناک منظر تھا، پسلیوں کے پیچھے پھیلی پھیپھڑے صاف نظر آ رہے تھے ! خون آلود، چپکے ہوئے، جیسے پانی کا قطرہ خوردبین سے نظر
آتے ۔ وہ وحشت کے مارے انتہائی طور پر خوفزدہ ہو گیا ۔ چیخ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی ۔ اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا ۔
ڈھانچہ کے لب ہلے اور ایک خفیف آواز اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی ——
" گھبرائیے نہیں میں آپ کے ایک حقیر نوکر کا مردہ جسم ہوں "
" نوکر ؟ " چودھری ہمہ تن سوال بن گیا، اُس کے دل و دماغ کا سارا استعجاب اُس کے چہرے پر سمٹ آیا ۔
" اوہ ! سرکار اس بیچارے کو بھول گئیں ؟ "
" فیروز، رحمتی کا لڑکا "
" فیروز نہیں بیچاری ۔ جب تم نے زندگی میں مجھے یہ عزت نہ بخشی تو اب اس تکلف کی کیا ضرورت ہے "؟
زرد رو ڈھانچے کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے جیسے وہ چودھری سے کسی خوفناک جرم کا انتقام لینے

کالا دہ رکھتا ہو۔ چوہدری کا خون خشک ہو رہا تھا۔ وہ پسینہ میں شرابور تھا۔ وہ اضطراب کی شدت میں جان کنی کا سا اضطراب محسوس کر رہا تھا۔ وہ بس دھاپ رہے۔ اُس کی شعلہ بار نظروں سے نجات چاہتا تھا۔ اُف تپتی ہوئی سلاخوں کی طرح اس کی نظریں اُسے عذاب دے رہی تھیں

"تم نے" وہ دھاپ رہے نے کہا۔ "مجھے قتل کیا ہے"

"غلط۔ بالکل غلط ..... میں نے کسی کو ..... تم کو قتل نہیں کیا"

"ہاں ہاں غلط ____ بالکل غلط ____ یہ بکواس ہے کہ تم نے مجھے قتل کیا ہے۔ تم نے مجھے ملازم بھی نہیں رکھا تھا، تم نے مجھے ایسڈ پینے والی چکی پر بھی نہیں لگایا تھا، اس ایسڈ کے زہر نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا، تم نے مجھے بارہ آنے یومیہ اور سال کے بعد چار آنے یومیہ ترقی بھی نہیں دی تھی اور اس قلیل آمدنی میں سے جب میری ماں نے کچھ بچانا شروع کیا تاکہ وہ میری شادی کر کے خود کو مسرتوں سے ہمکنار کر سکے تو مجھے اچھی خوراک نہ مل سکی اور مجھے ٹی بی ہو گئی اور میں مر گیا: یہ سب کچھ غلط ہے۔ جھوٹ ہے، افسانہ ہے، ہے نا؟"

بھوجی کے ایک ایک جملے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ اس کی زبان زہر میں بجھا ہوا نشتر بن گئی تھی اور چوہدری الٰہی بخش اس نشتر کی چبھن کو محسوس کر رہا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ بھوجی اتنا بے باک کیسے ہو گیا ہے۔ وہ اس بھوجی سے کیوں مختلف ہے جو اس کے ہاں ملازم تھا۔ فرمانبردار، عاجز اور اطاعت گزار! ____ ترقی مانگتے وقت تو وہ یوں ہوا کرتا تھا جیسے زمین میں گڑا جا رہا ہو۔

بیوہ رحمی چوہدری کے ہاں کئی بار آئی تھی، معجزات کی روٹی لینے، قربان کی کھال لینے، زکوٰۃ کے پیسے لینے، صدقہ کا گوشت لینے۔ کئی بار اس نے بھوجی کے لئے ملازمت کی درخواست کی۔ چوہدری نے کہا "اچھا سوچ کر بتاؤں گا"۔ اور چار دن تک جب وہ اچھی طرح سوچ چکا تو اس نے بیوہ رحمی کو بتایا کہ اس نے بھوجی کو ملازم رکھ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ اُسے بارہ آنے یومیہ دے گا۔

رحمی کی حالت قابل دید تھی۔ وہ پھولی نہ سماتی تھی اور اس کے پاؤں زمین پر پڑتے نظر نہیں آتے تھے۔ بھوجی تین برس تک ملازم رہا۔ ہر سال اُسے چار آنے یومیہ کی ترقی ملتی، مرنے سے پہلے اُسے ڈیڑھ روپیہ ملتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ زندگی کا خزانہ لٹا کر، اُس کے کارخانے کو اپنے خون کا آخری قطرہ پیش کر کے چل بسا۔ اسکی بیوہ ماں کی مسرتیں بھی موت کے گھاٹ اتر گئیں۔ مدت تک وہ کھیوں بیچ گھوں کی طرح روتی پھرتی رہی۔ ذرا سی بات پر اسکے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھتا اور اُس کی آنکھیں ساون کی جھڑی لگا دیتیں۔

بھوجی بڑا اطاعت گزار لڑکا تھا، اطاعت شعار اور محنتی بھی، صبح سے شام تک وہ متواتر کام کرتا اور کبھی کبھی اتفاق سے وہ ساتھی مزدوروں سے مشغول گفتگو ہوتے ہوئے چوہدری کو آتا دیکھ لیتا تو بڑا شرمندہ ہوتا۔ چوہدری اس بات کو خاص طور پر نوٹ کر لیتا اور ترقی کی درخواست سن کر فوراً کہتا۔

"کمپنی گھاٹے اور ترقیاں لو، کوئی پوچھنے والا ہی نہیں"

بھوجی کو معلوم ہوتا کہ چوہدری غلط کہہ رہا ہے مگر اس کے باوجود وہ یوں محسوس کرتا جیسے اس کے سر پر منوں بوجھ رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی گردن جھک جاتی، نظریں نیچی ہو جاتیں اور وہ یوں محسوس کرتا جیسے وہ مجرم ہے۔ اُس نے سات خون کئے ہیں اور اب کئے کی سزا پانے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ اُس کا حلق خشک ہو جاتا اور وہ ایک لفظ تک نہ کہہ سکتا۔ چوہدری کو حیرت تھی کہ اب وہ بے باک کیوں ہے۔ اسکی آنکھیں اس پر کیوں گڑی ہوئی ہیں۔ اس کی باتوں میں نشتریت اور زہر کیوں ہے؟ وہ شدید کرب اور اضطراب محسوس کر رہا تھا جیسے اُسے آگ میں ڈال دیا گیا ہو، جیسے تپتی ہوئی سلاخوں سے اُسے داغا جا رہا ہو۔ اُف! کتنا دردناک تھا یہ عذاب!

"میرا جنم افلاس کی کوکھ سے ہوا تھا" بھوجی نے کہنا شروع کیا۔ "بد قسمتی نے مجھے پرورش کیا، میرا باپ ایک حادثے کا شکار ہو گیا، سرکار نے کوئی مدد نہ کی، میں یتیم ہو گیا۔ اور میں نے کسی زبان سے یہ نہ سنا جو میری ماں کو کہتی "بہن اگر رحیم بخش فوت ہو گیا ہے تو یہ اللہ کی مرضی تھی، تم فکر نہ کرو

سمجھ رکھتا ہوں" اس نے سوچا ـــــــ اور وہ دیر تک یہی سوچتا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے فیصلہ کیا کہ

وہ یہ سب کچھ نہیں کرے گا وہ تو یہ کرے گا:

اور پھر اس نے جیسے صحیح راستہ جان لیا ہو اُس کے سر سے ایک بوجھ اُترتا محسوس ہوا۔ "خدا کو منانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔" اُس نے سوچا اور وہ وضو کرنے کے لئے صحن میں چلا گیا۔

مرغیوں کے ڈربے میں شور ہوا، مرغیاں پھڑپھڑائیں۔ یقیناً بلی نے حملہ کر دیا تھا۔ مگر وہ وضو کرتا رہا اور اُدھر چنداں توجہ نہ دی۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ اُدھر گیا۔ بلی مرغی چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اُس نے اس کا خون گرایا تھا اور کچھ گوشت بھی کھا چکی تھی۔

غیر ارادی طور پر اُس کے ذہن میں ایک تجویز اُبھری، تھی تو یہ گستاخی ہی ـــــ حضرت صاحب کو آزمایا جائے "۔ اُس نے سوچا۔

صبح کی نماز اس نے حضرت صاحب کی معیت میں ادا کی نماز سے فارغ ہو کر وہ بیٹھک میں آ بیٹھے۔ لوگ مسجد میں حضرت صاحب کا دیدار کرتے رہے اور وہاں کافی دیر ہو گئی۔

بعینہٖ وہی کیفیت جو رات کو حضرت صاحب کے چہرے پر پیدا ہوئی تھی اب بھی پیدا ہوئی ـــــــ

"الٰہی بخش"

"جی" چوہدری بیتابی سے اور جلدی سے متوجہ ہوا۔

"بُو ابھی تک آ رہی ہے"

"کیسی بُو سرکار" چوہدری نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"خون کی بُو ہے اُف!"

چوہدری حسب سابق اُٹھا دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگا اور پیشتر اس کے کہ حضرت صاحب کچھ کہتے انھوں نے سنا۔ چوہدری کہہ رہا تھا۔

"اِدھر معلوم ہوتی ہے"

"کدھر؟" حضرت صاحب کے استفسار کا لہجہ اُکھڑا ہوا سا تھا۔

اور تھوڑی دیر بعد چوہدری نے قالین کے نیچے سے مردہ مرغی نکالی۔ حضرت صاحب کی عجیب حالت تھی، چہرہ مبارک پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا گویا کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اُن کی شکست واضح تھی۔ چوہدری اندر گھس گیا اور پھر وہاں اُس کے گرجنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ وہ ملازموں پر برس رہا تھا اور پھر وہ ایک سہمے ہوئے نوکر کے پیچھے نمودار ہوا۔ بچہ مرغی اُٹھا کر باہر چلا گیا۔

"اسلام نے غصہ پی جانے کا حکم دیا ہے ورنہ ان نالائقوں کی بوٹی بوٹی کر دیتا۔ غضب خدا کا رات کی مرغی پڑی ہوئی ہے کسی نے دیکھا نہیں۔ میں تو شہر گیا تھا۔ مجھے تو رات پتہ ہی نہ چل سکا"

حضرت صاحب کسی اور ہی عالم میں تھے۔ اُن کی تکنیک یہاں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ وہ اگرچہ پیر تھے (اور پیر ہونا میں حقیقت پسند سب سمجھتے تو وہ بن سکے "اس لئے وہ خاصے "پروگریسو" تھے۔ اکثر خوشحال لوگ ان کے مُرید تھے۔ چوہدری سے اُن کا تعارف بھی ایک ایسے ہی گھرانے میں ہوا تھا جہاں سے وہ اُنھیں بہشت لایا تھا۔ مُرید بنانے سے پہلے ہر جگہ وہ یہی تکنیک استعمال کرتے۔ بعض اوقات الٰہی بخش کی

ہو کیتی کرتا تو وہ جلال میں آ کر کفِ افسوس ملتے ہوئے کہتے ______

"افسوس دولت نے احمقوں کو اندھا کر دیا ہے"

مخاطب نادم ہو جاتا تو اب وہ دوسرا وار کرتے ______

"دنیا اس وقت تک کسی کو نہیں ملتی جب تک کہ وہ ظلم نہ کرے کسی کا خون نہ چوسے"

اس کے بعد کا فکر حسبِ حالاتِ مخاطب ہوتا، پھر وہ فلسفیانہ شان سے کہتے۔

"چہروں پہ رونق اس وقت آتی ہے جب حرام رزق حلق سے نیچے اترے تو نور قلب بڑھتی ہے جب وہ مظلوموں کی محنت پہ جیئے۔ آخرت کا خیال تک دل میں نہ آئے آدمی موت کو بالکل بھول جائے"

اس شعبدہ بازی سے مرید کافی متاثر ہو جاتا اور توبہ تائب اللہ کے وعدے کرتا۔ اور پھر اس کی عاقبت چاہے سنورتی ہو یا نہ سنورتی پر حضرت صاحب کی دنیا ضرور سنور جاتی۔ مگر اس کا اظہار ان کے ظاہر سے نہ ہوتا۔ ان کی کیفیت ایک ایسے شخص کی ہوتی جو کشمش پی گیا ہو مگر اس کے لبوں پہ پپڑیاں بھی جمی ہوں اور ابھی پیاسا دکھائی دے۔

"الٰہی بخش" حضرت صاحب نے کہا "مجھے کچھ کام یاد آ گیا ہے مجھے اجازت دو"

"گنہگار نہ کیجئے۔ مگر شام کو چلے جائیے"

چوہدری نے زیادہ اصرار نہ کیا اور حضرت صاحب کا جانا گوارا کر لیا۔

* * * *

حضرت صاحب کو رخصت کر کے جب وہ واپس لوٹ رہا تھا تو اس کے ذہن نے ایک الہامی انکشاف کیا

"ہو نہیں وہم ہوا ہو گا" ------ "وہم!" ------ ہاں ہاں! ورنہ وہ یوں خاموش نہ ہو جاتے"۔ ------

ایک انکشاف کے بعد دوسرا انکشاف وارد ہوا۔

"اور وہ بھی وہم تھا" رات والے واقعہ کا تصور کرتے ہی وہ خوفزدہ ہو گیا اور وہ اسی کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کی جزئیات تک کی تفصیل اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی اور وہ حیران رہ گیا جب اس نے اسے ایک وہم کا نتیجہ قرار دیا۔ تاہم اس کا ذہن تفکرات کے بوجھ سے کسی قدر ہلکا ہو چکا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ صوفے پر گر گیا۔ "وہم ------؟" ایک خیال اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ چکر لگا رہا تھا۔ وہ کسی طرح مطمئن نہیں ہو رہا تھا باہر کسی نے کسی کو کہا۔

"یار چھوڑو بھی وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھا"

"وہم کا علاج لقمان کے پاس بھی نہ تھا" اس نے اعادہ کیا "وہم ------ مرض لا علاج ہے؟"

اس ذہنی کشمکش سے نجات پانے کے لئے اس نے کارخانے کا رخ کیا۔ سب مزدور خوش تھے اور کارخانہ قہقہوں سے بھرپور تھا۔ اسے ان کی حالت پر رشک آیا۔ "کاش میں بھی مزدور ہوتا" اس نے خواہش ظاہر کی۔ مزدوروں کے قہقہے رک گئے۔ جیسے چڑیاں شکرے کی بو پا کر چہچہانا بند کر دیں۔ اس نے ایک چکر لگایا اور پھر دفتر میں چلا گیا وہاں کلرک لیمپ کی مدھم روشنی میں حسابات کا کام کر رہے تھے کارخانہ ایک نشیبی اور اندھیرے کمرے میں تھا۔ مزدور یہیں کام کرتے تھے۔ کلرک اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ وہ رجسٹر چیک کرنے لگا۔ اور ابھی وہ پڑتال کر ہی رہا تھا کہ منشی آ گیا۔ مگر اس نے اس کی آمد کی تصدیق کا اظہار نہیں کیا۔ اور رجسٹر دیکھنے میں مصروف رہا۔ منشی کو ملازم ہوئے سال ہو گیا تھا

وہ چپڑاسی کی جگہ رکھا گیا تھا۔ اس کی ماں بیوہ تھی۔ اس نے بھی چوہدری سے اُسی طرح درخواست کی تھی جیسے بیوہ ربی سے کی تھی اور حبیب چوہدری نے ہاں کر دی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا تھا۔ ننھا ترقی کی درخواست لے کر آیا تھا۔ چوہدری میٹنگ سے فارغ ہوتا نظر آیا تو ننھے نے ہمت کر کے اُسے مخاطب کیا ———

"جناب"۔

اس نے لاپروائی سے پیچھے دیکھا۔

"کہو کیا بات ہے؟"

"جناب سال پورا ہو گیا ہے" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کام چور کام کرتے نہیں اور ترقی کا مطالبہ آ جڑتے ہیں"

ننھا جانتا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ مگر مصلحت نے اُس کی زبان بندی کر دی اس کا سر جھک گیا اُس کی نظریں زمین پر گڑ گئیں جیسے وہ اپنا حق مانگنے نہیں بلکہ کسی جرم کی سزا پانے آیا ہے۔

"خدا کا خوف آ جاتا ہے۔ میں انہیں ملازموں کی طرح تھوڑا رکھتا ہوں یہ تو میری اولاد ہیں' اولاد' جاؤ کام کرو"

ننھا رکا رہا تو اس نے کہا۔ "تمہیں پہلی سے چار آنے روپیہ زیادہ ملیں گے"

ننھا دفتر سے نکل آیا' اُسے ترقی کی خوشی ضرور تھی مگر وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی سات پشتوں کی کمریں چوہدری الٰہی بخش کے احسان کے بوجھ تلے ٹوٹ رہی ہیں۔

برطانیہ میں پاکستانی راج

"لالہ صحرائی"

یہ دلچسپ مضمون جو پاکستان ٹائمز کے آزادی نمبر میں چھپا تھا ہمارے ہاں ترجمہ ہو کر زیرِ کتابت ہی تھا
کہ مشیر کراچی میں اس کا ترجمہ شائع ہو گیا۔ اب ہم نے اسے محض اس بنا پر شریکِ اشاعت رکھا ہے
کہ "لالہ صحرائی" کا ترجمہ زیادہ بلند معیار ہے۔ (ادارہ)

نیم سرکاری مراسلہ، شمارہ : ۹ ب ج /۱۲۳۴۵/ ب ن
صدر دفاتر حکومتِ پاکستان

قلندر آباد .... مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء

مکرمی مولا بخش فرزانہ صاحب

سلام مسنون،

دفتر نوآبادیات پاکستان کی طرف سے آپ کا تقرر بطور ڈپٹی کمشنر ضلع لنکا شائر (انگلستان) عمل میں آیا ہے، آپ کو ماہانہ مبلغ -/۲۲۰ روپے مشاہرہ منصب اور مبلغ -/۴۰۰ روپے وظیفہ سمندر پار ملازمت ملے گا۔ نیز قواعد ملازمت نوآبادیات کے تحت جو مزید وظائف اس ضمن میں واجب الادا قرار پاتے ہیں وہ ان کے علاوہ ہوں گے۔

مراسلہ ہذا کی تاریخ اجراء سے ایک ماہ تک آپ کو حلفی رخصت بسلسلہ تقرری نو دی جاتی ہے۔ آپ کی تقرری کا اعلان آج کے جریدۂ سرکاری میں کر دیا گیا ہے۔ والسلام

آپ کا مخلص

(دستخط) برکت اللہ۔ معتمد نوآبادیات

(حکومتِ پاکستان)

مکرر :-

اس مراسلہ کے ہمراہ، آپ کی سہولت کی خاطر، تازہ ترین قواعد تحفظِ حکومت برطانیہ کی ایک نقل اور ایک کتابچہ بعنوان "برطانوی رعایا سے پیش آنے کے طریق" بھی شامل ہے۔

امید ہے کہ یہ رسالہ آپ کے لئے کافی سود مند ثابت ہوگا۔

(دستخط ب ا)

●

اگلے روز میں اپنے تقرر کی مزید تفصیلات معلوم کرنے کی غرض سے دفتر نوآبادیات میں گیا، تو معلوم ہوا کہ مجھے جلد از جلد انگلستان پہنچ جانا چاہیے کیونکہ وہاں مخالف عناصر نے پاکستان کے خلاف ایک زبردست ایجی ٹیشن شروع کر رکھی ہے بلکہ اکثر مقامات پر انگریز باغیوں کے گروہوں نے برطانیہ میں مقیم پاکستانی افواج کے خلاف گوریلا جنگ کی ابتدا بھی کر دی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ برطانیہ کے گوریلا زیادہ تر لنکا شائر کے ضلع میں مصروفِ عمل ہیں۔ دفتر نوآبادیات میں مجھے بتلایا گیا کہ حکومت پاکستان علاقہ متاثرہ میں امن و امان کی بحالی کے لیے صدقِ دل سے خواہش مند ہے اور اس مقصد کے لئے اس نے کئی اعلیٰ تربیت یافتہ اور دیرینہ تجربہ کار انتظامی افسروں کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہیں افسروں میں سے ایک میں بھی تھا۔

مہتمم نوآبادیات نے جو بذاتِ خود انتظامیۂ پاکستان کا ایک پرانا اور آزمودہ کار افسر تھا۔ برطانیہ کی عام صورتِ حال اور میرے مستقبل کے فرائض کے بارہ میں مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھو ہم ایک ایسی قوم کے افراد ہیں، جس کا تمدن نہایت اعلیٰ اور جس کی روایات نہایت بلند پایہ ہیں، ہماری تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ لیکن اس عصر ہماری برطانوی رعایا اپنے سابق فرمان رواؤں کی حرصِ اقتدار کے باعث متعدد خونیں جنگوں میں مبتلا ہو کر تہذیبی اور اخلاقی لحاظ سے گہری پستیوں میں گر چکی ہے۔ لہٰذا ہم پر اپنی برطانوی رعایا کی تہذیب اور ان کے اخلاق کو بلند کرنے کا مقدس فرض عائد ہو جاتا ہے۔ برطانیہ کے تمام باشندے جنگ اور جبر کی چھاؤں میں پلے اور بڑھے ہیں، ہمیں ان کو زندگی کی نئی اور جمہوری قدروں سے روشناس کرانا ہے۔ جب تم وہاں جاؤ تو وہاں کی رعایا کے ساتھ اس قرینے سے پیش آؤ جو ان کی نظروں میں تمہاری اور تمہارے ملک کی عزت و شوکت کو دوبالا کر دے، اس امر کا خاص خیال رکھو کہ تمہیں برطانوی باشندوں کے دلوں پر اپنے ملک، اپنی تہذیب، اپنے لباس، اپنی زبان اور اپنی معاشرت کی ہیبت پا کی کا گہرا نقش جمانا ہے ——— ایسا گہرا نقش، جس کے بعد ہر گونہ رہنمائی کے لئے، وہ بس تمہاری ہی ذات یا تمہارے ہی ملک کی طرف دیکھیں"۔

مہتمم نوآبادیات کی ان نصیحتوں کے جواب میں میں نے بادب یہ عرض کی۔

"جناب والا! مجھے اپنے فرائض کی نزاکت و اہمیت کا پورا پورا احساس ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے اس نئے نئے مفتوحہ علاقہ میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ آپ بے فکر رہیں، میں اس ضمن میں اپنے مقدور سے کہیں زیادہ کوشش کر کے دکھا دوں گا۔"

●

برطانیہ پر پاکستان کا قبضہ آج سے پچیس برس پہلے ہوا تھا۔ اور وہ یوں کہ جب تیسری عالمی جنگ میں مغربی اقوام نے مشرقی اقوام سے شکست فاش کھائی اور پھر اس جنگ کے بعد جب مجلس اقوامِ مشرق نے امن و امان اور کاروبارِ زندگی کی بحالی کی خاطر، فاتح ممالک کے مابین یورپ کے مفتوحہ علاقوں کا بٹوارہ کیا، تو جزائر برطانیہ پاکستان کے حصے میں آگئے، اور یوں ہیم فلک نے اس سرزمین پر پہلی مرتبہ ہلالی پرچم کی دلکش ادائیں دیکھیں۔

●

قیامِ انگلستان کے لئے تیاریوں کے دوران میں مجھے سب سے زیادہ فکر لباس کی فراہمی کا تھا۔ کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ انگلستان میں اچھا پاکستانی لباس تیار کرنے والے درزی مشکل ہی سے ملتے ہیں اور جن چند انگریز درزیوں نے پاکستانی لباس سینے شروع کر رکھے ہیں وہ کامل طور پر معیاری حد تک تیار کرنے سے قاصر ہیں، البتہ میں نے اپنے لئے پاکستان ہی سے، تمام موسمی کپڑے، مثلاً پگڑیاں، ململ کے کرتے، گرم کپڑے کی شلواریں وغیرہ

کی قیمت صدریاں، کشیدے اور پٹی کی ٹوپیاں، شام کو پہننے کے لئے ہلکے تہمد، اور پاکستان کی ساختہ دوسری متفرق اشیا خرید لیں۔ پاکستان نے پہلے ہی سے کپڑے کی صنعت میں درجۂ کمال حاصل کر رکھا تھا۔ اور اس کے ساختہ کپڑے، وسیع مقدار میں نو آبادیات میں بھیجے جاتے تھے، جہاں سے ان کے عوض ہمیں خام مال مہیا کیا جاتا تھا۔

●

امیر سے مکین - - - - - -

آخر کار وہ دن آپہنچا جب میں ایک پاکستانی بحری جہاز "مشہورِ لستان" نامی میں سوار ہو کر عازمِ انگلستان ہوا۔ یہ جہاز دو ہفتوں کے سفر کے بعد لیورپول پہنچا۔ لیورپول سے ایک ریل گاڑی کے ذریعہ میں نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد مانچسٹر آیا، جو ضلع لنکا شائر کا صدر مقام ہے۔ جونہی میری گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی، انگریزی باشندوں کا ایک جمِ غفیر استقبال کے لئے میرے ڈبے کی طرف لپکا، اس گروہ میں شہر کے سرکردہ لوگ، اعلیٰ عہدیداران، میرے دفتر کا عملہ اور کچھ عام لوگ شامل تھے۔ شہر کے سرکردہ لوگ اور اعلیٰ عہدیداران زیادہ تر پاکستانی لباس یعنی لمبے کرتوں، صدریوں اور پگڑیوں میں ملبوس تھے چند ایک نے اچکنیں اور جناح ٹوپیاں بھی پہن رکھی تھیں، نچلے درجے کے افسر اور ماتحت اہلکار البتہ مقامی باشندوں کے لباس یعنی کوٹ پتلون اور نکٹائی میں ملبوس تھے اور دور ایک کونے میں اچھوتوں کی مانند کھڑے تھے اُن کے اطوار سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے محکومانہ لباس کے باعث شرم سے کٹے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جب وہ خیر مقدم کے لئے آگے آئے تو میں نے دیکھا کہ ان کی نیچی نگاہوں سے احساسِ کمتری اور احساسِ ندامت کی جیسے ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اکثر بدنصیب تو میرے پاس آکر شدتِ ادب سے پالتو جانوروں کی مانند زمین پر لیٹ جانے کی سی فرمائش لگے۔

ادھر جو لوگ پاکستانی لباس میں ملبوس تھے وہ ایک شانِ برتری کے ساتھ اتنا اترا کر پلیٹ فارم پر ٹہلتے پھرتے تھے۔ اور اپنے کرتوں، طرئوں اور اچکنوں کی نمائش میں دوسرے ہم لباس بھائیوں سے خواہ مخواہ سبقت لے جانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے اپنی پگڑیاں نہایت بھونڈے انداز میں باندھ رکھی تھیں اور ان کے طرّوں کو قطعی غلط مقامات پر موجود کر رکھا تھا جب وہ مجھ سے مصافحہ کرنے کے لئے میرے پاس آتے تو وفورِ کسرِ نفسی میں انتہائی طور پر جھک گئے، اور اپنی مسکین صورتوں کو پہلے سے بھی زیادہ فدویانہ بنا لیا، پھر جب اُنہوں نے مجھ سے ہاتھ ملائے تو اپنے مخصوص انگریزی لہجہ میں "السلام علیکم" کے الفاظ کچھ اس طرح ادا کئے جیسے کہہ رہے ہوں "اس سلم۔ لو۔ کم" پہلے پہل تو ان کی بولی میں سمجھ ہی نہ سکا۔ لیکن آخر کار ہوتے ہوتے ان کے لب و لہجے سے کان مانوس ہو گئے۔

خیر مقدم کے لئے آنے والوں سے تعارف کے بعد میں باہر جانے کے لئے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ یہ سیڑھیاں آج بڑی عمدگی اور نفاست کے ساتھ سجائی گئی تھیں، اور ان کے بیچوں بیچ کوئی دو فٹ چوڑا نہایت ہی اعلیٰ سبز ریشمی کپڑا، پہلے زینے سے آخری زینے تک بچھا ہوا تھا ــــــ لنکا شائر کے قائم مقام ڈپٹی کمشنر مسٹر خدا بخش مستانہ میرے دائیں جانب تھے اور شہر کے مشہور رئیس سرجان گلبرٹ، دوسرے عمائدین اور عہدیداران کے ہمراہ میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، سیڑھیاں اترنے کے بعد ہم ایک جگمگاتی ہوئی رولز رائس کے قریب آکر رکے۔ جو اسٹیشن کے صدر دروازے کے قریب کھڑی تھی، اور جس کے بونٹ پر ایک ننھا سا پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔

کار کے پہلی طرف شہر کا ایک انگریزی بینڈ صرف اشارے کا منتظر کھڑا تھا، کار اور بینڈ سے ہٹ کر جہاں تک نگاہ جاتی تھی، سڑک کے دو رویہ تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے نظر آتے تھے۔

جونہی میں کار میں داخل ہوا، بینڈ کے مجمع لب کھل گئے، اور اس نے مشہور و مقبول پاکستانی نغمے کی تان اٹھائی ــــــ "ہمیں ہے کن یہ عالی"[illegible] اور اس گیت کے فضا میں گونجنے کے ساتھ ہی تماشائیوں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

"پاکستان زندہ باد!"

●

مسٹر خدا بخش مستانہ مجھے ڈپٹی کمشنر کی سرکاری قیام گاہ تک لے گئے۔ قیام گاہ میں پہنچ کر انہوں نے مجھے نہایت ہی پُر تکلف "پاکستانی" ظہرانہ کھلوایا۔
میں نے ظہرانہ کھاتے ہوئے مسٹر خدا بخش مستانہ سے کہا۔
"بھئی آپ کا کھانا خوب پکا ہوا ہے، کیا آپ اپنے ہمراہ کوئی پاکستانی باورچی لائے تھے؟"
"جی نہیں" انہوں نے جواب دیا "میرے ہاں ایک انگریز باورچی ہے جو پاکستانی کھانے نہایت عمدہ پکا لیتا ہے۔ ایسے انگریز باورچی یہاں بآسانی مل جاتے ہیں لیکن انہیں عام باورچیوں کی نسبت ذرا زیادہ تنخواہ دینا پڑتی ہے۔ ——— یہ انگریز خادم بڑے تابعدار ہوتے ہیں اور تھوڑی سی تربیت کے بعد خاصے مفید ثابت ہوتے ہیں۔"
"بہت اچھا!" میں مسرت سے بولا۔ "مجھے اس کا بڑا فکر تھا کہ یہاں پاکستانی کھانے کیسے مہیا ہوں گے؟"
"آپ قطعاً فکر نہ کریں" خدا بخش بولے "آپ جو بھی پاکستانی شے طلب کریں گے، یہاں بآسانی مل جائے گی۔ یہاں کے لوگ آہستہ آہستہ پاکستانی طرزِ زندگی اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں اور یہاں کے چند رئیس لوگ تو ہماری نقالی میں اس قدر کامیاب ہیں کہ جب آپ انہیں دیکھیں گے تو ان کے اطوار میں خود پاکستانیوں سے زیادہ پاکستانیت پائیں گے۔"

●

چھری اور انگلیاں

رات کو سرجان گلبرٹ نے میرے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا، جس میں روٴسائے شہر کی ایک کثیر تعداد کو مدعو کیا گیا تھا۔ سرجان گلبرٹ کے مکان کے ایک وسیع و کشادہ کمرے میں نہایت دبیز ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ قالینوں کے بیچوں بیچ ایک نہایت قیمتی کارچوبی دسترخوان دراز تھا اور دسترخوان پر متعدد پلیٹوں میں انواع و اقسام کے پاکستانی کھانے سجے ہوئے تھے۔ ان کھانوں میں پلاؤ، قورمہ، مرغِ مسلّم، آلو گوشت، زردہ، فرنی، کوفتے وغیرہ شامل تھے۔ ہم اپنے جوتے اتار کر دسترخوان کے اردگرد بیٹھ گئے اور ایک انگریز بیرہ جو مشرقی پشتم کے لباس کی طرز پر بنی ہوئی زرق برق وردی میں ملبوس تھا، ایک سلفچی اور تولیہ لئے ہوئے آیا اور باری باری سے مدعوین کے ہاتھ دھلانے لگا۔
میں نے اس دوران میں بیگم گلبرٹ سے پوچھا "کیا آپ چھری کانٹے استعمال نہیں کرتے"
بیگم گلبرٹ میرے اس سوال پر کچھ گھبرا سی گئیں، اور پھر جیسے اقرارِ جرم اور شرمندگی سے پُر لہجے کے ساتھ بولیں۔
"جی نہیں! چھری کانٹے ہمارے ہاں صرف نچلے طبقے کے لوگوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو چھری کانٹے دورِ جہالت کے قدیم انسانوں کی یادگار ہیں جب لوگ کچا یا ادھ پکا گوشت چھریوں سے کاٹ کاٹ کر کھایا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ لوگ اپنی روشنی سے بہرہ مند کرنے، کھانے کے اس جاہلانہ طریق کو بالکل ترک کر چکے ہیں اور چھری کانٹوں کی بجائے ہاتھوں سے کھانا کھاتے ہیں کیونکہ دراصل کھانے کا یہی طریق فطری اور مہذب ہے، ——— یقین جانئے ہم گھروں میں نجی طور پر بھی کبھی چھری کانٹے استعمال نہیں کرتے۔"
بیگم گلبرٹ نے یہ آخری جملہ کچھ ایسے ملتجیانہ انداز میں ادا کیا، جیسے اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر چھری کانٹوں سے کھانا کھانے کا یہ فعل کسی طور پر بھی ان کے ہاں ثابت ہو گیا تو ان کا سارا وقار مٹی میں مل جائے گا۔
میں نے کھانے کی سمت ہاتھ بڑھایا اور پھر جونہی میں نے ایک روٹی اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑی، جملہ حاضرین نے میری نقالی کی۔ البتہ بیگم گلبرٹ مجھے کچھ پریشان نظر آئی کہ ایک نو عمر لڑکی نے روٹی کو دائیں ہاتھ کی بجائے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، بیگم نے لڑکی کو دھیمے سے کہنی ماری جس پر اس لڑکی نے روٹی کو دائیں ہاتھ میں بدل لیا۔ اس کے بعد میں نے روٹی کے لقمے کو آلو شوربے کی رکابی میں ڈبو دیا، اور حاضرین نے پھر میری ہی نقالی کی۔ لیکن ان میں سے اکثر نے لقمے کو رکابی کے اندر اس قدر گہرا ڈبو دیا کہ ان کی تمام انگلیاں اور انگوٹھوں کے آدھے سے زیادہ حصے شوربے میں تر بتر ہو گئے

مرجان گلبرٹ اعوان کی بیگم نے غالباً اپنی غلطی محسوس کر لی۔ کیونکہ انہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میری صرف دو انگلیاں شوربے میں ڈوبی تھیں اور باقی سب خشک تھیں۔ چنانچہ وہ دلاں میری نظریں بچا کر اپنی انگلیوں کو رومال سے صاف کرنے کی سعی کرنے لگے۔ میں ان کی بے چارگی پر ترس کر تے ہوئے بولا

"بیگم صاحبہ! پریشان نہ ہوئیے یہ سب کچھ دراصل مشق چاہتا ہے۔ آہستہ آہستہ آپ سیکھ جائیں گی"

پھر میں نے ان کی خفت مٹانے کے لئے کہا "آپ کا کھانا واقعی بہت لذیذ ہے"

"شکریہ حضور!" مرجان گلبرٹ لجاجت آمیز مسرت سے بولا "میری لڑکی نے حال ہی میں پاکستانی کھانے تیار کرنے کا ایک امتحان پاس کیا ہے۔ اور آج وہ سارا دن باورچیوں کی خود نگرانی کرتی رہی ہے"

"ہم آپ کی لڑکی کو مبارکباد دینا چاہتے ہیں" میں نے جواباً کہا۔

بیگم گلبرٹ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور وہ بولی۔ "وہ آپ کی حوصلہ افزائی سے بے حد مسرور ہوگی۔ اور میں کھانے کے بعد اسے ضرور پیش خدمت کروں گی"

یہ ایک بہت بڑی ضیافت تھی۔ چنانچہ اس کے ذریعہ مجھے عمائدین شہر کی بیشتر تعداد سے گفتگو کرنے کا موقعہ مل گیا۔ عمائدین شہر میں سے چند ایک نے مجھ سے ایک خاص احساس تفاخر کے ساتھ اردو میں گفتگو کی۔ لیکن اردو میں رواں گفتگو چند ایک اشخاص ہی کر سکے ورنہ اکثر اشخاص کے انداز گفتگو سے زیادہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اردو میں بولنے کا تکلف ایک بارگراں بن کر ان کے ذہن کو کچل رہا ہے۔ وہ جب اپنے مقامی لب ولہجہ کے ساتھ اردو کے الفاظ ادا کرتے تو ان کا تلفظ بڑے ہی بھونڈے اور تمسخر انگیز انداز میں کرتے اور اکثر اوقات تو اس امر کا پتہ ہی نہ چلتا کہ آں جناب کیا فرما رہے ہیں۔ اس ضمن میں نے ایک اور چیز بھی دیکھی اور وہ یہ کہ جب وہ کسی پاکستانی سے گفتگو کرتے تو وہ اپنی مقامی بولی بولتے لیکن اس بولی میں بھی وہ جا بجا اردو کے الفاظ اور جملے ٹانکنے کی ضرور کوشش کرتے۔ تاہم کسی پاکستانی کی موجودگی میں وہ اپنے مابین بھی انگریزی بولنے سے احتراز کرتے۔

●

تعلیمی جامعات۔

اگلی صبح مجھے بتلایا گیا کہ شہر کے ماڈل ہائی اسکول نے میرے اعزاز میں ایک کھیلوں کے میلے کا اہتمام کیا ہے۔ جس کے پروگرام میں میرے ہاتھوں سے بچوں کو انعامات تقسیم کرنا بھی شامل ہے میلہ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے میں اسکول پہنچا جونہی میری کار اسکول کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر میری طرف فدویانہ انداز میں لپکا اور ایک فرشی سلام بجا لایا۔ میں نے کار سے اتر کر اسکول کے طلباء کے کمرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور ہیڈ ماسٹر میری معیت میں کمروں کی سمت چلا۔ اسکول کے کمرے خوب سجائے گئے تھے۔ اور ہر ایک کے دروازے کے عین سامنے ایک سبز کپڑے پر سنہرے الفاظ میں "خوش آمدید" لکھا ہوا تھا۔ جونہی میں ایک کمرے میں داخل ہوا۔ سارے کے سارے طلباء یکدم کھڑے ہو گئے۔ اور پھر یک زبان بولے۔ "السلام علیکم" ——— اور پھر جب میں اپنے مختصر سے معائنہ کے بعد کمرے سے باہر نکلا تو تمام لڑکے مع اپنے استاد کے میٹھے سروں میں گانے لگے۔

"قائم رہے ہمیشہ فرماں روا ہمارا"

اس کے بعد ہیڈ ماسٹر مجھے اسکول کے بہترین کمرے میں لے گیا اور بولا!

"جناب والا! یہ ہمارا اردو کا کمرہ ہے۔ جہاں تمام جماعتوں کے طلباء باری باری آتے ہیں اور اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اردو ہمارے اسکول میں لازمی مضمون ہے ویسے بھی ہمارے طلباء اردو کی تعلیم خوشی خوشی حاصل کرتے ہیں کیونکہ یہ ایک نہایت ہی آسان زبان ہے"

میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ داڑھی اور عجیب لباس والا۔ لیم وشیم اور قدآور پاکستانی استاد انگریزی

کو اردو پڑھا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے استقبال کو بڑھا۔ اور پھر جیسے میری فرنائگی پہ مسکرا دیا ۔

میں نے اس سے پوچھا "آپ یہاں کب آئے ؟"

"پچھلے سال"

"کیسے آ نکلے تھے یہاں ؟"

"انگریز بچوں کو اردو پڑھانے"

"یہ تو خیر میں دیکھ ہی رہا ہوں ــــــــ لیکن کیا آپ ایک تربیت یافتہ استاد ہیں ؟"

"جی ہاں"

"کیا آپ پاکستان میں بھی معلم تھے ــــــــ اور آپ رہنے والے کہاں کے ہیں ؟"

"میں جھنگ کا رہنے والا ہوں لیکن میں پاکستان میں معلمی کا کام نہیں کرتا تھا"

"پھر کیا آپ کا تعلق استادوں کے کسی خاندان سے ہے ؟"

"جی نہیں !" اور پھر اس کی نگاہیں جھک سی گئیں ۔ خفیف سا ہو کر وہ بولا "پاکستان میں ہمارا کنبہ نائیوں کا کام کرتا ہے ۔ لیکن میں یہاں استاد ہو کر آیا ہوں"۔

"اچھا ! تو آپ در اصل ایک نائی ہیں ــــــــ پھر آپ کس طرح سے ــــــــ خیر خیر ذرا ادھر تو آؤ ــــــــ" اور میں اسے ایک کونے میں لے گیا "تم بچوں کو سبق کیسے پڑھاتے ہو"۔

"آپ فکر نہ کریں" وہ دھیمی سے بولا "میں اس جگہ پر ایک بے حد کامیاب شخص ہوں! وہ انگریز طلبا بھی جو زبانِ اردو کے اعلیٰ ترین تعلیمی درجات ۔ مثلاً ایم اے اور پی ایچ ڈی وغیرہ میں داخل ہیں میرے علم و فضل کے بے حد قائل ہیں وہ میرے پاس آکر گھنٹوں بیٹھتے ہیں ۔ میرے ساتھ اردو میں گفتگو کرتے ہیں اور بڑے غور ہی کے ساتھ میرے اردو لب و لہجہ میرے ہونٹوں کی حرکات کی کامل نقالی کرنے کی مشق کرتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ اگلے روز پھر میرے پاس آتے ہیں اور اپنی مشق کے نتائج کا مظاہرہ کر کے مجھ سے مزید تعلیم کے خواہاں ہوتے ہیں اور کبھی یہ محسوس نہیں کر پاتے کہ میری نقالی ان کی صورتوں کو کس قدر مضحکہ خیز بنا دیتی ہے ۔

میں یہ سُن کر حیرت سے اچھل پڑا اور پھر بولا ۔ "ماشاء اللہ ! ــــــــ تب تو تم اپنی موجودہ ملازمت کو بے حد پسند کرتے ہو گے ــــــــ اچھا تو یہ بتاؤ تمہیں تنخواہ کیا ملتی ہے ؟"

"آٹھ سو روپے ماہوار"

"اور انگریزی کے استادوں کی تنخواہ کیا ہے"

"صاحب ان کی تو بُری حالت ہے ! اتنی سو روپلی ماہوار سے بے چارے کبھی نہیں بڑھ پاتے !"

●

غنڈے اور چودھری

اسکول کے معائنہ کے بعد جب میں واپس اپنی کوٹھی پر آیا ۔ تو میرے مسٹر سنڈھی مسٹر ڈیول نے میرے سامنے ضلع کے ان سرکردہ اشخاص کی ایک فہرست پیش کی جو سلام عرض کرنے کے لئے حاضر ہو رہے تھے ۔ میں نے سکرٹری سے کہا کہ وہ انہیں اگلے ہفتہ کی کسی تاریخ کو دوبارہ آنے کے لئے کہہ دے کیونکہ میں بہت تھکا ہوا ہوں ۔

مسٹر ڈیول نے لجاجت آمیز لہجے میں درخواست کی کہ میرے خیال ناچیز میں حضور والا، ان میں سے دو تین اشخاص کو ضرور شرف باریابی بخشیں۔ یہ لوگ اس عزت افزائی پر ہمیشہ کے لئے بے دام غلام بن جائیں گے۔"

میں نے اس نکتہ آفرینی پر چونک کر سیکرٹری کی جانب دیکھا۔ اور پھر بولا

"اچھا تو پھر انہیں بلا لو ——— لیکن وہ ہیں کون؟"

سیکرٹری نے جواب دیا "حضور! ان میں سے ایک تو نواب العرفہ سبحان الدولہ ہے۔ دوسرا خان خاناں جعفری ڈی مونٹ مورلنسی ہے۔ تیسرا بدمتری لا فورڈ چیپس ہے۔ اور چوتھا مقامی طبیہ کا مدد جان گلبرٹ ہے۔ یہ سب کے سب خطاب یافتہ ہیں اور حکومت پاکستان کے از حد وفادار خادم ہیں!"

میں نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔ "پہلے نواب کو حاضر کر دو!"

اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد میرے کمرے میں ادھیڑ عمر کا ایک پست قامت اور وسیع ڈیل ڈول کا شخص داخل ہوا۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں بل دے رکھی تھیں جو اس کی خشخشی داڑھی پر بلا سبب ورمان بن کر معلق تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک مرتبہ تو دروازے ہی میں احتراماً خم ہو گیا۔ اس کے بعد دھیمے دھیمے چلتا وہ میرے قریب آیا۔ اور ایک مرتبہ پھر حالتِ رکوع میں جھکا، پھر بڑی ہی عاجزی کے ساتھ اس نے اپنے دونوں ہاتھ مری سمت مصافحے کے لئے بڑھائے۔ میں نے بھی اپنا ایک ہاتھ بڑھایا جسے اس نے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر لپک کر قبول کیا، اور پھر کھیس نکالتے ہوئے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کہیے نواب اورن، کیا حال ہے؟"

"حضور والا کی مبارک دعاؤں اور حضور والا کی بے پایاں نوازشوں سے خیریت سے ہوں، فرمایئے حضور والا کے مزاج کیسے ہیں حضور والا کے بچے، حضور والا کے ہم وطن بھائی اور حضور والا کا ملک تو خیریت سے ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا "نواب اورن ہم یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ آپ ہماری حکومت کے وفادار دوست ہیں"

"شکریہ حضور والا کا ——— واقعی میں حضور والا کی حکومت کا ایک حقیر وفادار خادم ہوں۔ اور میری ساری عزت، دولت اور حکومت، حضور والا کی حکومت کی عنایت خسروانہ کا نتیجہ ہے"

"نواب اورن ہم آپ کے خاندان کا کچھ حال سننا چاہتے ہیں"

"بجا ارشاد ہوا حضور والا ——— سنئے، اے سنئے حضور ——— فدوی کا شمار اس ضلع کے سرکردہ لوگوں میں ہوتا ہے اور میرے خاندان کو ماضی میں حضور والا کی سرکار بدولت مدار کی طرف سے پانچ ہزار ایکڑ اراضی کا عطیہ ملا ہے۔ یہ عطیہ ہماری ان حقیر خدمات کا صلہ ہے جو ہم نے اس ضلع میں گزشتہ عوامی بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلہ میں انجام دی تھیں۔ حضور والا! سچ پوچھئے تو میں اپنے ہم وطنوں کی قبیح حرکات پر بے حد نادم ہوں۔ یہ بدبخت دراصل چند غنڈوں کی طرف سے گمراہ کئے جا رہے ہیں۔ ایسے غنڈوں میں جان تیلر، مستہ اور ڈارون جیسے لوگ شامل ہیں۔ ان سب کا سرغنہ جان نیلر ہے۔ یہ ایک بالکل کنگال شخص ہے اور وہ سرکار دولت مدار کے خلاف خلقِ خدا میں نفرت پھیلا کر اور ایجی ٹیشن چلا کر ذلیل اور سستے طریق سے عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ بے ایمان عوامی جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے تمام ساتھی اول درجے کے بدمعاش ہیں جن کا علاج سوائے گولی کے کچھ نہیں۔"

"میرا سارا خاندان اور دوسری رعایا حکومت پاکستان کے صدق دل سے وفادار خادم ہیں اور ہمارے نزدیک پاکستانی تہذیب کی بقا تمام اقوام میں سب سے زیادہ عالی قدر دوگ ہیں۔ میں نے اپنے ہاں کی طرح پر قومی جوانوں کا دستہ باغیوں کی سرکوبی کے لئے منظم کر رکھا ہے۔——

چنانچہ یہ بدمعاش جب بھی ہمارے گاؤں کا رُخ کرتے ہیں، منہ کی کھا کر واپس ہوتے ہیں۔

"شاباش، شاباش، نواب اعلیٰ شاباش!" میں نے اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔ "ایسی ہی خدمات کے بدلے ہم نے آپ کو نواب بنایا ہے۔"

"جی حضور والا! فدوی کی نوابی کی ایک وجہ اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ گزشتہ عام بغاوت کے دنوں میں جب جلالت مآب حضرت والا شان جناب محمد خان صاحب سپہ سالار اعظم افواج پاکستان کا خیمہ بدمعاش باغیوں کے نرغے میں آگیا اور ان کے تمام اعلیٰ افسران انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تو جلالت مآب کا یہ حقیر خادم ان کی اردلی میں بدستور موجود رہا اور انہیں باغیوں کے گھیرے سے بحفاظت نکال کر بخیر تمام ضلعی صدر مقام میں لے آیا۔"

"ہم یہ واقعہ بھی سن کر بڑے خوش ہوئے ہمیں امید ہے کہ نواب اردلی آپ آئندہ بھی ہمارے اسی طرح وفادار رہیں گے۔"

"یقیناً حضور والا۔ فدوی کی ساری عزت، دولت اور شان و شوکت حضور کی حکومت کی عطا کردہ ہے، لہٰذا جب بھی ضرورت پڑے گی۔ ہم اپنی زندگیاں تک حضور والا کی حکومت کی خاطر قربان کر دیں گے۔"

"اچھا تو نواب اردلی اب آپ جا سکتے ہیں!" ——— اور نواب اردلی مسکینی سے ایک دو مرتبہ جھک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد چودھری چیپ لارڈ حاضر ہوا۔ وہ ایک مخصوص لٹک رفتاری سے چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے اپنی پگڑی خاصے اچھے انداز میں باندھ رکھی تھی جس کا کلف زدہ طرہ بھی خاصا طویل تھا۔ مصافحہ کے بعد وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنے طرہ کے مقام کے تعین کے بارے میں کچھ پریشان سا ہے۔ چنانچہ اس نے پگڑی کو متعدد مرتبہ مختلف زاویوں پر جمایا۔ تاکہ اس کے طرے کو معیاری مقام حاصل ہو جائے۔

آخر کار میں نے اسے اس مخمصے سے نجات دلانے کے لئے سلسلۂ گفتگو چھیڑا اور بولا "سناؤ، چودھری چیپ کیسے ہو؟"

"عنایت ہے سرکار عالی کی، ——— میں حضور کی بابرکت نوازشات کی طفیل اچھا ہوں، ——— آپ فرمائیے۔ حضور والا اور حضور والا کے بچوں، حضور والا کے ہم وطنوں اور حضور والا کی حکومت کا مزاج کیسا ہے؟"

"سب ٹھیک ہیں" میں نے جواب دیا "چودھری چیپ، بتلاؤ، تم نے ہماری حکومت کی کیا کیا خدمات سرانجام دی ہیں؟"

"حضور والا، فدوی کے خاندان نے پاکستانی افواج کو رنگروٹ اور جنگی سامان مہیا کرنے کے لئے بڑی عظیم قربانیاں پیش کی ہیں۔ صرف میرے خاندان نے اب تک اسی رنگروٹ فوجی خدمت کے لئے پیش کئے ہیں۔ ان میں میرا ایک لڑکا اور دو بھتیجے بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ہم نے تین سو مزید رنگروٹ بھی حکومت پاکستان کو فراہم کئے تھے۔ عوامی غدر کے خوفناک ایام میں میرے علاقے کے اندر کامل امن و امان رہا۔ اور یہ سب میری ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وہ تمام غنڈے اور بدمعاش جو لوگوں کو خواہ مخواہ حکومت کے خلاف مشتعل کر رہے تھے گرفتار ہو گئے، میں نے ایسے تمام مخالف عناصر کی نشاندہی حکومت کی خدمت میں پیش کر دی تھی اور میری ہی مخبری پر مشہور باغی راہنما جند کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ چنانچہ ان خدمات کے عوض مجھے حکومت پاکستان نے دو ہزار ایکڑ اراضی کی جاگیر اور "چودھری" کا خطاب عطا فرما رکھا ہے!"

"آپ کی خدمات بہت شاندار ہیں، چودھری چیپ، ہم بہت خوش ہوئے آپ کے حالات سن کر۔"

"لیکن حضور والا! میں تو دراصل نواب بننے کا حق رکھتا ہوں۔ کیونکہ جیسا کہ آپ نے بھی ملاحظہ فرمایا ہے۔ اس منصب کے لئے میری خدمات کسی طرح بھی کم نہیں ہیں!"

"ہوں! ——— ہم تمہارے معاملے پر غور کریں گے چودھری! اور امید رکھو کہ تمہیں تمہارا حق مل جائے گا!"

"بہت بہت شکریہ حضورِ والا کا!"

اور یہ کہہ کر چوہدری چیپس اپنی کرسی سے اُٹھا۔ متعدد مرتبہ کورنش بجا لایا، اور پھر انتہائی مودبانہ انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

چوہدری چیپس کے جانے کے بعد میں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر ولیل سے کہا۔

"مسٹر ولیل خانِ خاناں اور مسز جان گلبرٹ سے کہہ دو، اب ہم بہت تھک گئے ہیں لہٰذا ان سے سہ پہر کی چمنستانی دعوت میں ملیں گے۔"

●

پرانادے اور شلوار

سہ پہر کو میں بلدیہ مانچسٹر کی طرف سے دی ہوئی چمنستانی دعوت میں شمولیت کی غرض سے باغِ اقبال میں گیا، باغ میں چاروں طرف قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور فی الواقعہ ایسا گمان ہوتا تھا، جیسے ان تختہ ہائے گل کی رنگینیوں میں شاعرِ مشرق کی حسین تخیل کا پرتو جھلک رہا ہے ——— قریب ایک ہزار اشخاص کو اس دعوت میں مدعو کیا گیا تھا ——— اور مہمانوں سے ذرا ہٹ کر پورے پانچ انگریزی بینڈ والے کے منتظر موجود تھے۔

جوں ہی میری کار باغ کے صدر دروازے کے سامنے رکی۔ صدر بلدیہ مسز جان گلبرٹ مع چند عمائدین کے میری پیشوائی کی، اور پھر مجھے اپنے جھرمٹ میں لے کر مجلس کے وسط تک لے آئے۔ پھر مدعوئین سے میرا تعارف کرایا گیا۔ اور اس کے بعد مجھے ایک نہایت نفیس اور قیمتی میز کے سامنے بٹھلا دیا گیا۔ یکایک میری نگاہیں چند انگریز لڑکیوں کی سمت اٹھیں جنھوں نے اپنے سر کے بال انگریزی طرز کی بجائے پاکستانی وضع کے مطابق گوندھ رکھے تھے، اور باقاعدہ مینڈھیاں نکال کر انھیں پراندوں سے باندھ رکھا تھا۔ ایک لڑکی میرے قریب ہی بیٹھی تھی اور پراندے میں کر خاصی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "یہ پراندہ اس نے کہاں سے لیا ہے؟"

لڑکی نے جواباً مجھے بڑے اشتیاق کے ساتھ بتلایا۔ کہ حال ہی میں اس کا بھائی لاہور یونیورسٹی سے اردو ادبیات کا ایم اے کر کے لوٹا ہے۔ اور وہ آتے ہوئے ایسے تین پراندے اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔

میں نے بیگم گلبرٹ سے کہا "بیگم صاحبہ! بھلا دیکھئے تو، اس بچی کو پراندہ سجا ہے یا نہیں؟"

بیگم گلبرٹ تمکنت سے بولی "بہت خوب سج رہا ہے جناب!" پھر فخریہ کہنے لگی۔ "یہ بچی میری بھتیجی ہے، سچ پوچھئے تو اسے دیکھ کر میری دونوں لڑکیاں بھی پراندے کے شوق میں ہلکان ہوتی جاتی ہیں۔ ہمارے شہر کے ایک سیاح نے پاکستان سے پراندے منگوائے تھے لیکن نہایت ہی محدود مقدار میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئے اور جب میری لڑکیاں لینے کے لئے گئیں تو بیچاری محروم واپس آئیں"

"ہم آپ کے لئے پراندوں کا انتظام کر دیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ جناب کا۔ لیکن، معاف کیجئے گا۔ آپ کو اس ضمن میں خواہ مخواہ زحمت ہوگی، میرا لڑکا آج کل ملتان یونیورسٹی میں پنجابی ادبیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ میں اسے لکھ دوں گی اور وہ یقیناً وہاں سے بھجوا دے گا۔"

یکایک ایک اور لڑکی مہمانوں کے میز الانگتی ہوئی میرے پاس آئی، اور بولی

"میں دخل در معقولات کی معافی چاہتی ہوں ——— مجھے اپنی بہن کے لئے پاکستانی جوتوں کا ایک جوڑا مطلوب ہے۔ کیا آپ از راہِ کرم اس ضمن میں کچھ اعانت فرمائیے گا؟"

"کیوں نہیں۔ لیکن تم نے جو پاکستانی جوتا خود پہن رکھا ہے وہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

"جی یہ تو میرا [illegible] سے لایا تھا وہ ملٹری میں ہیں وہاں سے ترکی فوج کی تربیت حاصل کر کے آیا ہے۔"

نیز اگر تم براہِ راست پاکستان سے جوتا منگوانا چاہو، تو وہاں کی ایک معتبر فرم کا پتہ ہم تمہیں لکھوا دیں گے "
لڑکی بولی "جیسے میرے ایک چچاجان مسٹر میکڈانلڈ پاکستانی جوتوں کی ایک بہت بڑی دکان اسی شہر میں کر رہے ہیں "
"خوب کیا نام ہے۔ تمہارے چچاجان کی دکان کا ؟"
"جی، پاکستان جوتی گھر !"
"اچھا تو کیا تمہارا منگیتر یہاں موجود ہے "
"حضور افسوس ہے، وہ آج کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ ورنہ میں اسے ضرور آپ سے ملاتی، وہ بڑا ہی سجیلا اور فیشن ایبل نوجوان ہے "
"فیشن ایبل نوجوان سے تمہاری کیا مراد ہے ؟"
"جی فیشن ایبل نوجوان میرے نزدیک وہ شخص ہے جو پاکستان کا تعلیم یافتہ ہو اور خوش لباس ہو یعنی ہمیشہ پاکستانی لباس پہنے۔ مثلاً
رح دار طرّے والی پگڑی، اچکن اور شلوار وغیرہ "
"کیا تمہیں انگریزی سوٹ پسند نہیں آتا ؟"
"توبہ توبہ ! مجھے تو صاحب انگریزی سوٹ سے دلی نفرت ہے۔ یہ بڑا بھونڈا لباس ہے خصوصاً نکٹائی تو یوں لگتی ہے جیسے کتے
میں پٹہ —— یا کسی قدیم زمانے کے غلام کا نشانِ غلامی ! —— اور پھر پتلون اپنی چستی کے باعث یوں نظر آتی ہے
نے ٹانگوں میں نلکیاں پہن رکھی ہوں —— مجھے تو بڑی نفرت ہے انگریزی پتلون سے ! کم بخت جسم کو دو حصوں میں کاٹ کے رکھ
ہے۔ اور انسان اسے پہن کر کاٹھ کے بت کی مانند سخت اور کرخت نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس شلوار بڑا خاندانی لباس ہے اس کے
دست گھیرے کی لہریں بڑی دلکش نظر آتی ہیں جیسے کوئی مور رقصاں ہو —— شلوار ہی وہ لباس ہے جسے پہن کر انسان کی شخصیت بڑی کا
نظر آنے لگتی ہے چلتے وقت شلوار میں جو مترنم سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے وہ نہ صرف شلوار پہنے ہوئے شخص کے خرام میں ایک پیاری
موسیقی کا عنصر شامل کر دیتی ہے، بلکہ دوسروں کے لئے بھی گویا ایک فردوسِ گوش پیدا کر دیتی ہے —— مجھے شلوار سے بڑی
ہے صاحب !"
جب یہ انگریزی لڑکی یوں بے خود و اعلیٰ ہو کر پاکستانی لباس کے محبت کے گیت گا رہی تھی۔ تب میرے پاس صدر بلدیہ آیا اور اس نے
یہ درخواست کی کہ ڈیوک آف ملبورا مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے لڑکی کو الوداع کہا، اور پھر ڈیوک کے ہمراہ گارڈن پارٹی سے
لوٹ آیا۔

•

کمالی اور حسن !

گھر واپس جاتے ہوئے ہماری کار میں جب "شاہراہِ وارث شاہ" نامی سڑک پر سے گزری، تو ہم نے ایک تھیٹر کی عمارت دیکھی جس کی کھڑکی
نے خلقِ خدا کا ایک کثیر اژدہام کھڑا تھا۔
اس وقت میری کار ایک انگریز شیشن جج مسٹر ماؤنٹ بیٹن چلا رہا تھا چنانچہ میں نے اس سے پوچھا
"مسٹر ماؤنٹ بیٹن۔ بھلا اس تھیٹر میں کون سا تماشا دکھلایا جا رہا ہے ؟"
"حضور ! یہاں آج کل دنیا کے عظیم ترین ڈرامانویس وارث شاہ کا مشہور و معروف ڈراما 'ہیر رانجھا' دکھلایا جا رہا ہے۔ یہ کھیل یہاں
دس ہفتوں سے پیش کیا جا رہا ہے لیکن شائقین کے جوش و خروش کا یہ عالم ہے کہ ہر شو سے پہلے تمام نشستیں پیشگی ہی سے

نوش کر لیتے ہیں"

"بہت خوب! " میں نے اظہار خوشنودی کرتے ہوئے کہا "آؤ آج ہم بھی ذرا یہ کھیل دیکھیں"

سیشن جج نے موٹر روک لی، اور پھر لپک کر میری کھڑکی کا دروازہ کھول دیا، میں موٹر سے نیچے اترا اور پھر ہم دونوں تھیٹر کی عمارت میں
مل ہو گئے۔ اسی دوران میں میں نے سیشن جج سے پوچھا۔"

"کیوں بھئی، کیا تم نے شیکسپیئر کا کوئی ڈراما پڑھا ہے؟ میرے خیال میں وہ تمہارے ملک کا ایک بہت بڑا ڈراما نویس ہے"

سیشن جج نے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر جواب دیا۔ "ہے تو سہی حضور، لیکن وہ زیادہ تر سستا مواد لکھتا ہے اور ہمارے ہاں اس کے
اسے بالعموم نچلے طبقے کے لوگ پڑھتے ہیں، اس کی تحریروں سے خالص گنوارپن ٹپکتا ہے۔ لہٰذا اعلیٰ اور شائستہ طبقے میں شیکسپیئر کی تحریروں کو
ئی پسند نہیں کرتا۔ اور پھر یوں بھی دیکھیے، تو شیکسپیئر جیسے ذلیل کا وارث شاہ جیسے عظیم فن کار سے کیا مقابلہ! ——— حقیقت یہ ہے
حضور! کہ وارث شاہ ایک بہت بڑا ادبی جادوگر ہے۔ اس کی خوبصورت زبان، نفیس و شائستہ انداز بیان، اس کی مسحور کن ادبی صناعی ———
ان کی تخیل میں سنہری، نشاط انگیز جنتیں بسا دیتی ہے، ——— شیکسپیئر کو ہمارے شرفا میں سے کوئی بھی، جسے خوش ذوقی کا ذرا سا بھی پاس ہے
ہاتھ نہیں لگاتا" ——— اور پھر ناک سکیڑتے ہوئے بولا "اجی شیکسپیئر تو نرا بکواس ہے بکواس!"

اسی گفتگو کے دوران میں ہم تھیٹر کے ہال تک پہنچ چکے تھے۔ تھیٹر کا مالک ہمیں آتا دیکھ کر بوکھلا گیا، اور پھر بعجلت تمام میرے پاس آ کر کورنش
لایا، آخر میں کہنے لگا۔

"حضور! اگر اجازت مرحمت فرمائیں تو آپ کی خدمت میں ہونے والے کھیل کی ہیروئن حاضر کروں؟"

میں نے اجازت دے دی، اور وہ ایک نوجوان بنی ٹھنی لڑکی کو میرے روبرو لایا، اور بولا "یہ مارگریٹ فلیس ہے ——— ہماری بہترین ایکٹرس!
——— جو ہمارے مشہور کھیل ہیر رانجھا میں ہیر کا کام کرتی ہے، برطانیہ بھر میں ہیر کا کام اس سے بہتر انداز میں کوئی دوسری ایکٹرس نہیں کر سکتی چنانچہ
اس وجہ سے یہ سارے انگلستان میں شیطان کی طرح مشہور ہے، اور جب کبھی اسے گھر سے باہر نکلنے کا اتفاق ہوتا ہے، تو شائقین کے ٹھٹ کے
ٹھٹ اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے راستوں پر امڈ آتے ہیں"۔

"کھیل کب شروع ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

تھیٹر کے مالک نے عاجزی سے عرض کی "حضور! لوک ناچ کے بعد"

"یہ لوک ناچ انگریزی ہے کیا؟"

"جی نہیں!" تھیٹر کے مالک نے تپاک سے جواب دیا، "ہمارے ہاں انگریزی ناچ مقبول نہیں ہے، ہم جو لوک ناچ دکھائیں گے وہ ہے
ستان کے دیس پنجاب کے رومانی خطہ یعنی ملتان کا لوک ناچ، جسے جھمر کہتے ہیں ——— یہ ناچ حضور والا کے بائیں پہلو والے چبوترے پر
گا اور تماشائیوں میں سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس ناچ میں شامل ہوں گے، ہر شام کھیل سے پہلے ہم جھمر کرتے ہیں کیونکہ اس کے
یہ ہمیں تماشائیوں کا ایک اچھا خاصا ہجوم دستیاب ہو جاتا ہے"

"کیا تم اپنے ہاں انگریزی ناچ کبھی نہیں کرتے؟"

"نہیں حضور! انگریزی ناچ تو ہمارے ہاں محض نچلے طبقوں میں رائج ہیں، صرف گنوار اور جاہل لوگ ان ناچوں کو پسند کرتے ہیں"

"مگر کیوں، ان میں کیا برائی ہے؟"

"برائی؟ ——— حضور، یہ انگریزی ناچ تو خالص جاہلانہ طریق کے حامل ہیں اور پھر ان کے ذریعہ اوباشی کے سوا کچھ حاصل نہیں

ہوتا ہے۔ سب مرد اور عورتیں، دو دو ہو کر بے ڈھنگے انداز میں زمین پر پاؤں پٹختے ہیں۔ تو ہر شریف آدمی کو یوں کودتے پھاندتے دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ ابھی یہ ناچ کیا ہیں یہ تو ایک مزاحیہ کھیل ہیں لگائی! ——— اس لئے ہمارا مہذب طبقہ پنجابی جھمر اور پنجابی بھنگڑے کا شائق ہو چلا ہے اور حضور، سچ پوچھئے تو جھمر اور بھنگڑا فی الواقعہ ہیں بھی بے حد حسین دلچسپ! ——— لیکن آج ہم جھمر سے پہلے ٹھنک ناچ کرنا چاہتے ہیں!"

"بہت خوب! تو پھر شروع کر دو!" میں نے کہا۔

تھیٹر کا مالک ہال کی سمت دیکھتے ہوئے بولا "حضور کھیل شروع ہونے میں ابھی کامل ایک گھنٹہ باقی ہے۔ لیکن دیکھ لیجئے، ہمارا ہال ابھی سے تمام کا تمام بھر گیا ہے۔ غالباً یہ حضور کی تشریف آوری کی برکت ہے۔ لہٰذا ہم بڑی مسرت کے ساتھ کھیل شروع کئے دیتے ہیں!"

اور پھر ——— دوسرے ہی لمحے میں ڈھول اور شہنائی نے ہال میں ایک نرم و شیریں موسیقی کے دریا بہانے شروع کر دیئے اور ان کے آہنگ میں ٹھنک ناچ شروع ہو گیا۔ میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ ناچ دیکھنا شروع کیا۔ پھر جب جھمر شروع ہوئی تو اس کی دلکشی سے متاثر ہو کر خود میں بھی اس میں جا شامل ہوا۔ میرے شامل ہوتے ہی ناچ کے شرکا کی تعداد آن کی آن میں اس قدر بڑھ گئی کہ ناچ کا چبوترہ آخری حد تک بھر گیا۔ اور تھیٹر والوں کو مجبوراً ہال کے دروازے بند کر دینا پڑے!

جھمر پورے عروج پر تھی۔ دو ڈھول اور پانچ شہنائیاں اپنے گیتوں سے فضا کو مسحور کر رہی تھیں اور لوک ناچ کا عروج شرکا کو بے خود و مستانہ کئے دے رہا تھا۔ ناچ کی پُرجوش وجدانی لہریں ہمیں بے خودی کے عمیق سمندروں میں دھکیلنے والی ہی تھیں کہ میری میز پر دھرا ہوا ٹائم پیس بج اٹھا اور میری آنکھ کھل گئی۔ شہنائی کی مدھم تانیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور میری بانہیں ان تانوں کے آہنگ پر اسی طرح بے خودی کے عالم میں حرکت کر رہی تھیں۔ کہ میرے نوکر دتو نے شاید تنگ آ کر مجھے بُری طرح جھنجھوڑا اور ایک خفگی آمیز ادب کے ساتھ کہنے لگا۔

"صاحب کیا ہو گیا آپ کو! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے!"

انشااللہ

منیر بانو

روشی نے بیزاری سے ٹخنوں پر لپٹے ہوئے جوتے کے تسمے کھولے اور اپنے ننگے پیر فرش پر رکھ دیئے۔ فرش کی اینٹوں کی ٹھنڈک سے اس کے تلوؤں کی جلن آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ ابھی ابھی وہ ایک شادی کی محفل سے آئی تھی اس چلچلاتی دھوپ میں دن کے پورے ایک بجے کوئی چھ فرلانگ کا راستہ اس نے پیدل طے کیا تھا۔ کولتار کی تپتی ہوئی سڑک پر اس کے پیر جھلس کر رہ گئے تھے۔

یہ گرمیوں کی دوپہر جب چیل بھی انڈا چھوڑ دیتی ہے شادی کی محفلوں اور ہنگاموں کے لئے بھی کتنا ناموزوں وقت ہے۔ غالباً لوگوں کے ذہن سے موزوں اور غیر موزوں کا سوال ہی نکل چکا ہے۔ روشی نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس منگا کر پیا۔ اور بچا ہوا پانی اپنے پیروں پر انڈیل دیا جو پیروں سے پھسل کر زمین پر بہہ گیا۔ اس نے اس گیلی جگہ پیر ٹکا دیئے اور اسی طرح پلنگ پر لیٹ گئی۔ آج اسے اپنے کمرے کا ٹھنڈا اندھیرا اور پنکھے کی ہلکی ہلکی ہوا بہترین نعمتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اسے اتنی سستی محسوس ہو رہی تھی کہ اپنی قیمتی ریشمی ساری تبدیل کرنے کو بھی جی نہ چاہا۔ ہوا بار بار ساری کے دامن میں بھر جاتی اور اسے غبارے کی طرح پھلا دیتی۔ پھر وہ ریشم خالی ہو کر اسکی پنڈلیوں سے لپٹ جاتا۔ روشی کو اس کھیل میں وہی لطف آنے لگا جو بچوں کو غبارے میں ہوا بھرنے اور نکالنے میں آیا کرتا ہے۔

جب تھکاوٹ ذرا کم ہوئی تو اس نے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور ہلکے پھلکے کپڑے پہن اسی اندھیرے کمرے میں آ کر پنکھے کے نیچے لیٹ گئی۔ آہستہ آہستہ شادی کے گھر کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور وہ اطمینان سے ایک ایک منظر دیکھنے لگی۔ سب سے پہلے تو اسے دلہن کی سج دھج اور انداز انجانے سے معلوم ہوئے۔ اپنے ہاں تو دلہنیں شرمائی، لجائی سمٹی گھٹنوں میں سر جھکائے بیٹھی ہوتی تھیں اور چہرہ پر شرم و حیا کا وہ روپ ہوتا تھا جو آج کل کے غازے اور سرخیوں کی تہیں کی تہیں بھی نہیں دے سکتیں۔ لیکن یہ دلہن تو ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے سسرال والوں سے برسوں کی راہ و رسم ہو۔ گھونگھٹ اٹھا۔ نگاہوں کا جھکاؤ اٹھا۔ پیچھے سے حیا بھی کھسک گئی۔ اور یہ تو تعلیم روشن خیالی اور ترقی کی دلیل ہے۔

اس خیال کے آتے ہی روشن آرا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ بھی تو تعلیم یافتہ روشن خیال ہے اور زیادہ سے زیادہ ترقی حاصل کرنا چاہتی ہے اگر اجمل تھوڑا سا اور اس کا ہم خیال ہوتا تو وہ کب کی برقعہ پوشی کی لعنت سے نجات حاصل کر لیتی۔ آج کل برقعہ پوشی پردہ داری کی دلیل نہیں رہی۔ برقعہ صرف رسماً لادا جاتا ہے۔ باپ بھائیوں کے لحاظ سے یا کنبہ برادری کی انگشت نمائی کے خوف سے۔ وہ رفعت جس کے ماں باپ کیسے بزرگ صورت انسان ہیں جن کے چہروں سے نیکی کا نور برستا دکھائی دیتا ہے۔ گھر سے برقع پہن کر نکلتی ہے اور مینا بازار میں پہنچ کر آئے ہوئے اعلیٰ افسروں کو اپنے ہاتھ سے چائے کی پیالی پیش کرتی ہے۔ ان کی خاطر تواضع کرتے ہوئے اسے ذرا جھجک اور تامل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنی لطیفوں اور مسکراہٹوں کی دلفریبی بھی چائے کی پیالی میں گھول دیتی ہے اور میں منہ کھڑی اس کی کرسی پر پڑے برقع کو حسرت سے تکتی رہ گئی تھی اگرچہ میں مجبوراً برقعہ پہنتی ہوں تو مجبوراً اس کا احترام بھی کرتی ہوں چاہے محض اجمل کو خوش کرنے کے لئے ہی سہی۔

اور وہ جو اس روز یوم صحت منایا گیا تھا۔ خاصی تعداد میں عورتیں شریک ہوئی تھیں اور اچانک اسٹیج پر ایک ڈاکٹر صاحب نے قبضہ کر لیا۔ لڑکیاں کھسر پھسر کرنے لگیں کہ یہ کیوں آیا ہے۔ چند عورتیں بڑبڑائیں بھی کہ عورتوں کے جلسے میں مردوں کا کیا کام۔ مگر وہاں سے ہٹ

جلنے کی ایک کو بھی توفیق نہیں ہوتی ۔

میں نے ذکیہ سے پوچھا کہ تم تو ہمیشہ اسلامی تہذیب کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا کرتی ہو، پردہ پسند کرتی ہو، برقع پہنتی ہو، اسٹیج پر ایک غیر مرد کو کیسے گوارا کر لیا تم نے؟

میرے اس براہ راست سوال سے وہ ایکدم گھبرا گئی ۔ اس کی آنکھوں کی عجیب کیفیت ہو گئی ۔ جیسے دو مچھلیاں تالاب میں تیرتی پھڑپھڑا کر دور نکل جائیں ۔ مجھے بڑا لطف آیا ۔ "میری نیک اور معصوم ذکیہ تم کیوں گھبرائیں یہ تو الپا کی سنت کی بے مزہ سی پیروی تھی آخر دور حاضر کی عورتیں اس سنت کی پیروی سے کیوں محروم رہتیں"۔

اب روشی کو دھان پان کا سی سی نوری یاد آئی ۔ جو گریجویٹ تھی ۔ اور قومی خدمت اور پہننے اوڑھنے کے شوق میں ملازمت کر بیٹھی تھی ۔ جہاں نظر کرم کی امید میں کلرک ہر وقت خوشامدیں کرتے تھے ۔ جہاں اس افسر کے بڈھے باپ نے اپنا عشق جتا کر اس کی زندگی تلخ کر دی تھی ۔ جب وہ قینچی مرغے کی طرح سرخ ٹائی لگائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے ارد گرد گھومتا تھا اور چپکے سے اس کے کان میں کہتا تھا کہ "آہ نوری تم تو میرے خوابوں کی تعبیر ہو" جیسے اس کھوسٹ نے آج سے پہلے کبھی کوئی خواب ہی نہ دیکھا تھا جس کی تعبیر نکالنے کی سعی ہوتی ۔ نوری گھٹتی تھی مگر منہ سے اُف نہ کر سکتی تھی کہ مس صاحبہ ناراض ہو جائیں گی ۔ ملازمت میں گڑبڑ ہو جائے گی ۔ اپنے دوسرے ماں باپ کو آگاہ نہ کرتی تھی کہ ان کی برسوں کی مانی ہوئی شرافت کو ٹھیس لگے گی ۔ اور میرے سامنے اسکی آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑیاں لگا دیتی تھیں کہ وہ کہاں جائے کیا کرے ۔ وہ کہتی کہ مر ہی جاؤں تو اچھا ہے کہ اس عذاب سے چھوٹوں ۔ وہ پاگل لڑکی یہ نہیں سمجھتی کہ مر کر وہ اس عذاب سے تنہا نجات پائے گی ۔ مگر وہ ہزاروں نوریاں جو اس کی طرح ان دلدلوں میں پھنسی ہوئی ہیں ان کی نجات کی کیا صورت ہے؟ کیا وہ سب مر جائیں ۔ یا اسی دلدل کی کیچڑ کو اپنے چہرے کا غازہ سمجھ کر سرخرو بن جائیں ۔

اُف خدایا! یہ گرمی ۔ کہیں ٹھنڈک نہیں ۔ یہ اُلجھے ہوئے گرم گرم خیالات مجھے خود بھی پاگل بنائے دے رہے ہیں ۔ میری عزیزہ تم کب سے فلسفی ہو گئیں ۔ پھر یہ دنیا ہے معلوم نہیں یہاں رات دن کیا کیا ہوتا رہتا ہے ۔ تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے ۔ تم دوسروں کے غم اور دکھ میں کہاں تک سر کھپاؤ گی ۔ تم تو ابھی شادی کی خوشی کی محفل سے آئی ہو ۔ اس لئے تمہیں بھی خوش ہونا چاہئے ۔ لیکن خوشی کسے کہتے ہیں ۔ کوئی کیسے خوش ہو تا ہے اور رہ سکتا ہے ۔ یا تو وہ بالکل جاہل اور ناواقف ہو ۔ یا خود غرض ہو ۔ اپنے آپ میں گُم ۔ ورنہ یہ غم اور دکھ جو لوگوں کو چاروں طرف بُری طرح سے گھیرے ہوئے ہیں دیکھنے والے کے کلیجہ کو برماتی رہتے ہیں ۔ پھر درد کی ٹیسیں اور لہریں اُٹھتی ہی رہتی ہیں اور اس کی صبح و شام کو غمگین بنا دیتی ہیں ۔

روشی فلسفی نہ سہی انسان تو ہے ۔ وہ نہ جانور ہے نہ خود غرض ۔ آج بیگم سکینہ کی باتوں نے کچھ شدید کر دی ۔ وہ کسی اور باتیں کر رہی تھی اور روشی سن رہی تھی ۔ روشی کی حساس طبیعت جانے کہاں سے کہاں جا پہنچی ۔ اسے اپنی جنس کی بے چارگی کا ہمیشہ سے اندازہ تھا ۔ مگر وہ اس خیال سے خوش تھی کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد عورت کی حالت بہت سدھر گئی ہے ۔ وہ اب آزاد ہے ۔ تعلیم ملازمت روشن خیالی اپنی پسند کی شادی ۔ پردے سے نجات ۔ یہ سب نعمتیں اسے حاصل ہونی شروع ہو گئی ہیں وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے جا سکتی ہے ۔ ہر سیر و تفریح میں حصہ لے سکتی ہے ۔ سینما ۔ مینا بازار ۔ ناچ رنگ ۔ مشاعرے سب اس کے لئے بھی ہیں ۔ وہ بھی مشاعروں میں کلام سنا سکتی ہے ۔ پہلے ناچ دیکھ لینا بھی گناہ سے کم نہ تھا اب وہ خود ناچ کر سینکڑوں دلوں کی دھڑکنیں سن سکتی ہے ۔ پردہ؟ غلامی کی یادگار تقریباً اٹھ چکا ہے ورنہ اس کی وقعت اُٹھ جانے میں تو بالکل کلام نہیں ۔ کیا یہ سب ترقی کی طرف قدم نہیں ہیں ۔ یہ تذکرے آتے ہی اس کی گردن فخر و غرور سے تن جایا کرتی تھی ۔

پہلے وہ ایک بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کے والد ایک بہترین ادیب اور شاعر تھے۔ وہ اپنی دھن میں اقبال کے لگائے ہوئے درخت کو
لتے رہے تھے۔ وہ ہمیشہ شاعری کی زبان میں اسلام کا پیغام قوم کو پہنچاتے رہتے تھے۔ مگر انہوں نے کبھی اپنی بیاض سے اوپر نظر اٹھا کر نہ دیکھا
ی لڑکیوں کو کسی خاص پیغام کی تربیت نہ دی۔ حالانکہ وہ بھی اللہ کا ایک پیغام بن سکتی تھیں۔ ان کے ذریعہ قوم کو بہت کچھ مل سکتا تھا
ن کا چشمہ بیاض کی تحریروں پر جھکا رہتا تھا۔ کلام کی باریکیاں پرکھتا تھا۔ مگر اس نے لڑکیوں کی طبیعت اور فطرت کو نہیں جانچا کہ ان
ے ذہنوں میں کون سے نظریئے پرورش پا رہے ہیں۔ وہ کہاں تک اسلام کے مطابق ہیں۔ وہ کس قدر اقبال کی قول کی پیروی کی ہمت رکھتی ہیں
ــــہ وہ اسی طرح پلتی بڑھتی سیانی ہو گئی۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ اجمل بیاہ کر لے گھر لے گیا۔ شادی سے اس میں حقیقت پسندی آ گئی
ہوئی مسئلہ کھل کر اس کے سامنے آ جاتا تو وہ اس کی حقیقت پا لیتی تھی۔

سکینہ کہہ رہی تھی "ان پانچ سالوں میں عورتوں کے حالات پہلے سے بہت بگڑ گئے ہیں۔ اس ترقی، روشن خیالی اور بے پردگی نے
ں کو کچھ بھی سُکھ اور سکون نہیں بخشا۔ اب، نئے نئے روگ لگ گئے ہیں اس نئے چلن نے ان کی زندگی کو زیادہ تلخ و زہر یلا بنا دیا ہے۔ کم از
پہلے دنوں میں ان کے لئے عزت ہوتی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پرائی عورتوں کا نام تو لے۔ بے پردگی نے ان کے نام کو عوامی ملکیت بنا
ا ہے"

"اجی جب سے پاکستان بنا ہے اتنی بے حیائی پھیل گئی ہے کہ دیکھ دیکھ کر طبیعت حیران ہوتی ہے۔ ماں کا ادب نہیں رہا۔ خاندانی
شرم نہیں رہی۔ بچوں کی محبت نہیں رہی۔ بچوں کو کمرے میں بند کر کنڈی میں تالے ڈال سینما چل دیتی ہیں۔ پیچھے پیچھے رو رو کر ہلکان ہوں یا
پ تڑپ کر مر جائیں کچھ پرواہ نہیں"

یہ سُن کر میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے معصوم بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرا سب سے پسندیدہ منظر یہ ہے کہ ایک ننھا مُنا ماں کی
ہیں ہو۔ بچوں کے ساتھ ماں کا یہ سلوک سُن کر میرا جی لرزنے لگا۔ کیا یہ وہی تقویٰ کی حق تھا جس کی طلبگار عورتیں تھیں جسے پا کر اب یہ کچھ
نے لگا ہے۔ پہلے تو ایسی باتیں سننے میں نہ آیا کرتی تھیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ ان پانچ سالوں میں عورتوں نے کھویا سب کچھ ہے اور پایا بہت
ہے۔ کیا جہالت کے ساتھ محبت بھی دفن ہو گئی۔

باہر سڑک پر لو کے بگولے اُٹھ رہے تھے۔ جن میں تنکے، پتے، خاک کے ذرے ناچ رہے تھے۔ کوئی تند جھونکا روشندان اور کھڑکیوں سے
کے روشی کے نازک جسم کو چھیلتا ہوا نکل جاتا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے، ایک نہ بجھنے والی تشنگی تھی۔ اس کے دل میں ایک نہ دکھائی دینے
ی انگیٹھی سی دہک رہی تھی۔ جس کے شعلوں نے اس کے تمام جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہیں سے اچانک
ج کی آواز سنے۔ بجلی چمکے۔ گھٹائیں گھر گھر کر آئیں۔ رحمت اور نور کی ٹھنڈی پھواروں کی جھڑی لگ جائے۔ اس کے تن من کی جلن دھل
ئے۔ تنکے، پتے، خاک کے ذرے سب بہہ جائیں۔

روشی بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ مگر انہیں بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی۔ انہیں تانوں بانوں میں اُلجھتی رہی۔ اسے دُور سے ایک آواز
سنائی دی۔ جیسے چپکے چپکے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہے۔ تمہاری زندگی کی پُرسکون جھیل میں یہ لہریں کیوں اُٹھ رہی ہیں۔ یہ طلاطم و اضطراب کیسا!
جھیل تو وہ ہے جس کی سطح پر ہمیشہ کنول ہی کھلتے ہیں۔ وہ کنول کیا ہے۔ بھینی بھینی خوشبو دینے نیلوفر کہاں چھپ گئے ہیں۔ آج اس خاموش
بے جاب جھیل کی تہہ سے یہ طوفان کیوں اُبل رہا ہے؟ اور تم گھبرا رہی ہو میری عزیز روشی آ آ! گھبراؤ نہیں، زندگی خواب نہیں ——
پھولوں کی ڈالی نہیں، خوشیوں کا جھولا نہیں۔ پھولوں کا فرش نہیں ایک نہ ایک دن زندگی کے رُخ سے نقاب اُٹھتا ہے۔ تم اس کے دُکھ، درد
سے، زہر، تلخیاں، دلدلیں، کیچڑ، خار، سعد اُوٹ نے عقربت دیکھ کر آنکھیں بند کر تا چاہتی ہو۔ تم سمجھتی تھیں یہاں پھول ہی پھول ہوتے ہیں!

آنکھیں بند کرنے سے کام نہ چلے گا آنکھیں کھولو۔ تمہیں تو حقیقت پسندی کا دعویٰ ہے اب اس کا ثبوت دینا ہوگا۔ ہمت ہے تو کچھ کرو۔ کانٹوں میں ہاتھ ڈال کر تلخیوں کو شہد بنا دو۔ دلدلوں کو صاف کر دو۔ کیچڑ کی جگہ باغ لگا دو۔ حشرات کو غاروں میں دھکیل کر منہ پر سلیں جما دو۔

اس نے اپنے نازک ہتھیلیوں انگلیوں اور کلائیوں کو غور سے دیکھا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قریب ہی کپڑے میں لپٹی ہوئی برف پڑی تھی۔ اس نے برف کھول کر گھڑی میں پھیری، اور ایک ایک ڈلی منہ میں ڈال کر چوستے چوستے بھیگے ہوئے کپڑے پر دونوں پیر جما دیئے۔ اس خنکی سے اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ گرمی کی یہ لمبی دوپہر کاٹنے نہیں کٹتی۔ آج نیند بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے شل ہو گیا تھا۔ خیالات تھے کہ پیرا کئے گھیر لیتے تھے۔ پاکستانی عورت کا اصل رنگ و روپ اس پر ظاہر ہو رہا تھا۔ کن راہوں پر اس نے ترقی کی ہے اور کن راہوں میں وہ بھٹکی ہے۔ زندگی کی حقیقتوں پر سے خوشنما پردے اور دبیز غلاف اتر رہے تھے۔ اس دلیل میں وزن باقی نہ رہا تھا کہ ایک جگہ خرابی کا مطلب یہ نہیں کہ سب جگہ خرابی موجود ہے۔ کہیں نہ کہیں ایک زبردست غلطی سرزد ہو چکی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جگہ جگہ خرابی پھوٹ رہی ہے۔ اتنی تعلیم و ترقی اور روشن خیالی کے باوجود عورت دکھی ہے۔ اس کی زندگی میں اطمینان نہیں۔ نہ ماں باپ کے گھر رہتے ہوئے نہ شوہر کے گھر جا کر۔ اصل پوچھو تو یہ بے حجابی بھی اس کے لئے سکھ کا پیغام نہ لائی۔ ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ چین اڑ گیا۔

فوزی تم گریجویٹ ہو کر بھی رو رہی ہو۔ تمہاری روح پر اس بڑھے کا سہم کا لبوس بن کر چھایا ہوا ہے۔ رفعت تم ملازمت میں ترقی پانے کے لئے افسروں کو ہنس ہنس کر چائے کی پیالیاں پیش کرتی ہو۔ تمہاری بہن زرینہ نے کچھ اس قسم کے فائدے حاصل کرنے کے لئے اپنے جسم تک کو غلامی میں دے دیا ہے۔ شہناز نے اپنی سہیلی کے گھر رہنے کو اپنے شوہر کے گھر رہنے پر ترجیح دی اور خاوند کی محبت کو ٹھکرا دیا جس کے چرچے شہر کی گلی گلی پہنچ چکے ہیں۔ کتنی لڑکیاں سہل جیون کے خواب دیکھ دیکھ کر زندگی شروع کرتی ہیں اور خاوند کو اپنے معیار کا نہ پا کر ان کے طلسمی محل خاک کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ کیسے کیسے دونوں برباد ہو جاتی ہیں اور کراچی جہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ وہاں میری آنکھوں کے سامنے پروفیسر قمرالزماں کی بہن جو میٹرک سالویں میں پڑھتی تھی۔ دن دہاڑے کسی کے ساتھ چلدیتی ہے اور قمرالزماں کا چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ وہ طرح طرح کی تاویلیں کرتی ہے اور اپنا دل بہلاتی ہے۔ مگر اصل خرابی پر اس کی اور اس کی کیا کسی کی نظر نہیں جاتی۔

یہ ہے آزادی کی دوڑ کا وہ مقام جو پاکستانی عورت نے ابھی تک حاصل کیا ہے۔ وہ پاکستان جس کا نام آتے ہی رحمتوں اور برکتوں کے خواب نظر آنے لگتے تھے۔ وہ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا۔ جہاں اسلامی تہذیب رائج کرنے کے ارادے تھے۔ جہاں اسلامی قوانین کی حکمرانی کا یقین تھا۔ جہاں قرارداد مقاصد پاس ہوئی۔ جس میں ہر شہری کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی ضمانت تھی۔ اس مقدس سرزمین میں عورت کا یہ حشر ہے آج بھی اس کی آنکھ میں آنسو ہیں۔ آج بھی اسکی زندگی سے چین اور اطمینان مفقود ہے۔ اس کی عزت بڑھی نہیں گھٹی ہے۔ وہ ترقی نہیں کر رہی اسکی راہ میں گڑھے کھودے جا رہے ہیں۔ اس کے خیالات روشن نہیں ہوئے وہ پہلے سے بھی زیادہ اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ اقتصادی خود مختاری کے پردے میں غلامی کی زنجیروں میں اضافہ ہوا ہے اس نے مہذب ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لئے چند قدم ضرور بڑھائے ہیں۔ لیکن ان قدموں نے بڑھ کر اس کے اخلاق میں ایسا خلا پیدا کر دیا ہے۔ جس کا پر ہونا مشکل ہو گیا ہے۔

مجھے یاد ہے جب یہ بے حجابی کی تحریک چلی تھی تو کس طرح عورتوں نے اپنے آپ کو دھوکے اور تسلیاں دی تھیں کہ چہرہ کھولنا قرآن سے ثابت ہے۔ سادہ کپڑوں میں باہر جائیں گے زینت چھپا کر۔ آج ان کا قرآن کہاں ہے۔ چہرہ چھوڑ بازو اور سینہ بھی کھل گیا۔ زینت کے وہ وہ مظاہر ہوتے ہیں کہ نظریں پھسلتی ہیں۔ اخلاق لڑکھڑا جاتا ہے۔

لاشی کی کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگیں اس نے دونوں ہتھیلیوں میں سر دبا لیا۔ اصل میں تہذیب خشک گزار ہوں۔ اگر تم سہارا نہ دیتے تو میں کا ترقی کا بیل لگا لینے کی دھن میں جانے گرد و غبار کے کسی گڑھے میں ہوتی۔ شکر ہے بعد میں نے پادریوں کی وعدہ قدم واپس لوٹنے مشکل ہوتے

بنا بھی یہی خیال تھا کہ پاکستان کی سرزمین پر قدم دھرتے ہی ہم اسلام کے سایہ میں آ جائیں گے حقوق اور آزادیاں مل جائیں گی ۔ عورتیں صدیوں سے پستی میں
رہی ہوئی ہیں وہ اُبھریں گی ماں کے حالات سدھر جائیں گے ۔ مگر جانے کہاں گڑ بڑ ہوئی ۔ توازن بگڑ گیا حق اور آزادی کے مفہوم بدل گئے ہر من مانا کام کرنا حق
ہو گیا ۔ بے پردہ رہی آزادی ٹھہری ۔ سب سے بڑا کمال یہ مانا گیا کہ گھروں کو ترک کر دیا جائے ۔ سمجھ میں یہی آتا ہے کہ سب سے زیادہ پس اس بے حجابی
کی تحریک نے گھولا ہے جس نے عورت کو عورت نہیں رہنے دیا ۔

مجھے یقین ہے جلدی یا بدیر سب جاگیں گی ۔ میں خوش ہوں بہت خوش ۔ میں ترقی کے اعلیٰ زینوں پر نہ چڑھ سکی ۔ کیا ہوا ۔ مانا کہ میں نے نرسنگ کی
ٹریننگ حاصل نہیں کی ۔ سلامیوں میں شامل نہیں ہو سکی ۔ لیکن میری نسائیت تو گم نہ ہوئی ۔ مخلوط تعلیم سے دامن تو بچ گیا ۔ ملازمت کے بکھیڑوں میں نہ مجھے
دغیروں کی غلامی سے تو بچ گئی ۔ مخلوط سوسائٹی کے زہریلے پنجے تو مجھ تک نہیں پہنچ سکے ۔ یہ صرف خدا کی مہربانی تھی کہ میرا چہرہ کسی کے ذوقِ جمال کی
تسکین کا باعث نہیں بنا ۔ میرے گھنگھروؤں کی صدا کسی کے کانوں سے نہیں ٹکرائی ۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے جہالت کی حقارت سے پالا پڑا نہ
نئے تقاضے میری نسائیت کو ذلیل کر سکے ۔ مجھے وہ اطمینان حاصل ہے جو آج کل بہت کم کو میسر ہے ۔

میں خوش ہوں میری روح خوش ہے ۔ میرا ضمیر مطمئن ہے ۔ میرے گرد و پیش میں سکون ہے میں اپنے آپ میں سرخرو ہوں اور اسی طرح اپنے
رب کے حضور سرخرو حاضر ہوں گی ۔ انشاء اللہ

نئی پرانی لغات

لالہ صحرائی

ٹھنڈی جنگ :- جس میں سیاسی لبوں پر سے گولیاں برسائی جائیں ۔
تحقیقاتی کمیٹی :- جس کے تین ارکان میں سے ہمیشہ ایک بیمار رہے اور دوسرا غیر حاضر
حزب الاختلاف :- ہوا کے رُخ کے خلاف اڑنے والی پتنگیں
ادب :- الفاظ کے مینا میں سوچ کی مئے کہنہ
ادھیڑ عمر :- جب آپ کے جذبات ، بیماریوں کی علامات میں تبدیل ہونا شروع ہو جائیں ۔
چغل خور :- کاربن پیپر
صحت :- وہ زمانہ جو آپ پر یہ احساس طاری کر دے کہ یہ وقت سال بھر کا بہترین موسم ہے ۔
ماہر اعداد و شمار :- وہ شخص جو ایک غیر مصدقہ قیاس کے نقطہ سے ایک پہلے سے طے شدہ نتیجہ کی طرف ریاضی کے قواعد کے بوجب ایک دماغی خود کشی
لسانی :- سوچ کی نعشوں کو کفن پہنانے کا فن
شائستگی :- بھینچے ہوئے منہ سے جماہی لینے کا ضبط !
نئی تہذیب :- انسانوں کی بجائے مشینوں کے چہروں پر چمک دمک پیدا کرنے کا فن !

تعارفِ کتب و جرائد

مسلمات

* مولفہ جناب حکیم محمد فاروق صاحب * شائع کردہ، مکتبۂ پاکستان، بازار لنگے منڈی، لاہور * قیمت ۱۰/

یہ مختصر کتاب نبی صلعم کی ازدواجِ مطہرات اور صحابیات کے اجمالی حالات پر مشتمل ہے مولف نے پاکستان کی ہونہار بیٹیوں کے سامنے یہ تحفہ اس خواہش کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ مغرب کی تقلید سے بچ کر ان مثالی خواتین میں اپنے لئے اسوۂ حسنہ تلاش کریں جنہیں اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول نے مسلمان خواتین کے لئے نمونہ قرار دیا ہے۔ تحریر سادہ ہے اور خواتین کے تعلیمی معیار کے مطابق ہے۔

پیارے رسول

* از جناب افضل حسین صاحب ایم اے ناظم درسگاہ جماعت اسلامی ہند * ناشر، مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور، انڈیا۔ قیمت ۵/

یہ بچوں کے پڑھنے کے لئے سیرت کے موضوع پر ایک اچھا رسالہ ہے۔ مناسب زبان اختیار کی گئی ہے۔ ابواب بندی بھی نہایت معقول ہے آخر میں پیارے نبی کی پیاری باتوں کے نام سے نبی صلعم کے ایسے سادہ سادہ فرمودات درج کئے گئے ہیں جو بچوں کے لئے خاص طور پر سامانِ تربیت ہیں۔

مسک الختام فی ختم نبوت علی سید الانام

* از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ، لاہور
* ناشر:۔ مکتبہ صدیقیہ ملتان * قیمت ۵/

مولانا کاندھلوی علوم دینی میں جو مستند حیثیت رکھتے ہیں اس کے ساتھ موصوف نے یہ رسالہ عقیدۂ ختم نبوت کے ثبوت میں لکھا ہے اور علمی انداز سے کتاب و سنت سے استدلال فرمایا ہے۔ ملت اسلامیہ اول روز سے محمد مصطفیٰ صلعم کی نبوت کے بارے میں اس عقیدے پر متفق رہی ہے کہ آپ کے بعد نبی نبوت کا علم بلند کرنے والا اور کسی نئی نبوت پر ایمان لانے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس دیرینہ متفقہ عقیدے میں قادیانی علم کلام نے نقب لگانے کی سعی کی ہے اس کو ناکام بنانے کی کوششوں میں مولانا ادریس نے بھی یہ کتاب لکھ کر اپنا حصہ شامل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے! مفت تقسیم کرنے کے لئے یہ کتاب ۲۵ روپے فی صد کے حساب سے مل سکتی ہے۔

سلسلہ رسائل ختم نبوت

* از جناب مولانا عبدالرحیم صاحب * شائع کردہ مکتبہ صدیقیہ، ملتان * قیمت فی رسالہ ۱/

تین رسائل "مرزائیوں کا اصلی چہرہ" "مرزائیوں کی خوفناک سیاسی چالیں" اور "مرزائیوں کے خطرناک ارادے" ہمارے سامنے ہیں۔ یہ چیزیں مرزائی فتنے کی حقیقت واضح کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں جا بجا انہی کی تحریروں اور تقریروں کے حوالے درج کر کے ان پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان رسائل کا مزاج علمی کے بجائے مناظرانہ ہے۔ مفت تقسیم کرنے کیلئے ۳/ فی صد کے حساب سے مل سکتے ہیں۔

احمدیت کا پیغام

* من جانب امام جماعت احمدیہ * پبلشر، عبداللہ اللہ دین، الہ دین بلڈنگ، سکندر آباد۔ دکن۔ قیمت درج نہیں۔

اس میں مرزا غلام احمد کے منصب اور ان کی جماعت کے موقف کو اپالوجی کے انداز میں لپیٹ کر بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائے گفتگو یہاں سے ہوتی ہے کہ احمدیت کوئی الگ کلمہ پیش نہیں کرتی احمدیت کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ اسلام ہی کا نام ہے (مگر اسلام کا نام احمدیت رکھنے کی وجہ کیا؟) پھر بتایا گیا ہے کہ احمدی ختم نبوت کے منکر نہیں ہیں۔ بلکہ اس بدیہی عقیدے کو صدق دل سے مانتے ہیں، البتہ وہ ختم نبوت کے اس مفہوم کو نہیں مانتے جو اس دور کے زمانے میں مسلمانوں میں پھیلا ہے (یعنی یہاں سے مرزا صاحب کی نبوت کا چور دروازہ کھلا) اس کے بعد ایک نئی جماعت بنانے کے مقاصد و وجوہ اور فوائد و برکات کو بیان کیا گیا ہے۔ اب یہ تصریح کی جاتی ہے کہ احمدی تنظیم کا مرکز مرزا غلام احمد کس بنا پر بنائے گئے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ

لی قدیم سنت کا ذکر ہوتا ہے کہ جب کبھی دنیا میں روحانی بگاڑ بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کسی امور کو مبعوث فرماتا ہے بعض دفعہ مامورین نئی شریعت لاتے ہیں اور بعض دفعہ سابق شریعت کو بحال کرتے ہیں چنانچہ نبی صلعم جو شریعت لائے ہیں وہ تو اپنی جگہ کامل ہے اور ہمیشہ کے لئے کافی ہے لیکن بندوں کے حالات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ اس پاک تعلیم کو کبھی نہ چھوڑ بیٹھیں گے جس کا کوئی انتظام ہونا چاہئے ۔ دیکھئے اب اس سلسلہ میں تفسیری نکات شروع ہوتے ہیں فرمایا جاتا ہے کہ یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ کا مطلب یہ ہے کہ آخری شریعت کو اللہ تعالیٰ ہزار سال میں دنیا سے اٹھا لے گا ۔ اور دوسری طرف دین کے قائم رہنے کا زمانہ احادیث میں صاحب پیغام کی تحقیق کے لحاظ سے تین سو سال ہے اور قرآن کریم نے الٓمٓرٰ کے ذریعہ (ابجد کے حساب سے) یہ زمانہ دو سو اکہتر سال مقرر دیا ہے قیام دین کے اس زمانے کے بعد ہزار سال گزرنے پر شریعت کا پرتو زمین سے اٹھا لیا گیا ۔ تو یہ کل زمانہ ۱۲۷۱ سال ہو گیا ۔ یہ ٹھیک وہ وقت ہے کہ خدا کی سنت کے مطابق اسمیں کوئی مامور آنا چاہئے خصوصاً جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر کسی مامور کو مجدد بنا کر بھیجتا ہے تاکہ وہ صدی کا بگاڑ دور کرے تو آخر ۱۲۷۱ سال کے خاتمے پر جب بگاڑ حد درجہ کا پیدا ہو جائے تو کوئی بڑے درجے کا مامور آنا چاہئے ۔ چنانچہ وہ آ گیا ۔ صاحب پیغام کے الفاظ یہ ہیں کہ " پس اے عزیزو ! سلسلہ احمدیہ کا قیام اسی سنت قدیمہ کے ماتحت ہوا ہے " ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب مرزا صاحب کی ذات کو اسلامی معیار دین و اسلام پر پرکھیں اور کوئی انمیں دلکشی نہ دیکھیں تو اس کا ازالہ کرنے کے لئے فرمایا کہ " اگر مرزا صاحب کا انتخاب اس کام کے لئے مناسب نہ تھا تو یہ خدا تعالیٰ پر الزام ہے ، مرزا صاحب کا اس میں کیا قصور ہے " ۔ کیا ہی حسن استدلال ہے ۔ ایک جھوٹا مدعی دعوائے نبوت کرتا ہے ۔ اور وہ نبوت تو کیا ایک عام معیار اسلامیت و انسانیت پر بھی پورا نہیں اترتا تو کہا جاتا ہے کہ اس کا کیا قصور ، جو کچھ ہے خدا کا کیا دھرا ہے ۔ جاکے اس سے بحث کرو ۔

تاہم راقم الحروف کو اس امر کا اعتراف ہے کہ عام قادیانی لٹریچر کے مقابلے میں یہ رسالہ غنیمت ہے ۔ اس لحاظ سے کہ اس میں مناظرانہ رنگ کا مشتی کے مقابلے میں داعیانہ رنگ زیادہ نمایاں ہے ۔

وقت آیا

ابوالبیان حماد

رفیقو! آؤ پھر باطل سے ٹکرانے کا وقت آیا
مجاہد فی سبیل اللہ کہلانے کا وقت آیا

مقامِ شوق سے آگے گزر جانے کا وقت آیا
رہِ حق میں متاعِ زیست لٹوانے کا وقت آیا

پرستارانِ یزداں سوختہ ساماں بیٹھے ہیں
انھیں کیا ڈر جو پھر باطل سے ٹکرانے کا وقت آیا

بہار آنے ہی والی ہے ابھی اجڑے گلستاں میں
کہ پھر بارانِ رحمت کی گھٹا چھانے کا وقت آیا

فسردہ ہو گئی شمعِ حقیقت بزمِ عالم میں
تعال اللہ پروانوں کے جل جانے کا وقت آیا

نیا گردوں بنانا ہے نئے تارے سجانے ہیں
بنائے گنبدِ کہنہ کو پھر ڈھانے کا وقت آیا

خدا رکھے سلامت امتحاں پھر ہونے والا ہے
حضورِ حق سے اجرِ بےکراں پانے کا وقت آیا

گئے وہ دن کہ جسم کو موت جب آنکھیں دکھاتی تھی
جگر پر مسکرا کر گولیاں کھانے کا وقت آیا

تفنگ و توپ سے دار و رسن سے کھیلنا ہوگا
خود اپنی کھال بھی تیغوں سے کھچوانے کا وقت آیا

دلِ مضطر رہینِ دولتِ دردِ محبت ہے
مبارک! پھر تڑپنے اور تڑپانے کا وقت آیا

رہِ حق میں ہزاروں آتش و خوں کے سمندر ہیں
کلیم آسا انھیں اب پار کر جانے کا وقت آیا

صدائے چنگ و بربط اب تو بارِ گوش ہوتی ہے
کہ شمشیر و سناں سے دل کو بہلانے کا وقت آیا

خدا کی راہ میں رنج و محن کا ذکر ہی کیسا ہے
ضرورت ہو تو خود گردن بھی کٹوانے کا وقت آیا

تلاشِ حق میں ہیں اہلِ زمانہ کب سے سرگرداں
انھیں اسلام کا پیغام پہنچانے کا وقت آیا

فسردہ ہو گئی ہے انجمن اپنی زبس حماد
اسے پھر آتشیں نغموں سے گرمانے کا وقت آیا

ایک دوست کے نام

کوثر نیازی

یہ چمکتے ہوئے بکتے، یہ کھنکتے ہوئے جام
یہ سیاست، یہ معیشت، یہ تمدن، یہ نظام
یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ لپکتے طوفان
روحِ انساں کو کچلنے کے لئے یہ سامان
یہ حکومت کے عمائد کی تعیش گاہیں
اور رعایا کے دلِ زار سے اٹھتی آہیں
یہ مچلتے ہوئے جذبے، یہ سسکتے ارماں
اک کشاکش ہے کہ پیدا ہے یہاں اور وہاں
آج آبادیاں روتی ہیں کہ انساں نہ رہے
غیرت عباس کے ماروں کے نگہباں نہ رہے
عصمتِ نازک کی حیادار نگاہیں نہ رہیں
اس کے خورشید میں عصمت کی شعاعیں ہیں

درسگاہوں میں غلاظت کے سوا کچھ بھی نہیں
خانقاہوں میں تجارت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ عدالت کے فلک بوس چمکتے ایواں
مدفنِ عدل، حکومت کی بقا کے ساماں
ان میں مظلوم کے زخموں کا کہاں ہے مرہم
ان کا ساحل تو ہے طغیانیٔ زر میں مدغم
یہ سیاست، کہ شرافت یہ ہے کیچڑ پانی
جس میں ہر سیٹ مکّار ہے مردِ غازی
اس کے دم سے یہ تعفن یہ وبائیں توبہ
اس کے دم سے یہ زمانے کی ادائیں توبہ
یہ تعقل کی فضاؤں میں جہالت کا گزر
اُف! یہ تہذیب کی دنیا میں ذلالت کا گزر

یہ امیروں کے مقابر کہ مجسم سامان
یہ غریبوں کے مسائل کہ مجسم حرمان
یہ فلاکت زدہ ۔ آلام کی ماری مخلوق
یہ جہالت زدہ مجبور بیچاری مخلوق
چیتھڑے مانگتی ہے جسم چھپانے کیلئے
روٹیاں چاہتی ہے بھوک مٹانے کیلئے
آدمیت پہ قیامت کی گھڑی آئی ہے
آج دنیا پہ تباہی کی گھٹا چھائی ہے
ڈر رہا ہوں مرے بھائی! یہ زمانہ ہے سیاہ
تیری معصوم جوانی نہ ہو برباد و تباہ
تجھ کو تہذیب کے یہ کرم ۔ نہ کھا جائیں کہیں
مذہبیاں تیری یہ اژدر ۔ نہ چبا جائیں کہیں
قالب زر میں تری روح نہ ڈھل جائے کہیں
تیرا ایمان نہ مٹ جائے ۔ نہ گل جائے کہیں
تک رہے ہیں دلِ مضطر کو تسلی اے دوست!
آج تو چھوڑ دے یہ کبر و تعلی اے دوست

ان اداؤں پہ یہ گناہوں کی ہواؤں پہ نہ جا
ان میں دوزخ ہیں تو خوشرنگ فضاؤں پہ نہ جا
چند روزہ ہیں یہ آرام کے جھولوں پہ نہ جا
ان میں کانٹے ہیں تو سرمایہ کے پھولوں پہ نہ جا
آ کہ ایمان کی پھر شمعیں جلائیں مل کر
آ کہ انسان کو انسان بنائیں مل کر
آ کہ اسلام کا پھر تخت بچھائیں مل کر
آ کہ آلام سے دنیا کو چھڑائیں مل کر

تیرے آنے کے لیے چشم براہ بیٹھا ہوں
مان بھی جا کہ میں پامال تباہ بیٹھا ہوں

جب پیتے تھے تو پیتے تھے

نعیم صدیقی

ہم ایسے مخلص ہیں، دل سے دل جوڑ گئے تو جوڑ گئے
پر ساتھ ہی غیرت مندی ہیں، رُخ موڑ گئے تو موڑ گئے

جب پیتے تھے تو پیتے تھے! اب توبہ ہے تو توبہ ہے
ہاں! شوخ سمجھ کر پیمانے جب پھوڑ گئے تو پھوڑ گئے

خونابہ فشانی سے دھلتے کیا داغ جگر کے اے ہمدم!
سینے پہ حوادث نقش اگر کچھ چھوڑ گئے تو چھوڑ گئے

یاں یاد تو پانا مشکل ہے، ہاں دِل کا تقاضا پڑھئے
چوکھٹ پہ تمہاری آکے کبھی سر پھوڑ گئے تو پھوڑ گئے

پہلے سے خدارا مہلت دے صیاد! تڑپنے کی ہم کو
اک بار کسی بندھن کو اگر ہم توڑ گئے تو توڑ گئے

تیرے دو عالم

نعیم صدیقی

دل بھی بے نندہ! آنکھ بھی پرنم! پھر بھی تجلی پائی ہے کم کم
میرا یہاں کیا بجز اک نگہ ہے تیرا ہے سب کچھ! تیرے دو عالم
کانٹے بھی تیرے، کلیاں بھی تیری تیرے چمن میں ہیں صرف شبنم
دل پہ جنہوں نے چرکے لگائے یا رب! انہی سے لائیں گُل مرہم؟
صرف ایسی آنکھیں پیاری ہیں مجھ کو جن میں ہو نورِ عصمتِ مریم!
یہ نوعِ انساں کس کام کی ہے؟ اک اور حوا! اک اور آدم!
لوگ ضمیریں دے کے خریدیں بازارِ تن میں عشرتِ دو دم
صبح کسی کا چہرۂ تاباں! شام کسی کا گیسوئے برہم
اشکوں میں خنداں، روئیں تبسم غم میں ہوا ہے یاں عیش مدغم

ہم سے ہوئی ہے آخر خطا کیا
دُنیا بھی برہم! آپ بھی برہم!
دونوں کے شاید مل جائیں سوتے
اُلٹی ہے گنگا! اُلٹی ہے زمزم!

کبتک دیکھوں

رشید محمود طوی

یہ ستم اے فلکِ پیر میں کب تک دیکھوں — حق کو طاغوت کا نخچیر میں کب تک دیکھوں
اپنی بگڑی ہوئی تقدیر میں کب تک دیکھوں — اپنی ناکامیٔ تدبیر میں کب تک دیکھوں
کفر و طغیان کی توقیر میں کب تک دیکھوں — دین و ایمان کی تحقیر میں کب تک دیکھوں
ایک فریادِ مجسم ہے سراپا اک درد — ہائے انسان کو دلگیر میں کب تک دیکھوں
جن کو سمجھا تھا کہ رہبر میں وہ رہزن نکلے — اپنے خوابوں کی یہ تعبیر میں کب تک دیکھوں
اپنے ہاتھوں ہی سے خود دختِ حرم سے ساقی! — بادہ خانوں کی یہ تعمیر میں کب تک دیکھوں
گھر میں اسلام کے اور داد خدائی بُت دیں؟ — اپنی آنکھوں سے یہ تصویر میں کب تک دیکھوں
فرق پر تاجِ "مقاصد" ارے اللہ اللہ! — پاؤں میں کفر کی زنجیر میں کب تک دیکھوں
دل میں سوزش نہ رہی سر میں نہ سودا نہ جنوں — پھر بھلا جوشش تقریر میں کب تک دیکھوں
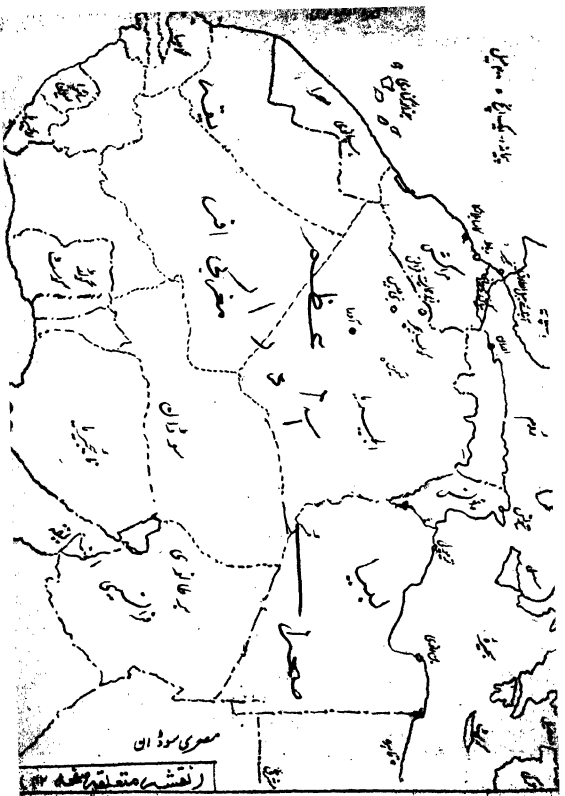
کون سا جرم کیا کہہ دی جو حق بات رشید
شوق لائقِ تعزیر میں کب تک دیکھوں

(نقشہ متعلقہ صفحہ ۳۲)

شمالی افریقہ میں مستعمرات کے تجربات

(مصنفہ فوزی حسین دوفی)
(ترجمہ ۔۔ ابو ندیم ایم اے)

ایک مشہور برطانوی مصنف اور دنیائے عرب کے دوست روم لینڈاؤ (Rom Landau) کا انگلستان سے لکھا ہوا خط
ابھی ابھی ملا ہے جس میں یہ فقرے بھی شامل ہیں :

"میرا ارادہ تھا کہ اس موسم خزاں میں کچھ دن مراکش میں گزاروں لیکن مجھے ابھی ابھی اطلاع دی گئی ہے
کہ فرانسیسی حکومت مجھے دوبارہ مراکش جانے کی اجازت نہیں دے گی "

مسٹر روم لینڈاؤ نے اپنی انکشاف انگیز کتاب " دعوت الی المراکش " "INVITATION TO MOROCCO" پچھلے سال شائع کی
اور انکی تالیف جلالت مآب سیدی محمد بن یوسف سلطان مراکش کی سرکاری سوانح عمری بھی عنقریب طبع ہونے والی ہے ۔

اس کا خط پڑھ کر اور شمالی افریقہ کے حالیہ واقعات کو پیش نظر رکھ کر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جو تجربات میں نے شمالی افریقہ کی سیر و سیاحت کے
دوران میں حاصل کئے ہیں ۔ دنیائے اسلام کے افادہ کی خاطر اُن کا مفصل حال شائع کردوں ۔ مغرب اقصیٰ میں اسلامی تہذیب کے ایک طالب علم ہونے
کی حیثیت میں میں نے جیسے اس ملک سے روانہ ہونے سے پہلے کوئی صحافتی تجربہ نہیں تھا ۔ فرانسیسی اور ہسپانوی حکام کے ہاتھوں مندرجہ ذیل سلوک
برداشت کیا :-

(۱) مناسب گزرنامہ (Passport) اور ضروری راہداری (VISA) رکھنے کے باوجود تین علاقوں میں گرفتاری

(۲) ایک علاقے سے ۸ دن کے اندر اندر نکل جانے کا حکم

(۳) ایک علاقے میں جہاں زائد علاقائی حقوق کا رواج ہے ۔ بغیر کسی معقول وجہ کے داخلے سے انکار

مندرجہ ذیل حقائق میں سے اکثر تحریری صورت میں شمالی افریقہ کے برطانوی قونصل خانے کے قبضے میں ہیں ۔ اور ان میں سے کئی مراکش الجزائر اور
ان کی خفیہ پولیس کی مسلوں میں میرے دستخط شدہ بیان کی شکل میں موجود ہیں ۔ اور فرانس کے مستعمراتی حکام کے لئے ان کی تردید ناممکن ہے اس اجمال کی تفصیل
حسب ذیل ہے :-

عفنی[۱] :- اس ہسپانوی نو آبادی میں جو مراکش کے جنوب مغرب میں واقع ہے ۔ میں ۱۹۴۷ء میں دو مرتبہ گیا ۔ دوسری مرتبہ میں جزائر کنساری
(Canary) سے بذریعہ کشتی گیا ۔ میرے گزرنامے پر اس علاقے کے نائب حاکم نے اجازت داخلہ دیدی تھی ۔ وہاں پہنچ کر میں ایک
ہوٹل میں ٹھہرا اور دو گھنٹے کے بعد فوجی پولیس کے دو سپاہی وہاں آموجود ہوئے انہوں نے مجھے فوراً اپنے ساتھ چلنے کو کہا ۔ چنانچہ ان مسلح فوجی محافظوں

[۱] عفنی ۔ رقبہ ۹۶۵ ۔ آبادی ۴۰ ہزار ۔ [۲] جزیروں کا مجموعہ ۔ ۵۶۰۰۰ مربع میل

ساتھ شہر کے صدر بازار میں سے ہوتا ہوا میں فوجی پولیس کے حاکم کے پاس حاضر ہوا ۔ پولیس افسر نے تھوڑی ترشی سے پوچھا کہ میرے وہاں آنے کا کیا مطلب ہے ۔ اس نے میرے گزر نامے کا معائنہ کیا اور آخر کار ان الفاظ کے ساتھ مجھے واپس کر دیا ۔

"تمہیں علاقہ چھوڑنے کی اجازت ہے لیکن تم یہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے ۔ تمہیں علی الصباح اس ملک سے سب سے پہلے جانے والی بس پر سوار ہو کر چل دینا چاہئے ۔ تمہیں واپس آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی ۔ بہت کم لوگوں کو اس علاقہ میں ایک بار بھی آنے کی اجازت ہے اور ان کے لئے یہاں دوبارہ موجود ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں "

میں یہاں اس بات کی صراحت کر دوں کہ میں نے جزائر کناری میں صرف ایک دن گزارا تھا ، تنجیر[1] (TANGIER) میں اپنی امامت گاہ تک ہونے کا نزدیکی راستہ حقیقی تھا ۔ اور اتفاق سے یہ ارزاں ترین بھی تھا اور گھر واپس آتے ہوئے مجھے جنوبی مراکش (فرانسیسی علاقہ) میں اپنے دوستوں سے ملنے کا موقع بھی مل سکتا تھا ۔ یہ سلوک اُن سزاؤں کا پہلا تجربہ تھا جو شمالی افریقہ میں تجسس افراد کو اس جرم کی پاداش میں کرنا پڑتا ہے کہ وہ پامال راستے سے ہٹ کر نئی راہوں پر کیوں گئے ۔

صحرائے الجیریا ۔

۱۹۵۸ء کے آواخر میں صحرائی نخلستان کی سیر کے فیصلے سے پہلے ہی مجھے اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ فرانسیسی ارباب اختیار میری نقل و حرکت کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ الجیریا میں جو سندر پار قومی فرانسیسی علاقہ شمار کیا جاتا ہے برطانوی باشندوں کو راہ داری کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ لیکن چونکہ مجھے اس بات کا تجربہ تھا کہ فرانسیسی ہر ایسے فرد مسافر کو جو صحرا میں سفر کرے یہی سمجھتے ہیں کہ یا تو وہ کوئی ٹی ای لارنس ہے ۔ یا کوئی غیر ملکی جاسوس اس لئے میں نے فرانسیسی حکام کو اپنے ارادوں سے پوری طرح باخبر رکھنے کی ہر ممکن احتیاط کی ۔ الجیریا میں داخل ہونے سے پہلے میں نے مراکش کی سرحد پر فرانس کی فوجی اور دیوانی پولیس کے حکام کے پاس حاضر ہو کر اُن سے پوچھا کہ کیا مجھے تہذیب اور علم الانسان کے مطالعہ کی خاطر صحرا میں سفر کرنے کی اجازت مل سکے گی ؟ مجھے بتایا گیا کہ میری تمام دستاویزیں درست ہیں اور میں سفر کر سکتا ہوں ۔ چنانچہ میں کولمب بیچر (Colomb Bechar) کو جانے والی گاڑی پر سوار ہو گیا ۔ یہ مقام انتہائی مغربی صحرا میں شد ادانامیں (Sud-Oranais) کی فرانسیسی چھاؤنی کا مرکز تھا ۔

گاڑی پر سوار ہو کر مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر نگاہ رکھی جا رہی ہے ۔ ایک عرب منہ زور سال سادہ لباس میں میرے ساتھ کمرے میں سوار تھا جس کے پوچھنے پر اس نے مجھے بتایا کہ وہ تیسا کا ایک سوداگر تھا ۔ لیکن اس کی عربی گفتگو اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ الجیریا کی سعد کا رہنے والا ہے ۔ جب ٹکٹ کلکٹر نے اس سے ٹکٹ پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میں مامور سخیدہ مت ہوں ۔ اور ٹکٹ کلکٹر اس جواب سے پوری طرح مطمئن ہو گیا ۔ جب میں ۔۔ کولمب بیچر کے مقام پر اترا تو ایک عرب نے مجھے بتایا کہ سراغ رساں سرحدی چوکی پر اتر گیا تھا اور اس نے چھاؤنی کے لفٹنٹ کو اس کی اطلاع دی تھی کہ میں سارا دن گاڑی میں خطوط لکھتا رہا ہوں ۔ لفٹنٹ نے چوکی پر میرے سامان کی نہایت چھان بین کی تھی ۔

کولمب بیچر پہنچ کر میں فوجی پولیس کے حاکم اعلیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آیا حکومت فرانس کو میرے آگے جانے پر اعتراض تو نہیں ۔ مجھے جواب ملا کہ میں اس علاقے میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں دوسرے دن ایک اور فوجی جاسوس میرا پتہ پوچھتا ہوا میرے ہوٹل آ پہنچا ۔ مجھے ملتے ہی اس نے نہایت بھونڈے طریقے سے یہ ظاہر کیا ۔ کہ وہ ایک عرب تھا اور کل اس نے غلط فہمی سے میری بجائے ایک اور سے دوستانہ مراسم پیدا کر لئے تھے ۔ اس تعارف کے بعد اس نے کہا ۔ کہ آپ ہمارے ملک میں اجنبی ہیں ۔ ہماری مہمان نوازی کا دستور اس بات کا متقاضی ہے کہ میں آپ کو خوش آمدید کہوں ۔ اور دعوت کروں ۔ چنانچہ اس کے ساتھ مجھے قریب کے ہوٹل میں جانا پڑا ۔ جہاں اس نے فرانسیسیوں کے خلاف

[1] ۔ مینڈگا شمالی افریقہ آبنائے جبرالٹر کے مغربی سرے پر آباد ہے ۔۔۔ ۵۱ رقبہ ۱۴۹ مربع میل ۔

خوبصورت عورت نے بہت سی باتیں کیں۔ جب ہم ہوٹل سے روانہ ہونے لگے۔ تو ایک خوش طبع لیکن بدصورت یہودی نے مجھے پکارا اور کہا۔
"ابھی پولیس افسر صاحب کس کی مہمات میں لگے ہوئے ہو"؟
بعد ازاں میں نے براہ راست پولیس کے حاکم اعلیٰ سے شکایت کی کہ تم نے عجیب اشتعال انگیز کارندے چھوڑ رکھے ہیں اور اُسے جتا دیا کہ ایسے لوگ کسی کام کے نہیں ہوتے کیونکہ یہ اپنا کام دکھانے کی خاطر من گھڑت خبریں بھی سنایا کریں گے۔ وہ پریشان سا ہو کر ایک بے معنی ہنسی ہنسا اور اس نے اس بات کی پرواہ بھی نہ کی کہ وہ ان لوگوں کو میرے پاس بھیجنے کی تردید ہی کر دیتا۔
کولمب بیچر سے میں نخلستان بنی عباس پہنچا۔ یہاں بندرگاہ کے جائزہ دار کپتان نے میرا استقبال کیا۔ اگرچہ وہ بہت خوش خلق تھا اور اس نے اور اس کی اہلیہ نے میرے قیام کے دوران میں میری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن پھر بھی انھیں یقین نہ تھا کہ میں کوئی جاسوس ہوں جس بس پر سوار ہو کر میں وہاں پہنچا تھا اسی میں کپتان کے نام ایک خط بھی آیا تھا جس میں میرے متعلق بہت سی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ میرے پہنچتے ہی اس نے کہا

"یہاں میں آپ کو اپنے چند دوستوں سے ملانا چاہتا ہوں" اور اس نے سب سے میرا تعارف کرایا اور آخر میں کہا "اور یقیناً آپ ہمارے قائم امور تلگی سے مل کر بہت خوش ہوں گے کیونکہ آپ ان سے عربی میں بات چیت کر سکیں گے۔ آپ حیران کیوں ہو گئے؟ ہمیں معلوم ہے کہ آپ عربی جانتے ہیں ہمیں آپ کے متعلق بہت سی باتوں کا علم ہے۔ دراصل آپ کی اس متوقع آمد کا ہمیں کافی دیر پہلے سے پتہ چل چکا تھا"
بعد میں مجھے صحرا کی بہترین تار رسانی کی خدمت کے متعلق بہت کچھ علم ہوا۔ یہاں پر ہر سیاح کے متعلق جو بھی وہ جنوبی الجیریا میں قدم رکھتا تھا اس وسیع علاقے کے گوشے گوشے میں اس کی مکمل تفصیلات بذریعہ تار پھیلا دی جاتی تھیں۔

بعد میں ادرار (ADRAR) کے مقام پر بھی مجھے اسی قسم کی فرانسیسی مہمان نوازی اور مہربانی کا تجربہ ہوا۔ فرانس کے کئی بہترین نوجوان اس مخلص کوشش میں اپنی زندگی نثار کر رہے تھے کہ وہ صحرا کی پسماندہ آبادی کی کچھ خدمت کر سکیں لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انھیں اکثر اپنے منصب سے چھوٹے مگر اپنے سے کم فہم افسروں کی تجویزوں پر عمل کرنا پڑتا ہے اور ضابطے سے مجبور رہ کر آنکھیں بند کر کے اُن سیاست دانوں کے احکام بجا لاتے ہیں جنہیں اپنی ذمہ داری یعنی لاکھوں عربوں کی بہتری کا قطعاً احساس نہیں۔ فرانسیسی فوج نے ہر جگہ مہربانی اور تلطف کا ہی اظہار نہیں کیا بلکہ بعض صورتوں میں اُن کا رویہ کھلم کھلا شک و شبہ، کھلی جھوٹ اور مہمان دشمنی پر مشتمل تھا۔ تیمیمون ([illegible]) کے گاؤں میں میرے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک ہوا۔ مجھے عربوں کی طرف سے اپنی آزادی کے متعلق ہر جگہ پُر امید پیغامات مل رہے تھے۔ میرے کانوں نے ظلم قید اور استحصال کے واقعات تو بہت سنے لیکن فرانسیسیوں کے حق میں جائز طور پر بھی کلمہ خیر کہنے والے بہت کم تھے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں نے اُن دوستوں کا نام لکھ دیا تو ان بے چاروں کا کیا حشر ہو گا۔ آخر کار ادرار چھاؤنی کے جائزہ دار کپتان نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور الجیریا کے دیہاتی گورنر جنرل مسٹر نیج لین (Naegelen) کا تار دکھایا جس میں لکھا تھا۔ "برطانوی باشندے ف ح روفے کو الجیریا سے فوراً نکل جانے کا حکم دے دو۔ [illegible] دن کے اندر اندر الجیریا کے علاقے سے نکل جانا چاہیے۔ غالباً برطانوی جاسوس ہے" بعد میں میں نے اس حکم اخراج کی ایک نقل حاصل کی جو اب تک میرے پاس ہے۔ نقل میں آخری تین الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں۔
فوجی خوج پر مسلح گارڈ کے ساتھ میں نے کولمب بیچر سے واپس سینکڑوں میلوں کا سفر طے کر لیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے چند دن فرانسیسی خفیہ پولیس کے سوالات کا جواب دینے میں گزارنے پڑے۔ میں نے ہر سوال کا صحیح جواب دیا۔ اپنا پورا سامان دیکھنے کی اجازت دے دی اور یہ ثابت کرنے

ٹہ پہاڑی علاقہ۔ صحرائے افریقہ کا مغربی حصّہ۔ فرانسیسی غربی افریقہ

کہ میں کسی معاندانہ یا مخالفانہ سرگرمی کا مرتکب نہیں ہوا۔ میں نے اپنے کیس کی تمام تفصیلیں دھو کر پیش کر دیں لیکن بے سود۔ انہوں نے صرف اتنا کہا۔ "ہمیں پہلے ہی تم سے قابل اعتراض شئے کے ملنے کی توقع نہیں تھی اس سے تو صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ تم بے وقوف نہیں ہو۔ پولیس کے سوالات سے مجھے معلوم ہوا کہ مراکش کی پچھلی بار جانے کے دوران میں مجھ پر مندرجہ ذیل قابل اعتراض سرگرمیوں کا الزام لگایا گیا تھا۔

(۱) سرحد پار سے خفیہ اور تخریبی مراسلات کا لانا

(۲) مقامی یہودی تاجروں کو ٹیلیفون کرنا، اُن کے ہاں کار میں جانا اور وہاں یہ مراسلات حوالے کرنا۔

میں سمجھ گیا کہ فوجی پولیس نے میرے اخراج کے حکم کو جائز ثابت کرنے کی خاطر میرے خلاف ایک مقدمہ کھڑا کر دیا ہے جب میں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ تمام کہانی جعلی ہے اور اُن سے کہا کہ وہ اُن مبینہ تاجروں کو میرے سامنے لائیں جن سے میرا ملنا بیان کیا جاتا ہے۔ تو خفیہ پولیس یہ کہنے پر مجبور ہو گئی۔ "کہ یہ معاملہ نازک ہے"۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ فوج کے دجل و فریب کو ظاہر کرنے کے لئے مجھے کوئی موقعہ نہیں مل سکتا۔

پچھلی دفعہ کے قیام کے دوران میں میں نے اس شہر میں نہ کوئی ٹیلیفون کیا تھا۔ نہ کسی یہودی سے کوئی گفتگو کی تھی اور نہ کسی کار میں سوار ہوا تھا۔ اور نہ ہی کسی کو کسی قسم کے مراسلات دیئے تھے۔ فوجی پولیس نے یہ مقدمہ میرے جنوب میں جانے سے پہلے کھڑا کیا تھا۔ لیکن چونکہ الجیریا کے گورنر جنرل کے حکم کے بغیر مجھے ملک سے خارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے اس نے مندرجہ بالا قصہ گھڑ کر جھوٹی شہادتوں کے ساتھ اوپر بھیج دیا اور دو ہفتے کے بعد میرے اخراج کا حکم جاری کر دیا گیا۔

اوران۔

اوران میں مغربی الجیریا کے فرانسیسی خبر رسانی کے حاکم موسیو گالارڈ (monsieur Gaullard) سے ملاقات کے بعد مجھے ملک سے نکل جانے کی اجازت دیدی گئی۔ آج تک مجھے اس اخراج کی کوئی معذرت یا تشریح نہیں ملی۔ مجھے صرف اتنا بتایا گیا۔ کہ ملک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی غیر پسندیدہ شخص کو باہر نکال دے۔ اگرچہ اس غیر پسندیدگی کا کوئی الزامی ثبوت مہیا نہیں کیا گیا۔ لیکن اگر ان فرضی الزامات کو لکھا جائے تو فرد الزامات کچھ اس طرح کی ہو گی۔

(۱) یہ مسلمان ہے۔ (۲) مغرب اقصیٰ کی عربی زبانوں میں روانی سے گفتگو کر سکتا ہے۔

(۳) مقامی مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں دلچسپی لیتا اور اُن سے بات چیت کرتا اور ان کے ہاں مہمان ہوتا ہے۔

(۴) ایک دفعہ ایک مشہور قوم پرست مراکشی کے ہاں بھی گیا تھا۔

(۵) اگرچہ ایک آسٹریلوی صحافی کی ترجمانی کا کام کر رہا ہے لیکن فرانسیسی اس سے خوف زدہ ہیں۔

(۶) کہا جاتا ہے کہ مراکش کے برطانوی قونصل خانہ نے اسے عربی اخبارات و رسائل کے مترجم اور انگریزی زبان کے معلم کی حیثیت سے ملازم رکھا ہوا ہے"۔

فرانسیسیوں کی نگاہوں میں مندرجہ بالا "حقائق" میں سے ایک بھی شک و شبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھا۔ مزید برآں جرائم کی مکمل فہرست میرے جاسوس ہونے کا ثبوت مہیا ہوتی ہے کیونکہ فرانسیسی منطق کی رو سے ایک عربی دان انگریز مسلمان برطانوی جاسوس ہونے کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ اس لئے کہ انگریز بہت ذہین لوگ ہیں اور کسی ایسے موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اگر فرانسیسیوں کو ایک دفعہ یہ شک پڑ جائے تو پھر یہ شک کبھی دور نہیں ہو سکتا۔ خواہ بے چارہ ملزم معصوم ہی کیوں نہ ہو فرانسیسی حکام کا ذہن ملزم کے تفصیلی بیان کے باوجود صاف نہیں ہو سکتا اور برطانوی حکام کی دخل اندازی قدرتی طور پر شک و شبہ میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی

ان حالات میں فرانسیسیوں کی نظروں میں میں ایک مشکوک آدمی بن گیا اور بعد کے واقعات نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ فرانسیسی مقبوضات شمالی افریقہ کے گئی علاقوں میں میرا نام بطور فرانسیسی دشمن لکھا جا چکا تھا اور اہل فرانس کی اس حماقت کی وجہ سے میں سچ مچ فرانس دشمن بن گیا۔

ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے فرانس میں فرصت کے کچھ مسرت آفریں دن گزارے ہوں اور فرانسیسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ دیکھا ہو میری یہ کہانی سن کر حیران ہوں اور اعتراض کریں کہ بھلا فرانسیسیوں کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ایک متجسس سیاح کو اپنے علاقہ سے خارج کرنے کے لئے ایسا جھوٹا مقدمہ کھڑا کریں لیکن کیا کیا جائے۔ یہ ایک بیّن حقیقت ہے۔ فرانس اور برطانیہ کے ایک باہمی سمجھوتہ کے مطابق فرانسیسی باشندوں کو انگلستان میں اور برطانوی باشندوں کو فرانس میں کسی راہداری کی ضرورت نہیں ہوتی اور چونکہ الجیریا فرانس کا ایک صوبہ ہے اس لئے قانونی طور پر اس حق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں وسطی افریقہ کے فرانسیسی علاقوں میں جانے والے فرانسیسی کارواں کو برطانوی نائیجیریا میں سے ہو کر جانا پڑتا ہے اور اس لئے برطانوی علاقے میں سے گزرنے کی سہولتیں حاصل کرنے کے لئے فرانسیسیوں کو بھی صحرا کے پار جانے والے برطانوی باشندوں کو وہی سہولتیں پہنچانی پڑتی ہیں۔ چونکہ اصولی طور پر کسی لحاظ سے فرانسیسیوں کے پاس برطانوی باشندوں کو صحرا میں داخل ہونے سے روکنے کی کوئی دلیل نہیں اس لئے وہ ہر ایک کو ملک میں جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ لیکن جب انہیں پتہ چل جاتا ہے کہ مسافر کی نیت سیر سپاٹا کرنے کی نہیں بلکہ وہ عربوں کی حالت زار سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو پھر وہ بخیریت سفر نہیں کر سکتا۔ ملک میں بذات خود کوئی ایسی چیز نہیں جسے بیرونی دنیا کی نظروں سے چھپایا جائے۔ لیکن فرانسیسیوں کے نقطہ نگاہ سے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ عربوں اور بیرونی دنیا کے درمیان کوئی تعلق قائم نہ ہونے پائے۔ تاکہ ان کی آزادی کے مسئلہ پر غیر ممالک میں اُن کے حامی پیدا نہ ہو سکیں اور دنیا کو اُن کی صحیح حالت کا پتہ نہ چل جائے۔ شمالی افریقہ کے دوسرے حصوں میں کئی برطانوی صحافیوں کو اسی صورت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

فرانس کے زیر حمایت مراکش

سابقہ واقعات کے ایک ماہ بعد فرانسیسی قونصل خانہ سے راہداری حاصل کر کے میں تنجیر کے راستے اندرون مراکش میں دوبارہ داخل ہوا۔ مجھے بغیر کسی تردد کے ہی مل گئی۔ جب میں رباط کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو پولیس نے مجھے دوسرے مسافروں سے الگ کر کے بلوایا۔ اور کہا کہ راہداری منسوخ کر دی گئی ہے اور اس لئے مجھے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر ملک سے نکل جانا چاہئے۔ جب میں نے احتجاج کیا کہ میں نے تو فرانسیسی قونصل خانے سے راہداری حاصل کی ہے تو مجھے بتایا گیا کہ وہ غلطی سے جاری کی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے دوسرے دن صبح مراکش سے جانے والے ہوائی جہاز میں کوئی نشست خالی نہ تھی۔ اس لئے وقت سے فائدہ اٹھا کر میں احتجاج کرنے کے لئے برطانوی قونصل خانہ میں گیا اگرچہ اس غیر مہذب سلوک کے خلاف حکومت مراکش سے رسماً احتجاج کر دیا گیا۔ لیکن قونصل نے مجھے بتا دیا کہ میری کوئی خاص عملی مدد نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ مراکش میں برطانوی قونصل خانوں کو وزارت خارجہ کی طرف سے اس امر کی خاص ہدایات ملی ہوئی ہیں کہ کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جس سے فرانسیسیوں کو پریشانی ہو سکتی ہو۔ شمالی افریقہ میں بے انصافی کے انفرادی معاملے برطانیہ اور فرانس کے ۱۹۰۴ء کے یورپی معاہدے کا نتیجہ تھے۔ آج بھی اگرچہ امریکہ اور برطانیہ شمالی افریقہ کے عربوں کی حمایت کرتے ہیں۔ تاکہ انہیں دنیائے اسلام کی ہمدردیاں حاصل ہوں۔ لیکن معاملہ کو یہی مشرق بعید کی کشمکش میں فرانسیسی تعاون حاصل کرنے کی ضرورت پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ میں جنرل دی لاتر General de Lattre کی آمد نے فرانس کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو زیادہ مستحکم بنا دیا ہے۔ انہیں ہند چینی میں اُن اشتراکی فوجی دستوں کے خلاف مدد مل سکے جو اگر کامیاب ہو گئے تو ملایا کے لئے باعث خطر بن جائیں گے۔

بلکہ فرانسیسی پولیس افسروں کے پاس حاضر ہونے کی وجہ سے جنرل جوئین (General Juin) کی کابینہ نے اخراج کا حکم منسوخ کر دیا اور مجھے پاسپورٹ میں درج شدہ مدت تک ملک میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن اس وقت سے لے کر اب تک میں نے دوبارہ مراکش جانے کی کوشش نہیں کی۔

ہسپانیہ کے زیر حمایت مراکش

ہسپانیہ کے زیر حمایت مراکش کا وجود سلاطین مراکش کے ساتھ معاہدہ کا نتیجہ ہے لیکن اس معاہدہ کو بعض مراکشی غیر قانونی سمجھتے ہیں جو دستخط کے وقت مراکش کے تخت کے دو دعویدار تھے۔ یہ بات ابھی تک مبہم ہے کہ آیا وہ سلطان جس نے دستخط کئے۔ دستوری طور پر ایسا کرنے کا مجاز بھی تھا یا نہیں اگر یہ حقیقت ثابت ہو جائے تو دَوَلِ یورپ کے پاس نو آبادیاں قائم رکھنے کی کوئی قانونی اساس باقی نہیں رہے گی ——— لیکن یہ ثبوت ابھی تک مہیا نہیں کیا جا سکا۔

برطانیہ نے مراکش میں فرانسیسی حقوق کو مصر میں برطانوی حقوق کے عوض تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن برطانیہ نے ہسپانیہ کے ساتھ کبھی ایسا معاہدہ نہیں کیا۔ چنانچہ اگرچہ امریکہ یورپی مستعمرات کے کسی حق کو تسلیم نہیں کرتا اور امریکہ کے شہری سارے ملک میں زائد علاقائی حقوق رکھتے ہیں۔ برطانوی باشندے فطرتی طور پر ویسے ہی حقوق صرف ہسپانوی علاقے میں رکھتے ہیں۔ جب ہسپانوی مراکش میں برطانوی باشندہ صرف اپنے قونصل کے بل بوتے پر ہوتا ہے۔ وہ ہسپانوی قوانین کے ماتحت نہیں ہوتا اور بین الاقوامی قانون کے ماتحت ہسپانوی اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب میں اس ہسپانوی علاقے میں پہنچا تو میں ریف کے بربریوں میں خوب گھوما۔ علم الانسان کے طالب علم کے لئے یہ نسل ایک دلچسپ معمہ ہے۔ یعنی زبان کے بہت سے الفاظ عبرانی زبان سے ملتے ہیں اور ان کی کوزہ گری عراق عرب کے قدیم سمیریوں کے دریافت شدہ نمونوں سے مماثلت رکھتی ہے۔

میں ان مسائل کو زیادہ اچھی طرح سمجھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے شلیحی (ریفی) زبان سیکھ لی اور کئی راتیں تنہا ان حاضرہ سے دور غیر معروف پہاڑی جنگلوں میں گزاریں۔ اگرچہ ہر جگہ مجھ سے نہایت مہربانی کا سلوک ہوا لیکن ہسپانوی افسر کی پیشگی اجازت کے بغیر مجھے کسی گھر میں دعوت نہ دی گئی۔ تاہم میں نے مرکزی ریف کا ایک بازار دیکھا اور قبیلہ کے کئی سرکردہ لوگوں سے بات چیت بھی کی۔ میں غازی عبدالکریم کے مولد و منشا میں سے ہو کر گذرا اور ان کے قبیلے کے لوگوں سے بات چیت بھی کی ——— وہ ابھی تک اُن کی واپسی کے آرزومند ہیں۔

جب میں تنجیر واپس پہنچا تو فرانسیسی قونصل خانہ میں میرے گزرنامے سے علاقہ ریف سے بحفاظت گزرنے کی ہدایت پراسرار طور پر غائب ہو چکی تھی۔ جب میں نے احتجاج کیا تو مجھے بتایا گیا کہ فرانسیسی حکام کو اس بات کا کوئی علم نہیں۔ مزید تکرار پر یہ جواب موصول ہوا۔ "جناب فرانسیسی قونصل خانہ جھوٹا نہیں ہے" اب مزید کیا کیا جا سکتا تھا۔ بحیثیت استعمار پسند قوت کے اگرچہ ہسپانیہ اور فرانس ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ تمام ایسے معاملات میں زبردست تعاون کرتے ہیں جن سے اُن کے مشترکہ مستقبل پر اثر پڑتا ہو۔

ہسپانیوں نے دوسرا حفاظتی گزرنامہ جاری کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے ریفیوں میں ہسپانیہ کے خلاف جذبات مشتعل کرنے کی عمداً کوشش کی تھی۔ جب برطانوی قونصل خانہ نے اس الزام کی تائید میں ثبوت طلب کیا تو وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔ معاملہ دفتر خارجہ میں لطیفہ بنا پہنچا کہ کس طرح ہسپانوی ایک برطانوی باشندے کو اپنے ملک میں داخل ہونے سے روک رہے تھے اور اس طرح بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ دفتر خارجہ میں یہ معاملہ دو سال تک چلتا رہا۔ اور اب مجھے اس کے متعلق علم نہیں۔

یہ تھے وہ تجربات جو میں نے شمالی افریقہ میں بھاگتی گزرتے ہوئے حاصل کئے۔ ایک غیر ملکی صحافی کے تجربے کے حاصل کئے۔ مندرجہ بالا کہانی کا دلچسپ تتمہ حسب ذیل اطلاع ہے جو مجھے انڈونیشیا میں ایک قابل اعتماد ذریعے سے ملی۔۔۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ میں مراکش سے انڈونیشیا وارد ہوا تھا، فرانسیسی حکام نے اپنے سفیر مقیم جکارتا کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس بات کی اطلاع دی گئی کہ میں استقلال دشمن اسلامی تحریکوں سے وابستہ ہوں اور اس میں غالباً یہ بھی مذکور تھا کہ مجھے ہند چینی میں داخل ہونے کا اجازت نامہ ہرگز نہ دیا جائے۔ بہر حال اس سے اتنا پتہ ضرور چل جاتا ہے کہ اہلِ فرانس مشکوک لوگوں کا دنیا بھر میں پیچھا کرنے میں مستقل مزاج ہیں۔

یہ صرف ایک آدمی کے تجربات کی منفرد داستان ہے۔ مسلمان مشرقی صحافیوں کو ان مستعمرات میں کبھی داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مصر، برطانوی صحافیوں کو بھی اسی طرح دوبارہ جانے کی اجازت نہیں ملی اور تازہ ترین واقعہ مسٹر روم لینڈاؤ کا ہے۔ مصر کو سارے شمالی افریقہ میں اپنا قونصل خانہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اگرچہ بین الاقوامی شہر تنجیر میں ایسا کرنے سے کوئی شخص نہیں روک سکتا۔ اب یہ عرب ریاستوں کا کام ہے کہ وہ شمالی افریقہ میں اپنے بھائیوں کی خاطر زیادہ عزم اور جوش کے ساتھ تدابیر اختیار کریں اگر انہیں وہاں قونصل خانے قائم کرنے کی اجازت نہیں تو پھر اسلامی ریاستوں میں فرانسیسی قونصل خانے کیوں قائم ہیں۔

شمالی افریقہ کی آزادی یا کم از کم وہاں کی آبادی کے لئے تھوڑا سا انصاف حاصل کرنا ساری دنیائے اسلام کی ذمہ داری ہے اور اس سلسلے میں مغربی جمہوریتوں کی طرف سے قدرے اور روس کی طرف سے کافی امداد مل سکتی ہے۔ شمالی افریقہ کے باشندوں کے لئے زبانی ہمدردی کا اظہار قاہرہ، کراچی اور جکارتا میں کیا گیا ہے، لیکن سوچنا یہ ہے۔ کیا یہ کافی ہے؟

★ ——— قرآن بہت آسان ہے

★ ——— قرآن بہت مشکل ہے

دونوں ہی باتیں اپنی جگہ درست ہیں

ان میں کوئی تضاد نہیں ہے

اس حقیقت کو مولینا امین احسن اصلاحی نے اپنی گراں بہا تصنیف

"تدبر قرآن"

میں علمی و تحقیقی انداز سے نمایاں کیا ہے

اور یہ بھی بتایا ہے کہ:-

قرآن مجید میں تدبر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ ——— اس کام میں کن آداب و شرائط کا اہتمام ضروری ہے۔ تفسیر کی کتابوں میں سے کون سی کتابیں کس حد تک مفید ہیں؟ عربی ادب کی کس درجہ کی استعداد قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے؟ لغت کی کون سی کتابیں مطالعۂ قرآن کے وقت پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ نحو، بلاغت، تاریخ اور حدیث سے قرآن مجید کو کس حد تک تعلق ہے۔؟

دوسرا ایڈیشن۔ ترمیم و اضافے کے ساتھ قیمت ۳/۸/۰

مکتبۂ چراغِ راہ

۹۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

حاذق نروائن پلز

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل ودماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے۔ یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم اصحاب کے واسطے آبِ حیات کا کام دیتی ہیں۔ اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنی ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک	۱۰ یوم	۲۰ یوم	۴۰ یوم
پیکنگ	۲۰ گولی	چالیس گولی	۸۰ گولی
قیمت	2/-/-	3/12/-	7/-/-

مقویات میں تاج سلورین پلز

ہر موسم کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ جنرل ٹانک ہے جو بھوک کو بڑھاتا ہے اور جسم میں تازہ اور سرخ خون پیدا ہوتا ہے۔ قوت اور طاقت پیدا کرتا ہے۔

سلورین

پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ قیمت ۴۰ گولی چار روپے بارہ آنے۔ ۸۰ گولی ۷ روپے

تیار کردہ :- حاذق دواخانہ بندر روڈ۔ کراچی

مکاتیب زنداں

16 DEC

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب [illegible] کے ان خطوط کا مجموعہ جو انہوں نے پہلی قید کے دوران میں سنٹرل جیل ملتان سے لکھے —

★ — اس مجموعے میں تینوں حضرات کی زندگی کا مختصر خاکہ ۔ گرفتاری کا پس منظر اور میاں محمد طفیل صاحب کی لکھی ہوئی جیل کی ڈائری (گرفتاری سے رہائی تک) بھی شامل ہے —

★ — حکیم محمد شریف سرہندی (حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ) نے اس مجموعے کو مرتب کیا ہے —

صفحات ۲۰۸ جلد مع گرد پوش

قیمت — — صرف ۲ روپے

الاخوان المسلمون

اور

ان کی دعوت

شہید راہ شیخ حسن البنا کے ایک خطبہ کا ترجمہ جو آپ نے ۱۹۳۸ء میں اخوان المسلمون کے پانچویں اجلاس میں دیا تھا —

ترجمہ — ظفر حسین رفیق دارالعروبہ ۔ راولپنڈی

مشمولات

★ — دو لفظ از مولانا مسعود عالم ندوی

★ — عرض مترجم

★ — تمہید

★ — جماعت الاخوان کی اساس

★ — الاخوان المسلمون کا اسلام

★ — ہماری فکر کی جامعیت

★ — دعوت الاخوان کی بعض دوسری خصوصیات

(۱) فقہی اختلافات سے دوری (۲) اکابر وارباب جاہ سے بے نیازی (۳) سیاسی جماعتوں اور [illegible] سے اجتناب (۴) ٹھوس تعمیری اور تدریجی تربیتی عمل (۵) خاموش عملی کام (۶) نوجوانوں کا دعوت کی طرف کھنچ آنا (۷) شہروں اور دیہات میں دعوت کا سرعت سے پھیلنا (۸) مقصد اور طریق کار (۹) الاخوان اور تجدد انقلاب (۱۰) الاخوان اور حکومت و اقتدار (۱۱) الاخوان اور دستور (۱۲) الاخوان اور قانون (۱۳) اتحاد قومی اتحاد عربی اور اسلامی (۱۴) الاخوان اور خلافت (۱۵) الاخوان اور اسلامی جماعتیں (۱۶) الاخوان اور السنان (۱۷) [illegible] سیاسی جماعتیں (۱۸) الاخوان اور جمہور العلماء (۱۹) الاخوان اور یورپی حکومتیں (۲۰) خاتمہ —

صفحات ۱۸ — — قیمت — ایک روپیہ چار آنے ۱/۴/۰

مکتبہ چراغ راہ کراچی-۱

Printed at Nasir Printing Press, McLeod Road, Karachi &
[illegible] at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, Karachi.
Printer & Publisher Ghulam Mohammed M Chaudhri